ریاست

افلاطون

ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین

سلسلۂ انجمن ترقی اردو

نمبر ۵۳

ریاست

از

افلاطون

مترجمہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

ریاست

یا

تحقیقِ عدل

از

افلاطون

مترجمہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کیلیے

جامعہ ملیہ برقی پریس دہلی نے طبع کی

۱۹۳۲

بسمہ

مقدمہ

دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی سب سے اہم کتاب کو اردو زبان میں پیش کرتے ہوئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں مترجم سے نہ جانے کتنی جگہ فہم مطالب اور اظہار معانی میں غلطیاں ہوئی ہونگی، جن کے لیے وہ با ادب معذرت خواہ ہے۔ لیکن شاید ان غلطیوں کے باوجود اردو بولنے سمجھنے والے اس یونانی فلسفی اور شاعر، عالم اور مصلح کے سالہا سال کی کاوش ذہنی کے نتائج سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر سکیں گے، اور یہ بھی کچھ کم نہیں۔ ذیل میں مصنف اور کتاب کے متعلق چند ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں، جن سے شاید کتاب کے سمجھنے میں مدد ملے۔

فلاطون کا سال ولادت یقینی نہیں لیکن غالب گمان یہ ہے کہ حضرت مسیح سے ۴۲۷ برس قبل پیدا ہوا۔ اس کا خاندان "اتھنس (اثینہ) میں" بہت ممتاز تھا؛ حسب نسب کے اعتبار سے بھی اور جاہ و دولت کے لحاظ سے بھی۔ دادا نے ارستا کلیس نام رکھا تھا، لیکن بچپن ہی سے اس کی صحت بہت اچھی تھی اور جسم چوڑا چکلا، اس لیے ایک استاد نے اس رعایت سے اس کا نام پلاٹون رکھ دیا جس کے معنی چوڑے چکلے کے ہیں۔ اسے ہم نے معرب کر کے فلاطون اور افلاطون کر لیا ہے۔ لڑکپن ہی سے جوش اور ولولے کے ساتھ سمجھ بوجھ کے آثار نمایاں تھے؛ چنانچہ ساری عمر حیات نظری وعملی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور یہ چیز اس کی زندگی کی امتیازی خصوصیت بن گئی۔

یہ جوشیلا، من چلا، امیرزادہ اپنے عہد کی ساری متاع علمی سے بہرہ اندوز، فلسفہ اور ادب میں ماہر

وقت کے سیاسی ہنگاموں سے متاثر ہوا۔ اور کیوں نہ ہوتا؟ اس کا لڑکپن ہی تھا کہ اہلِ ایتھنز نے سسلی کی مہم شروع کی اور شباب شروع ہوتے ہوتے شہر کی قوت کا تقریباً خاتمہ ہی ہو گیا۔ ایک طرف خارجی جنگیں تباہی دکھا رہی تھیں، دوسری طرف داخلی مفاسد سر اٹھا رہے تھے۔ افلاطون شریف متمول خاندان کا نوجوان تھا، اُدھر عوام نے حکومت پر قبضہ کر رکھا تھا، جمہوریت کا دور دورہ تھا، اشراف اُمرا محض بے بس تھے۔ یہ نوجوان دیکھتا تھا کہ جماعتی زندگی کا یہ سب سے دشوار اور سب سے اہم کام، حکومت کرنے کے لیے ہر کس و ناکس، ہر چھوٹا بڑا، ہر اچھا بُرا، آمادہ بلکہ کوشاں ہے۔ یہ سمجھتا تھا کہ یہ جمہوری ریاست ایک بے ملاح کی ناؤ ہے، کہاں دیکھیے تھمے۔ پھر صرف جمہوریت کا یہ سیاسی طوفان بے تمیزی ہی اس شریف زادہ کے لیے سوہانِ روح نہ تھا بلکہ یہ نیک دل منصف مزاج نوجوان جمہوریت کی مادی ترقیوں سے بھی اثر لے رہا تھا۔ یہ دیکھتا تھا کہ عام زندگی میں سکون اور سادگی کی جگہ مسابقت اور تعیش نے لے لی ہے۔ یہ تجارت کے انتظامات دیکھتا، اور کاروبار کا فروغ، تجارتی بیڑے اور اچھے اچھے بندرگاہ۔ مگر انھیں بندرگاہوں، انھیں تجارتی منڈیوں کی ریل پیل میں ننگے بھوکوں کی بپتا پر بھی اس کی نظر پڑتی؛ تمول کے ساتھ افلاس اور محلوں کے قریب جھونپڑیاں بھی دکھائی دیتیں، اور جمہوریت کی سیاسی کمزوریاں ہی نہیں، سرمایہ داری کی اجتماعی مضرتیں بھی اس کا دل دکھاتیں اور اسے سوچنے پر مجبور کرتیں۔

افلاطون ان سب چیزوں کو دیکھتا اور سوچتا، سوچتا اور دیکھتا۔ لیکن اس نے نتائج پر پہنچنے میں عجلت سے کام نہیں لیا، شاید اس وجہ سے کہ اس کا عہد یونانی تاریخ کا وہ زمانہ ہے جب جماعتی زندگی نے گویا اپنے معراجِ کمال کو پہنچ کر رو بہ زوال ہونا شروع ہی کیا تھا اور ان زوال آمادہ اداروں کا بھرم ابھی اچھی طرح کھلا نہ تھا؛ اس لیے آثارِ زوال کا احساس بھی نہ بہت قوی تھا اور نہ بہت واضح۔ ابھی علم و فن شاعری اور ناٹک، تعمیرات اور صورت تراشی غرض ذہنی زندگی کے سارے

مظاہر نہایت اچھی شکل میں سامنے موجود تھے، کھلی خوبیوں کے سامنے چھپی برائیوں پر نظر پہنچ بھی جائے تو آدمی آسانی سے انہیں درست کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ واقعہ کے مقابلے میں خیال اور موجود کے سامنے موہوم کے لیے کوئی عجلت سے آمادہ عمل کیسے ہوا چنانچہ جوانی میں افلاطون نے عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ اثینہ کی علمی صحبتوں سے مستفید ہوتا رہا۔ اسے ادب اور شعر سے شغف تھا اور سنا ہے کہ شعر کہتا بھی تھا مگر ابھی اس کے ذہن کی گرہ نہیں کھلی تھی، اس کی روح کی کلی نہیں کھلی تھی۔ سیرت کا ہیولیٰ تشکیل کے لیے بیتاب تھا اور ذہنی زندگی اپنے مرکز کی تلاش میں بیقرار۔

انسانی زندگی، ذہنی زندگی، یعنی جماعتی زندگی ہے۔ ساری ذہنی زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ اجتماع میں یا کم سے کم دوئی سے پیدا ہوتی ہے۔ حیات انفرادی کا پودا جماعت کی نمو بخش فضا ہی میں پرورش پاتا ہے۔ من و تو، دونوں یکساں طور پر ذہنی زندگی کے لوازم ہیں۔ بچہ ہی ماں کو ماں بناتا اور اس میں وہ ساری ذہنی خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو عورت میں محض بحیثیت جنس نہیں ہوتیں، اور ماں ہی اپنی محبت اور شفقت سے بچہ کی ذہنی زندگی کو وہ متاع گراں مایہ دے سکتی ہے جس کا بدل دنیا کی اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اچھا استاد شاگرد دے اور اچھا شاگرد استاد دے، سچا گرو چیلے سے اور سچا چیلا گرو سے وہ منازل ذہنی و روحانی طے کرا دیتا ہے جو اس کے بغیر ناقابل تصور ہوتے۔ جس زندگی کے ساز کو کسی دوسری زندگی کا مضراب نہیں چھیڑتا اس کے نغمے خاموش ہی رہتے ہیں، جس زندگی کی کلی کو دوسری زندگی کی حیات بخش شبنم نہیں نصیب ہوتی وہ شگفتہ ہونے کی جگہ مرجھا جاتی ہے۔ افلاطون کی زندگی کی کلی اس وقت کھلی جب اس پر اس انوکھے بوڑھے سقراط کی نظر بہار اثر پڑی۔

ان دونوں میں شروع سے خیالات و رجحانات کی مطابقت تو یوں تھی کہ افلاطون امرا

اور اشراف میں سے تھا اس لیے جمہوری نظام حکومت سے چنداں لگاؤ نہ رکھتا بلکہ متنفر ہی تھا! ادھر ایک غریب کا بیٹا سقراط، خاندانی اثرات سے نہیں بلکہ عقلاً و اعتقاداً جمہوریت کا مخالف تھا۔ جمہوریت کی مخالفت نے اسے طبقہ اشراف کے نوجوانوں سے جا ملایا۔ انھیں نوجوانوں میں فلاطون بھی تھا جس کی زندگی کی کایا اس بوڑھے فلسفی کے فیض صحبت نے بالکل پلٹ دی۔ روایت ہے کہ اس نے سقراط سے ملنے کے بعد اپنی شاعری کا سارا دفتر سپرد آتش کر دیا۔ نہ جانے ادب عالم کو اس سے کیا ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہوگا، مگر شاعری کا کیسا ہی نقصان ہوا ہو انسانیت کو ایک انسان مل گیا۔ جس کی ذہنی قوت کے ارتعاشات آج تک نوع انسانی کی حیات ذہنی و عملی دونوں کے لیے تموّج و حرکت کا باعث ہیں۔

حیات بخشی کے اس احسان سے فلاطون نے یوں سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنی اکثر تصانیف میں خود اپنے خیالات کو سقراط کی زبان سے ادا کیا ہے اور اس طرح اپنی فکر کے سارے نتائج کو اپنے استاد ہی کی طرف منسوب کیا ہے۔ کہنے والوں نے کہا ہے کہ جہاں تک نظریات عقلی کا تعلق ہے فلاطون کو سقراط سے بہت کم ورثہ ملا ہے، اس لیے کہ سقراط غریب کے پاس مشکل ہی سے کوئی مثبت نظریۂ عقلی تھا۔ بتانے والوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ سقراط میں وہ مذہبیت یکسر مفقود تھی جس میں فلاطون کا سارا تخیل ڈوبا ہوا ہے اس شریف زادہ کو مذہبی گداز اپنے خاندان کی روایتوں سے ملا تھا، نہ کہ سقراط کے تشکیکی فلسفہ سے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سقراط کی تعلیم بے ترتیب تھی فلاطون ایک مکمل نظام فلسفہ کا موجد ہے۔ سب صحیح سب درست لیکن اس قسم کا فرق دیکھنے والے شاید اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ سقراط کے فیض نظر نے فلاطون کو محض ایک شاعر، محض ایک فلسفی یا مذہبی رسمیت کے دلدادہ محض بننے سے بچا کر ایک زندگی بخش قوت بنا دیا، اس کی مردہ

رسمی اور خاندانی مذہبیت کو اصلاح اجتماعی کے جذبہ سے کس نے آشنا کیا؟ اس کے وقتی ہیجانی رجحانات کو ایک مستقل اخلاقی مطالبہ کس نے بنایا؟ اشراف اثینہ کے فرقہ وارانہ تعصبات رکھنے والے نوجوان کو کس نے یقین دلایا کہ ہیئت اجتماعی کی نجات خود اس کے فرقہ سے بھی ممکن نہیں؟ اور یہ حقیقت کس نے فلاطون کے ذہن نشین کرائی کہ مصائب وقت اور مفاسد زماں سے بچنے کی راہ کسی عارضی اور جزوی تدبیر سے نہیں نکل سکتی بلکہ صرف اس طرح کہ کسی مخصوص گروہ یا طبقہ کے اغراض پر ریاست کی بنیاد رکھنے کے بجائے اس کی اساس تعلیم اخلاق پر ہونا چاہیئے؟ یہ سب کچھ سقراط ہی کا فیض تھا۔ انھیں خیالات سے فلاطون کا دماغ مرتے دم تک معمور رہا اور انہیں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ مدت العمر اپنی تصانیف، اپنے [illegible] اپنے سیاسی اشغال کے ذریعہ جان توڑ کوشش کرتا رہا۔ اس نے دنیا کے اس سب سے [illegible] مصنف میں ایک شان اصلاح، اس بڑے معلم میں [illegible] اور اس مفکر اعظم میں شان [illegible] پیدا کردی۔

فلاطون کی زندگی کا یہ سب سے اہم معاملہ یعنی سقراط سے اسکا تعلق ۳۹۹ ق۔م میں ختم ہو گیا۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ اور چونکہ اس سزائے موت کے اسباب سیاسی تھے اس لئے استاد کی رحلت کے بعد شاگردوں کو بھی اثینہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ یہ سب کے سب مگارا میں اقلیدس کے ہاں چلے گئے۔ انہیں میں فلاطون بھی تھا۔ اس کے بعد کے حالات کا تفصیلی پتہ نہیں چلتا۔ قیاس ہے کہ اثینہ واپس آنے سے پہلے فلاطون نے افریقہ کا سفر کیا، قیروان اور مصر میں فلسفہ اور ریاضی کی تحصیل کی اور اثینہ واپس پہنچا۔ پھر ۳۹۰ ق۔م سے پہلے سسلی اور جنوبی اٹلی کا سفر کیا۔ اس سفر میں علمی اغراض کے علاوہ فلاطون کے پیش نظر عملی سیاسی مقاصد بھی تھے

اپنی ریاست کی جمہوریت سے اس کے دل میں جو بیزاری سی پیدا ہو گئی تھی اور اصلاح حکومت کے جو نئے نئے منصوبے اس کے ذہن میں پیدا ہوتے تھے، وہ اس جوشیلے نوجوان کے لیے دعوتِ عمل کا کام دے رہے تھے۔ اپنی ریاست میں اُسے مشکل سے کوئی ہمنوا ملتا تھا۔ خود اس کے خاندان کے بہت سے لوگ، اُمرا و اشراف، زمانہ کا رنگ دیکھ کر جمہوریت کے قائد بن بیٹھے تھے۔ جب اس نے اپنوں میں کوئی ساتھی نہ پایا تو باہر کا رخ کیا اور یونانی تمدن کے مغربی علاقوں کی راہ لی۔ اسے توقع تھی کہ وہاں اپنے سیاسی خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں متبعین فیثا غورث سے مدد ملے گی۔

یہ جماعت چھٹی صدی ق۔م میں قائم ہوئی تھی۔ آئے دن کے سیاسی تغیرات نے اس جماعت کو کبھی اُبھارا، کبھی گرایا۔ اس نے بہت کچھ دھوپ چھاؤں دیکھی۔ ہوتے ہوتے سیاسی اثر میں خاصی کمی بھی ہو گئی لیکن [illegible] مذہبی اور علمی تسلط برابر بڑھتا گیا اور اسکے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاسی مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اس لیے یہ لاکھ کمزور ہوں ان کا تھوڑا بہت سیاسی اقتدار اب تک باقی تھا۔ ان کے پیش نظر بھی اصلاحی مقاصد تھے۔ یہ عوام کی حکومت کو عقل و دانش کے تفوق اور اخلاقی تعلیم اور مذہبی عقائد کے اثر سے بدلنا چاہتے تھے اور جمہور کے مقابلہ میں ہمیشہ طبقہ امرا کی طرفداری کرتے تھے، اس سیاسی مسلک کے باعث نیز ان علمی اور مذہبی خیالات کی وجہ سے فلاطون کو ان سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اور اس نے سوچا کہ سراکیوز میں اس کے لیے عملی کام کا اچھا موقع ہے۔

اس شہر میں عرصہ سے ایک مطلق العنان حکمراں دیونی سی اوس کی حکومت تھی سیاست خارجی میں اس نے کارتھیج اور یونانی ریاستوں سے اپنا معاملہ استوار کر لیا تھا۔ اندرون ملک میں مختلف فرقوں کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنا اقتدار خوب

جمالیا تھا اور اپنے دربار کو علم دوستی اور فن پروری سے چار چاند لگا چکا تھا۔ درباریوں میں طبقہ اشراف کا سرگروہ اور خود اس کا بہنوئی ڈیون بھی تھا، جسے فیثا غورثی جماعت سے تعلق تھا۔ چنانچہ اسی واسطے سے فلاطون کی دربار میں رسائی ہوئی۔ پہلے بہت کچھ آؤ بھگت کی گئی فلاطون نے بادشاہ پر اپنے خیالات کا بہت کچھ اثر بھی ڈالا، مگر دربار کی سازشوں نے زیادہ دن تک یہ حالت قائم نہ رہنے دی۔ انجام کار وہ دربار کی اشراف پارٹی کی سازشوں میں شرکت کے الزام پر قید کیا گیا اور پھر غلام کی حیثیت سے بیچ دیا گیا! شاہی بے رخی کے بعد کسی قیروانی فلسفی کی علم دوستی اس کے کام آئی کہ اس نے اس قیمتی غلام کو خرید کر آزاد کرایا!

عملی سیاست میں فلاطون کی یہ پہلی کوشش ناکام رہی۔ اور جب یہ کوئی ۳۸۸ ق۔م میں اثینہ لوٹا، تو غالباً یہ تہیہ کر کے کہ عملی سیاست کو خیرباد کہے اور اپنے جماعتی و سیاسی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے درس اور علمی تحقیق سے کام لے۔ چنانچہ اس نے اپنی مشہور تعلیم گاہ "اکادمی" قائم کی۔ اس کے اکھاڑے اور عمارتوں کے لیے زمین غالباً اس نے خود اپنے روپیہ سے خریدی کچھ مدد دوستوں نے دی اور اس طرح یہ سب سے قدیم یونیورسٹی وجود میں آئی۔ تعلیم کا کوئی مالی معاوضہ یہاں نہ لیا جاتا تھا۔ ہاں کبھی کوئی طالب علم بھی کوئی ہمدرد روپیہ یا جائداد وقف کر دیتا اسی سے رفتہ رفتہ اکادمی کے پاس خاصی جائداد ہو گئی۔ کتب خانہ بھی اسی طرح عطیوں سے بنا۔ جیتے جی فلاطون ہی اس علمی جماعت کا صدر رہا۔ اس کے بعد سابق صدر کی وصیت کے مطابق ارکین میں سے ایک شخص صدر بنایا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ کوئی ۹۰۰ سال تک چلتا رہا حتی کہ ۵۲۹ء میں شہنشاہ جسٹینین نے اسے ختم کر دیا۔ مرتے دم تک اس اکادمی میں درس تدریس ہی فلاطون کا مخصوص شغل رہا۔ شادی اس نے کی نہیں اس لیے اس کا یہ مدرسہ ہی گویا اس کا خاندان تھا۔ سیاسی زندگی میں شرکت کے ولولے نے بھی یہی شکل اختیار کی کہ اس کے وقتی ہنگاموں سے الگ رہ کر آنے والی نسل کو اس تعمیر نو

کے لیے تیار کرے۔

لیکن اس کے دل میں سیاسی اصلاح کے جذبے کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ساٹھ برس کی عمر میں جب علمی مشاغل کی پُرسکون فضا میں ایک مدت گزر چکی ہے اسے (۳۶۸ ق۔م میں) خبر ملتی ہے کہ دیونس کی وفات کے بعد تخت و تاج اس کے بیٹے کو ملا اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ تمام سسلی اور جنوبی اٹلی میں فیثاغورثی جماعت کا اثر از سرِ نو بڑھ گیا ہے تو یہ بے چین ہو جاتا ہے اور جہاں اسے دعوت پہنچتی ہے کہ آکر اپنے مشورہ سے سیاسی تشکیل میں مدد دے تو اس سے نہیں رہا جاتا اور یہ پیرانہ سال معلم چل کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں پہنچکر نوجوان حکمراں کے مزاج میں خاصا دخل بھی پا لیتا ہے لیکن کچھ دن بعد اس کی سیاسی جماعت کے سرگروہ دیون کو بادشاہ جلا وطن کرتا ہے تو ناچار افلاطون بھی اثینہ واپس چلا آتا ہے۔ دیون بھی اس کے ساتھ ہی اثینہ آتا ہے اور ان کے ہمراہ فیثاغورثی جماعت کے اور بہت سے لوگ آکر اکاڈمی میں شریک ہوتے ہیں لیکن سیاسی دلچسپی اب بھی ختم نہیں ہوتی۔ ۳۶۲ ق۔م افلاطون ایک مرتبہ اور سسلی کا سفر کرتا ہے، تا کہ اپنے اثر سے دیون اور بادشاہ میں مصالحت کرا دے۔ اس مرتبہ بھی پہلے تو خوب خاطر و مدارات ہوتی ہے لیکن آگے چل کر سیاسی اختلافات خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں اور حکومت تارنٹ کی مداخلت سے جو فیثاغورثی جماعت کے زیر اثر تھی افلاطون کی جان بچتی ہے۔

عملی سیاست سے دل برداشتہ ہونے کے لیے اتنی پیہم ناکامیوں اور مایوسیوں کی ضرورت تھی! اس کے بعد افلاطون نے کبھی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا؛ اور آخر عمر تک اکاڈمی میں پڑھانے اور لکھنے کے کام میں مشغول رہا۔ اور جب وہ وقت آیا جو سب کے لیے آتا ہے تو عقیدتمند شاگردوں اور ہونہار نوجوانوں کے حلقہ میں جان دی۔ سال وفات ۳۴۷ ق۔م بتایا جاتا ہے۔

اس عظیم الشان شخصیت کی عملی ناکامیوں کی داستان کیسی عبرت انگیز ہے اور اس کا حال کو بدلنے میں ناکام رہ کر درس و تصنیف سے مستقبل کو متاثر کرنے کا تہیہ کس قدر سبق آموز۔ تاریخ عالم ایسی بہت کم شخصیتوں سے آشنا ہے جن میں خیال و فکر کے مراتب اعلیٰ غیر معمولی عملی صلاحیتوں سے توام ہوں۔ فلاطون بھی ان بڑے انسانوں میں تھا جن کے دل میں تشکیل نو کی آگ بھری ہوتی ہے جن کا ذہن اس تشکیل کے مفصل سے مفصل نقشے بنا سکتا ہے۔ مگر انھیں عملی دنیا کی قوتیں ارزانی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اس صف اول کے مفکر سیاسی کو بھی تدبر سیاسی کا موقع نہیں ملتا اور یہ ناچار امروز سے آنکھیں بند کر کے فردا کی لو لگاتا ہے اور عملی وقتی و آنی کے بجائے اپنی تصانیف کے ذریعہ عمل جاری کی طرح ڈالتا ہے جس کے اثرات آجتک دنیائے فکر اور دنیائے عمل میں محسوس ہوتے ہیں اور نہ جانے کب تک محسوس ہوتے رہیں گے۔

فلاطون کی نظر چونکہ مستقبل پر تھی اس لیے اس نے اپنے تعلیمی کام کو درس ہی تک محدود نہ رکھا۔ ہر چند اس کی زندگی کا بڑا حصہ اسی شغل میں صرف ہوا لیکن اس درس کے نتائج اسنے آنیوالی نسلوں کے لیے اپنی متعدد تصانیف میں چھوڑے ہیں اور اس کا درس ہمارے لیے اس شان سے محفوظ ہے کہ کتابوں کو پڑھتے وقت معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود فلاطون کے حلقہ تلمذ میں جا بیٹھے۔ مصنف کی حیثیت سے فلاطون کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ ایک شاعرانہ تخیل رکھنے والے معلم کی کاوش ذہنی و ادبی کا نتیجہ ہیں جن میں سیاسی و مذہبی مقاصد اور علمی افکار کا یک زندہ مرقع ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ ادبی میں مشکل ہی سے یہ بات کہیں اور اس درجۂ کمال پر مل سکیگی۔ فلاطون کی کتابیں ایک طرف تو مجددانہ مقالات ہیں جن میں ایک نئے تصوّر حیات ایک جدید دستور زندگی کی شروع سے آخر تک حمایت کیگئی ہے، دوسری طرف وہ نہایت بلند پایہ علمی تحقیق کی شان رکھتی ہیں، اور پھر اپنے شاعرانہ حسن اور ادبی کمال کی وجہ سے بے مثل ہیں

سچ یہ ہے کہ تصنیف کے میدان میں فلاطوں کو وہ مرتبہ ملا جو اور کسی کو حاصل نہیں۔ بقول ونڈل بانڈ "اس کی شخصیت کے نظری اور عملی پہلو دونوں آگرچہ لیانی کمال میں مل گئے ہیں مصلح اور مفکر کا تضاد آرٹسٹ کی ذات میں غائب ہو گیا ہے" فلاطون کا یہ جرمن سوانح نگار ایک اور جگہ کیا خوب لکھتا ہے کہ "اکثر فلسفیوں مثلاً ارسطو، اسپنوزا، ہیوم، کانٹ، ہیگل کو ہم ان کے علمی تعمق کی داد دیتے ہیں، بعض مثلاً فشٹے، کونت کے یہاں اس علمی گہرائی کے ساتھ ایک پیغمبرانہ شان سی نظر آتی ہے، اوروں میں مثلاً دیکارت، شیلنگ، شوپن ہاؤر کے یہاں اس کے ساتھ حسن بیان کی آمیزش ہے، لیکن یہ تینوں چیزیں ایک جگہ اگر ملتی ہیں تو بس فلاطون کی تصانیف میں!" اس خوبی کا کمال فلاطون کو اپنی آخری تصانیف خصوصاً "ریاست" میں حاصل ہوا ہے۔

یہ کتاب جو فلاطوں کے شجر علم کا پختہ ثمر ہے ہم تک دو ناموں سے پہنچی ہے: 'ریاست' اور 'تحقیق عدل'۔ ان ناموں سے یہ سمجھ لینا کہ یہ سیاست یا قانون پر ایک تصنیف ہے غلط ہوگا سچ یہ ہے کہ اس میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے، البتہ زیادہ توجہ انسانی زندگی کے عملی پہلو پر ہے اس لیے کتاب کا زیادہ حصہ اخلاقی اور سیاسی مسائل سے پُر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ فکر و خیال کی دنیا کو یک قلم نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ فلسفہ کی بلندیاں دیکھنی ہوں تو عین خیر میں سب چیزوں کے اتحاد کا جلوہ بھی اس کتاب میں دکھائی دیتا ہے؛ اخلاق کا سبق لینا ہو تو اس میں روح انسانی کے محاسن کی گہری اور لطیف تحقیق موجود ہے؛ تعلیم کے مسائل پر روشنی درکار ہو تو بقول روسو "فن تعلیم پر آج تک جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں یہ سب سے بہتر ہے" سیاسی زندگی میں رہنمائی کے لیے یہ ایک جدید ہیئت اجتماعی اور اس کے اداروں کی جیتی جاگتی تصویر لا کر کھڑی کر دیتی ہے؛ اور انسانی جماعتوں کے تغیر، عروج و زوال، کے اسرار سربستہ کی کنجی کی تلاش ہو تو فلسفہ تاریخ کے یہ مشکل مسائل بھی اس میں حل کر دیے گئے ہیں۔

اس سے شاید یہ خیال پیدا ہو کہ مختلف مسائل کا ایک کتاب میں اس طرح جمع ہو جانا اس وجہ سے ہو کہ قدما کے یہاں علوم کی تقسیم کچھ بہت واضح نہ تھی۔ یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ "ریاست" کی تیاری میں افلاطون نے دس سال سے زیادہ صرف کیے، شاید مختلف وقتوں میں لکھے ہوئے رسائل کو یکجا کر دیا ہو اور جوڑ پیوند لگا کر ان میں تسلسل قائم کیا ہو لیکن یہ خیالات صحیح نہیں افلاطون نے ان مختلف مسائل پر اپنے مرکزی مسئلہ کی خاطر مجبوراً بحث کی ہے۔ اور اس کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اچھا آدمی کیسے بنے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے اجتماعیات کے اس مرکزی مسئلہ کا حل ضروری ہے کہ فرد اور جماعت میں تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ افلاطون کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی تمام صلاحیتوں کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے کسی جماعت، کسی ریاست، کی رکنیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اچھا آدمی اچھی ریاست ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے اصل سوال کے جواب کی خاطر افلاطون کو اچھی ریاست کا خاکہ بنانا پڑا۔ اور فلسفہ اخلاق کا مسئلہ سیاست کا مسئلہ بن گیا۔ اور اس سیاسی مسئلہ پر بحث میں افلاطون کو معاصرانہ سیاست کے خلاف جہاد بالقلم کا موقع بھی ملا۔

افلاطون کے زمانہ میں اقتدار سیاسی شخصی آرزؤں کو پورا کرنے کا وسیلہ بن گیا تھا۔ انفرادیت کا بھوت سب کے سر پر سوار تھا۔ اور افلاطون فرد کو جسم اجتماعی کا ایک عضو مانتا تھا۔ اسلیے اسنے اس اخلاقی صفت پر بحث کی جس کی وجہ سے آدمی ہوائے نفس کا بندہ بن جانے کے بجائے ضبط نفس سے کام لیتا ہے اور جماعت کی فلاح کے لیے بس ایک کام اختیار کر لیتا ہے یعنی اپنے وظیفہ اصلی کو پورا کرتا ہے۔ اس انفرادیت کے بجائے جو جمہوریت کے پردے میں پھیلی ہوئی تھی افلاطون اجتماعی تعاون کا پیام دیتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے تخصیص کار کا اصول پیش کرتا ہے تاکہ ہر فرد اور ہر طبقہ اپنے فرض مفوضہ کو قناعت اور خوشدلی سے انجام دیتا رہے، اپنا دھرم پورا کرتا رہے کہ افلاطون کی نظر میں

یہی اجتماعی زندگی کا سچا اصول یعنی عدل ہے۔ اسی وجہ سے "ریاست" کا دوسرا نام "تحقیق عدل" بھی ہے۔

اس تخصیص کار کو کامیاب بنانے کے لیے لازمی ہے کہ ہر فرد اور ہر طبقہ کو اسکے وظائف مخصوص کے لیے تیار کرنے کا انتظام کیا جائے۔ یہ تعلیم کا کام ہے چنانچہ فلاطون اس کتاب میں تعلیم کا نہایت مفصل نظام پیش کرتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ریاست دراصل تعلیمات پر ایک مقالہ ہے۔ پھر حکمرانوں کی تعلیم اعلیٰ کے سلسلے میں علم مطلق یعنی مابعد الطبیعیات کی فلسفیانہ بحثیں آجاتی ہیں۔ اس نظام تعلیم کی تفصیلی بحث کے بعد فلاطون محسوس کرتا ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ عمل میں لانے اور مستقل بنانے کے لیے اجتماعی زندگی کے بہت سے اداروں کو بدلنا ضروری ہے چنانچہ معیشت کا ایک اشتراکی نظام تجویز کرکے گمراہیوں کا سدباب کرتا ہے۔ ہم ذیل میں کتاب کے ان ۳ اہم مباحث کا خلاصہ ناظرین کی سہولت کے لیے پیش کرتے ہیں یعنی (۱) ماہیت عدل۔ (۲) نظام تعلیم۔ (۳) نظام معیشت

(۱) عدل: ریاست میں عدل کے رائج الوقت نظریات نہایت خوبی سے پیش کیے گئے ہیں، اور انپر بحث کرکے مخصوص سقراطی انداز میں انھیں رد کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے عدل کا روایتی نظریہ کیفیلس کی زبان سے پیش ہوتا ہے کہ عدل قرض ادا کرنے یا واجب کے پورا کرنے کا نام ہے۔ اثنا گفتگو میں ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ عدل کوئی مہارت یا ہنر ہے جس سے دوستوں کو نفع اور دشمنوں کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ فلاطوں یہ جتا دیتا ہے کہ عدل کوئی ہنرمندی یا مہارت نہیں بلکہ روح کی ایک صفت اور ذہن کی ایک عادت ہے جس کا حامل بس ایک ہی طریقہ پر عمل پیرا ہوسکتا ہے اور وہ طریقہ ہرگز ایسا نہیں ہوتا جس سے کسی کو چاہے دوست ہو چاہے دشمن نقصان پہونچے یا اس کی ذات میں کسی طرح کا زوال یا انحطاط پیدا ہو۔

کیفیلس اور اس کے بیٹے کے بعد مشہور سوفسطائی تھریسی مکس اس روایتی تصور عدل کے

مقابلہ میں انقلابی اور تنقیدی نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ عدل کو قوی تر فریق کے اغراض سے تعبیر کرتا ہے یعنی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا اصول نہایت بیباکی اور دیدہ دلیری سے پیش کرتا ہے۔ یہ صاف صاف کہتا ہے کہ ریاست میں حکمراں کے اغراض کی پابندی عدل ہے یعنی عدل قوی کے لیے اپنی غرض اور کمزور کے لیے دوسرے کی غرض پورا کرنے کا نام ہے۔ عدل کا یہ نظریہ انفرادیت کی حد ہے جس کے جواب میں افلاطون اس موقع پر اپنا نظریہ جماعت پیش نہیں کرتا کہ افراد اور گروہ کے جدا جدا بے تعلق و بے ربط اغراض ہوتے ہی نہیں بلکہ ہر ایک کی غایت یہ ہے کہ کل کی بھلائی کے لیے اپنے اپنے وظائف مخصوصہ پورا کرے۔ یہاں تو وہ صرف اپنی بے پناہ سقراطی جرح سے اس نظریہ انفرادی کو ختم کر دیتا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اگر حکومت کوئی فن ہے تو ہر فن کی طرح اس کا مقصد بھی اپنے موضوع کے نقائص کو رفع کرنا ہوگا۔ اور حکمراں کے لیے اگر وہ سچا حکمراں ہے بے غرض اور محکوموں کے مفاد کا ضامن ہونا لازمی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ تھریسی میکس سر رفتہ رفتہ یہ بھی منوا لیتا ہے کہ عادل شخص ظالم سے زیادہ دانشمند زیادہ قوی اور زیادہ خوشحال ہوتا ہے۔ زیادہ دانشمند اس لیے کہ وہ ہر ایک سے جا و بیجا مقابلہ و مسابقت میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اس کا مقصد خوبی و کمال حاصل کرنا ہے نہ کہ کسی دوسرے سے بڑھ جانا۔ زیادہ قوی اس لیے کہ غیر عادل یا ظالم لوگوں کے کسی گروہ کو بھی قوت حاصل کرنی ہو تو وہ تک ایک دوسرے سے عدل و انصاف ہی سے پیش آنے پر مجبور ہوتے ہیں ورنہ ساری قوت منتشر ہو جاتی ہے۔ زیادہ خوشحال یوں کہ ہر چیز کا ایک مخصوص وظیفہ ہوتا ہے جسے بس وہی انجام دے سکتی ہے اور کوئی دوسری چیز اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتی۔ ہر چیز کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے مخصوص وظیفہ کو باحسن وجوہ پورا کرے جس طرح آنکھ کا کمال اچھی طرح دیکھنا اور کان کا کمال اچھی طرح سننا ہے اسی طرح روح انسانی کا مخصوص کمال اچھی زندگی حیات طیبہ ہے۔ روح عدل سے محروم ہو کر جو اس کی مخصوص خوبی ہے یہ حیات طیبہ حاصل نہیں کر سکتی اور اس کے بغیر اسے حقیقی مسرت خوشحالی نصیب نہیں ہوتی۔

فلاطون کے سقراط نے تھریسی میکس کو چپ کر دیا لیکن حاضرین کے دل سے یہ خیال جو بہت عام خیال ہی نہیں ہٹا کہ عدل اچھی چیز سہی مگر ایک غیر فطری سی چیز ہی۔ اور آدمی اس پر بس اس لیئے عمل کرتا ہی کہ رسم و رواج نے اس پر عمل کرنا سکھایا ہی اور رسم و رواج ہی اس کی پابندی پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ جو تیسرا نظریۂ عدل اس بحث کے سلسلہ میں سامنے آتا ہی وہ یہی ہی کہ عدل ایک مصنوعی رسمی چیز ہی۔ آدمی جب قبل تمدنی حالت میں رہتا تھا تو بس بھر ظلم کرتا تھا اور سکت بھر ظلم سہتا تھا۔ لیکن بہتوں کے لیے یہ صورت ناقابل برداشت ہو گئی۔ ظلم سہنا زیادہ پڑا اور ظلم کرنے کے موقعے اتنے نہ ملے تو آدمیوں نے باہم معاہدہ کر لیا کہ نہ ظلم کرینگے نہ ظلم سہیں گے۔ اسی معاہدہ کو قانون کی شکل دے کر کے معیار عمل مقرر کر دیے۔ رفتہ رفتہ اس قانون کے اثر سے انسانی فطرت اپنی اصلی جبلت سے ہٹ کر ظلم سہنے کے ڈر سے عدل کی خوگر ہو گئی۔ یوں عدل گویا خوف کا آفریدہ ہی۔ یا یوں کہیے کہ بہترین حالت یعنی ظلم کر سکنے اور بدترین حالت یعنی ظلم سہنے پر مجبور ہونے کے درمیان ایک مصالحت کی صورت ہی۔ اگر تھریسی میکس کے نزدیک عدل قوی فریق کے مفاد کا نام تھا تو یہاں عدل سے مراد کمزور کی ضرورت ہی۔

گفتگو میں اس نقطہ پر پہنچ کر فلاطون کو محسوس ہوتا ہی کہ عدل کے جتنے نظریے پیش کیے جاتے ہیں ان میں یہ بات مشترک ہی کہ سب کے سب عدل کو کوئی خارجی چیز سمجھتے ہیں اور فلاطون اسے ثابت کرنا چاہتا ہی روح کی ایک ذاتی داخلی صفت۔ اس لیئے اب وہ منطقی استدلال و جرح کو چھوڑ کر نفسیاتی تحلیل سے کام لیتا ہی لیکن فوراً نفس انسانی (انفرادی) کی تحلیل شروع نہیں کرتا بلکہ ایک بالکل نئی راہ اختیار کرتا ہی۔ کہتا ہی کہ اگر کسی کتاب کے دو نسخے ہوں ایک بہت جلی لکھا ہوا، دوسرا خفی تو جلی تحریر کے پڑھنے میں آسانی ہوتی ہی۔ اسی طرح کتاب عدل کے بھی دو نسخے ہیں۔ جلی نسخہ تو اجتماعی زندگی میں ملتا ہی اور خفی حیات انفرادی میں۔ پہلے میں یعنی ریاست میں اس کا دیکھنا اور پہچاننا زیادہ سہل ہی۔ اور اگر

یہ ریاست ابھی بن رہی ہو اور اجتماعی زندگی کا ہیولیٰ پہلی مرتبہ متعین سیاسی شکل اختیار کر رہا ہو تو اس وقت عدل کا جلوہ موجودہ تاریخی ریاستوں کی عارضی آلودگیوں سے پاک نظر کے سامنے آجائیگا۔ چنانچہ فلاطون خیال میں ایک ریاست کی بنیاد رکھتا ہے اور اس طرح عدل کی تلاش میں ایک ریاست کا دستور مرتب ہو جاتا ہے۔

دستور ریاست کی ترتیب میں انفرادی نفسیات کی فیثاغورثی تقسیم سہ گانہ فلاطون کے پیش نظر رہتی ہے جس طرح انسانی روح تین عناصر سے مرکب ہے یعنی عنصر شہوانی، عنصر قہری، اور عنصر عقلی، اسی طرح ریاست بھی تین طبقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ فلاطون سب سے پست عنصر یعنی عنصر شہوانی سے شروع کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ انسانی احتیاجات اور ضروریات کی نوعیت اسے تعاون باہمی پر مجبور کرتی ہے۔ ابتدا ہی سے اس معاشی نظام میں تخصیص کار اور تقسیم عمل نظر آتی ہے۔ پھر انسان اپنی ضروریات کی تسکین پر قانع نہیں ہوتا نفیس اور لطیف چیزیں بھی مانگتا ہے؛ نقاشی، شعر، موسیقی، سب اس کی ضرورتیں بنجاتے ہیں اور ان کی فراہمی کے لیے خاصی بڑی آبادی درکار ہوتی ہے، اور اس آبادی کے لیے خاصا رقبہ زمین۔ اس رقبہ کے حاصل کرنے اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ ریاست کے وظائف میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح نفس اجتماعی کا عنصر جبری منظم ہو کر ریاست میں فوجی طبقہ کی صورت اختیار کرتا ہے، جو ظاہر ہے کہ پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جوتے گانٹھنے اور کپڑے سینے کے کام کو تو اتنا اہم سمجھا جائے کہ ایک آدمی ساری عمر بس یہی کرے اور کچھ نہ کرے لیکن ریاست کی حفاظت کا اہم تر کام ایسے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جنھیں اسکے انجام دینے کی خاص تعلیم نہیں دی گئی۔ یہ کام سپاہیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جن کا یہی پیشہ ہو اور کچھ نہ ہو۔ جن اشخاص میں عنصر جبری زیادہ نمایاں ہو انھیں اس کام کے لیے منتخب کرنا اور انھیں یہ کام خاص اہتمام سے سکھانا چاہیے لیکن ان محافظوں میں صرف عنصر جبری کا ہونا کافی نہیں ہے

ن کی مثال محافظ کتوں کی سی ہے جو گھر کے لوگوں سے تو نہیں بولتے لیکن اجنبیوں پر جھپٹتے ہیں
ی محافظ کتے جنھیں جانتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جن کو نہیں جانتے اُن سے نفرت۔ یعنی
ن کے نزدیک دوست دشمن میں وجہِ امتیاز علم یا عنصرِ عقلی ہے! لہٰذا ریاست کے جنگی طبقہ میں بھی
یہ عنصرِ عقلی ضرور موجود ہونا چاہیئے۔ پھر اگر عام محافظوں میں اس عنصرِ عقلی کا وجود ضروری ہے تو کامل
حافظ یا حکمراں میں تو یہ بدرجہ اتم موجود ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس کامل محافظ کے تصور کے ساتھ
فلاطون تیسرے عنصر کو پوری طرح ریاست میں داخل کرتا ہے اور محافظوں کی دو قسمیں کر دیتا ہے
یعنی فوجی محافظ جنھیں بعد میں "مددگار" کا لقب دیا گیا ہے اور فلسفی محافظ جن کی خصوصیت امتیازی
عنصرِ عقلی کا کمال ہے اور جو حقیقی معنوں میں ریاست کے حکمراں یا فلسفی بادشاہ ہیں۔

غرض ان تین طبقوں کی ایک ریاست بنا کر فلاطون اس میں عدل کی تلاش کرتا ہے کہ یہی
اس تاسیس کی وجہ تھی۔ یہ ریاست کے چار محاسن قرار دیتا ہے یعنی حکمت، شجاعت، عفت اور عدل
پہلے تین محاسن کو متذکرۂ بالا تین طبقوں کے وظیفۂ خاص سے تعبیر کر کے یعنی حکمت کو حکمرانوں کا
کمال بتلا کر، شجاعت کو مددگار محافظوں کا اور عفت یا ضبطِ نفس کو دولت آفریں طبقہ کا وہ عدل کے
متعلق سوال کرتا ہے کہ آخر یہ کس طبقہ کا مخصوص جوہر ہے اور جواب دیتا ہے کہ عدل کسی مخصوص جزو کا جوہر
نہیں بلکہ کل کا جوہر ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر فرد اپنے مخصوص وظیفہ کو بخوشی انجام دے
اور دوسرے کے کام میں دخل نہ دے۔ محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ حکمت کی روشنی میں ریاست کے لیے مقاصد
متعین کرے اور اس کے وسائل تجویز کر کے ریاست کو ان پر عمل کرائے، مددگار محافظ کا عدل یہ ہے کہ وہ
شجاعت و جرأت سے ریاست کی حفاظت کرے، دولت آفریں گروہ کا عدل یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی
کے کل پرزوں کو اعتدال کے ساتھ چلاتا رہے۔ اور چونکہ کسی طبقہ یا کسی فرد میں اس وقت تک اپنا مخصوص
جوہر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنا مفوضہ کام پورے انہماک سے انجام نہ دے اس لیے عدل کام محتاج

اخلاق کی شرط اول ہے۔

"ریاست" کے نسخہ جلی میں عدل کی یہ ماہیت معلوم کرکے فلاطون اس کو نفس انفرادی پر منطبق کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ اگر ریاست میں عدل مختلف طبقوں کے اپنے اپنے فرائض کو انجام دینے کا نام ہے تو انفرادی زندگی میں یہ اس سے عبارت ہے کہ روح کے اجزاء ثلاثہ اپنا اپنا کام انجام دیں اور عقل جذبات اور شہوات اپنی اپنی حدود میں کارفرما ہوں اور شخصی زندگی ان میں مناسب ہم آہنگی اور توازن پیدا کرے۔

(۲) **تعلیم**۔ اگر عدل کی ماہیت یہی ہے جو فلاطون نے بتلائی ہے تو ظاہر ہے کہ جماعت کے اہم ترین فرائض میں سے تعلیم ہے جو مختلف طبقوں کے لوگوں کو اپنے مخصوص وظائف کے پورا کرنے کے قابل بنا سکے۔ چنانچہ فلاطون نے ریاست کا معتدبہ حصہ ایک نظام تعلیم کے بیان میں صرف کیا ہے۔

فلاطون سے پہلے بھی عام طور پر یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا۔ یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو۔ اس لیے ریاست کے فرائض لازمہ میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب اراکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے کو ایک تعلیمی ادارہ بنائے جس میں وہ کہ ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعہ دوسرے افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے۔ اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

فلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے۔ وہ بھی مانتا ہے کہ ریاست میں حکومت

کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انھیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا۔ البتہ فلاطون کے نزدیک اس اجتماعی پہلو کے علاوہ تعلیم فی نفسہٖ بھی ایک قدر ہے، اس کا ایک انفرادی اور شخصی پہلو بھی ہے یعنی حق مطلق، خیر مطلق کا ادراک۔ اس انفرادی حیثیت سے تو فلاطون کا تصور تعلیم یونانی خصوصاً سوفسطائی تصورات سے مختلف ہے، جو تعلیم کو محض اجتماعی کامیابی کا ذریعہ قرار دیتے تھے، لیکن اجتماعی حیثیت سے بھی فلاطون انکا ہمنوا نہیں ہے اس لئے کہ وہ اجتماعی کامیابی کی جگہ اجتماعی عدل کے حصول کو تعلیم کا مقصد بتاتا ہے۔

تعلیم کو اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتیں دیکر فلاطون نے درصل یونان کے دو اہم ترین مذاہب تعلیمی کو یکجا ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے ایک تو خود فلاطون کے شہر اثینہ کا مذہب تھا جسے مختصراً مذہب انفرادیت کہہ سکتے ہیں۔ یہاں حکومت کو تعلیم سے سروکار نہ تھا، شہری خود اپنا انتظام کرتے تھے۔ معمولاً ابتدائی تعلیم میں لکھنے پڑھنے کے علاوہ کچھ شعر و موسیقی کی تعلیم ہوتی اور کچھ ورزش جسمانی کی۔ جو لوگ اس سے زیادہ تعلیم کے خواہاں ہوتے وہ سوفسطائی معلموں کے ہاں دام دے دے کر سیاست اور خطابت کے فنون سیکھتے۔ اس کے بعد ۱۸ سے ۲۰ سال کی عمر تک حکومت سب شہریوں کو فوجی تعلیم دیتی تھی۔ تعلیم کا بڑا حصہ خاندان کے ذمہ تھا۔ فلاطون کے نزدیک اثینہ میں جاہل اور نادان لوگوں کے برسر اقتدار ہونے کی ذمہ داری اسی تعلیمی آزادی کے سر تھی۔

دوسرا مذہب تعلیمی اسپارٹا کا تھا۔ یہاں بچہ ۷ سال کی عمر میں اپنے والدین سے جدا کر لیا جاتا، علٰحدہ مکانوں میں سرکاری نگرانوں کے زیر نظر اس کی پرورش ہوتی اور اسکی تعلیم کا بیشتر حصہ جسمانی ورزش اور فوجی تربیت پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہاں خاندان کو تعلیم میں کوئی دخل نہ تھا، جو کچھ کرتی حکومت کرتی، اور افراد کو اپنے فوجی اغراض کے لیے بطور سپاہیوں کے تیار کرتی تھی۔

فلاطون کو اسپارٹا کا طریقہ زیادہ بھایا اس لیے کہ یہ گروہ و جماعت کے ہاتھ میں تعلیم کا تصور ہے

فلاطون کے نظریے سے زیادہ مطابق تھا۔ اس کے نزدیک بھی فرد کی حیثیت جماعت کے ایک جزو اور خادم کی تھی اور اسپارٹا کے نظام میں بھی۔ لیکن فلاطون پھر اثینہ کا خوش مذاق اور وسیع النظر شہری تھا۔ ادب اور موسیقی سے سیرت کی جو تربیت اور تہذیب ہوتی ہے اس سے فلاطون سے زیادہ اور کون آشنا ہو سکتا تھا۔ یہ بھلا اپنی ریاست میں لوگوں کو محض اکھڑ سپاہی بنانے پر کیسے قناعت کر لیتا۔ وہ سمجھ گیا کہ اسپارٹا کے نظام تعلیم کا مرکزی خیال اگرچہ صحیح ہے لیکن اس کے عمل میں بہت تنگی ہے جس سے سیرت انسانی کا بس ایک عنصر یعنی عنصر جری نشو و نما پاتا ہے اور دوسرے عناصر بالکل نہیں پنپنے پاتے۔ چنانچہ فلاطون نے اپنے نظام تعلیم میں اسپارٹا اور اثینہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کر دیا۔ اثینہ کے شہری کی حیثیت سے اس نے تعلیم میں سیرت انسانی کے تمام عناصر ترکیبی کے نشو و نما کی سبیل کی، بہ حیثیت اسپارٹا کے معتقد کے اس نے کامل انسان کو جماعت کا خادم بنایا اور اس کی تعلیم کو کلیتہً حکومت کے سپرد کیا۔

"ریاست" میں جو نظام تعلیم تفصیل سے پیش کیا گیا ہے وہ جنگ آزماؤں اور حکمرانوں کے لیے ہے۔ تیسرے یعنی دولت آفریں طبقہ کی تعلیم کا ذکر نہیں ہے۔ اس نظام میں تعلیم کے دو حصے کر دیے گئے ہیں۔ پہلے حصہ کی تعلیم تمام جنگ آزماؤں کے لیے ہے اور اس کا زمانہ لڑکپن اور شباب کا زمانہ ہے۔ دوسرا حصہ صرف حکمرانوں کے لیے ہے اور اس کا زمانہ شباب سے کہولت کی عمر تک رہتا ہے۔ پہلے حصہ کی تعلیم کا مقصد ہے شہریوں کو ریاست کے تحفظ کے لیے بطور سپاہی کے تیار کرنا، دوسرے کا مقصد ہے ان میں سے چند کو کامل محافظت یا حکمرانی کا اہل بنانا۔ پہلے میں جذبات کی تہذیب سیرت کی تربیت پیش نظر ہے، دوسرے میں فلسفہ و حکمت کی معرفت عقل و خرد کی تعلیم۔ پہلے حصہ میں تمام تر اجتماعی اغراض پیش نظر ہیں، دوسرے میں بالکل نہ سہی پھر بھی بہت کچھ انفرادی تکمیل۔

پہلے حصہ کا نصاب جو ۱۸ سال کی عمر تک کے لیے ہے دو اجزا پر مشتمل ہے، ورزش اور موسیقی لیکن یہ تو

لفظ ذرا وسیع معنی میں استعمال کیے گئے ہیں مثلاً ورزش میں صحیح غذا اور علاج بھی شامل ہی اور موسیقی میں ادب اور فنون لطیفہ فلاطون چاہتا ہی کہ ورزش اور موسیقی کے دوگونہ عمل سے سیرت انسانی کی ہم آہنگ نشو و نما کا کام لے۔ اگرچہ بظاہر معلوم ہوتا ہی کہ ورزش سے جسم اور موسیقی سے ذہن کی تربیت مقصود ہوگی مگر درصل جسم کی تربیت بھی ذہن اور روح ہی کی خاطر ہی کہ اس سے جرات و پامردی کی صفتیں پیدا ہوں طبیعت کے عنصر حربی کی صحیح نشو و نما ہو جو نوجوانوں کو اچھا سپاہی اور بہادر جنگ آزما بنائے، اور ریاست کا اچھا اور سچا خادم۔ موسیقی سے اس عنصر حربی کو حدود مناسب میں رکھنا اور عقل کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا مطلوب ہی۔ اس سے ہرچند "علم" کا حصول ممکن نہیں تاہم "صحیح رائے" کا پیدا کرنا ممکن ہی۔ اس کا مقصد یہ ہی کہ روح کو جو ابھی جذبات کی منزل سے گذر رہی ہی اس بات کا عادی بنا دیا جائے کہ وہ حل طلب مسائل کے متعلق صحیح احساس رکھے اور جب یہ احساس بطور عادت کے راسخ ہو جائے تو روح صحیح راہ عمل اختیار کرے، یہ جانے بغیر کہ اس عمل کی وجہ یا علت کیا ہے"[۱] موسیقی ادب اور فنون لطیفہ کو نصاب کا جزو بنایا ہی اس لیے گیا ہی کہ ان کی دلکشی خود بخود نوجوان روحوں کو اپنی جانب کھینچتی ہی، شعر کے وزن اور بحر سے چنگ و رباب کی سامعہ نوازی سے حسین مجسموں کے حسن صورت اور دلفریبی الوان سے روح آپ ہی آپ متاثر ہوتی ہی اور اس طرح ان کی اخلاقی تعلیم کو بے جانے بوجھے قبول کرتی جاتی ہی۔

فلاطون فنون لطیفہ کی اس تاثیر کو اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہی۔ یہی وجہ ہی کہ وہ موسیقی، شعر، اور صورت تراشی کے ہر طرز کو نوجوانوں کی تعلیم کا جزو نہیں بننے دیتا بلکہ صرف ان طرزوں کو جن سے روح کی صحیح اخلاقی تربیت ہو سکے۔ چنانچہ "ریاست" میں نظام تعلیم کے ساتھ ادبیات اور موسیقی کے احتساب کا بھی ایک مکمل پروگرام پیش کیا گیا ہی۔ ادب کی اصلاح میں

[۱] صفحہ ۱۹۲ Barker: Greek Political Theory (1917)

مطالب اور اسالیب بیان دونوں کی اصلاح کی تجاویز سامنے آتی ہیں، اور سچ پوچھیے تو افلاطون اس سلسلہ میں اصلاح مذہبی اور تنقید ادب کی بنیاد رکھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یونانی شاعر ہی اپنی قوم کے مذہبی معلم ہوتے تھے۔ ان کے کلام میں افلاطون کو جہاں کہیں کوئی ایسی چیز ملتی ہے جس سے معبود دیوتاؤں کا ایسا تصور سننے والے کے ذہن میں پیدا ہو جو صحیح اخلاقی نشو و نما کے لیے مضر ہو تو وہ بلا تامل اسے خارج کر دینا یا بدل دینا چاہتا ہے۔ اور اس طرح معبودوں کی مروجہ صفات میں بنیادی تغیرات تجویز کر کے اور اس کام کو حکومت کی سپردگی میں دے کر افلاطون ریاست کو زندگی کے بہت بڑے اور بہت اہم شعبہ یعنی مذہب اور معتقدات پر بھی مسلط کر دیتا ہے!

پھر ادب کے اسالیب بیان کے متعلق بھی ریاست ہی مجاز ہے کہ جس اسلوب کو نوجوانوں کے اخلاق کے لیے مفید سمجھے اس کے استعمال کی اجازت دے جسے مضر جانے اسے منع کر دے۔ مثلاً اس ضمن میں ڈراما کی سخت ممانعت کی گئی ہے اس لیے کہ اس صنف ادب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی شخص متعدد روپ بھرتا ہے اور یہ بات ایسی ریاست میں کیسے روا رکھی جا سکتی ہے جس کی قدر اساسی عدل ہو یعنی یہ کہ ایک شخص بس ایک کام کرے اور اپنے مفوضہ وظیفہ کی کما حقہ بجا آوری کو غایت حیات جانے۔ یہاں تو ادب کی شکل بس بیان کی ہو سکتی ہے جس میں بیان کرنے والا اپنی شخصیت کو کسی اور ذات میں ضم نہیں ہونے دیتا اور اگر کبھی کسی دوسرے کی زبان سے بولتا بھی ہے تو صرف اچھے اور نیک لوگوں کی طرف سے، بدوں کا روپ یہ کسی حال میں نہیں لے سکتا۔

اسی طرح موسیقی میں بھی ریاست کا یہ کام ہے کہ مختلف راگ راگنیوں میں بتلائے کہ کس کی اجازت ہے کس کی نہیں، مختلف آلات موسیقی میں سے کن کا استعمال جائز ہے کن کا ناجائز۔ ریاست کا فرض ہے کہ تعلیم کے اس ذریعہ کو بھی اس اخلاقی مقصد کا تابع کرے جس کا حصول مطلوب ہے، اور موسیقی کو سادہ سے سادہ بنا کر روح کی سادگی اور یگانگت کے قیام و بقا کی سبیل کرے۔ عجب ستم ظریفی ہے

کہ دنیا کے اس سب سے بڑے ادیب کے ہاتھوں جس کی ہر ہر سطر سے شعریت ٹپکتی ہے، جو اپنی تصانیف اور اپنی زندگی میں آرٹ کا مظہر معلوم ہوتا ہے، ادب موسیقی اور آرٹ کی آزادی سلب کرنے کی ایسی تجویزیں تیار ہوں! "آرٹ کو آرٹ کی خاطر" چاہنے والے حیرت سے منہ تکتے ہیں کہ یہ کیا غضب ہو رہا ہے کہ حکومت کو نہ صرف تعلیم کا سارا انتظام سپرد کر دیا گیا، بلکہ اسی سلسلہ میں مذہبی عقائد، افکار و خیالات پر اسی کا تسلط ہے کہ ادب اور آرٹ میں بس انہیں چیزوں کی تلقین ہو جنھیں حکومت چاہے اور ستم بالائے ستم، انداز تلقین بھی وہی ہو جو حکومت کو بھائے! لیکن نظر غور سے دیکھیے تو واضح ہو جاتا ہے کہ فلاطون ادب اور آرٹ کو ان کی ماہیت کے خلاف ریاست کی خدمت پر زبردستی مجبور نہیں کرنا چاہتا بلکہ آرٹ کی غایت ہی اس خدمت کو جانتا ہے۔ اس کی نظر میں سچا آرٹ، اچھا آرٹ، ہے ہی وہی جو جماعت کے مقاصد میں ممد ہو۔ وہ زندگی میں اصول خیر کی کارفرمائی دیکھتا اور ساری کائنات میں ایک مقصد مضمر پاتا ہے! آرٹ چونکہ زندگی اور کائنات کی تعبیر اور ترجمانی کا نام ہے اس لیے اسے بھی اس خیر مطلق کا پرتو ہونا چاہیے جس سے زندگی اور کائنات معمور ہیں۔ وہ آرٹ کو ریاست کا غلام نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس سے صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے حقیقی مقصد کو پورا کرے۔

فلاطون نے نوجوانوں کی تعلیم کا جو نصاب بنایا ہے اس کا مختصر ذکر تو ہو چکا۔ اس نصاب کے ختم ہونے کے بعد اس نے اعلیٰ تعلیم کا ایک خاکہ بھی ان لوگوں کے لیے پیش کیا ہے جو ریاست کے اصلی حکمراں بننے والے ہیں۔ پہلی منزل میں تعلیم کا خاص ذریعہ ادب اور آرٹ تھا، اس اعلیٰ منزل میں ریاضی اور فلسفہ ہے۔ فلاطون کے زمانے میں اعلیٰ تعلیم کا ایک اور نصاب بھی جاری تھا جسے اس نے یکسر بدل دیا۔ اثینہ میں سوفسطائی معلموں کے مدارس تھے جن میں ۱۷، ۱۸ برس کے نوجوانوں کو ابتدائی تعلیم ختم کر چکنے کے بعد خطابت اور سیاست کا درس دیا جاتا تھا۔ تاکہ اس کی تکمیل کر کے یہ جمہوریت کی سیاسی زندگی میں امتیاز اور کامیابی حاصل کر سکیں۔ فلاطون خطابت کی خرد دشمنی سے بیزار ہے اس لیے اس کے نصاب میں کوئی جگہ نہیں پاتا۔ وہ اپنے نصاب میں

۵ مضمون رکھتا ہے: (۱) علم الحساب (۲) علم الاشکال (۳) ہیئت (۴) موسیقی (۵) فلسفہ
ان میں پہلے (۱) تا (۴) اور بعد میں (۵) یعنی فلسفہ کی تعلیم رکھی ہے۔ اور چونکہ موسیقی میں بھی یہاں سب
کی ریاضیاتی بحثیں مقصود ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ فلاطون نے اپنے نصاب میں ریاضی کو فلسفہ کی تعلیم
کا پیش خیمہ بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاضیاتی علوم اگر ایک طرف محسوس عملی دنیا میں بھی مفید اور
کارآمد ثابت ہوتے ہیں تو دوسری طرف دنیائے محسوس پر غور کے بجائے مجرد اور غیر محسوس تصورات پر
غور و فکر کی عادت ڈال کر یہ غیر محسوس عالم اعیان تک پہنچنے کا ایک زینہ بھی بن جاتے ہیں جن کا پورا
پورا علم پھر فلسفے سے حاصل ہوتا ہے۔

ان چاروں مضامین کے مطالعے کے لیے فلاطون نے ۱۰ سال کا زمانہ تجویز کیا ہے یعنی ۲۰
سال سے ۳۰ سال تک کی عمر۔ گویا ۱۸ برس کی عمر میں ابتدائی تعلیم ختم کر کے دو سال خالص فوجی تعلیم
ہو اور اس کے اختتام پر جو لوگ اس اعلیٰ تعلیم کے اہل نظر آئیں انھیں اس نصاب کے مطابق تعلیم دی جائے
اس نصاب کی تکمیل کے بعد ۵ سال فلسفہ کی تعلیم کے لیے رکھے گئے ہیں۔ فلسفہ کا یہ نصاب صرف ان کے
لیے ہے جنھوں نے گذشتہ دس سال میں ریاضیاتی مضامین کے باہمی ربط و تعلق کا سب سے قوی اور واضح
احساس ظاہر کیا ہو۔ اس لیے کہ ریاضی محسوس سے غیر محسوس تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، اور فلسفہ دنیائے فکر و
عالم اعیان کے علم اور اس علم سے بالآخر عین خیر تک پہنچنے کا نام ہے۔ فلسفہ حقیقت محض یعنی عین خیر کا علم
ہے کہ یہی غایتِ وجود بھی ہے اور مقصودِ علم بھی اور فلسفی وہ ہے جو حقیقتِ اشیا سے آشنا ہو جائے اور عین خیر
کا ادراک رکھتا ہو۔

تجویز یہ ہے کہ فلسفہ کی اس پنج سالہ تعلیم میں امتحانوں اور آزمائشوں کا ایسا سلسلہ رکھا جائے کہ صحیح
فلسفیانہ طبائع کا پورا پورا پتہ چل جائے۔ جن میں خامی ہو وہ رد کر دیے جائیں۔ جو سب آزمائشوں میں پورے
اتریں وہ ریاست کے فلسفی حکمران یا محافظ بنیں۔ ۳۵ سے ۵۰ سال کی عمر تک یہ ریاست کی خدمت کریں

اور حکومت کے وہ تمام کام انجام دیں جو زیادہ معمر بزرگوں سے مخصوص نہیں ہیں۔ اس زمانہ خدمت میں بھی برابر انکی آزمائش ہوتی رہے۔ وہ جو ان آزمائشوں میں پورے اتریں انھیں سب سے بڑے اعزاز اور سب سے زیادہ ذمہ داری کے کام تفویض کیے جائیں۔ اب یہ لوگ اپنا کچھ وقت تو فلسفیانہ غور و فکر میں صرف کریں اور جب ان کی باری آئے تو کچھ وقت ریاست کے عملی فرائض انجام دینے میں اور آنے والی نسلوں کو ریاست کی خدمت اور حفاظت کے لیے تیار کرنے میں۔

ذوق علم اور جوش عمل کی جس کشمکش کا آماجگاہ خود فلاطون کا دل تھا، اور جس کا تصفیہ آخر دم تک نہ ہو سکا، اس کا اثر تعلیم کی اس آخری منزل میں بھی رونما ہے۔ اس منزل میں بھی جہاں فلسفی مقصود علم کو پہنچ جاتا ہے اور غایۃ وجود کا محرم ہو جاتا ہے فلاطون اسے بالکل فکر کی دنیا کے لیے نہیں چھوڑتا بلکہ علم و عمل میں ہم آہنگی اور توازن کا مطالبہ یہاں بھی قائم رہتا ہے۔ علم حقیقت کچھ گونگے کا گڑ نہیں جسے فلسفی اکیلے اکیلے چکھے اور دوسروں کو اس کے مزے سے آگاہ نہ کرے۔ فلسفی کا ایک مقصد اگر عین خیر کا علم حاصل کرنا ہے تو دوسرا اس علم کی روشنی میں نوع انسانی کو سدھارنا بھی ہے۔ اگر اس علم سے اپنی ذہنی تکمیل اور سیرت شخصی کی بہترین تشکیل ہوتی ہے تو پھر اس سے ہیئت اجتماعی کے فلاح و بہبود کی سبیل نکلنی چاہیے۔ کامل مفکر کا صاحب عمل ہونا بھی ضروری ہے۔

یہی ارباب علم اور اصحاب عمل فلاطون کی اصطلاح میں فلسفی حکمراں یا فلسفی بادشاہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں جاہل اور خود غرض اہل سیاست کا خاتمہ کرانا چاہیے۔ یہی حکمت و خردمندی سے حکومت کر سکتے ہیں کیونکہ یہی حقیقت سے بہرہ یاب ہیں، یہی بے لوث اور بے لاگ حکومت کر سکتے ہیں کیونکہ ان کے لیے حکومت کی زحمت کوئی شرف نہیں بلکہ ایک فرض ہے اور بنی نوع کی سچی خدمت کا ایک موقع۔ حیات اجتماعی و انفرادی کے سارے متعلقہ مسائل ان پر روشن ہوتے ہیں اور یہ ان کو پیش نظر رکھ کر حکومت کر سکتے ہیں۔ اس لیے نہ ان پر ضابطۂ قانون کی پابندی عائد ہوتی ہے نہ بیجا رسم و رواج کی بندش۔

یہ آخری بات قابل لحاظ ہے اس لیے کہ فلاطون نے جہاں حکومت کو مذہبؔ و دبؔ کے آرٹ پر پورا اقتدار دیدیا ہے وہاں ایک چیز میں ریاست کے کام کو بہت کم بھی کر دیا ہے۔ عام طور پر ریاست کے خاص کاموں میں شمار کیا جاتا ہے کہ وہ قانون بنائے اور انھیں نافذ کرنے کے لیے عدالتیں قائم کیے ہوئے رکھے لیکن فلاطون کو اپنی صحیح تعلیم کے نتائج پر اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ جسم کی نگہداشت کے لیے ڈاکٹروں طبیبوں اور معاملات کے تصفیہ کے لیے عدالتوں وکیلوں سے اپنے کو بے نیاز سمجھتا ہے صحیح تعلیم کے بعد نہ امراض جسم کی گنجائش ہے نہ امراض روح کی اور طبیب اور وکیل یہ سب امراض کی علامت ہیں۔ فلاطون نہ مرض کو باقی رکھنا چاہتا ہے نہ علامات کا روادار ہے اس کے نزدیک تو ریاست جماعت عامہ ہے جس پر قانون بنانے کی کوئی پابندی نہیں اس جماعت عاملہ کا کام دراصل تعلیمی کام ہے اور ریاست ایک تعلیمی ادارہ ہے اور بس

---

(۳) **معیشت**: ریاست کو اساس عدل پر قائم رکھنے کے لیے نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ فلاطون نے معیشت کے ایک اشتراکی نظام کا خاکہ بھی پیش کیا ہے لیکن اس کو صرف حکمرانوں اور سپاہیوں تک محدود کر دیا ہے مثلاً املاک کے متعلق فلاطون کی تجویز ہے کہ تیسرا یعنی محنت و مشقت کرنے والا دولت آفریں طبقہ اپنی پیداوار کا اتنا حصہ حکمرانوں اور جنگ آزماؤں کو دے دیا کرے کہ بس ان کی لابد ضروریں پوری ہوجائیں اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ یہ دولت روپیہ پیسہ کی شکل میں بطور تنخواہ ان میں تقسیم ہو اور یہ اس کو جس طرح چاہیں صرف کریں بلکہ سب ایک جگہ ایک سا کھانا کھائیں ایک سا کپڑا پہنیں یعنی فلاطون ان طبقوں کو دولت آفرینی ہی سے منع نہیں کرتا بلکہ صرف دولت کو بھی اجتماعی شکل دیتا ہے۔

اشتراک املاک کے ساتھ ساتھ فلاطون نے اشتراک ازواج کی بھی حمایت کی ہے اور اس تجویز سے ریاست میں گویا بحث ہے حکمرانوں اور سپاہیوں کے لیے شادی بیاہ کرنا اور الگ الگ خاندان رکھنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ بوڑھے تجربہ کار حکمرانوں کا یہ کام ہے کہ مقررہ اوقات پر تندرست نوجوان مرد و عورت کو یکجا کر دیں

اور ان کے اختلاط سے جو اولاد پیدا ہوئے اس کا علم ہی نہ ہو کہ اس کے والدین کون ہیں بچوں کو پیدا ہوتے ہی ریاست ماؤں سے لے کر اپنے آغوش میں پرورش دے تاکہ ہر نئی نسل اپنے سے پہلی نسل کو بحیثیت اکل اپنے ماں باپ سمجھے اور ہر پُرانی نسل چھوٹوں سے ایسی ہی محبت رکھے جیسی اپنی اولاد سے۔ افلاطون کی خواہش ہے کہ شخصی خاندان کی خود غرضیوں اور تنگ نظریوں کو مٹا کر ریاست کے دو اعلےٰ طبقوں کو بس ایک خاندان بنا دے تاکہ یہ محدود خاندانی تعلقات ان طبقوں کی یگانگت میں مخل نہ ہوں۔ عورتوں کو بھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے تفکرات سے نجات ملے اور وہ مہمات اُمور میں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکیں۔

اس سلسلہ میں افلاطون نے مرد عورت کی مساوات پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ اس کے معاصرین غالباً اسی تجویز پر سب سے زیادہ بھڑکے ہونگے۔ اس لیے کہ یونان میں عورتوں کی حیثیت وہ تھی جس سے ہم مشرقی ممالک کے لوگ خوب آشنا ہیں۔ یونانی زندگی مردوں کی زندگی تھی عورتیں گھروں کی چار دیواری میں بیٹھی رہتیں۔ گھر کی دیکھ بھال، کھانے پکانے اور بچے دینے کا کام کیا کرتی تھیں سیاست میں انھیں بالکل دخل نہ تھا۔ اس مساوات کے اُصول کو منوانا منطقی طور پر افلاطون کے لیے ضروری نہ تھا۔ وہ جو ریاست میں ہر ایک کو اپنا وظیفہ مخصوص دینا چاہتا تھا اور جس نے پورے محنت کش طبقہ کے طبقہ کو سوائے دولت آفرینی کے اور کسی ذہنی شغل کا اہل نہ جانا وہ آسانی سے عورتوں کے لیے وہی وظیفہ مخصوص کر سکتا تھا جو اس وقت کی سوسائٹی نے انھیں تفویض کر رکھا تھا۔

بظاہر ایسا نہ کرنے کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو شاید یہ ہو کہ یونان میں دیونیسی مذہب کے فروغ دینے میں عورتوں کا حصہ مردوں سے کم نہیں کچھ زیادہ ہی تھا۔ حال اور جذب میں، مذہب کے ساتھ والہانہ شیفتگی میں، اور اس کی خاطر جسمانی تکلیفیں برداشت کرنے میں عورتیں مردوں سے کچھ آگے ہی تھیں۔ افلاطون جس نے یہ دیکھا تھا کیونکر سیاسی زندگی میں بھی انھیں برابر کا موقع دینے، نہیں بلکہ ان سے

برابر کا کام لینے کا فیصلہ کرتا؟ دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے ذہنی اور سیاسی ہیجان سے حرم سرا کی عزلت نشین خواتین یوں بھی متاثر ہو چلی تھیں۔ آس پاس اکثر جگہ عورتوں نے خانگی امور سے علاوہ وسیع تر معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے کے ادب میں خود یونان میں بھی عورتوں کے گھر سے باہر نکل کر عام زندگی میں مداخلت کرنے کے تذکرے اور اشارے ملتے ہیں بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عام انتشار و بدنظمی میں لوگ یہ سوچنے لگے تھے کہ چلو آخری آزمائش بھی کر دیکھیں، مردوں کو دیکھ چکے اب یہی سہی، عورتوں کے ہاتھ میں سیاست دیدیں!! اس لیے افلاطون نے بھی جو بنیادی اصلاح کا علم بردار تھا اور نئے اصولوں پر ہیئت اجتماعی کی جدید تشکیل چاہتا تھا، عام روایات و رسم کے خلاف اس مساوات مرد و زن کی حمایت کی۔ جو خاندان اور املاک شخصی کو مٹانے کی ہمت رکھتا تھا وہ عورت مرد کے فرق کو کیوں کالعدم کر دیتا؟

مشترک املاک، مشترک خاندان اور مساوات مرد و زن کی تجویزیں اس قدر انقلابی ہیں کہ "ریاست" کے اکثر پڑھنے والوں کی زیادہ تر توجہ ان کی طرف منعطف ہو جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ اشتراک کے یہ مسائل پیش کرنا ہی اس کتاب کا اصل مقصود ہے لیکن یہ خیال درست نہیں۔ اس لیے کہ افلاطون کے نزدیک اس نظام اشتراک کی حیثیت اصولی نہیں بلکہ فرعی ہے۔ افلاطون جانتا تھا، اور ارسطو اور اس کے آئندہ معتقدین کی یک طرفہ تنقید اور نکتہ چینی سے پہلے جانتا تھا، کہ ریاست ذہن انسانی کی ایک خارجی تشکیل ہے؛ اس لیے اس کی حقیقی اصلاح ذہن ہی کی اصلاح سے ممکن ہے۔ گویا ارسطو اور متبعین ارسطو کا اصرار کہ نظام معاشی میں تبدیلی بے سود اور غیر ضروری ہے، سچی اصلاح صرف تعلیم کی اصلاح سے ہوسکتی ہے، در اصل پڑھے کو پڑھانا اور سیکھے کو سکھانا ہے۔ ہاں، مگر افلاطون یہ بھی جانتا تھا کہ ذہن انسانی اپنے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اور اگر عدل ایک روحانی کیفیت، ایک ذہنی عادت سے عبارت ہے جس کی وجہ سے ہر آدمی اپنا مخصوص وظیفہ پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کیفیت، اس عادت کی کما حقہ پختگی کے لئے ضروری ہے کہ جن حالات میں ذہن پرورش پائے وہ اس کے نشو و نما کے لیے مضر اور مخالف نہ ہوں۔ افلاطون کے نزدیک اس

عادت کے نشو و نما پانے اور راسخ ہونے کے لیے سب سے مساعد حالات ایک اشتراکی نظام ہی میں ممکن ہیں اس لیے اس نے یہ نظام مرتب کیا ہے جس کا تمام تر مقصد یہ ہے کہ تعلیمی نظام کو اپنے نتائج حسنہ کے پیدا کرنے میں خارجی ماحول کی مخالفت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

افلاطون کی اشتراکی تجاویز سے ایک غلط فہمی اور پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت چونکہ اکثر ممالک میں معاشی زندگی کا ایک اشتراکی مسلک رفتہ رفتہ رواج پا رہا ہے اس لیے افلاطون کی تجاویز کو ذرا سطحی نظر سے دیکھنے والے اس کے نظام معیشت کو جدید اشتراکی نظام سے ملا دیتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ افلاطون کے اشتراک کو جدید اشتراک سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ اشتراک جدید پوری ہیئت اجتماعی کے لیے ایک تجویز ہے اور افلاطون کا اشتراک ریاست کے صرف ایک مخصوص طبقہ کے لیے۔ جدید اشتراک دولت آفرینی کا سارا کام ریاست کے سپرد کرنا چاہتا ہے، افلاطون کے نظام میں دولت آفرینی بدستور افراد ہی کے سپرد ہے اور اس مجوزہ نظام کا براہ راست کوئی اثر کسی دوکاندار، مزدور یا کسان پر نہیں پڑتا۔ جدید اشتراک ہر ایک سے دولت آفرینی کا کام لے کر دولت کو بڑھانا اور پھر اس دولت کو سب میں برابر برابر تقسیم کرنا چاہتا ہے، افلاطون کے اشتراک میں وہ طبقہ جس کے لیے یہ نظام تجویز کیا گیا ہے دولت آفرینی میں حصہ ہی نہیں لے سکتا۔ جدید اشتراک کے پیش نظر ایک معاشی مسئلہ ہے، افلاطون کے سامنے ایک اخلاقی مہم۔ جدید اشتراک سیاسی اور معاشی قوت کا حامل جمہور کو بنانا چاہتا ہے۔ افلاطون کا اشتراک تزکیہ سیاست کی خاطر اپنے حکمراں طبقہ کو معاشی زندگی سے بالکل بے تعلق کرنا چاہتا ہے۔ جدید اشتراک دولت کا اشتراک ہے، افلاطون کا اشتراک ترک دولت کا اشتراک!

اس تمہیدی تحریر کو اپنے فاضل دوست ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ناظم اردو اکادمی جامعہ ملیہ دہلی کا شکریہ ادا کیے بغیر ختم نہیں کر سکتا جن کے مشورہ اور صلاح سے اس ترجمہ اور مقدمہ کی تیاری میں قدم قدم پر مدد ملی۔ ذاکر حسین

۲۷ فروری ۱۹۳۲ء

ریاست

پہلی کتاب

میں کل ارسطن کے بیٹے گلاکن کے ہمراہ پائریس میں دیوی کی پوجا کے لیے گیا تھا۔ اور چونکہ اس رسم کی ابتدا ہی اس روز سے ہونے والی تھی اس لیے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ [illegible] کس طرح ادا کی جاتی ہے۔ اثینا کے خاص باشندوں کے جلوس سے مجھے بہت تفریح حاصل ہوئی گو تھریس والوں کا جلوس بھی کچھ کم شاندار نہ تھا۔ ادائے فریضہ اور ختم مراسم کے بعد ہم شہر واپس آرہے تھے کہ کیفلس کے بیٹے پالیمارکس نے کہیں دور سے ہم لوگوں کو دیکھ لیا اور اپنے نوکر کو دوڑایا کہ ہمیں ٹھہرا لو۔ نوکر نے پیچھے سے میری عبا کھینچکر کہا کہ پالیمارکس فرماتے ہیں کہ آپ ذرا توقف فرمائیں۔

میں :- (مڑکر) وہ کہاں ہیں ؟

نوکر :- ذرا ٹھہریے۔ وہ ہی آپ کے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔

گلاکن :- اچھا۔ ہم ٹھہرتے ہیں۔

چند ہی لمحوں میں پالیمارکس نظر آئے۔ گلاکن کا بھائی ادیمنیتس اور نیسیاس کا بیٹا نائیسرائش اور بعض اور لوگ ان کے ہمراہ تھے۔

پالیمارکس:- (مجھے مخاطب کرکے) آپ غالباً مع اپنے ہمراہیوں کے شہر واپس جارہے ہیں۔

میں:- ہاں آپ کا قیاس غلط نہیں ہے۔

پالیمارکس:- لیکن آپ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہماری جماعت کتنی بڑی ہے۔

میں:- ہاں بیشک۔

پالیمارکس:- اب آپ یا تو اپنی جماعت کو قوی تر ثابت کریں یا بس یہیں ٹھہر جائیں۔

میں:- نہیں یہ کیوں؟ ایک صورت یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم ترغیب دیکر آپ کو آمادہ کردیں کہ ہمیں جانے دیا جائے۔

پالیمارکس:- اور اگر ہم آپ کی سنیں ہی نہیں تو کیا آپ پھر بھی ہمیں قائل کر سکتے ہیں؟

گلاکن:- بھلا یہ کیسے ممکن ہے!

پالیمارکس:- تو پھر آپ مطمئن رہیں۔ ہم آپ کی ایک نہ سنیں گے

اتنے میں ادیمنیتس نے اپنے رفیق کے مطالبہ کو تقویت دینے کے لیے یہ تذکرہ چھیڑ دیا "کیوں کچھ اس کی بھی خبر ہے کہ آج شام کو دیوی کے نام پر گھوڑ دوڑ ہونے

والی ہی جس میں سواروں کے پاس مشعلیں ہوں گی"۔

میں :۔ گھوڑوں پر مشعلیں ! یہ تو ایک طرفہ تماشا ہی۔ کیا سوار دوڑتے میں ایک دوسرے کو مشعلیں دیں گے ! یا کچھ اور !

پالیمارکس :۔ جی ہاں۔ اور اس کے علاوہ ایک اور رسم بھی تو ادا ہوگی جو آپ کو ضرور دیکھنی چاہیئے رات کا کھانا کھا کر ہم سب کے سب یہ رسم دیکھنے چلیں گے نوجوانوں کا بڑا مجمع ہوگا اور دلچسپ گفتگو کا موقع ملے گا۔ بس انکار نہ کیجیے ٹھہر ہی جائیے۔

گلاکن :۔ بھائی معلوم ہوتا ہی کہ ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

میں :۔ خیر تو پھر جیسی مرضی ہو۔

چنانچہ ہم سب پالیمارکس کے ہمراہ اُن کے مکان پر گئے۔ ان کے دونوں بھائی لیسیاس اور یوتھیڈمس، تھریسیمکس اور کلیتوفن وغیرہ وہاں موجود تھے پالیمارکس کے والد کیفیلس سے بھی ملاقات ہوئی۔ ایک مدت بعد میں نے انھیں دیکھا تھا اس لیے زیادہ مسن معلوم ہوتے تھے۔ ایک آرام کرسی پر تشریف رکھتے تھے اور کسی فریضۂ قربانی کے ادا کرنے کے سلسلہ میں سر کے چاروں طرف ایک پھولوں کا ہار لپٹا ہوا تھا۔ اردگرد ایک نیم بیضاوی دائرے میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں جن پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ نہایت تپاک سے سلام کرکے انھوں نے مجھے یوں مخاطب کیا۔

آپ سے تو ملاقات کا موقع بہت ہی کم ملتا ہے۔ آپ تشریف ہی نہیں لاتے۔ اگر میں چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تو بجائے اس کے کہ آپ سے یہاں آنے کی درخواست کروں خود حاضر خدمت ہو جاتا۔ لیکن ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے میں تو شہر جا نہیں سکتا۔ آپ ہی کبھی قدم رنجہ فرمایا کریں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگرچہ لذائذ حیوانی دن بدن رو بہ انحطاط ہیں لیکن گفت و شنیدکی دلفریبیاں میرے لیے روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ آپ میری استدعا کو رد نہ فرمائیں گے۔ اور اکثر غریب خانہ کو تشریف آوری سے عزت بخشا کریں گے۔ تاکہ ان نوجوانوں کو آپ کی صحبت سے فیضیاب ہونے کا موقع مل سکے۔ ہمارے دیرینہ تعلقات و مراسم کی وجہ سے تکلف کی تو گنجائش نہیں۔

میں:۔ میرے نزدیک اپنے بزرگوں سے گفتگو کا موقع ملنا عین خوش نصیبی ہے۔ ان کی مثال اس رہ نورد کی سی ہے جو اس راہ پر سفر کر چکا ہے جس پر مجھ کو خود چلنا ہے۔ میرا فرض ہے کہ ان سے دریافت کروں کہ آیا راہ ہموار اور سہل ہے یا ناہموار اور دشوار گذار۔ آپ چونکہ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کو شاعر منزل پیری کی آستان سے تعبیر کرتے ہیں اس لیے یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں۔ کہیے آپ کا کیا خیال ہے آیا زندگی کے آخری منازل تلخ معلوم ہونے لگتے ہیں یا نہیں؟

کیفیلس:۔ میں آپ کو اس معاملہ میں اپنے ذاتی خیالات اور جذبات

بتلاتا ہوں۔ یوں تو میرے ہم عمر لوگ اکثر ملتے رہتے ہیں۔ پرانی مثل ہی کند ہم جنس باہمجنس پرواز۔ ان صحبتوں میں لوگ عموماً اپنا اپنا دکھڑا روتے ہیں کوئی کہتا ہی کہ اب کھایا نہیں جاتا اور کوئی کہتا ہی کہ پیا نہیں جاتا۔ کوئی گلستانِ شباب کی خزاں رسیدگی پر نوحہ خواں ہی اور کوئی جذبات عشق و محبت کی پژمردگی پہ ماتم گسار۔ ایام گذشتہ کی یاد اُن کو ستاتی ہے اور شباب کے بغیر انکے نزدیک زندگی زندگی ہی نہیں بعض اپنے اعزا کی طعنہ زنی کے شاکی ہیں اور بڑھاپے کو ان تمام آفات کی وجہ قرار دیتے ہیں لیکن میرے نزدیک تو یہ الزام غلط ہے کیونکہ اگر ضعیفی اور کبر سسن ہی ان تمام باتوں کا سبب ہوتا تو پھر میں یا اکثر اور سعمر لوگ ان سے کیوں مامون رہتے۔ لیکن خدا کا شکر ہی کہ میں ان سب بلاؤں سے محفوظ ہوں۔

مجھے اکثر اُس جادو نگار شاعر سوفاکلیز کا قصہ یاد آجاتا ہی کہ بڑھاپے میں جب کسی نے اُس سے سوال کیا کہ کہیئے اس عمر میں بھی آپ کو عشق و محبت بھاتی ہی اور اب بھی اس بارہ میں آپ کے محسوسات وہی ہیں جو کبھی پہلے تھے تو اُس نے کیا خوب جواب دیا تھا کہ خدا کا شکر ہی میں اب اس بلا سے محفوظ ہوں اور میں اپنی آزادی پر اسی قدر مسرور ہوں جیسے کوئی ایک وحشی اور بدمزاج آقا سے علحدہ ہونے پر ہوتا ہی۔ یہ الفاظ مجھے اکثر یاد آتے ہیں اور میں اپنے لیے انھیں آج بھی اتنا ہی صحیح خیال کرتا ہوں جتنا کہ وہ واقعہ مذکورہ کے وقت تھے۔ اس میں کون شک

کر سکتا ہو کہ عمر کی زیادتی کے ساتھ ساتھ سکون اور آزادی کا احساس بڑھتا جاتا ہو
جذبات شہوانی کا تسلط کم ہو جاتا ہو اور ہم ایک ہی نہیں متعدد وحشی آقاؤں
کی اطاعت سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ سچ تو یوں ہو کہ تمام رنج و ملال اور اعزا کی شکایتوں
کا سبب بس ایک ہی ہو اور وہ خود ان کے عادات و خصائل اور خود ان کی طبیعت
نہ کہ کبر سنی۔ جس شخص کی طبیعت میں انبساط و سکون ہو اُس کے لیے عمر کی زیادتی
کوئی بار نہیں۔ لیکن جن لوگوں کی طبائع کی افتاد اس کے برعکس ہو ان کے لیئے
زمانۂ شباب بھی ویسا ہی گراں ہو جیسے ایام شیب"۔

میں نہایت توجہ کے ساتھ یہ ساری تقریر سنتا رہا اور اس ارادے سے کہ یہ
سلسلۂ کلام جاری رہے میں نے کہا۔ "بیشک آپ صحیح فرماتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں
کہ آپ اپنے ہم عمر لوگوں کو ان باتوں سے قائل نہ کر سکتے ہوں گے۔ کیونکہ غالباً ان کے
نزدیک آپ پر جو عمر کی زیادتی گراں نہیں گذرتی اس کا سبب آپ کی فطرت اور
طبیعت کی افتاد نہیں بلکہ آپ کا تمول ہو۔ اور ہر شخص جانتا ہو کہ مال و دولت اطمینان
و راحت پیدا کرنے کے کیسے قوی ذرائع ہیں"۔

کیفیلس:- آپ کا خیال صحیح ہے۔ بیشک وہ لوگ قائل نہیں ہوتے۔ اور سچ
تو یہ ہو کہ اُن کی بات میں بھی کچھ سچائی ضرور ہے لیکن اس قدر نہیں جتنی کہ وہ غلطی سے
سمجھتے ہیں۔ میں ایسے موقع پر اُن لوگوں کو وہی جواب دیتا ہوں جو تھمسٹوکلیس نے
ایک سریفی .... کو دیا تھا۔ آپ نے غالباً وہ قصہ سنا ہوگا۔ سریفی

اپنے مخاطب کو ملامت کر رہا تھا اور اس کی شہرت اور اُس کے محاسن کو باشندۂ اثینا ہونے پر محمول کرتا تھا نہ کہ خود اُس کے ذاتی جوہر پر۔ تھمسٹوکلیس نے کیا خوب جواب دیا کہ ”بیشک میں آپ کے ملک کا رہنے والا ہوتا تو مجھے یہ شہرت نصیب نہ ہوتی۔ لیکن آپ تو اثینا کے باشندہ ہو کر بھی یہ امتیاز حاصل نہ کر سکتے“ اسی قسم کا جواب میں اُن لوگوں کو دیتا ہوں جو غربت کی وجہ سے زیادتی عمر کی شاکی ہیں۔ بلاشبہ ممکن ہے کہ ایک مفلس و نادار شخص کو باوجود نیک دلی بڑھاپا گراں گذرے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تو یقینی ہے کہ ایک بدطینت شخص کے لیے تمول سکون قلب کا باعث نہیں ہو سکتا۔

میں :- ذرا یہ تو بتلائیے کہ آپ کی تمام جاہ و دولت خود آپ کی حاصل کردہ ہے یا وراثتاً آپ کو ملی تھی۔

ک :- میری حاصل کردہ! شاید آپ یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا کس قدر حصہ میرا حاصل کردہ ہے۔ میں امور دنیا داری میں اپنے جد امجد اور والد بزرگوار کے بین بین ہوں۔ دادا مرحوم کو جس قدر جائداد ملی تھی اُسے انھوں نے اپنی حیات میں دوگنا بلکہ تگنا کر دیا تھا۔ لیکن والد مرحوم کے زمانہ میں اس کا بہت سا حصہ کم ہو گیا۔ چنانچہ میری موجودہ جائداد سے بھی اُن کے زمانہ میں کچھ کم رہ گئی تھی میرے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ میں اپنے ورثا کے لیے اپنے والد کی جائداد کو بلا تخفیف بلکہ کچھ تھوڑے بہت اضافہ کے ساتھ چھوڑ جاؤں گا۔

میں :- میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ آپ مال و دولت کی طرف سے کچھ مستغنی سے معلوم ہوتے ہیں اور یہ بات اکثر اِن لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کو یہ چیزیں بلا ذاتی محنت اور کاوش کے وراثتاً مل جاتی ہیں۔ یوں تو بہ خیال افادہ و منافع مال سے کسے محبت نہیں ہوتی لیکن جو لوگ ذاتی کوشش اور زور بازو سے دولت پیدا کرتے ہیں اُنھیں اس سے کچھ مزید تعلق سا ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ یہ اسے اپنی محنت کا ثمرہ جانتے ہیں اس لیے انھیں دولت سے ایسی ہی الفت ہو جاتی ہے جیسے شاعر کو اپنے شعر سے یا والدین کو اپنی اولاد سے۔ خدا ایسے لوگوں کی صحبت سے محفوظ رکھے ان بیچاروں کے پاس سوائے دولت کی مدح سرائی کے کوئی اور عنوان گفتگو ہوتا ہی نہیں۔

ک :- بیشک آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

میں :- ہاں یہ صحیح سہی لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ نے اپنی دولت سے سب میں بڑا کیا فائدہ حاصل کیا؟

ک :- میں آپ کو بتلاؤں تو ضرور لیکن اکثر لوگ میرے قول کو باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ خیر سنیئے۔ جب انسان زندگی کی دلچسپیاں ختم کرنے کے بعد قریب مرگ ہوتا ہے تو مختلف خیالات اور تفکرات اس کے دماغ میں پیدا ہوتے ہیں جن افعال کے ارتکاب کے وقت اس کو کسی قسم کا خیال بھی نہ ہوا تھا۔ اب اُن پر مواخذہ کا خوف اس کو ستاتا ہے عقبیٰ اور آخرت کی روایات جو اب تک محض افسانہ معلوم

ہوتی تھیں اب اُن کی صحت کا امکان اس کو پریشان کرتا ہے۔ اور یا تو ضعف پیری کی وجہ سے یا اُس عالم سے دم بدم قریب تر ہونے کے باعث یہ خیالات روز بروز زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں اس کی روح پر خوفناک شبہات مستولی ہو جاتے ہیں اور بالآخر وہ اپنے اعمال کی نیکی اور بدی کا جائزہ لینا شروع کرتا ہے۔ اعمال شنیعہ کی گرانباری کے احساس کے ساتھ ہی قوت متخیلہ اُسکے سامنے اس کے مستقبل کو تاریک ترین شکل میں پیش کرتی ہے اور وہ حزن و خوف کی زیادتی کے باعث بچوں کی طرح نیند میں ڈر کر چونک پڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے دامن عمل کو گرد عصیاں سے پاک پاتا ہے تو امید جزا اُس کے ایام پیری کو پُرسکون بنا دیتی ہے۔ پندار نے کیا خوب کہا ہے "آس اور امید ان لوگوں کی روحو کو پرورش کرتی ہے جو عدل اور تقدس کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اُن کی شریک راہ ہوتی ہے اور ایام پیری میں مونس جان نواز کا کام کرتی ہے۔ انسان کی غیر مطمئن اور پریشان روح کو سکون بخشنے کے لیے اس سے قوی تر اور کون طاقت ہے؟" ہر شخص کے لیے تو نہیں لیکن ایک نیک خصلت انسان کے لیے دولت کی یہ سب میں بڑی برکت ہے کہ اُسے ارادۃً یا بلا ارادہ جعل و فریب سے محفوظ رکھتی ہے اور راہی عدم ہوتے وقت اُس کی روح ان خیالات سے پریشان نہیں ہوتی کہ اس کی گردن پر کسی کے قرض کا بوجھ ہے یا کسی دیوتا کی قربانی واجب الادا رہ گئی ہے۔ دولت اس سکون قلب اور اطمینان روح کے حصول میں بڑی حد تک

مدد کرتی ہے اور اگر مقابلہ کیا جائے تو میرے نزدیک دولت کا یہ فائدہ کہ اُس سے انسان کو عدل کرنے میں مدد ملتی ہے دوسرے فوائد سے کہیں زیادہ وقیع ہے۔

میں :- سبحان اللہ! کیا نکتہ بیان فرمایا ہے لیکن آپ نے اس تقریر میں عدل کا جو ذکر کیا اس سے کیا مطلب ہے کیا اس کا منشا صرف راستبازی اور ادائگی قرض ہے اور کیا اس تعریف میں مستثنیات نہیں؟ مثلاً فرض کیجئے کسی دوست نے بہ ثبات عقل و ہوش میرے پاس کچھ ہتھیار امانتاً رکھوائے۔ کچھ عرصہ بعد اس بیچارہ کا دماغ خراب ہوگیا اور اسی حالت میں اس نے مجھ سے اُن ہتھیاروں کا مطالبہ کیا۔ کیا میرا فرض ہے کہ میں یہ امانت واپس کردوں؟ غالباً کوئی نہ کہیگا کہ میں ایسا کروں اور اگر میں کروں تو شاید کوئی شخص اسے بنظر استحسان نہ دیکھیگا۔ اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ متذکرۂ بالا کیفیت میں اس شخص سے ہمیشہ راستبازی کی جائے۔

ک :- آپ بجا فرماتے ہیں۔

میں :- یعنی راستبازی اور ادائے قرض عدل کی صحیح تعریف نہیں ہے۔

پالیمارکس :- (بات کاٹ کر) کیوں؟ اگر آپ سائیمانڈیس پر کچھ بھی اعتبار کریں تو پھر یہی صحیح تعریف ہے۔

ک :- ذرا قربانی کا انتظام کرنا ہے اس لیے مجھے تو اجازت دیجئے پالیمارکس اور دیگر حاضرین سلسلۂ گفتگو کو قائم رکھیں گے۔

میں :- ہاں کیوں نہیں، یہ حق تو انھیں ورا ثتاً پہونچتا ہی(اگر بدپر ہتو اللہ بسیر تمام کند)

ک :- جی ہاں۔

اور یہ کہکر مسکراتے ہوے رسم قربانی کی ادائگی کے لیے چلے گئے۔

میں :- (پالیمارکس سے) اچھا تو فرمائیے آپ کے سائیمانڈیس صاحب کیا کہتے ہیں۔

پ :- بقول اس کے ادائے قرض یا واجب الادا اشیار کی واپسی عدل ہی اور میری راے میں اس کا یہ قول صحیح ہے۔

میں :- سائیمانڈیس جیسے فہیم اور دانشمند شخص کی راے سے اختلاف کرنا میرے لیے باعث تکلیف ہی۔ لیکن کیا کروں میں اس کا اصلی مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ شاید آپ اس کا مطلب سمجھ گئے ہوں۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہی کہ اُس کے نزدیک بھی یہ ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ اختلال دماغ کی صورت میں ہتھیاروں کی امانت کسی شخص کو واپس کی جاے۔ لیکن اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ امانت واجب الادا ہوتی ہی۔

پ :- بیشک۔

میں :- تو اگر امانت رکھوانے والے کا دماغ صحیح حالت میں نہ ہو تو مجھ پر امانت کا واپس کرنا واجب نہیں؟

پ :- ہرگز نہیں۔

میں :- کیا سائیمانڈیس نے اپنی تعریف میں یہ مثال شامل نہیں کی تھی اور وہ جو ادائے قرض کو عدل سے تعبیر کرتا ہی تو اُس کا مفہوم کچھ اور ہی؟

پ :- بیشک اور ہی کیونکہ اُس کے نزدیک دوست کا فرض ہی کہ دوست کے ساتھ ہمیشہ نیکی کرے اور بدی سے باز رہے۔

میں :- تمہاری رائے میں اگر میرے پاس کسی دوست کے زروجواہر امانتاً رکھے ہوں اور ان کی واپسی سے اُس دوست کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں اس امانت کا واپس کرنا ادائے قرض نہیں ہی۔ غالباً آپ کے خیال میں سائیمانڈیس کا یہی مطلب ہی۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- پھر کیا دشمنوں کو اُن کی واجب الادا چیز واپس دینی چاہیے یا نہیں؟

پ :- بیشک دینی چاہیئے۔ لیکن میرے خیال میں دشمن کے لیے تو برائی ہی واجب الادا یعنی مناسب ہی۔

میں :- گویا سائیمانڈیس نے شعرا کی طرح عدل کی تعریف اور اُسکی ماہیت صاف الفاظ میں بیان نہیں کی بلکہ اُسے ایک چیستاں اور معمہ بنا دیا۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہی کہ فریق ثانی کو وہ چیز دی جائے جو اُس کے لیے مناسب ہی اور اس مناسب شے کا نام اُسنے واجب الادا چیز یا قرض رکھا ہی۔

پ :- غالباً اس کا مطلب یہی ہو جو آپ فرماتے ہیں۔

میں :- لاریب لیکن اگر اُس سے کوئی یہ پوچھتا کہ فن طب کونسی مناسب چیز دیتا ہو اور کسے دیتا ہو تو وہ کیا جواب دیتا۔

پ :- اس کا جواب یقیناً یہ ہوتا کہ فن طب اجسام انسانی کو ادویہ اور اغذیہ دیتا ہو۔

میں :- اور فن طباخی کیا دیتا ہو اور کسے؟

پ :- غذا کو ذائقہ۔

میں :- تو پھر عدل کیا دیتا ہو اور کسے دیتا ہو؟

پ :- اگر اسی تمثیل کے مطابق جواب دیا جاے تو عدل اس فن کا نام ہو جو احباب کو خیر اور فائدہ، اور اعدا کو شر اور نقصان دیتا ہو۔

میں :- اچھا تو عدل سے سائیمانڈیس کا یہ مطلب ہو؟

پ :- میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں :- زمانہ علالت میں کون شخص احباب کو فائدہ اور اعدا کو ضرر پہونچا سکتا ہو؟

پ :- طبیب۔

میں :- اور اگر سمندر کے سفر میں کسی خطرہ کا سامنا ہو تو کون؟

پ :- نا خدا۔

میں :- ہاں تو وہ کونسی صنف اعمال ہو جسمیں ایک عادل و منصف شخص

اپنے دشمنوں کو ضرر اور دوستوں کو فائدہ پہنچانے کے قابل ہوتا ہے۔

پ :- اول الذکر سے جنگ کرنے میں اور مؤخر الذکر سے روابط اتحاد قائم کرنے میں۔

میں :- اچھا ذرا یہ بھی بتلا دیجیے کہ تندرستی میں تو طبیب کی ضرورت نہیں ہوتی

پ :- جی نہیں۔

میں :- اور اگر سمندر کا سفر درپیش نہ ہو تو نا خدا کی ضرورت نہیں پڑتی۔

پ :- نہیں۔

میں :- اسی طرح زمانہ امن میں عدل و انصاف کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

پ :- میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔

میں :- تو کیا تمہاری رائے میں عدل و انصاف زمانہ جنگ اور امن میں یکساں کارآمد ہے۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- جیسے زمانہ امن میں فراہمی غلہ کے لیے زراعت کا کام؟

پ :- جی ہاں۔

میں :- یا جوتے فراہم کرنے کے لیے موچی کا کام۔

پ :- بیشک۔

میں :- اسی طرح یہ بتلائیے کہ زمانہ امن میں عدل کی ضرورت کس چیز کی

فراہمی کے لیے پڑتی ہے؟

پ :- معاہدات کی ترتیب اور تکمیل کے لیے۔

میں :- معاہدات سے غالباً آپ کا مطلب کاروبار میں باہمی شرکت ہے؟

پ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن اگر بالفرض شطرنج کھیلنے میں آپ کو کسی شریک کی ضرورت ہو تو اس کھیل کا ماہر آپ کے لیے زیادہ مفید ہوگا یا ایک عادل و منصف شخص؟

پ :- یقیناً اس کھیل کا ماہر زیادہ مفید ہوگا۔

میں :- اور اگر تعمیر مکان کے سلسلہ میں یہ ضرورت ہو تو معمار زیادہ کارآمد ہوگا یا ایک عادل و منصف آدمی۔

پ :- معمار زیادہ مفید ہوگا۔

میں :- جیسے ان تمام معاملات میں ان مختلف کاموں کا ماہر زیادہ مفید ہے ویسے ہی یہ فرمایئے کہ عادل شخص کی شرکت کس امر خاص میں زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوگی؟

پ :- روپیہ اور مال کے لین دین کے معاملہ میں۔

میں :- صحیح۔ لیکن غالباً استعمال زر کے معاملہ میں تو ایسے شخص کی شرکت چنداں مفید نہیں۔ کیونکہ مثلاً اگر ایک گھوڑے کی خرید و فروخت کا مسئلہ درپیش ہو تو ایسی صورت میں کس کا مشورہ زیادہ مفید ہوگا ایک عادل شخص کا یا ایک

ایسے آدمی کا جو اس معاملۂ خاص میں اچھی مہارت رکھتا ہو؟

پ :- بیشک مؤخرالذکر ہی زیادہ مفید ہوگا۔

میں :- اور اگر کوئی جہاز خریدنا ہو تو غالباً ایک ملاح یا جہاز ران زیادہ مفید ہوگا۔

پ :- بیشک۔

میں :- تو وہ کونسا استعمال سیم وزر ہے جس میں ایک عادل شخص زیادہ مفید ثابت ہوگا؟

پ :- جب آپ کو اپنا روپیہ یا مال حفاظت کے ساتھ رکھوانا ہو۔

میں :- یعنی بہ الفاظ دیگر جب روپیہ بیکار پڑا رہے اور کام میں نہ آئے۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- ہاں تو یوں نہ کہیئے کہ عدل اُس وقت کارآمد ہوتا ہے جب نقد و مال کو بیکار رکھنا ہو۔

پ :- اور کیا نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں :- اس کے معنیٰ یہ ہوے کہ اگر آپ ایک آلۂ باغبانی کو حفاظت سے مگر بے کار رکھوانا چاہتے ہیں اُس وقت تو عدل کی ضرورت ہوگی ورنہ اگر استعمال کا خیال ہو تو ایسی حالت میں فن باغبانی زیادہ مفید اور کارآمد ہوگا۔

پ :- ظاہر ہے۔

میں :- اسی طرح اگر آپ ایک تلوار یا ایک رباب کو بیکار رکھنا چاہیں اُس وقت تو

عدل مفید ہی ورنہ فنون سپہ گری و موسیقی۔

پ: بیشک

میں:۔ گویا عدل اُس وقت مفید ہوتا ہی جب اشیا بیکار رہوں اور اگر ان چیزوں کو کار آمد بنایئے تو یہ بیکار ہو جاتا ہی۔

پ:۔ اور کیا۔

میں:۔ پھر عدل تو کچھ یہی کار آمد اور مفید چیز نہ ہوئی۔ لیکن ہاں ایک اور بات تو سُنیئے۔ اگر کوئی شخص اپنے حریف پر عمدگی سے وار کرسکتا ہی تو غالباً وہ وار بچانے کی قابلیت بھی بدرجۂ اتم رکھتا ہوگا؟

پ:۔ بلا شبہ۔

میں:۔ اور جو شخص امراض سے محفوظ رہنے اور ان کا علاج کرنیکی قابلیت رکھتے ہیں وہی امراض پھیلانے کی بھی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔

پ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ جو چوری چھپے سے دشمن کے مکانات پر حملہ کرسکے وہ اپنے مکان کی بخوبی حفاظت بھی کرسکتا ہی۔

پ:۔ ہاں۔

میں:۔ یعنی ایک چیز کا عمدہ محافظ اُس کا شاطر چور بھی ہوتا ہی۔

پ:۔ جی ہاں اور کیا؟

میں :یعنی جو شخص مال کا اچھا محافظ ہو سکتا ہے اُس میں مال چرانے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔

پ :۔ نتیجہ تو یہی نکلتا ہے۔

میں :۔ تو اس تمام گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ عادل شخص ایک قسم کا چور ہے۔ غالباً آپ نے یہ سبق ہومر سے سیکھا ہے کہ وہ اپنے ایک ممدوح (اودیسیس کے نانا آتولکس) کی تعریف کرتے ہوئے فخریہ بیان کرتا ہے کہ وہ چوری اور دروغ حلفی میں اپنے تمام ہم جنسوں میں بے مثل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہومر اور سائیمانڈیس کی طرح آپ کی رائے میں بھی عدل ایک قسم کا فن سرقہ ہے۔ البتہ اسکا مقصد آپ حضرات کے نزدیک احباب کو نفع اور اعدا کو ضرر پہنچانا ہے۔ کیوں آپ کا یہی مطلب تو ہے؟

پ :۔ نہیں میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ نہ معلوم اثنا رگفتگو میں میں کیا کہہ گیا۔ بہر حال میں ابھی تک اپنی پہلی تعریف پر قائم ہوں کہ دوست کی مدد کرنا اور دشمن کو ضرر پہنچانا عدل ہے۔

میں :۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ دوست اور دشمن آپ کسے کہتے ہیں؟ آیا وہ لوگ مقصود ہیں جو فی الحقیقت دوست یا دشمن ہیں یا وہ جو بظاہر ایسے معلوم ہوتے ہیں۔

پ :۔ ایک انسان سے یقیناً یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اُن لوگوں سے

مانوس ہو جو اُس کے نزدیک نیک ہیں اور اُن سے نفرت کرے جنھیں وہ بد سمجھتا ہے۔

میں:- لیکن کیا لوگ نیک و بد کی تمیز میں اکثر غلطی نہیں کرتے بہت سے آدمی جو حقیقتاً بُرے ہیں بظاہر بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور اس کے برعکس اکثر اچھے لوگوں پر بدی کا گمان ہوتا ہے۔

پ:- اس میں کیا شک ہے۔

میں:- ایسی صورت میں اکثر ایسا ہوگا کہ نیک لوگ ایک شخص کے دشمن اور بد لوگ اُس کے دوست ہوں۔

پ:- جی ہاں۔

میں:- کیا ایسی حالت میں بدوں کے ساتھ نیکی اور نیکوں سے بدی کرنا جائز ہے۔

پ:- ہاں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔

میں:- لیکن نیک لوگ تو عادل ہوتے ہیں اور کوئی غیر منصفانہ بات نہیں کرتے۔

پ:- بیشک۔

میں:- تو آپ کی رائے میں ان لوگوں کو ضرر پہنچانا جائز ہے جو غلطی کے مرتکب نہیں ہوتے۔

پ :- نہیں نہیں۔ یہ خیال تو اخلاق صحیحہ کے بالکل منافی ہے۔

میں :- شاید آپ کا مطلب یہ ہے کہ عادل کے ساتھ نیکی اور ظالم کے ساتھ بدی کی جائے۔

پ :- جی ہاں یہ زیادہ مناسب ہے۔

میں :- لیکن ذرا اس کے نتائج پر بھی غور کرتے چلیے۔ اکثر لوگ فطرت انسانی سے ناواقفیت کے باعث ایسے آدمیوں کو دوست رکھتے ہیں جو فی الحقیقت برے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں ان لوگوں کو چاہیے کہ اپنے احباب کو ضرر پہنچائیں اسی طرح اکثر نیک لوگوں سے دشمنی بھی ہوتی ہے تو کیا انھیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیئے؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو آپ گویا سائیمانڈیس کی تعریف کی مخالفت کرتے ہیں۔

پ :- آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن ابتدائے گفتگو میں ہم سے ایک غلطی دوست اور دشمن کے معنی بیان کرنے میں ہوگئی ہے۔ مناسب ہے کہ اس کی تصحیح کرلی جائے۔

میں :- وہ کیا ؟

پ :- ہم نے دوست سے مراد وہ شخص لیا تھا جو بظاہر ہمارے نزدیک نیک معلوم ہوتا ہو۔

میں :- اور اب آپ اس غلطی کی تصحیح کیونکر کرنا چاہتے ہیں؟

پ :- میرے خیال میں دوست وہ شخص ہے جو بظاہر ہی نہیں بلکہ حقیقتاً نیک ہو اور اگر وہ فی الحقیقت نیک نہیں تو وہ حقیقی نہیں بلکہ ظاہری دوست ہے۔ اور دشمن کے بارہ میں بھی یوں ہی قیاس کر لیجیے۔

میں :- گویا آپ کے نزدیک صرف نیک لوگ ہمارے دوست اور بد ہمارے دشمن ہیں۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- اور اب آپ یہ فرمانے کے بجائے کہ عدل کے معنی دوستوں سے نیکی اور دشمنوں سے بدی کرنا ہیں یہ ترمیم کرنا چاہتے ہیں کہ دوستوں کے ساتھ بشرطیکہ وہ نیک ہوں بھلائی کی جائے اور دشمنوں سے بشرط بدی برائی۔

پ : جی ہاں۔ یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میں :- مگر کیا عادل شخص کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے!

پ :- بیشک۔ اس کا فرض ہے کہ ان دشمنوں کو جو فی الحقیقت برے ہیں ضرر پہنچائے۔

میں :- اچھا ایک بات اور بتلائیے۔ اگر کوئی گھوڑا مجروح ہو جائے تو وہ ترقی کرے گا یا تنزل؟

پ :- ظاہر ہے تنزل کرے گا۔

میں :- اپنی صفات مخصوصہ میں تنزل کریگا یا کسی دوسرے اعتبار سے!

پ :- اپنی مخصوص صفات میں تنزل کرے گا۔

میں :- اسی طرح ایک کتا مجروح ہونے کے بعد اپنی صفات مخصوصہ میں تنزل کرے گا۔

پ :- جی ہاں۔

میں :- اسی طرح اگر کوئی انسان مجروح ہو یا اُسے ضرر پہنچایا جائے تو وہ ان صفات میں تنزل کرے گا جو انسان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

پ :- بیشک۔

میں :- اور کیا انسان کی صفت خصوصی عدل نہیں ہے؟

پ :- یقیناً ہے۔

میں :- مگر یہ تو فرمائیے کہ کوئی ماہر موسیقی اپنے فن سے دوسرے لوگوں کے طبائع کو غیر موزوں بنا سکتا ہے۔

پ :- یہ کیسے ممکن ہے۔

میں :- اسی طرح ایک شہسوار دوسرے لوگوں کو برا سوار نہیں بنا سکتا۔

پ :- ہرگز نہیں۔

میں :- پھر کیا ایک عادل شخص اپنے عدل کی وجہ سے دوسروں کو غیر منصف اور ظالم یا ایک نیک شخص اپنی نیکی کے ذریعہ اوروں کو بد بنا سکتا ہے؟

پ:- یقیناً نہیں۔

میں:- اور کیا۔ میرے خیال میں تو یہ بات اسی درجہ ناممکن ہی جتنی یہ کہ گرمی سے سردی اور خشکی سے تری پیدا ہو۔

پ:- بیشک۔

میں:- تو یہ طے ہوا کہ نیک آدمی دوسروں کو بد نہیں بنا سکتا۔ اور نیک آدمی عادل ہوتا ہے۔

پ:- بیشک۔

میں:- گویا دوست ہو یا کوئی اور، عادل شخص کا یہ کام ہرگز نہیں کہ اسے ضرر پہونچائے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تو ظالم اور بے ایمان آدمیوں کا کام ہی۔

پ:- آپکا خیال بالکل بجا ہی۔

میں:- اب غور کیجیے کہ ایک شخص کہتا ہی کہ عدل قرض یا واجب لادا چیزوں کے ادا کرنے کا نام ہی اور اس کے ساتھ یہ تشریح بھی کرتا ہی کہ احباب کے لیے واجب لادا چیز نیکی ہے اور اعدا کے لیے بدی میں تو اس کے قول کو سراسر غلط تصور کرتا ہوں اور مجھے امید ہی کہ آپ اس میں مجھ سے متفق ہوں گے کیونکہ ہماری گفتگو نے طے کر دیا ہی کہ کسی کو ضرر پہونچانا عدل کا مرادف نہیں ہو سکتا۔

پ:- میں بیشک آپ سے متفق ہوں۔

میں:- تو اب اگر کوئی شخص اس نامعقول قول کو سائیمانڈیز بائیس یا پٹیکس

کی طرف منسوب کرے یا مشاہیر میں سے کسی اور کی طرف تو ہمیں اس کی مخالفت اور تردید کرلی چاہیئے۔

پ:- میں اس حقیقت کے انکشاف میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور آپ کا ساتھ دینے پر بخوشی آمادہ۔

میں:- میں آپ کو بتلاؤں کہ میرے نزدیک یہ کس کا قول ہے؟

پ:- فرمایئے۔

میں:- میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی متمول اور باثروت آدمی کا قول ہے جسے اپنی جاہ و دولت پر بہت ناز تھا مثلاً پیری اینڈر یا زرکسیز وغیرہ۔

پ:- آپ فرماتے تو سچ ہیں۔

میں:- اچھا یہ تعریف تو غلط ثابت ہوئی۔ اب کہیے عدل کی صحیح تعریف کیا ہے؟

اثنار گفتگو میں تھریسی میکس بار بار ہماری بات کاٹ کر بولنا چاہتے تھے لیکن تمام حاضرین مجلس چونکہ ہماری گفتگو کا نتیجہ سننے کے آرزومند تھے اس لیے انھیں دبا دیا جاتا تھا۔ لیکن جب ہمارا سلسلۂ کلام ختم ہوا اور تھوڑی دیر خموشی رہی تو تھریسی میکس چپ نہ رہ سکے اور اپنی تمام قوت مجتمع کرکے مجھ پر حملہ شروع کر ہی تو دیا۔ اور اس شد و مد سے تقریر کی کہ میں سہم سا گیا۔ بہت زور سے چلا چلا کر لگے فرمانے "جناب والا یہ آپ کس خبط میں پڑے ہیں اور آپ کو آخر یہ کیا حماقت لاحق ہوگئی ہے مگر ماشاءاللہ آپ لوگ علمی کشتی خوب لڑتے ہیں۔ اگر آپ کو فی الواقع عدل انصاف کی ماہیت

دریافت کرنی منظور ہے تو صرف جرح پر اکتفا نہ کیجیے۔ خود بھی تو کچھ فرمایئے۔ کسی کی بات کو رد کر دینا بہت آسان ہے۔ لیکن خود کچھ کہنا مشکل۔ سوال ہر کوئی کر سکتا ہے جواب دینا البتہ سہل نہیں۔ لیکن ہاں یہ پہلے ہی جتلا دوں کہ کہیں عدل کی کوئی ایسی چلتی ہوئی تعریف نہ کر دیجیئے گا کہ یہ کسی جماعت کے اغراض کا نام ہے۔ ایک انسانی فرض ہے یا ایک امر مستحسن ہے کثیر المنافع۔ میں ایسی گوں باتوں کو نہیں مانتا۔ میں تو صحت و صفائی کا طالب ہوں۔"

ان بزرگ نے کچھ ایسے زور شور سے تقریر کی کہ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی اور اگر آنکھیں نیچی نہ کروں تو شاید بالکل جواب دے سکتا[1] مگر جب دیکھا کہ ان کا غصہ تو بڑھتا ہی جاتا ہے تو میں نے مناسب خیال کیا کہ کچھ عرض کروں۔

میں:- جناب من، اس درجہ ناراض نہ ہو جیئے۔ ممکن ہے اثنائے کلام میں مجھ سے یا پالیمارکس سے کوئی غلطی ہو گئی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غلطی ارادۃً نہیں کی گئی۔ سچ فرمایئے اگر ہم دونوں اس وقت ایک سونے کے ٹکڑے کی تلاش میں مصروف ہوتے تو شاید آپ کو ہمارے مل کشتی لڑنے کا گمان نہ ہوتا۔ آپ غالباً کبھی یہ نہ خیال فرماتے کہ ایک دوسرے کی خاطر لوگ

---

[1] اشارہ ہے یونانیوں کے عام خیال کی طرف کہ اگر آدمی بھیڑیے سے دوچار ہو جائے اور بھیڑیے کی نگاہ پہلے آدمی پر پڑ جائے اور آنکھ سے آنکھ ملجائے تو آدمی بالکل گونگا ہو جاتا ہے۔

اس قیمتی ٹکڑے کے حصول کے لیے دل وجان سے کوشاں نہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر آپ یہ شبہ کیوں کرتے ہیں کہ ہم تلاش حق اور ماہیت عدل کے معلوم کرنے میں ایک دوسرے سے مروتاً دب جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز سونے کے متعدد ٹکڑوں سے بھی بدرجہا زیادہ بیش بہا اور قیمتی ہے۔ برادرعزیز! آپ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ ہم تلاش حق میں پوری محنت صرف نہیں کرتے۔ ہم تو سخت کوشش کرنے کو تیار ہیں لیکن کیا کریں اس گنج گرانمایہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ممکن ہے آپ اُس سے واقف ہوں لیکن پھر بھی ہماری لاعلمی پر خفا ہونے کی کیا وجہ ہے آپ کو تو ہم پر افسوس اور رحم کرنا چاہیئے۔

تھریسی میکس:۔ (حقارت آمیز تبسم کے ساتھ) آپنے کس قدر "سقراطیت" فرمائی ہے۔ سبحان اللہ۔ یہی آپ کا مخصوص طرز طعن ہے میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ یہ حضرت کسی سوال کا جواب نہ دیں گے بلکہ طعن وتمسخر یا کسی اور تدبیر سے اُسکو ٹال جائیں گے۔

میں:۔ آپ تو بڑے دانشمند آدمی ہیں۔ ماشاءاللہ فلسفی بھی ہیں۔ آپ تو خوب سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ایک شخص سے پوچھا جائے کہ بارہ کا عدد کیا ظاہر کرتا ہے اور ساتھ ہی اُسے منع کر دیا جائے کہ بھائی یہ نہ کہنا کہ بارہ چھ کا دوگنا یا چار کا تین گنا یا دو کا چھ گنا یا تین کا چوگنا ہے۔ تو بیچارہ لامحالہ کچھ جواب نہ دے سکیگا۔ اور وہ آپ سے پوچھ سکتا ہے کہ اگر آپ کے سوال کا جواب انھیں میں سے ایک ہو تو پھر میں کیا کروں

کیا بجائے صحیح جواب کے کوئی غلط بات کہدوں۔ ایسی صورت میں آپ کیا فرمائینگے؟

ت :۔ آپ تو اس طرح سوال کر رہے ہیں گویا یہ دونوں صورتیں ایک سی ہیں۔

میں :۔ کیا اس میں بھی کچھ شبہ ہے؟ اور اگر بفرض محال میں تسلیم بھی کر لوں کہ یہ یکسانیت حقیقی نہیں بلکہ صرف ظاہری ہے تو بھی کیا یہ بجا بات نہیں کہ آپ ایک شخص کو اپنے حقیقی خیالات کے اظہار سے منع کرتے ہیں۔

ت :۔ کہئے تو آپ کا آخر ارادہ کیا ہے؟ شاید جناب انھیں ممنوع جوابات میں سے کوئی جواب دینا چاہتے ہیں؛

میں :۔ کیا عجب ہے۔ ممکن ہے غور کرنے کے بعد میں ایسا ہی کروں۔

ت :۔ اور اگر میں ان سب سے بہتر جواب پیش کر دوں تو پھر آپکی کیا سزا ہوگی؟

میں :۔ سزا؟ میری سزا یا جزا وہی ہوگی جو ہر جاہل بے علم آدمی کی ہوتی ہے یعنی عقلمندوں سے سبق لینا۔

ت :۔ خوب۔ اور کچھ جرمانہ نہ دلوائیگا۔

میں :۔ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں اس کے لیے بھی آمادہ تھا۔

گلاکن :۔ آپ روپیہ کا خیال نہ کریں۔ اور تھریسی میکس کو بھی روپیہ کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔ سقراط کی طرف سے ہم لوگ روپیہ ادا کر دیں گے۔

ت :۔ مگر صاحب یہ حضرت تو وہی حرکت کریں گے جو ہمیشہ کیا کرتے ہیں خود جواب دیں گے نہیں اور دوسرے کے جواب کو کسی نہ کسی طرح رد کر دیں گے۔

میں :- عزیز من - آپ کیا فرماتے ہیں ؟ وہ غریب کیا جواب دے جو اول تو کچھ جانتا نہیں اور ساتھ ہی اپنے جہل کا احساس بھی رکھتا ہے - اور اگر بالفرض وہ کچھ کہنا بھی چاہے تو آپ جیسا قابل شخص اُسے منع کرتا ہے - اس لیے مناسب تو یہی ہے کہ وہ شخص جواب دے جو اس معاملہ میں علم کا مدعی ہے اور اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد بھی ہے - مجھ پر اور جملہ حاضرین پر آپ کی عین عنایت ہو گی اگر آپ عدل کی کوئی تعریف پیش کریں -

گلاکن اور دیگر حاضرین نے بھی اس درخواست میں میری ہمنوائی کی -

تھریسی میکس ، چونکہ بزعم خود بہت عمدہ تعریف پیش کرنے والے تھے اسلیے دراصل اظہار خیال کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے لیکن ظاہر داری کے لیے تکلفاً مجھی سے اصرار کرتے رہے - لیکن بالآخر جواب دینے پر آمادہ ہو گئے -

ت :- حضرت سقراط کی عقلمندی تو ملاحظہ کیجیے کہ خود تو کچھ بتاتے نہیں دوسروں سے ہی کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پھر شکریہ تک ادا نہیں کرتے -

میں :- مجھے اس سے ہرگز انکار نہیں کہ میں ہمیشہ دوسروں سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہوں - لیکن یہ سراسر غلط ہے کہ میں دوسروں کا احسان نہیں مانتا - ہاں میرے پاس چونکہ مال و دولت نہیں ہے اس لیے صرف مدح و تعریف اور اظہار تشکر پر اکتفا کرتا ہوں - اور دور کیوں جائیے میرے بیان کی تصدیق تو ابھی ہوئی جاتی ہے مجھے امید ہے کہ آپ نہایت قابلیت کے ساتھ اپنا جواب پیش کرنے والے ہیں

اور پھر دیکھ لیجیے گا کہ میں جس طرح ہر قابل شخص کی تعریف کرتا ہوں آپ کی داد دینے میں بھی مطلق کوتاہی نہ کروں گا۔

ت:۔ اچھا تو لیجیے سُنیے۔ عدل فریق قوی کے فائدے اور منافع اور اُس کے اغراض کی پابندی کا نام ہے۔ میرے نزدیک بس یہی عدل کی تعریف ہے، .... ہاں کچھ فرمائیے نا، اب داد دیجیے تعریف کیجیے۔ مگر آپ کاہے کو ایسا کرنے لگے۔

میں:۔ ایک ذرا ٹھہریے۔ میں پہلے سمجھ تو لوں۔ آخر آپ کا مطلب و مفہوم کیا ہے۔ یہ معنی تو غالباً ہوں گے نہیں کہ چونکہ پالیڈمس ہم میں سب سے زیادہ مضبوط اور قوی ہے اور اپنی قوت جسمانی میں اضافہ کے لیے گائے کا گوشت بہ کثرت کھاتا ہے اس لیے ہمارے لیے بھی گائے کا گوشت کھانا مناسب ہے۔

ت:۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ الفاظ سے آپ ہمیشہ وہی معنی لیتے ہیں جس سے فریق ثانی کی دلیل کمزور ہو جائے۔

میں:۔ آپکا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ میں آپ کا صرف اصلی مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں براہ کرم اپنا مطلب ذرا صاف الفاظ میں بیان کر دیجیے۔

ت:۔ بہت اچھا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ نظام حکومت کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ کہیں شخصی حکومت ہوتی ہے کہیں طبقہ امرا، حکومت کرتا ہے اور کہیں جمہور کی حکمرانی ہوتی ہے۔

میں :۔ جی ہاں ۔

ت :۔ اور آپ غالباً یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہر ریاست میں حکومت ہی فریق قوی اور طاقت بالا دست ہوتی ہے۔

میں :۔ بیشک ۔

ت :۔ یہی نظام حکومت خواہ شخصی ہو، امارتی ہو، یا جمہوری اپنے مختلف اغراض کا خیال رکھکر آئین و قوانین کی ترتیب کرتا ہے۔ اور انھیں قوانین کے ذریعہ جو رعایا کی اغراض کے پابند ہوتے ہیں اپنی رعایا میں عدل و انصاف قائم رکھتا ہے ان قوانین کی نافرمانی کرنے والوں کو غیر منصف یا ظالم تصور کرکے سزا دیجاتی ہے۔ چنانچہ تمام ریاستوں میں ایک ہی اُصول عدل و انصاف ہے یعنی حکومت کی اغراض کا اتباع، اور چونکہ حکومت اور قوت میں چولی دامن کا ساتھ ہے اسلئے عدل کے معنی صرف فریق قوی کے اغراض کا پاس کرنا ہیں ۔

میں :۔ میں آپ کا مفہوم سمجھ گیا اور اب دیکھنا ہے کہ جناب کا ارشاد صحیح ہے یا غلط ۔ لیکن ہاں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ابتداے گفتگو میں آپ نے مجھے منع فرمایا تھا کہ عدل کو کسی کی "غرض" سے نہ تعبیر کرنا اور اب آپ خود اُسے فریق قوی کے "اغراض" کے مرادف قرار دیتے ہیں ۔

ت :۔ میں نے اس لفظ کے ساتھ جو اضافہ کیا ہے کیا وہ آپ کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتا ؟

میں:- خیر اہم ہو یا غیر اہم۔ یہ تو محض برسبیل تذکرہ تھا۔ اب تو سوال یہ ہے کہ جناب کا ارشاد صحیح ہے یا نہیں۔ آپ کے خیال میں عدل عبارت ہے فریق قوی کے اغراض کی پابندی سے۔ میں اس خیال کا مؤید نہیں ہوں۔ اس لیے آیئے ذرا تحقیق کریں۔

ت:- بہت اچھا۔ ضرور۔

میں:- عدل و انصاف کا یہ تقاضا ہے یا نہیں کہ رعایا حکام بالا دست کی اطاعت کرے۔

ت:- بلاشبہ ہے

میں:- مگر کیا حکام بالکل معصوم ہوتے ہیں اور ان سے کسی غلطی کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا۔

ت:- نہیں کیوں نہیں۔ یقیناً ان سے خطا کا احتمال ہے۔

میں:- تو نفاذ قوانین میں بھی ان سے کبھی نہ کبھی ضرور غلطی ہوگی۔

ت:- جی ہاں۔

میں:- اگر حکومت نے ٹھیک قوانین نافذ کیے تو وہ ضرور ان کے اغراض میں ممد ہوں گے لیکن اگر اس میں غلطی ہوئی تو ان قوانین کا اغراض حکومت کے منافی ہونا بھی ممکن ہے۔

ت:- جی ہاں۔

میں :- اور یہ آپ فرما ہی چکے ہیں کہ عدل کا تقاضا ہی کہ رعایا قوانین حکومت کی پابندی کرے۔

ت :- بلاشبہ۔

میں :- یعنی عدل ہمیشہ فریق قوی کے اغراض کے مرادف نہیں بلکہ کبھی اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہی؟

ت :- یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں!

میں :- کہہ کیا رہا ہوں! آپ کا ہی کہا دُہرا رہا ہوں۔ ذرا پھر سوچ لیجیے کیا آپ نے یہ نہیں تسلیم کیا کہ بعض اوقات ممکن ہے کہ حکومت بالادست غلطی سے اپنے اغراض کے منافی قوانین جاری کردے اور آپ نے یہ بھی تسلیم کیا ہی کہ بہ تقاضاے عدل رعایا کو ہر حکم مجریہ حکومت کی اطاعت کرنا لازم ہی۔ فرمائیے یہ دونوں باتیں تسلیم کرتے ہیں یا نہیں؟

ت :- جی ہاں کرتا ہوں۔

میں :- اس کا لازمی نتیجہ یہ ہی کہ آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اگر نفاذ قوانین میں حکومت سے خطا ہوجاے تو ایسی حالت میں عدل فریق قوی کی اغراض کے منافی ہوتا ہی۔ کیونکہ اگر جناب ہی کے ارشاد کے بموجب رعایا پر تمام احکام ریاست کی پابندی لازمی ہی تو اس نتیجہ سے کوئی مفر نہیں۔ یہاں تو فریق قوی مگر درجماعت سے حکماً ایسے افعال کراتا ہی جو خود اول الذکر کے مفاد کے خلاف ہیں۔

پالیمارکس:۔ بیشک۔ یہ تو بالکل صاف بات ہے۔

کلیتوفن:۔ جی ہاں۔ کیوں نہیں۔ بس آپ ہی کے اعتراف و شہادت کی ضرورت تھی۔

پالیمارکس:۔ بھائی اس میں اعتراف یا شہادت کی کیا ضرورت ہے۔ تھریسی میکس نے تو خود تسلیم کیا ہے کہ بعض اوقات حکومت اپنی اغراض کے خلاف قوانین جاری کرتی ہے اور رعایا پر اُن کی اطاعت بھی لازم ہے۔

کلیتوفن:۔ نہیں پالیمارکس، تھریسی میکس نے تو یہ کہا تھا کہ حکام کی اطاعت کرنا عدل ہے۔

پ:۔ میں نے مانا لیکن انھوں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ عدل طاقتور کے اغراض کا نام ہے۔ اور ان دونوں اصول کے ماننے کے بعد اُنھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ بعض اوقات طاقتور حاکم غلطی سے اپنی کمزور رعایا کے لیے ایسے ایسے احکام بھی جاری کر سکتا ہے جو خود حاکم کے لیے مضر ہوں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کبھی عدل طاقتور کے فائدے کا سبب ہوتا ہے تو کبھی اس کے نقصان کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

کلیتوفن:۔ لیکن فریق قوی کے اغراض سے تھریسی میکس کا مطلب ان اغراض سے تھا جنھیں یہ فریق خود اپنے لیے باعث نفع تصور کرے۔ کمزور پر ان اغراض کی پابندی لازمی ہے اور اسی کا نام عدل ہے۔

پالیمارکس:۔ تھریسی میکس کے الفاظ سے تو یہ مترشح نہیں ہوتا۔

میں:- خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں۔ اگر وہ اب بھی اپنی تعریف میں تبدیلی کرنا چاہیں تو میں اُسے قبول کرنے کو تیار ہوں (تھریسی میکس کو مخاطب کرکے) ہاں تو فرمائیے۔ کیا آپ کا مطلب یہی تھا کہ عدل سے مراد ان اغراض کی پابندی ہے جنہیں طاقتور خود اپنا فائدہ سمجھے خواہ فی الحقیقت وہ فائدہ مند ہوں یا نہوں۔

ت:- نہیں نہیں۔ آپ فرماتے کیا ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ طاقتور فریق سے غلطی ہوجانے کی صورت میں میں اسے خاص باعتبار اس غلطی کے طاقتور سمجھ سکتا ہوں؟

میں:- میرے نزدیک تو آپ کا یہی خیال ہے۔ اس لیے کہ آپ نے خود ہی تھوڑی دیر ہوئی فرمایا تھا کہ حکمراں معصوم نہیں ہوتے اور ان سے غلطی کا ارتکاب ممکن ہے۔

ت:- آپ تو خواہ مخواہ لفظی بحث کرتے ہیں۔ فرمائیے اگر ایک طبیب کسی مریض کے علاج میں غلطی کرے تو کیا بہ اعتبار اس سہو یا غلطی کے آپ اسے طبیب کہہ سکتے ہیں؟ یا اگر کوئی محاسب کسی سوال کے حل کرنے میں غلطی کرے تو کیا باعتبار اس غلطی کے اور اُس غلطی کے ارتکاب کے وقت آپ اس شخص کو محاسب یا ریاضی داں کہہ سکتے ہیں۔ عام بول چال میں تو اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ فلاں طبیب یا محاسب نے غلطی کی۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ کسی فن کا ماہر جب تک کہ وہ ماہر کے لقب کا مستحق ہے غلطی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ جہاں اس سے غلطی سرزد ہوئی وہ ماہر کہلانے کا اہل نہیں رہتا۔ نظر بریں کوئی ماہر۔ یا عقلمند شخص یا حاکم جب تک وہ ان الفاظ

سے مخاطب کیا جا سکتا ہو غلطی نہیں کر سکتا۔ اور اگر آپ صحت کلام پر اسی درجہ مصر ہیں تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ حاکم بہ حیثیت حاکم کے ناقابل سہو و غلطی ہے۔ اور اس لیے وہ کبھی اپنے اغراض کے منافی احکام و آئین جاری نہیں کر سکتا۔ بلکہ ہمیشہ ان احکام میں اپنی اغراض کا پاس رکھتا ہے اور ان احکام کی اطاعت رعایا پر لازمی ہے۔ چنانچہ میں عدل کی پہلی ہی تعریف پر قائم ہوں کہ یہ قوی تر جماعت کی اغراض کی پابندی کا دوسرا نام ہے۔

میں :۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری گفتگو عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کہیں آپکا یہ خیال تو نہیں ہے کہ میں جو یہ سوالات کرتا ہوں اس کا مقصد آپ کی دلائل کو کمزور کرنا ہے۔

ت :۔ خیال ؟ میرا تو یہی یقین ہے۔ بہر حال خدا نے چاہا تو آپ اس طرح مجھے شکست دینے میں کامیاب نہ ہوں گے۔

میں :۔ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ مگر آئندہ گفتگو میں غلط فہمی سے بچنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ دریافت کر لوں کہ آپ لفظ حاکم اور قوی کو کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں ؟ عام مروجہ معنی میں یا اپنے خاص بیان کردہ معنی میں۔

ت :۔ خود اپنے بیان کردہ معنی میں۔ اب چلیے کوئی اور دام پھیلایئے۔ دھوکا دیجئے۔ میں آپ سے رعایت کا طالب نہیں۔ انشاءاللہ آپ کامیاب نہ ہوں گے

میں :- اگر آپ مجھے اتنا پاگل سمجھتے ہیں کہ میں ایک زندہ شیر کو پکڑ کر اسکی کھال اُتارنے لگوں تو خیر آپ یہ بھی خیال کر سکتے ہیں کہ میں آپ کو دہوکا دینا چاہتا ہوں۔

ت :- خوب۔ اور ابھی ابھی آپ نے مجھے اپنے دام فریب میں پھانس رہے تھے تو اور کیا کرتے تھے؟

میں :- خیر یہ فقرہ بازی برطرف۔ اب یہ بتلائیے کہ آپ کے بیان کردہ معنی میں حقیقی طبیب کا کام مریضوں کی شفا ہی یا روپیہ کمانا۔ لیکن ذرا اپنے بیان کردہ معنی کا خیال رہے۔

ت :- اس کا کام شفاے مریض ہی نہ کہ جلب منفعت۔

میں :- ذرا یہ بھی بتلا دیجیے کہ حقیقی ناخدا ملاحوں کا افسر اور حاکم ہوتا ہی یا خود ملاح کا مرتبہ رکھتا ہی؟

ت :- ملاحوں کا حاکم ہوتا ہی۔

میں :- اس بات کا چنداں خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ خود بھی اسی جہاز میں سفر کرتا ہی اور نہ اُسے اس وجہ سے ملاح کہنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اس وجہ سے ناخدا نہیں کہلاتا کہ وہ جہاز میں سفر کرتا ہی بلکہ بہ لحاظ اپنے ہنر اور باعتبار اس امر کے کہ وہ ملاحوں پر نگرانی رکھتا اور ان کو احکام دیتا ہی۔

ت :- بیشک۔

میں :- آپ کو یہ بھی ضرور معلوم ہوگا کہ ہر فن کسی خاص چیز سے متعلق ہوتا ہے اور اس کی کوئی خاص غرض و غایت ہوتی ہے۔

ت :- جی ہاں۔

میں :- اور اس غرض کے حصول کے لیے وسائل اور ذرائع فراہم کرنا فن کا مقصد ہوتا ہے؟

ت :- بجا ہے۔

میں :- اور میرے خیال میں ہر فن کی غرض یہ ہے کہ اپنے سے متعلق چیز کی تکمیل کرے۔

ت :- میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں :- اچھا۔ میں اپنا مفہوم ایک تمثیل سے صاف کیے دیتا ہوں۔ اگر مجھ سے کوئی دریافت کرے کہ انسان کا جسم کافی اور کامل بالذات ہے یا ناقص اور ناکافی تو میں جواب دونگا کہ انسانی جسم ناقص اور حاجتمند ہے ممکن ہے اسے کوئی مرض لاحق ہو جائے اور اسے اس سے شفا کی ضرورت پڑے۔ اس کی کمیوں اور نقائص کی تلافی فن طب کرتا ہے اور یہی اس فن کی غایت ہے۔ کہئے آپ کی کیا رائے ہے۔

ت :- آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔

میں :- لیکن جس طرح کسی نقص یا عارضہ کی وجہ سے آنکھ کو ضعف بصارت

کی شکایت ہو سکتی ہے یا کان کو ثقل سماعت کی اسی طرح کیا فن طب یا دیگر فنون بھی ناقص ہو سکتے ہیں؟ اور کیا کسی فن کو اپنے اغراض کی نگہداشت اور اُن کے حصول کے لیے دوسرے فنون کی معاونت درکار ہے؟ یا ہر فن خالصاً اپنی اغراض سے متعلق ہوتا ہے۔ اور چونکہ فن میں خود کسی نقص کی گنجائش نہیں اس لیے دوسرے فنون کی معاونت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب تک ایک فن حقیقی اور آپ کی بیان کردہ معنی کے اعتبار سے فن ہے اُس وقت تک اس میں غلطی یا نقص کا امکان نہ ہونا چاہیئے۔

ت:۔ جی ہاں

میں:۔ گویا فن طب کا مقصد خود اپنے (فن طب) کے اغراض کی نگہداشت نہیں بلکہ جسم انسان کی اغراض کی نگرانی ہے۔

ت:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اسی طرح فن شہسواری کا مقصد اس فن کی نگہداشت نہیں بلکہ گھوڑوں کی اغراض کا پاس کرنا ہے۔ اور اسی طرح دیگر فنون بھی خود اپنے وجود اور اپنی اغراض کے لیے متفکر نہیں ہوتے، کہ اُن کو تو کوئی ضرورت ہوتی ہی نہیں، بلکہ ان اشیاء کی بہبودی کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اُن سے بہ حیثیت فن کے متعلق ہیں۔

ت:۔ بیشک۔

میں:۔ لیکن غالباً آپ ضرور تسلیم کریں گے کہ ہر فن اپنے مخصوص موضوع

سے افضل اور اسپر حاکم ہوتا ہے۔

تھریسی میکس نے اسے مان تو لیا لیکن بہت ہی تکلف سے۔

میں:۔ اس گفتگو کا تمام تر نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی علم یا فن فریق قوی کے (یعنی خود اپنے) اغراض کا خیال نہیں رکھتا بلکہ کمزور فریق (یعنی موضوع متعلقہ) کا۔

تھریسی میکس نے اس کی تردید کی کچھ کوشش کی لیکن بالآخر مان گئے۔

میں:۔ مجھے امید ہے کہ آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ ایک طبیب کا فرض بہ حیثیت حقیقی طبیب کے یہ ہے کہ مریض کی بھلائی کا خیال رکھے نہ کہ اپنے منافع کا۔ طبیب کی حیثیت بادشاہ کی سی ہے اور جسم مریض کی حیثیت رعایا کی۔ اور آپ تسلیم کر ہی چکے ہیں کہ حقیقی طبیب کو روپیہ کمانے سے کچھ سروکار نہیں۔

ت:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اسی طرح ناخدا کا کام ہے کہ ایسے احکام دے اور ایسے ذرائع فراہم کرے کہ ملاحوں کا فائدہ ہو نہ یہ کہ خود اپنے اغراض کا بندہ بن جائے۔

تھریسی میکس نے طوعاً و کرہاً اثبات میں جواب دیا۔

میں:۔ یعنی کوئی حاکم بہ حیثیت حقیقی حاکم کے کبھی اپنے ذاتی اغراض کا پاس نہیں کرتا بلکہ اپنے سے متعلق زیردست جماعت یعنی رعایا کا خیال رکھتا ہے۔ یہی اس کا مطمح نظر ہوتا ہے اور یہی خیال اس کے ہر قول و فعل پر حاوی ہوتا ہے۔

جب سلسلۂ گفتگو یہاں تک پہنچ گیا اور ہر شخص پر ظاہر ہو چلا کہ عدل کی جو

تعریف زیر بحث تھی وہ غلط ثابت ہوچکی تو تھریسی میکس بجائے میرے سوال کا جواب دینے کے کچھ عجیب بے ساختہ پن سے لگے فرمانے "اجی حضرت۔ آپ کی پرورش اور تربیت کے لیے کوئی دایہ بھی ہے؟"

میں :۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آپ ایسا بے ربط سا سوال کیوں کر بیٹھے؟

ت :۔ میں نے یہ اس لیے پوچھا کہ آپ کی دایہ نے شائد آپ کو ناک تک صاف کرنا نہیں سکھایا۔ آپ تو بھیڑ اور چرواہے میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔

میں۔ آپ نے کس وجہ سے یہ نتیجہ نکالا؟

ت :۔ اس وجہ سے کہ آپ کے نزدیک چرواہا اپنی بھیڑوں کو کھلا کھلا کر اسلیے موٹا کرتا ہے کہ اُس میں بھیڑوں کا نفع ہے نہ کہ خود اُس کا۔ اور شاید آپ کے خیال میں حاکم اور محکوم میں چرواہے اور بھیڑ کا سا تعلق نہیں ہے۔ اور جناب کا تو یقین معلوم ہوتا ہے کہ حکام دن رات صرف اپنی منفعت کے پھیر میں نہیں پڑے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ آپ تو عدل اور ظلم، ایمانداری اور بے ایمانی کے متعلق اس درجہ غلط خیالات رکھتے ہیں کہ آپ کی رائے میں عدل میں حاکم کی غرض مخفی ہی نہیں اور نہ اس میں آپ کے نزدیک رعایا یعنی کمزور جماعت کا کوئی نقصان ہے۔ جناب عالی بے ایمان ہمیشہ بھولے بھالے ایماندار آدمیوں کو دبائے رہتا ہے۔ وہ چونکہ قوی اور طاقتور ہوتا ہے اس لیے اس کے زیر دست وہی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جس میں اسکا فائدہ

ہو اور بیچارے بجاے اپنے اس کی تفریح و آرام کا سامان مہیا کرنے میں آپ
صاف دیکھ سکتے ہیں کہ ایماندار ہمیشہ بے ایمان کے مقابلہ میں نقصان اٹھاتا ہی
مثلاً سب سے پہلے ذاتی معاہدوں میں دیکھ لیجیے جب کبھی ایک بے ایمان اور
ایک ایماندار میں شراکت ہوگئی ہی تو ختم معاہدہ پر بے ایمان کو ہمیشہ ایماندار سے
زیادہ فائدہ ہوا ہی۔ نیز دیگر معاملات مثلاً قوانین حکومت کی اطاعت میں
بھی وہی نفع میں رہتا ہی۔ مثلاً آمدنی پر جو محصول لگتا ہی اسی کو دیکھ لیجیے مساوی
آمدنی ہونے کی صورت میں ایک بے ایمان شخص کو ہمیشہ ایماندار سے کم محصول
ادا کرنا پڑتا ہی۔ اور جب کچھ ملنے والا ہوتا ہی تو بیچارہ ایماندار منھ تکتا رہ جاتا ہی
اور بے ایمان سب لے اُڑتا ہی۔ مختلف عہدوں پر مامور ہونے کی حالت میں
بھی آپ دونوں کا مقابلہ کر لیجیے۔ ایماندار آدمی اپنے فرائض منصبی کی بہ احسن
وجوہ ادائیگی کے خیال سے اپنے خانگی معاملات کی طرف سے توجہ ہٹا لیتا ہی
نقصان اُٹھاتا ہی اور عامۃ الناس سے کچھ وصول بھی نہیں کرتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ
اس کے تمام دوست احباب اور اعزا اس سے ناخوش رہتے ہیں کہ بے ایمانی
اور طرفداری کر کے انھیں فائدہ نہیں پہنچاتا برخلاف اس کے بے ایمان آدمی کو
اس قسم کی کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ ہاں یہ خیال رہے کہ میں اس بے ایمانی
کا ذکر کر رہا ہوں جو بڑے پیمانہ پر ہو اور جس میں جابر و بے ایمان کا نفع بالکل بدیہی
ہو۔ میں آپ کو اس عظیم الشان ظلم اور ناانصافی کی مثال دیتا ہوں جسے حکومت کہتے

کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس میں سب سے بڑا مجرم سب سے زیادہ خوش نصیب انسان ہوتا ہے اور مظلومین کی حالت ناگفتہ بہ جس میں جبر و تعدی جعل و فریب سے دوسروں کی جائداد ہی نہ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ یک لخت ضبط کر لی جاتی ہیں۔ اور تمام چیزیں اچھی ہوں یا بُری۔ مقدس ہوں یا نجس شخصی ملک ہوں یا جماعتی سب کی سب ایک آدمی کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان ان افعال میں سے کسی ایک کا مرتکب ہو تو اس کو سخت سے سخت سزا دی جائے اور اس کی بیحد تذلیل ہو۔ لوگ اسے قزاق اور چور، بدمعاش اور جعلساز کہیں لیکن جب یہی شخص اپنی رعایا کے مال کو غصب کرنے کے علاوہ خود ان کی ذات کو اپنا غلام بنا لیتا ہے تو بجائے بُرا کہنے کے ہر شخص جو اس کے حالات سُنتا ہے حتی کہ خود اسکی مظلوم رعایا تک اسے مبارک ترین انسان متصور کرتی ہے اور یہ صرف اس لیے کہ اس نے ظلم اور بے ایمانی کو آخری درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ لوگ جو بے ایمانی کی مذمت کرتے ہیں اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ خود اس سے محفوظ رہیں اس وجہ سے کہ وہ اس کے ارتکاب سے پرہیز کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے غالباً یہ بات کافی طور پر واضح کر دی ہے کہ اگر بے ایمانی کافی بڑے پیمانہ پر عمل میں لائی جائے تو وہ عدل سے زیادہ فائدہ مند، طاقتور اور شاندار چیز ہے۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا۔ عدل جماعت قوی کی اغراض کا نام ہے اور بے انصافی اپنے ذاتی فائدہ اور منافع کے مرادف۔

الفاظ کی اس طوفان خیز رو کے بعد تھریسی مکس نے چل دینے کا ارادہ کیا مگر حاضرین نے نہ جانے دیا اور اصرار کیا کہ ذرا ٹھہر کر اپنے دعوی کا ثبوت دیتے جائیں، میں بھی بہت مصر ہوا اور اُن سے عرض کیا کہ "آپ نے اس تقریر میں نہ معلوم کس کس جانب اشارہ کر دیا اور اب یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ بلا اپنے دعوے کا ثبوت دیئے یا اس کا ابطال سنے بغیر یہاں سے تشریف لیجائیں کیا آپ حیات انسانی کے دستور العمل کی ترتیب کو اس قدر غیر اہم کام خیال کرتے ہیں ؟

ت :- میں کب اس کی اہمیت سے انکار کرتا ہوں ۔

س :- یا پھر آپ کو ہم لوگوں کا کچھ خیال نہیں۔ آپ کو بقول خود ایک ایسی چیز کا علم ہے جس کا علم یا جس سے جہل ہماری زندگی کی تعمیر یا تخریب کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ غالباً اس کی چنداں پروا نہیں کرتے۔ خدارا اس علم میں اتنے بخل سے کام نہ لیجیے۔ یہاں اسوقت حاضرین کی ایک کافی تعداد ہے اور اگر اس جماعت کو آپ کی ذات سے کچھ فائدہ پہنچ جائے تو آپ کی محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔ بہر حال میں ذاتی رائے کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نہ اس بات پر عقیدہ رکھتا ہوں نہ میں اس وقت جناب کی تقریر کا قائل ہوا ہوں کہ باوجود انتہائی آزادی کے بھی بے ایمانی میں عدل سے زیادہ منافع ہیں۔ اگر کوئی شخص ہو کہ بازی یا اپنی طاقت کی وجہ سے پوری بے ایمانی

اور کامل جبر کرنے پر قدرت رکھتا ہی اُس حالت میں بھی میں ظلم کو عدل سے زیادہ فائدہ مند اور کثیر المنفعت ماننے پر تیار نہیں اور میرا گمان ہی کہ اکثر لوگ اس رائے میں میرے موید ہیں۔ بہت ممکن ہی ہمارا خیال غلط ہو۔ اور اگر آپکی رائے میں غلط ہی تو براہ کرم عدل پر ظلم و ناانصافی کی فضیلت ثابت کیجیے۔

ت:۔ اگر میری گذشتہ تقریر آپ کو قائل نہیں کرسکی تو اب میں اور کیا کہہ سکتا ہوں میں کچھ آپ کو ثبوت گھول کر پلا تو دوں گا نہیں۔

س:۔ خدا نخواستہ میرا یہ مطلب نہیں۔ میں صرف اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ آپ ذرا اپنی باتوں پر قائم رہیں اور اگر بدلیں تو بالاعلان بدلیں تاکہ دوسرے ناحق غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ نے طبیب کی تعریف کی تھی تو اُس کے ایک خاص معنی مقرر کیے تھے، لیکن چرواہے کے معاملہ میں آپ اس معنی پر قائم نہ رہے اب آپ کے نزدیک ایک حقیقی چرواہا بھیڑوں کے فائدہ کے لیے انکی پرورش نہیں کرتا بلکہ انھیں کسی چٹورے شخص کا لقمہ تر بننے کے لیے پالتا ہی یا بہ حیثیت ایک تاجر کے انھیں بازار میں فروخت کرنے کے لیے موٹا کرتا ہی۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ چرواہے کا کام بہ حیثیت چرواہے کے صرف اپنے گلے کی فلاح و بہبود ہی۔ اس کا فرض ان کی ضروریات کو بدرجہ اتم فراہم کر دینا ہی اور اگر وہ یہ تمام ضروریات فراہم کردے تو یہی اس کے فن کی تکمیل کی علامت ہی۔ بعینہ یہی بات میں انسانی حکام کے متعلق کہہ رہا تھا۔ میرے نزدیک حاکم کا فرض خصوصی حیثیت

حاکم کے یہ ہی کہ اپنی رعایا کی فلاح کے تمام ذرائع بہم پہنچاے لیکن اس کے برعکس جناب کی راے یہ معلوم ہوتی ہی کہ حاکم اس وجہ سے حاکم بننا اور حاکم رہنا پسند کرتے ہیں کہ اُن کو اعزاز اور اختیارات حاصل ہوں۔

ت:- راے جناب میر تو یہ عقیدہ ہی۔

میں:- اچھا یہ تو فرمائیے کہ بادشاہ سے نیچے حکومت کے جسقدر عہدے ہیں ان پر لوگ بخوشی و رغبت بلا کسی مشاہرے کے رہنا کیوں پسند نہیں کرتے ؟ شائد ان کے خیال میں حکومت کرنے سے انکا فائدہ نہیں بلکہ دوسروں کا فائدہ ہی۔ خیر۔ ذرا میرے اس سوال کا جواب دیجیے کہ کیا فنون ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتے باعتبار اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کا کام جداگانہ ہوتا ہی۔ مہربانی فرماکر اس بارہ میں اپنا حقیقی خیال ظاہر فرمائیے تاکہ ہماری تحقیق کچھ آگے بڑھے۔

ت:- ہاں ہاں بیشک یہ فرق ہی۔

میں:- اور ہر فن سے ایک مخصوص نفع ہوتا ہی۔ مثلاً فن طب سے جسم کی صحت اور تندرستی اور فن جہازرانی سے سمندر کے سفر میں امن و حفاظت وغیرہ

ت:- جی ہاں۔

میں:- اسی طرح ایک فن روپیہ یا تنخواہ حاصل کرنے کا ہی۔ لیکن اگر کسی ناخدا کی صحت جسمانی بحری سفر کی وجہ سے اچھی ہوجاے تو اس کی وجہ سے فن جہازرانی کو فن طب سے مخلوط تھوڑے ہی کردیں گے بعینہ اسی طرح اس تنخواہ

حاصل کرنے کے فن کو دیگر فنون سے نہ ملانا چاہیئے۔

ت :- ہرگز نہیں۔

میں :- مثلاً اگر ایک آدمی کو کچھ تنخواہ ملتی ہے اور اس کی صحت بھی اچھی ہے تو اس لیے آپ تنخواہ حاصل کرنے کے فن کو کہیں فن طب سے تو نہ ملا دینگے؟

ت :- نہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے!

میں :- یا اگر ایک شخص علاج کرتا ہے اور بطور معاوضہ اُجرت لیتا ہے تو اس سے فن طب اور اُجرت حاصل کرنے کا فن ایک تو نہ ہو جائے گا۔

ت :- ہرگز نہیں۔

میں :- اچھا۔ ہم یہ تو تسلیم کر ہی چکے ہیں کہ کسی فن کا منافع اسی تک محدود رہتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔

میں :- اس لیے اگر کوئی نفع تمام فنون کے ماہرین میں مشترک ہو تو اس کی وجہ تو کوئی ایسا فن یا کوئی ایسی چیز ہو گی جسے وہ سب کے سب استعمال کرتے ہیں۔

ت :- اور کیا۔

میں :- یعنی اگر کسی ماہر فن کو کچھ اُجرت یا معاوضہ ملتا ہے تو یہ اُس فن مخصوص کے استعمال کی وجہ سے نہیں ہوتا جس کا وہ مدعی ہے بلکہ اس کے علاوہ

اُجرت حاصل کرنے کے فن کا بھی استعمال کرتا ہو۔

تھریسی میکس نے کچھ رُک رُک کر اس کو تسلیم کر لیا۔

میں :- گویا اُجرت ماہرین کو اپنے فن مخصوص کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ جس طرح فن طب کا نتیجہ صحت جسمانی اور فن تعمیر کا نتیجہ تیاری مکان ہو اسی طرح اُجرت حاصل کرنے کے فن کا نتیجہ حصول اُجرت ہی۔ وقس علیٰ ہذا۔ لیکن اگر کوئی ماہر اپنے فن کا استعمال کر رہا ہو لیکن اسے کچھ معاوضہ نہ ملے تو اس ماہر کا اس میں کیا کچھ فائدہ ہی؟

ت :- ظاہر ہی کہ نہیں۔

میں :- لیکن کیا اُجرت یا معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں وہ اپنے فن کے استعمال سے دوسروں کو بھی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

ت :- کیوں نہیں۔ ضرور پہنچاتا ہی۔

میں :- تو پھر تھریسی میکس اسبات میں شبہ کی مطلق گنجائش نہیں کہ حکومت یا فنون کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اغراض کو پورا کریں بلکہ ہم جیسا پہلے کہہ چکے ہیں ان کا کام اپنے ماتحت کی ضروریات فراہم کرنا ہی انکا منشا کمزور کی حفاظت ہی نہ کہ قوی کی طرفداری۔ اور یہی وجہ ہی کہ کوئی شخص حکومت کے کام کو از خود ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ کسے غرض پڑی ہی کہ بلا معاوضہ ان خرابیوں کی اصلاح کے لیے اُٹھ کھڑا ہو جن سے اُسے کوئی سروکار نہیں۔ کیونکہ فرائض

حکومت کی انجام دہی میں اسے اپنے ذاتی اغراض کا نہیں بلکہ رعایا کا فائدہ مدنظر رکھنا ہوگا۔ چنانچہ حکومت کرنے کی ترغیب دینے کے لیے اُجرت یا معاوضہ کے تین طریقے رکھے گئے ہیں۔ اول مال و زر، دوسرے عزت اور تیسرے انکار کی صورت میں سزا۔

گلاکن :- آپکا کیا مطلب ہی؟ میں اول دو طریقوں کو تو سمجھ گیا لیکن یہ تیسرا طریقہ کیا ہی؟ سزا کس طرح معاوضہ کا کام دے سکتی ہی؟

میں :- آپ تو اسی چیز کو نہ سمجھے جو قابل ترین اشخاص کو حکومت کرنے پر آمادہ کرتی ہی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ان لوگوں کے لیے حرص اور لالچ باعث ننگ ہی؟

گلاکن :- بیشک۔

میں :- اسی وجہ سے مال و زر یا عزت کے خاطر تو یہ لوگ اس طرف متوجہ ہوتے نہیں۔ نہ مزدوروں کی طرح یہ روپیہ کے لیے ہات پھیلاتے ہیں۔ اور نہ خزانۂ عامہ سے خفیہ طور پر متمتع ہو کر خائن بننا پسند کرتے ہیں۔ اور نہ انھیں عزت کی کچھ زیادہ پرواہ ہی۔ اس لیے ان کو حکومت کے کام پر لگانے کے لیے بس ایک ہی ذریعہ ہی کہ اس سے گریز کرنے کی صورت میں انھیں سزا کا خوف ہو۔ اور اس سے زیادہ سخت اور کیا سزا ہو سکتی ہی کہ اگر تم خود حکومت نہیں کرتے تو اپنے سے بُرے اور نالائق آدمیوں کے محکوم بنو۔ یہی خوف ان قابل لوگوں کو حکومت کے

عہدے قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی انھیں ضرورت مجبور کرتی ہے کہ فائدہ اور منافع کی خواہش۔ اس بات کو باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ اگر کسی ملک یا شہر میں سب کے سب لوگ نیک اور ایماندار ہوں تو وہاں سرکاری عہدوں سے الگ رہنے کے لیے اتنا ہی مقابلہ ہو جتنا کہ اس وقت ان کے حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم صاف طور پر دیکھ لیں کہ حاکم اپنے نفع کے لیے نہیں بلکہ اپنی رعایا کی بہبودی کے لیے حکومت کرتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر میں تھریسی میکس کی تعریف کو غلط خیال کرتا ہوں۔ لیکن خیر۔ اب اس بحث کو تو جانے دیجیے۔ ان حضرت نے ابھی ابھی جو بے ایمانی اور ظلم کی زندگی کو ایمانداری اور عدل کی زندگی سے زیادہ فائدہ مند بتلایا تھا اس پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ فرمائیے اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ آپ کس زندگی کو بہتر سمجھتے ہیں؟

گلاکن:- میرے نزدیک تو عدل و انصاف کی زندگی ہی قابل تحسین ہے۔

میں:- کیوں۔ کیا آپ نے وہ فوائد نہیں سُنے جو تھریسی میکس نے ناانصافی اور بے ایمانی سے منسوب کیے ہیں؟

گلاکن:- ہاں میں نے سُنے ضرور لیکن میں اُن سے قائل نہیں ہوا۔

میں:- تو پھر ہمارا فرض ہے کہ ہم تھریسی میکس کو غلطی کا یقین دلا کر انھیں قائل کردیں۔

گلاکن:- بیشک

میں :- لیکن اس کی کیا صورت ہو؟ اگر وہ ایک بسیط تقریر کریں اور میں بھی اس کا ایک لمبا چوڑا جواب دوں تو یہ لازمی ہو گا کہ فریقین اپنے اپنے جو فوائد اور منافع پیش کریں اُن کا شمار کیا جائے اور اس کے لیے ایک حکم کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن اگر ہم بدستور سابق باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو قائل کرتے چلیں تو وکیل اور حکم دونوں کا کام ہم خود انجام دے سکتے ہیں۔

گلاکن :- بیشک۔

میں :- آپ کس طریقہ کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟

گلاکن :- جو آپ مناسب خیال فرمائیں۔

میں :- (تھریسی میکس سے) اچھا تو میں سوال کرتا ہوں آپ جواب دیجیے۔ کیا آپ کے خیال میں کامل ظلم اور ناانصافی پورے عدل اور انصاف سے زیادہ سود بخش ہے؟

ت :- جی ہاں۔ میرا تو یہی خیال ہے اور میں آپ سے اس کے وجوہ بھی عرض کر چکا ہوں۔

میں :- اور ان دونوں میں سے ایک خیر ہے اور دوسرا شر۔

ت :- بیشک

میں :- یعنی عدل و انصاف خیر ہے اور ظلم و ناانصافی شر؟

ت :- سبحان اللہ! آپ نے کس قدر صحیح اندازہ فرمایا ہے!!

میں:- کیوں کیا میرا قیاس غلط ہے؟ کیا آپ عدل کو شر سمجھتے ہیں؟

ت:- نہیں۔ میں اسے انتہائی بھولاپن اور حماقت خیال کرتا ہوں۔

میں:- تو ظلم اور ناانصافی کو شاید آپ کمینہ چالاکی کہیں گے۔

ت:- نہیں بلکہ عاقبت اندیشی۔

میں:- گویا آپ کی رائے میں غیر منصف اور ظالم لوگ نیک اور عقلمند ہوتے ہیں۔

ت:- جی ہاں کم سے کم وہ تو ضرور ہی ہوتے ہیں جن میں کامل بے ایمانی اور ظلم کی قابلیت ہے۔ یعنی جو ریاستوں اور قوموں کو مطیع کرسکتے ہیں۔ آپ شاید یہ سمجھے کہ میں اُچکوں یا گرہ کٹوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ بیشک اگر پکڑے جانیکا اندیشہ نہ ہو تو اس کام میں بھی بہت فائدے ہیں۔ مگر پھر بھی اس کا اس ناانصافی اور ظلم سے کیا موازنہ جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔

میں:- میں نے آپکا مطلب تو سمجھ لیا۔ لیکن مجھے سخت استعجاب اور حیرت ہے کہ آپ ظلم کو عقلمندی اور نیکی سمجھتے ہیں اور عدل کو اس کے برعکس۔

ت:- ہاں۔ کیا کیا جائے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔

میں:- اب تو آپ کے دلائل کی بنیاد بہت زیادہ قوی ہوگئی اور ان کا جواب دینا تقریباً محال۔ کیونکہ ظلم و ناانصافی کو زیادہ سود مند سمجھنے کے ساتھ ساتھ اگر آپ اسے بدی اور شر بھی خیال کرتے تو اصول موضوعہ کی رو سے آپکو آ جاتی

جواب دیا جاسکتا تھا۔ لیکن اب تو آپ ظالم کو قوی و طاقتور اور ساتھ ہی قابل عزت بھی سمجھتے ہیں۔ اور جن صفات سے ہم آج تک ایک عادل اور منصف شخص کو متصف کرتے تھے آپ اُن سب کو غالباً ظالم کے ساتھ منسوب کریں گے۔ اور یہ بھلا کیا ہی جب آپ ظلم و نا انصافی کو عقلمندی اور نیکی کہنے ہی سے نہ جھجکے!

ت:۔ آپ کا خیال صحیح ہی میرے یہی خیالات ہیں۔

میں:۔ مجھے اس وقت تک اطمینان نہ ہوگا جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ آپ اپنے اصلی خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ امید تو ہی کہ آپ اپنی صحیح رائے کا اظہار کرتے ہونگے۔ مگر پھر بھی کہیں ہمارا مذاق اُڑانا تو منظور نہیں!

ت:۔ میں صحیح اظہار خیال کر رہا ہوں یا غلط آپ کو اس سے کیا سروکار آپ تو میری دلیل کو رد کیجئے۔

میں:۔ خیر یہی سہی۔ مگر ذرا ایک سوال کا جواب دیجیے۔ کیا ایک عادل شخص کسی دوسرے عادل شخص کے مقابلہ میں خود فائدہ اٹھا لینا چاہتا ہی؟

ت:۔ خوب! اگر وہ ایسا کرے تو بیچارہ کی حماقت و ابلہی کہاں باقی رہی!

میں:۔ اور کیا وہ کسی منصفانہ طریق عمل سے علحدہ ہو کر اس کی خلاف ورزی کر سکتا ہی؟

ت:۔ نہیں۔

میں:۔ لیکن اگر غیر منصف و ظالم شخص کے خلاف فائدہ حاصل کرنے کی

کوشش ہو تو اس کے متعلق ایک عادل شخص کا کیا خیال ہوگا۔ وہ اس فعل کو منصفانہ سمجھے گا یا نہیں۔

ت :۔ اس کے نزدیک یہ بات مبنی بر انصاف تو ضرور ہوگی اور ممکن ہے وہ خود اس قسم کا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے لیکن بیچارہ اس میں کامیاب نہ ہوگا۔

میں :۔ کامیابی یا ناکامی کا تو سوال ہی نہیں۔ میں تو صرف دریافت کرتا ہوں کہ جیسے ایک عادل شخص دوسرے عادل شخص کے مقابلہ میں مسابقت سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا کیا اسی طرح ایک ظالم و بے انصاف شخص کے مقابلہ میں بھی فائدہ نہ اٹھانا چاہیگا؟

ت :۔ کیوں نہیں؟ ضرور چاہیگا۔

میں :۔ برخلاف اس کے ظالم شخص کا کیا طرزِ عمل ہوگا؟ وہ تو غالباً عادل آدمی کے مقابلہ میں فائدہ بھی اٹھانا چاہیگا اور منصفانہ اعمال کی خلاف ورزی پر بھی آمادہ ہوگا؟

ت :۔ بیشک غیر منصف تو ہر ایک سے سبقت لیجانے اور زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہی۔

میں :۔ حاصل کلام یہ ہوا کہ عادل شخص اپنے مماثل دوسرے عادل شخص سے زیادہ حاصل نہیں کرنا چاہتا لیکن اپنے غیر مثل یعنی غیر منصف شخص سے زیادہ

حاصل کرنے کی ضرور کوشش کرتا ہے۔ لیکن ظالم اور غیر منصف اپنے مثل اور غیر مثل دونوں سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔

ت:- جی ہاں

میں:- اور بقول آپ کے ظالم اور غیر منصف ہی عقلمند اور نیک ہوتا ہے اور عادل اس کے برعکس۔

ت:- بیشک

میں:- یعنی ظالم اور غیر منصف مماثل ہے دانشمند اور نیک کا اور عادل اس کا غیر مثل ہے؟

ت:- بیشک

میں:- اچھا تو آئیے اب فنون سے ایک مثال لیں۔ مثلاً ایک شخص فن موسیقی کا ماہر ہے اور ایک اس سے بالکل نابلد۔

ت:- اچھا۔

میں:- ان میں سے کون دانشمند ہے اور کون نہیں؟

ت:- ماہر موسیقی دانشمند ہے اور دوسرا نہیں۔

میں:- اور ماہر باعتبار علم و دانشمندی کے نیک ہے اور دوسرا باعتبار جہل کے بد

ت:- بیشک۔

میں:- اور غالباً یہی رائے آپ ایک طبیب کے متعلق رکھتے ہونگے؟

ت :- جی ہاں

میں :- اچھا تو اب یہ بتلائیے کہ جب ایک ماہر موسیقی اپنے ستار کے تار کستا ہی اور زیر و بم درست کرتا ہی تو کیا ایسی صورت میں وہ کسی دوسرے ماہر موسیقی کے بالکل خلاف چلنے کی کوشش یا دعوی کرتا ہی؟

ت :- نہیں وہ ایسا نہیں کرسکتا۔

میں :- مگر وہ ایسے شخص کے خلاف تو چل سکتا ہی جو خود موسیقی کا ماہر نہیں ہے؟

ت :- بیشک۔

میں :- اسی طرح ایک ماہر طبیب دوا یا غذا کی تجویز میں دوسرے ماہر طبیب کے مخالف نہیں ہوسکتا۔ اور نہ فن طب کی مخالفت کرسکتا ہی۔

ت :- جی ہاں۔ ہرگز مخالف نہیں ہوسکتا۔

میں :- لیکن وہ ایسے شخص کی مخالفت تو کرسکتا ہی جو خود طبیب نہیں؟

ت :- جی ہاں۔

میں :- اسی طرح عمومی حیثیت سے علم اور جہل کے متعلق غور کیجیے۔ ایک حقیقی عالم غالباً کبھی دوسرے عالم سے قول و فعل میں اختلاف نہ کریگا۔ وہ ہمیشہ اپنے مثل سے متفق ہوگا۔

ت :- اس سے کون انکار کرسکتا ہی؟

میں :- ہاں۔ اور جاہل کیا کریگا؟ وہ تو عالم اور جاہل دونوں کی برابر مخالفت

کرے گا۔

ت :- بیشک

میں :- اور عالم دانشمند ہوتا ہے۔

ت :- ہاں

میں :- اور دانشمند نیک ہوتا ہے۔

ت :- جی ہاں -

میں :- گویا دانشمند اور نیک آدمی کبھی اپنے مثل سے آگے بڑھنے یا مخالفت کرنے کی آرزو نہیں کرتا۔ ہاں اپنے مخالف و غیر مثل سے بڑھنے کی کوشش ضرور کریگا

ت :- جی ہاں میرا یہی خیال ہے۔

میں :- لیکن بد اور جاہل شخص تو بلا امتیاز مثل اور غیر مثل دونوں سے آگے بڑھنے اور زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔

میں :- آپ کو شاید اپنا اقرار یاد ہو کہ ظالم اور غیر منصف شخص اپنے مثل اور غیر مثل دونوں سے مخالفت کر سکتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔ میں نے یہ اقرار کیا ہے۔

میں :- آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عادل شخص اپنے مثل کا مخالف نہیں ہو سکتا البتہ غیر مثل کی مخالفت کر سکتا ہے۔

ت :- جی ہاں۔

میں :- یعنی عادل تو دانشمند اور نیک کا مثل ہوا اور ظالم جاہل اور بد کا۔

ت :- بیشک نتیجہ تو یہی نکلتا ہی

میں :- اس طرح عادل نیک و عاقل ثابت ہوا اور ظالم بد اور جاہل

یہ تمام باتیں اسقدر آسانی سے تسلیم نہیں کی گئی تھیں جیسے میں لکھ رہا ہوں۔ تھریسی میکس بڑی حجت و تکرار کے بعد کوئی بات مانتے تھے۔ گرمی کے دن تھے اور انکا تمام بدن پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ کیا عجب کہ یہ عرق ندامت ہو کیونکہ اس سے پہلے میں نے انھیں نادم ہوتے نہ دیکھا تھا۔ اس مسئلے کے طے ہو جانے کے بعد کہ عدل خیر ہے اور ظلم شر میں آگے بڑھا۔

میں :- اچھا یہ مسئلہ تو طے ہوا۔ لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ظلم اور قوت کو باہم وابستہ تبلایا تھا۔

ت :- جی ہاں۔ یاد ہی۔ آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیجیئے گا کہ میں آپ کی تمام باتیں مان گیا اور میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں۔ اصل بات یہ ہی کہ اگر میں جواب دیتا ہوں تو آپ فرماتے ہیں کہ تم تو تقریریں کرنے لگے۔ اس لیے یا تو مجھے ادائے مطلب کی اجازت دیجیے۔ ورنہ بس آپ سوال کرتے رہیئے اور میں ہاں میں ہاں ملاتا جاتا ہوں۔ بوڑھیاں جب کہانی کہتی ہیں تو بچے ہونکاری بھرتے جاتے ہیں اسی طرح میں بھی ہاں اور نہیں کہتا رہونگا۔

میں :- لیکن ذرا اپنی راے اور خیال کا پاس ہے - !

ت :- جی نہیں - آپ چلیے بھی - میں آپ کی خوشنودی کے لیے جواب دیتا رہونگا - آپ اور کیا چاہتے ہیں ؟

میں :- میں کیا چاہونگا ! آپ کی اگر یہی راے ہے تو میں سوال کرتا ہوں آپ جواب دیتے جائیے -

ت :- بہت اچھا شروع کیجیے -

میں :- عدل اور ظلم کی اعتباری ماہیت معلوم کرنے کے لیے میں پھر وہی سوال کرتا ہوں جو پہلے کیا تھا - آپ نے یہ فرمایا تھا کہ ظلم میں عدل کی نسبت زیادہ قوت ہوتی ہے - مگر چونکہ اب عدل دانشمندی اور خیر کے مرادف ثابت ہوچکا اس لیے یہ بھی طے شدہ ہے کہ عدل میں ظلم سے زیادہ قوت ہے کیونکہ ظلم عبارت ہے جہل و لاعلمی سے - لیکن نہیں میں اس مسئلہ پر دوسری حیثیت سے بحث کرنا چاہتا ہوں - فرض کیجیے ایک ظالم ریاست ہے - کیا ممکن نہیں کہ یہ دوسری ریاستوں کو مطیع کر رہی ہو اور بعض کو مطیع کر چکی ہو -

ت :- ہاں کیوں نہیں - اور جو ریاست ظلم میں کامل تر ہوگی وہی اس کو بہت اچھی طرح کرے گی -

میں :- میں آپ کے اس خیال کو تو بخوبی سمجھ گیا ہوں - لیکن یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس فاتح ریاست میں جو قوت ہے اس کے لیے عدل کی ضرورت ہے

یا یہ بلا عدل کے ممکن ہے۔

ت :- اگر آپ کے خیال کے بموجب عدل دانشمندی ہے تو پھر اس قوت کے لیے عدل ضروری ہے۔ اور اگر میرا خیال صحیح ہے تو عدل کے بغیر ہی یہ قوت ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

میں :- بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ محض 'ہاں' اور 'نہیں' پر اکتفا نہیں کر رہے ہیں بلکہ نہایت معقول جواب ارشاد فرماتے ہیں۔

ت :- مجھے تو صرف جناب کی خاطر منظور ہے۔

میں :- یہ آپ کی نوازش ہے۔ براہ کرم یہ تو فرمائیے کہ اگر کسی ریاست یا فوج یا قزاقوں کے ایک گروہ کے مختلف ارکان باہم غیر منصفانہ برتاؤ کرنے اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے لگیں تو پھر ان کی جماعت میں کسی قوت عمل کا وجود رہ سکتا ہے؟

ت :- ہرگز باقی نہیں رہ سکتا۔

میں :- ہاں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو ضرر نہ پہنچائیں اور آپس میں منصفانہ رویہ رکھیں تو باہم مجتمع ہو کر اپنا کام اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں۔

ت :- بیشک۔

میں :- اس کی وجہ یہ ہے کہ ناانصافی اور بے ایمانی آپس میں پھوٹ اور تفرقہ نفرت اور جنگ وجدال پیدا کر دیتی ہے۔ اور عدل سے باہمی یگانگت اور الفت پیدا

ہوتی ہی۔

ت:- اب میں آپ سے کیا جھگڑوں مانے لیتا ہوں۔

میں:- یہ جناب کی عنایت ہی۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ جب ناانصافی ہر جماعت میں باہمی نفرت پیدا کر دیتی ہی خواہ اس کے ارکان عبد ہوں یا حُر تو کیا یہ نفرت ان میں نفاق پیدا کر کے انھیں ہر عمل مشترک کے ناقابل نہ بنا دیگی؟

ت:- جی ہاں۔

میں:- اور اگر یہ ناانصافی بجائے ایک گروہ کے صرف دو شخصوں میں پائی جائے تو کیا وہ باہم لڑتے نہ رہیں گے۔ اور ایک دوسرے کے نیز عادل شخص کے دشمن نہ ہوں گے؟

ت:- بیشک۔

میں:- اور اگر یہی ناانصافی کسی ایک فرد میں پائی جائے تو اس کی عقل کی فطری قوت میں کمی ہوگی یا زیادتی!

ت:- میرے خیال میں تو اس کی یہ قوت برقرار رہیگی۔

میں:- لیکن کیا ناانصافی کی طاقت ایسی مؤثر نہیں ہی کہ خواہ وہ کسی شہر میں پائی جائے یا کسی فوج میں۔ کسی خاندان میں ہو یا کسی دوسری جماعت میں تو پراگندگی اور پریشانی پیدا کر کے متحدہ عمل کی گنجائش باقی نہ رکھے گی اور اسطرح جہاں انصاف اور دوسری نیک چیز کی مخالف ہوگی وہاں خود اپنی بھی دشمن

ثابت ہوگی۔

ت:- بیشک۔

میں:- اور اگر یہ کیسی فرد واحد میں پائی جائے تو کیا اس کا وجود اسی درجہ مہلک نہ ثابت ہوگا۔ اول تو یہ خود اس غریب کی ذات کی وحدت و یگانگت کو مٹا کر اسے عمل کے قابل نہ رکھے گی۔ اور دوسرے یہ کہ اسے ہر عادل شخص کا اور خود اپنا دشمن بنا دیگی۔ کیوں کیا یہ سچ نہیں ہے؟

ت:- بالکل صحیح ہے۔

میں:- میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے نزدیک دیوتا تو یقیناً عادل ہوں گے۔

ت:- فرض کیجیے کہ ہیں

میں:- اگر ایسا ہی تو عادل دیوتاؤں کے مددگار و معاون ہوں گے اور ظالم و غیر منصف ان کے دشمن؟

ت:- میں آپ کی بالکل مخالفت نہ کرونگا۔ آپ اور حاضرین مجلس خوب جی بھر کر حظ اُٹھالیں۔

میں:- بہت اچھا تو ذرا جواب دیئے جایئے تاکہ ہم لوگ پورے طور پر محظوظ ہوسکیں۔ یہ تو ظاہر ہوچکا کہ عادل شخص ظالم کے مقابلہ میں بہتر، عاقل تر اور قوی تر ہوتا ہے۔ ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ ظالم اور غیر منصف لوگوں میں مشترک عمل کی قوت مفقود ہوجاتی ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو یہ بھی ممکن نہیں کہ کچھ بدلوگ مل کر

متحدہ کوئی برائی کریں۔کیوں کہ اگر وہ اپنی بدی میں کامل ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے پر ہاتھ صاف کرنے لگتے۔یہ تو شاید ان میں کوئی عدل کا شائبہ باقی تھا جس نے انھیں متحد کر دیا اور حقیقتاً وہ اپنی کارروائی میں نیم بد تھے۔بے ایمانی میں کامل ہونے کے ساتھ ہی وہ عمل کے قابل نہ رہتے۔میرے خیال میں یہی حقیقت امر کہ ہاں یہ ابستہ دوسرا سوال ہے کہ غیر منصف وظالم کی بہ نسبت ایک عادل شخص کی زندگی بہتر اور خوشتر ہوتی ہے یا نہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ وجوہ مذکورۂ بالا سے یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ عادل شخص ہی کی زندگی خوشتر ہوتی ہے۔لیکن پھر بھی اس کی مزید تحقیق ضروری ہے کہ مسئلہ زیر غور کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔یہ تو انسانی زندگی کا دستورالعمل مرتب کرنا ہے۔

ت:۔ اچھا تو آگے چلئے۔

میں:۔ میں آپ سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھتا ہوں۔آپ کی رائے میں گھوڑے کا کوئی خاص مقصد یا استعمال ہے؟

ت:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اور یہ استعمال ایسا ہوگا کہ اسے یا تو دوسری چیزیں بالکل انجام نہ دے سکیں اور یا کم سے کم اس درجہ خوبی اور آسانی سے نہ کر سکیں۔

ت:۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں:۔ میں بتلاتا ہوں۔کیا آپ آنکھوں کے بغیر دیکھ سکتے ہیں؟

ت:- نہیں

میں:- یا کانوں بغیر سُن سکتے ہیں؟

ت:- ہرگز نہیں۔

میں:- تو پھر یہی ان اعضاء کا مقصد یا استعمال ہے۔

ت:- جی ہاں

میں:- لیکن اگر آپ کو ایک پودے کی ڈالیاں تراشنی ہوں تو آپ یہ کام ایک تلوار یا خنجر یا اور بہت سے آلات سے کر سکتے ہیں۔

ت:- ہاں۔

میں:- مگر کوئی آلہ اس خوبی سے شاخ کو نہیں تراش سکتا جیسے وہ قینچی جو خاص اس کام کے لیے بنائی جاتی ہے۔

ت:- بیشک۔

میں:- تو یہی اس قینچی کا مقصد ہوا۔

ت:- جی ہاں۔

میں:- اب غالباً آپ کو اس کے سمجھنے میں چنداں دقت نہ ہوگی کہ کسی چیز کا مقصد وہ کام ہے جو دوسری چیز یا تو بالکل انجام نہ دے سکے یا اسقدر خوبی سے نہ انجام دے۔

ت:- میں سمجھ گیا آپ صحیح فرماتے ہیں۔

میں:- ہر چیز جس کا کوئی مقصد ہوتا ہے اُس میں کوئی مخصوص خوبی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً آنکھ کا ایک مقصد ہے۔

ت:- جی ہاں ہے۔

میں:- اور اس میں ایک خوبی بھی ہے۔

ت:- ہاں۔

میں:- اسی طرح کان کا ایک مقصد ہے اور اس میں ایک مخصوص خوبی بھی ہے۔

ت:- بیشک۔

میں:- اور اسی طرح تمام چیزوں کا ایک مقصد ہوتا ہے اور ہر ایک میں ایک خوبی ہوتی ہے۔

ت:- بیشک۔

میں:- لیکن کیا آنکھیں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہیں اگر ان میں اپنی مخصوص خوبی کے بجائے کوئی نقص ہو؟

ت:- ہرگز نہیں۔ اگر ان میں بصارت ہی نہ ہو تو کس طرح اپنا مقصد پورا کریں۔

میں:- آپ کا مطلب ہے کہ اگر ان کی مخصوص خوبی یعنی بصارت جاتی رہے تو وہ اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتیں۔ اب میں اس سوال کو ذرا زیادہ وسیع معنی میں دریافت کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ جو چیزیں اپنے مقصد کی تکمیل کرتی ہیں وہ اسی مخصوص خوبی کی وجہ سے کرتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر مقصد میں ناکام رہتی ہیں تو اُسی خوبی کی

عدم موجودگی کی وجہ سے۔

ت:- بیشک۔

میں:- یہی اصول کانوں پر صادق آتا ہے۔ اگر ان کی مخصوص خوبی جاتی رہے تو ان کا مقصد فوت ہو جائے۔

ت:- بلاشبہہ۔

میں:- اور اسی اصول کا دیگر اشیاء پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔

ت:- جی ہاں۔

میں:- ہاں تو کیا روح کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا؟ مثلاً اجرائے احکام غور و فکر، اور نگرانی اعمال۔ کیا یہ روح کے مخصوص فرائض نہیں اور کیا انھیں کسی دوسری چیز سے وابستہ کیا جا سکتا ہے؟

ت:- نہیں یہ کسی اور سے متعلق نہیں کیے جا سکتے۔

میں:- اور کیا خود زندگی اور حیات روح کا کام نہیں۔

ت:- بلاشبہ ہے۔

میں:- مگر کیا روح میں کوئی مخصوص خوبی نہیں ہوتی!

ت:- ضرور ہوتی ہے۔

میں:- کیا اس خوبی سے محروم رہ کر وہ اپنے مقاصد کو پورا کر سکتی ہے!

ت:- ہرگز نہیں۔

میں:- تو فطرتاً ایک بری روح بری حکمراں ہوگی اور ایک صالح روح اچھی حکمراں۔

ت:- یقیناً۔

میں:- اور ہم یہ اقرار کر ہی چکے ہیں کہ عدل روح کی خوبی ہے اور ظلم اس کا نقص۔

ت:- ہاں ہم یہ مان چکے ہیں۔

میں:- تو ایک صالح روح اچھی زندگی بسر کرے گی اور ایک بری روح بری زندگی۔

ت:- آپ کی دلائل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔

میں:- اور جس کی زندگی اچھی ہو وہ تو خوش و خرم ہے اور جس کی زندگی بری ہو وہ اس کا برعکس ہے۔

ت:- ہاں۔

میں:- تو عادل اس طرح خوش قسمت اور مسرور ٹھہرا اور ظالم بدنصیب و مغموم

ت:- جی ہاں۔

میں:- اور مسرت ہی فائدہ مند اور سود بخش ہوتی ہے نہ کہ غم۔

ت:- بلاشبہ۔

میں:- تو پھر اے برادر عزیز ظلم اور بے انصافی کبھی عدل سے زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتی۔

ت:- بہت اچھا آپ سمجھ لیجیے کہ اس جشن کے موقع پر یہ سب باتیں تسلیم

کرکے میں نے آپ کی ضیافت کی ہے۔

میں۔ میں آپ کا بیحد مشکور رہوں۔ آپ نے خدا کا شکر ہے کہ اب ذرا نرم طریقہ اختیار کیا اور مجھے بُرا بھلا کہنا چھوڑ دیا۔ مگر سچ پوچھئے تو میری ضیافت پوری نہ ہوئی۔ اور یہ خود میری غلطی تھی۔ جس طرح ایک چٹورا آدمی اپنے سامنے کی ہر کابی سے تھوڑا تھوڑا کھاتا ہے اور کسی ایک چیز سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہوتا۔ بعینہ وہی حالت میری تھی کہ میں اپنے اصلی مقصد تحقیق یعنی عدل کی ماہیت دریافت کرنے کے بجائے ایک مضمون سے دوسرے مضمون پر پہنچ جاتا تھا۔ میں نے اصل شاہراہ تحقیق کو ترک کرکے اس پر غور کرنا شروع کردیا کہ عدل و انصاف خیر ہے یا شر۔ دانشمندی ہے یا بیوقوفی۔ اور اس کے بعد جب عدل و ظلم کے فوائد کا مقابلہ آن پڑا تو میں چپ نہ رہ سکا چنانچہ اس تمام مباحثہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ جب مجھے یہی نہیں معلوم کہ عدل ہے کیا چیز تو میں اس کے خیر و شر ہونے کا یا عادل کے مسرور یا مغموم ہونے کا صحیح اندازہ کس طرح کرسکتا ہوں؟

دوسری کتاب

میرا گمان تھا کہ اسقدر گفتگو کے بعد میں نے بحث کو ختم کر دیا ہے لیکن یہ انتہا درصل ابتدا ہی ثابت ہوئی۔ گلاکن تھریسی میکس کی پسپائی سے کچھ مطمئن نہ تھے اور اُن کی دلی خواہش تھی کہ معرکہ فیصلہ کن ہو، یا ادھر یا اُدھر۔ چنانچہ مجھ سے فرمانے لگے "جناب سقراط! آخر اس تمام گفتگو سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ کیا آپ ہمیں صرف ظاہرا قائل کرنا چاہتے تھے یا درصل ہم پر اس حقیقت کا انکشاف منظور تھا کہ عادل و منصف شخص ہمیشہ غیر منصف جابر سے بہتر ہوتا ہے"!

میں:۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ اگر ہو سکے تو آپ لوگوں کو اصل حقیقت اچھی طرح منوا دوں۔

گلاکن:۔ اگر آپ کا مقصد یہ تھا تو آپ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ امور خیر کو کس طرح اصناف و اقسام میں منقسم کریں گے۔ میرے خیال میں بعض خوبیاں تو ایسی ہیں جنھیں ہم اُن کی ذاتی اچھائی کی وجہ سے پسند کرتے ہیں بلا لحاظ اُن نتائج اور منافع کے جو ان سے بعد میں حاصل ہوں۔ مثال کے طور پر بے ضرر مسرت و تفریح کو لے لیجئے کہ اس سے ایک وقتی انبساط حاصل ہوتا ہے اور بس اس کا اور کوئی نتیجہ نہیں ہوتا۔

میں:- جی ہاں - میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ خوبیوں کی ایک قسم یہی ہے۔

گ:- ایک اور دوسری قسم بھی ہے مثلاً علم - بصارت تندرستی وغیرہ جو نہ صرف فی نفسہ قابل پسندیدگی ہیں بلکہ اپنے نتائج کی وجہ سے بھی پسند کیجاتی ہیں۔

میں:- بیشک - آپ کا یہ خیال بھی صحیح ہے۔

گ:- اور غالباً آپ ایک تیسری قسم کے وجود کا بھی اقرار کریں گے مثلاً طب و تشریح - ورزش جسمانی یا بیماروں کی خبرگیری وغیرہ نیز دولت کمانے کے مختلف طریقے کہ یہ بذات خود ہر شخص کو غیر مرغوب ہیں اور کوئی بھی بلا خیال ان منافع و مفاد کے جو اُن سے حاصل ہوتے ہیں ان میں مشغول نہیں ہونا چاہتا۔

میں:- جی ہاں - یہ تیسری قسم بھی موجود ہے - لیکن آپ یہ سوال آخر پوچھ کیوں رہے ہیں؟

گ:- میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ عدل ان میں سے کس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

میں:- میرے نزدیک عدل اقسام متذکرہ میں سے افضل ترین قسم میں شامل ہے یعنی وہ ایک ایسا امر خیر ہے جسے مسرت و اطمینان قلب کا ہر طالب اُس کی ذاتی خوبی اور نیز اُس کے عمدہ نتائج کی وجہ سے پسند کرتا ہے۔

گ:- لیکن عامۃ الناس اس رائے میں آپ کے مخالف ہیں۔ اُن کے نزدیک تو عدل خوبیوں کی اُس تکلیف دہ قسم میں شامل ہے جسے لوگ بہ لحاظ منافع و مفاد یا بخیال شہرت و اعزاز اختیار کرتے ہیں لیکن جو فی نفسہٖ ناقابل پسندیدگی بلکہ قابل احتراز ہے۔

میں۔ میں عوام کے اس خیال سے بے خبر نہیں ہوں۔ اور اسی دعوے کی بنیاد پر تھریسی میکس ابھی ابھی عدل کی ہجو اور نا انصافی کی مدح سرائی کر رہے تھے لیکن کم سے کم میں تو اس سے قائل ہوا نہیں۔

گ۔ آپ نے جس طرح تھریسی میکس سے اتنی دیر گفتگو فرمائی مجھے امید ہے کہ آپ تھوڑی دیر کے لیے میری بات بھی سنیں گے اور مجھے توقع ہے کہ میں آپ کو اپنا ہمخیال بنا لوں گا۔ تھریسی میکس تو آپ کی صدائے ہوش ربا سے کچھ قبل از وقت مسحور ہو گئے۔ جیسے سانپ بین کی آواز سنکر بیخود ہو جاتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب تک عدل و انصاف اور جبر و نا انصافی کی اصلیت معلوم نہیں ہو سکی۔ نتائج و مفاد سے قطع نظر کر کے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ عدل اور نا انصافی کی حقیقی ماہیت کیا ہے۔ اور وہ روح انسانی میں کس طرح خموشی کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں از سر نو تھریسی میکس کی طرف سے سلسلہ کلام شروع کروں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں عدل کی حقیقت اور اس کی ابتدا و اصل کے متعلق عوام کے خیال کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ حقیقت روشن کرونگا کہ جو لوگ عدل پر کاربند ہوتے ہیں اس کی وجہ خود اس طرز عمل کی خوبی نہیں بلکہ ضرورت ہے جو خلاف خواہش ان سے ایسا کراتی ہے۔ تیسرے میں اس خیال کی معقولیت ثابت کرونگا کہ نا انصافی و ظلم کی زندگی بہر حال بحیثیت مجموعی عدل و انصاف کی زندگی سے بہتر ہے۔ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے ذاتی خیالات کی ترجمانی ہے۔ لیکن کیا کروں جب بار بار تھریسی میکس

اور اُن کے دوسرے ہمنواؤں کی تقریریں سُنتا ہوں تو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔ خصوصاً اس لیے اور بھی کہ میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ کسی نے انکا قابلِ اطمینان جواب دیا ہو اور ظلم کے مقابلہ میں عدل کی فضیلت صاف طور پر ثابت کر دی ہو۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ عدل میں فی نفسہٖ جو محاسن ہوں صرف وہ بیان کیے جائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے پہلے میں ناانصافی و ظلم کے تمام ممکن محاسن آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کے جواب میں اور اسی طرز کو مدنظر رکھ کر عدل کے محاسن اور ناانصافی کے معائب بیان فرمائیں۔ غالباً آپ اس طریقہ کو پسند کریں گے۔

میں :- بلاشبہ۔ بھلا اس سے بہتر اور کونسا مضمون ہو سکتا ہے جس پر ایک معقول شخص خود گفتگو کرنا اور دوسروں کی گفتگو سُننا پسند کرے۔

گ :- بہت خوب۔ تو پھر میں پہلے عدل کی ماہیت اور اصل کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ ظلم و ناانصافی کرنا بذاتِ خود تو اچھی چیز ہے لیکن خود انکا مورد بننا بُرا ہے۔ اور چونکہ یہ بُرائی اچھائی سے بدرجہا زیادہ شدید ہے، اسلیے جب آدمیوں کو ناانصافی کرنے اور ناانصافی سہنے کے دوگونہ تجربے ہوئے اور جب انھیں ناانصافی کرنے کی قابلیت کا ملنا مشکل اور اس سے بچنے کی توقع تقریباً ناممکن نظر آئی تو انھوں نے یہی فیصلہ مناسب سمجھا کہ نہ ناانصافی کی جائے

نہ سہی جائے۔ چنانچہ معاہدات مرتب ہوئے اور قوانین کا نفاذ ہوا، اور ان قوانین کی بجا آوری کا نام انصاف رکھا گیا۔

ان کے نزدیک تو انصاف کی ابتدا یوں ہوئی۔ بقول ان کے انصاف عدل بہترین حالت یعنی ظلم و ناانصافی کرنے اور سزا سے محفوظ رہنے اور بدترین کیفیت یعنی ظلم و ناانصافی برداشت کرنے اور انتقام کی قابلیت نہ رکھنے کے بین بین ایک رستہ ہے یا ایک درمیانی سمجھوتہ۔ اس کی قدر اس وجہ سے نہیں کی جاتی کہ یہ بجائے خود کوئی اچھی چیز ہے بلکہ دو برائیوں میں کمتر درجہ کی برائی ہے اس وجہ سے اچھا سمجھا جاتا ہے کہ عام لوگ ظلم کرنے کی قوت اور صلاحیت نہیں رکھتے۔ البتہ قوت مدافعت اور قابلیت انتقام ہونے کی صورت میں کوئی انسان جو انسان کہلانے کا مستحق ہے اس سمجھوتے کو نہیں مان سکتا اور اگر یہی حالت میں بھی وہ اسے مانے تو وہ غریب پاگل ہے۔ جناب عالی، عوام کے نزدیک تو آپ کے عدل و انصاف کی اصلی ماہیت یہ ہے۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ عادل و منصف لوگ ارادۃً عدل پر کاربند نہیں ہوتے بلکہ ناانصافی کی طاقت و قابلیت نہیں رکھتے اس لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس بیان کی صحت کا اندازہ کرنے کے لیے فرض کیجیے کہ دو شخص ہیں ایک منصف اور ایک غیر منصف۔ اور دونوں کو کامل آزادی اور اختیار حاصل ہے کہ جو چاہیں کریں۔ پھر دیکھیے ان کی خواہشات انھیں کدھر لے جاتی ہیں۔ آپ دیکھ

ہیں گے کہ دونوں بعینہ ایک راستہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ یعنی اپنی اغراض کی پابندی کرتے ہیں کہ ہر شخص اسی میں اپنا بھلا خیال کرتا ہے۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ قوانین کی پابندی کی وجہ سے لوگ مجبوراً عدل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ مفروضہ آزادی اور اختیار ان لوگوں کو ایسی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انھیں بھی وہی چیز نصیب ہو جو مشہور فسانہ میں جائجیس (Gyges) کو میسر تھی روایت ہے کہ جائجیس شاہ لیڈیا کی سرکار میں ایک چرواہا تھا۔ ایک دن سخت طوفان اور زلزلہ آیا۔ جس جگہ یہ اپنی بھیڑیں چرا رہا تھا زمین شق ہوئی اور ایک بڑا غار ہو گیا۔ تحیر و استعجاب کے عالم میں یہ اُس غار میں اُترا۔ منجملہ دیگر عجائبات کے ایک پیتل کا گھوڑا دکھائی دیا جس میں جابجا روزن بنے تھے۔ ان روزنوں سے جھانکا تو ایک لاش دیکھی جو قد میں معمولی انسانوں سے لمبی تھی۔ لاش بالکل برہنہ تھی البتہ ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ چرواہے نے یہ انگوٹھی اُتار لی اور غار سے نکل آیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ کچھ روز بعد تمام شاہی چرواہے بدستور سابق ایک جگہ جمع ہوئے تاکہ بادشاہ کی خدمت میں گلہ کے متعلق ماہانہ اطلاع پیش کریں۔ اس مجمع میں یہ چرواہا بھی انگوٹھی پہنے ہوئے آیا۔ یونہیں بیٹھے بیٹھے اس نے انگوٹھی کا نگ جو اندر کی طرف پھیرا تو یکایک تمام مجمع کی نظر سے اوجھل تھا۔ اور سب حاضرین اسے غائب سمجھنے لگے۔ یہ چرواہا خود سخت متعجب تھا کہ جونہیں انگوٹھی کا نگ باہر کی طرف پھیرا سب کو دکھائی دینے لگا۔

چنانچہ اس نے چند بار تجربہ کیا اور ہمیشہ یہی نتیجہ نکلا۔ اب کیا تھا۔ کوشش کرکے اِن پیامبروں میں شامل ہوگیا جو دربار میں جانے کے لیے منتخب کیے جاتے تھے دربار میں گذر ہوتا تھا کہ اس نے ملکہ کو بہکا لیا اور اس کی مدد سے بادشاہ کے خلاف سازش کی اور بالآخر اُسے قتل کرکے سلطنت کا مالک بن بیٹھا۔

فرض کیجیے اسی قسم کی دو انگوٹھیاں آج ہمیں ملجائیں اور ہم ایک کسی منصف شخص کو اور دوسری ایک غیر منصف شخص کو پہنا دیں میرے خیال میں تو شاید ہی کوئی اسقدر پکّی طبیعت کا آدمی ہو کہ ایسی حالت میں بھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ کون ہوگا جو ایسی صورت میں بازار سے گذرتے ہوئے مختلف ایسی چیزوں پر ہاتھ صاف نہ کر دے جو اُسے پسند ہیں لیکن اس کی ملک نہیں یہ لوگ گھروں اور خلوتخانوں میں گھُس کر جس سے چاہیں گے روابط اختلاط پیدا کریں گے جسے چاہیں گے مار ڈالیں گے اور جسے چاہیں گے قیدخانہ سے چھڑا لائیں گے۔ ان کی حیثیت انسانوں میں دیوتاؤں کی سی ہوجائے گی۔ اور اس صورت میں منصف اور غیر منصف کے اعمال بالکل ایک سے ہوجائیں گے سرِ فرق نہ ہوگا۔ میری رائے میں یہ بات اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ کوئی شخص بھی بخوشی اسلیے منصف نہیں ہوتا کہ وہ اُسے اپنی ذات کے لیے مفید سمجھتا ہے بلکہ لاچاری دضرورت اُسے منصف بننے پر مجبور کرتی ہے کیوں کہ جب کوئی شخص آسانی سے بلاخوف انتقام ناانصافی کر سکتا ہے تو وہ کبھی اس سے دریغ نہیں کرتا اور ہر شخص اپنے دل میں یہ

یقین رکھتا ہی کہ ظلم و نا انصافی کو عدل و انصاف کے بہ نسبت اُس کی ذات کے لیے بدرجہا زیادہ سود مند ہی۔ اور سچ یہ ہی کہ ان کا یہ خیال غلط نہیں۔ اگر آپ کے لیے کسی ایسے وجود کا تخیل ممکن ہی جو غیر مرئی ہونے کی قابلیت رکھتا ہو اور با وجود اس کے کوئی بُرا کام نہ کرے نہ کسی غیر کی چیز چھوئے تو یقین مانیے کہ عامۃ الناس ایسے آدمی کو انتہائی احمق خیال کریں گے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہی کہ ریاکاری سے یہ لوگ ایک دوسرے کے سامنے اس شخص کی تعریف ہی کریں لیکن یہ صرف اس غرض سے کہ کہیں ان کے ساتھ نا انصافی روا نہ رکھی جائے۔

اچھا اب اس قصّہ کو ختم کریں اور آئیے ایک عادل و منصف اور ایک غیر منصف شخص کی زندگی کی اچھائی اور بُرائی کا صحیح اندازہ کریں۔ اس غرض کے لیے ان دونوں کو الگ الگ لیجیے۔ غیر منصف شخص بدرجۂ اتم ظالم اور بے ایمان ہو اور عادل شخص کامل طور پر منصف اور ایماندار۔ دونوں کو اپنے مختلف مقاصد زندگی کے حصول میں کامل آزادی دیجیے۔ یہ بھی التزام ہو کہ غیر منصف شخص دیگر ماہرین فنون مختلفہ کی طرح اپنے کمال کی قوتوں اور نیز اُس کی حدود سے اچھی طرح واقف ہو۔ اور اگر کہیں غلطی ہو جائے تو اُس کی تلافی کر سکے۔ یہ سب اس لیے ضروری ہی کہ وہ تمام بے ایمانیاں آسانی سے کرے اور انھیں پوشیدہ بھی رکھ سکے کیوں کہ پکڑا گیا تو پھر کیا بات باقی رہی۔ نا انصافی اور بے ایمانی کا کمال تو یہی ہی کہ اس کا کرنے والا ایماندار سمجھا جائے۔ اور ہم چونکہ نا انصافی کا کامل ترین نمونہ

مقابلہ کے لیے لینا چاہتے ہیں اس لیے وہی شخص مناسب ہے جو باوجود انتہائی بے ایمانیوں کے بہت زیادہ ایماندار مشہور ہو۔ ساتھ ہی اچھا جادو بیان مقرر بھی ہو کہ اگر کوئی راز فاش ہوجائے تو اپنی سحر بیانی سے لوگوں کو خاموش کردے نیز ضرورت کے وقت اپنی قوت اور جرأت، دولت اور ہمت سے بھی کام لے سکے۔ اس شخص کے مقابلہ میں بیچارے عادل اور ایماندار شخص کو لیجیے جس کا مطمح نظر ایسکلس (Aeschylus) کی طرح یہ ہے کہ نیکی کرے لیکن بظاہر نیک نہ معلوم ہو اسے ظاہر اً مطلق ایماندار نہ ہونا چاہیئے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو لوگ اس کی عزت اور عظمت کریں گے اور اس طرح یہ تصریح نہ ہوسکے گی کہ آیا وہ عدل کو فی نفسہ اچھا سمجھتا ہے یا محض عزت کے لالچ سے منصف بنا ہوا ہے۔ اس کی متاع تو خالص انصاف ہونی چاہیے اور بس۔ اور پورا امتحان بھی اسی حالت میں ممکن ہے کہ وہ دراصل بہترین خلائق ہو لیکن لوگوں کے نزدیک بدترین انسان سمجھا جائے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ بدنامی اور اس کے نتائج کا کوئی اثر اس پر مترتب ہوتا ہے یا نہیں اس حقیقی ایماندار لیکن بظاہر بے ایمان شخص کی یہی حالت آخر دم تک رہنے دیجیے اور جب عادل اور ظالم دونوں بالترتیب اپنے عدل اور بے ایمانی کی انتہا کو پہنچ جائیں اس وقت یہ فیصلہ کیا جائے کہ کون زیادہ خوش رہا کس کی زندگی مسرت اور انبساط سے پُر تھی اور کس کی غم اور تکلیف سے۔

میں :- بھائی گلاکن تم نے تو کمال کر دیا۔ اس خوبی سے دونوں کیفیات کا

مرقع پیش کیا کہ آنکھوں میں تصویر سی پھر گئی۔

گ :- یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ خیر۔ مدمقابل فریقین کی کیفیات تو معلوم ہی ہو گئیں۔ اب صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کس قسم کی زندگی بسر کریں گے۔ اور یہ کچھ ایسا مشکل نہیں۔ میں اب اس زندگی کی تصویر پیش کرتا ہوں لیکن چونکہ ممکن ہے کہ میرا بیان کچھ بُرا اور رکیک معلوم ہو اس لیے چند لمحوں کے لیے فرض کر لیجیے کہ یہ میرے الفاظ نہیں بلکہ ظلم و ناانصافی کے کسی مداح و قصیدہ خواں کی زبان سے نکل رہے ہیں۔ اس مداح کے خیال میں تو یہ حقیقی ایماندار لیکن بظاہر بے ایمان شخص سخت مصیبت میں مبتلا رہیگا۔ اس کے کوڑے مارے جائیں گے۔ دُرّے بھی پڑینگے۔ قید کیا جائیگا۔ آنکھیں نکالی جائیں گی اور بالآخر یہ تمام مصائب و آلام برداشت کرلنے کے بعد وہ بیچارہ سپرد دار کر دیا جائے گا۔ اس وقت جاکر اس غریب کو خبر ہوگی کہ کام دراصل ایماندار ہونے سے نہیں چلتا بلکہ بظاہر ایماندار معلوم ہونے سے۔ اِسکلس کے الفاظ سچ پوچھو تو زیادہ صحت کے ساتھ بے ایمان پر چسپاں ہوتے ہیں۔ کیونکہ ظالم اور غیر منصف ایک حقیقت اور اصلیت کا پیرو ہے وہ صرف ظاہر پرست تو ہے نہیں اس کا مقصد تو فی الواقع بے ایمان بننا ہے نہ کہ صرف دکھاوے کے لیے۔ اب اس کی حالت سنیئے۔ اول تو لوگ اُسے ایماندار سمجھیں گے اور اس طرح وہ حاکم شہر بن جائیگا۔ جس عورت سے چاہیگا عقد کریگا جس مرد سے چاہیگا اپنی لڑکی کا عقد کرائے گا۔ ہر جگہ تجارت و کاروبار کر سکے گا۔ اور چونکہ کوئی اُسے بے ایمان تو

سمجھتا نہیں اس لیے ہمیشہ فائدہ میں رہیگا۔ ہر مقابلہ میں خواہ خاص ہو یا عام اپنے
حریف سے اچھا ثابت ہوگا۔ دوسروں کی دولت سے مالدار بنے گا اور اس مال کو
اپنے احباب کے نفع اور اعدا کے ضرر کے لیے صرف کریگا۔ اس کے علاوہ قربانیاں
کر سکے گا اور دل کھول کر دیوتاؤں پر نذریں چڑھا ئیگا۔ اگر کسی انسان یا دیوتا کی
عزت و توقیر بڑھانا چاہیگا تو ایک ایماندار شخص سے بدرجہا زیادہ آسانی اور عمدگی سے
ایسا کرنے کے قابل ہوگا۔ اور ان وجوہ سے دیوتاؤں کی نظر میں بھی عادل شخص کی
بہ نسبت زیادہ عزیز ہوگا۔ چنانچہ انسان اور دیوتاؤں کی متحدہ مساعی اس کی زندگی
کو ایک ایماندار شخص کی زندگی سے زیادہ دلفریب اور خوش گوار بنا دینگی۔"

میں: گلاکن کے جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایڈیمینٹس بیچ میں بول
اٹھے۔ "کیا جناب کا خیال ہے کہ اس تعریف میں مزید اضافہ کی گنجائش نہیں؟"

میں:۔ کیوں۔ کیا کچھ اور باقی ہے!

ایڈ:۔ ابھی سب سے زیادہ اہم بات کا تو ذکر ہی نہیں کیا گیا۔

میں:۔ سچ ہے بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اگر گلاکن سے کوئی بات رہ گئی ہے تو
آپ اس کی تکمیل کر دیجیے۔ اگرچہ حقیقت تو یہ ہے کہ گلاکن ہی نے مجھے کافی دشواری
میں ڈال دیا ہے اور مجھے کافی طور پر عدل کی حمایت کے ناقابل بنا دیا ہے۔

ایڈ:۔ آپ کا یہ ارشاد تو صحیح نہیں ہے۔ لیکن میں کچھ عرض ضرور کرونگا۔ گلاکن
نے عدل اور ظلم کی جو مدح و مذمت کی ہے اس کا ایک پہلو اور بھی ہے اور میرے

نزدیک گناہ کا مفہوم سمجھنے کے لیے اس پہلو کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ والدین اور اساتذہ ہمیشہ اپنی اولاد اور شاگردوں کو ایماندار اور منصف مزاج بننے کی تاکید کرتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کیوں؟ اس کی وجہ انصاف کی ذاتی خوبی نہیں بلکہ اس سے متعلقہ عزت اور شہرت ہے۔ اور اس تلقین سے مقصد یہ ہے کہ اس شہرت کی وجہ سے ان کی اولاد یا ان کے شاگرد ملازمت عقد اور دیگر امور میں فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ ظاہر پرست طبقہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دیوتاؤں کی عنایت و مہربانی کا لالچ بھی دیتا ہے۔ آپ کبھی ان لوگوں سے گفتگو کیجیے۔ ایک ان گنت تعداد اُن برکات سماوی کی پیش کر دیں گے جو نیک اور منصف لوگوں پر نازل ہوتی ہیں۔ شعراء بھی اپنے شعر میں اسی قسم کے لالچ دلاتے ہیں۔ چنانچہ ہیسیاڈ اور ہومر نے یہی کیا ہے۔ ان کی رائے میں عدل و انصاف سے زمین کی زرخیزی۔ فصلوں کی فراوانی۔ میووں کی عمدگی۔ مال و دولت کی زیادتی اور عام مرفہ الحالی وابستہ ہے۔ میوسائیس اور اس کا بیٹا تو اس سے کہیں زیادہ رفیع الشان چیزوں کی توقع دلاتا ہے ان کے خیال میں نیک و منصف شخص کو بعد مرگ جب عالم بالا میں لیجاتے ہیں تو وہ ایک دعوت میں شریک کیا جاتا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدہ لوگ مسندوں پر لیٹے ہوتے ہیں۔ پھولوں کے تاج سر پر ہیں اور شراب کا دور متواتر جاری ہے۔ گویا انکے نزدیک تمام نیکیوں کا صلہ شرب مدام اور مخموری ابدی ہے۔

بعض اس اجر کی امید کو عادل شخص کی ذات سے ماورا لیجاتے ہیں۔ ان کا

خیال ہے کہ منصف آدمی کی نسل چار پانچ پشت تک ضرور جاری رہتی ہے۔ غرض نت نئی شکلوں سے لوگ عدل و انصاف کی مدح میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔

لیکن بدوں کے لیے بالکل دوسری ڈگر ہے۔ یہ بیچارے تو جہنم میں ڈالدیے جائینگے۔ مشقت دائمی یہ ہوگی کہ چھلنی میں پانی بھر بھر کر لائیں۔ غرض اس غریب کو وہ تمام سزائیں ملیں گی جو گلاکن نے ابھی ابھی اس منصف شخص سے منسوب کی ہیں یا جو بے ایمان مشہور ہو۔ اسکے علاوہ عدل و نا انصافی کے متعلق ایک اور طریقہ بیان بھی ہے۔ اور یہ عوام اور شعرا دونوں میں یکساں رائج ہے۔ سب کے سب یک زبان ہیں کہ منصف ہونا بڑی قابل تحسین بات ہے لیکن ساتھ ہی سخت دشوار بھی ہے۔ برخلاف اس کے نا انصافی اور بے ایمانی بذات خود نہایت دلکش اور سہل الحصول ہیں لیکن صرف جمہور کی رائے اور قوانین کی وجہ سے بُرے سمجھے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک عدل و انصاف میں ظلم و نا انصافی سے کہیں کم فوائد ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ شریر اور ثروت پرور اشخاص کو خوش نصیب اور مبارک بتلانے نیز خلوت اور جلوت میں ان کی عزت و توقیر کرنے سے مطلق نہیں شرماتے۔ ہاں یہ شرط ہے کہ اُن کے پاس دولت ہو اور جاہ و ثروت کے دیگر اسباب بھی موجود ہوں۔ نہ یہ شمہ برابر اس نیک شخص کی ہجو اور مذمت کرنے سے محجوب ہوتے ہیں جو تنگی اور افلاس کی کڑیاں جھیل رہا ہو۔ اگرچہ خود انھیں مؤخرالذکر کی خوبی اور نیکی کا دلی اعتراف ہی کیوں نہ ہو لیکن ان تمام باتوں سے زیادہ حیرت خیز تو وہ بیانات ہیں جو خود دیوتاؤں کے متعلق

کیئے جاتے ہیں۔ ان تمام بیانات کا مفہوم یہ ہے کہ دیوتا بھی اکثر نیک لوگوں کو زندگی میں تکلیف اور بدوں کو راحت پہنچاتے ہیں۔ ہر جگہ ایسے شیخ و برہمن موجود ہیں جو ثروت و جاہ کے آگے سر جھکاتے ہیں اور اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اگر قربانیاں کی جائیں، منتیں مانی جائیں، کھانا کھلایا جائے تو اُن کے پاس ایسی طاقت ہے کہ وہ دیوتاؤں سے ہر گناہ بخشوا سکتے ہیں خواہ وہ خود اُن سے سرزد ہوا ہو یا انکے باپ دادا اس کے مرتکب ہوئے ہوں تھوڑے سے خرچ میں بلا امتیاز نیک و بد یہ لوگ ہر شخص کو گنڈے تعویذ سے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انکے پاس بعض دم درود اور اوراد و وظائف ایسے ہیں جن کے اثر سے دیوتا انکے کہے کی پابندی کرتے ہیں۔ اور ان تمام دعاوی کی تصدیق میں شعرا کا کلام پیش کیا جاتا ہے جن کے نزدیک " اگر شر اور بدی کی تلاش ہے تو وہ ہر جگہ مل سکتی ہے کہ اُس کی منزل بہت قریب ہے اور اس کی راہ نہایت آرام دہ ہے۔ لیکن اگر نیکی کے متلاشی ہو تو اس کے متعلق تو فرمودہ آسمانی ہے کہ پیشانی کا پسینہ ایڑی کو آئے تب کہیں یہ نصیب ہو کہ اس راہ میں ہر طرح کے مصائب و صعوبتیں ہیں۔ کہیں اس خیال کی تائید میں کہ دیوتا اپنے ارادے سے ہٹائے جا سکتے ہیں ہومر کی شہادت پیش کی جاتی ہے کہ " لجاجت و زاری تو ایسی چیز ہے کہ دیوتا تک اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی انسان سے کسی گناہ یا نافرمانی کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو وہ غم و حسرت سے بھری ہوئی دعائیں مانگتا ہے قربانیاں چڑھاتا ہے۔ خوشبودار

بخور دیتا اور گھی کے چراغ جلاکر عجز و انکسار سے منتیں کرتا ہے اور بالآخر دیوتاؤں کا عتاب رحم میں بدل جاتا ہے۔"

اس کے علاوہ میوسیس اور آرفیس کی تصانیف کا ایک انبار ہے جو پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ سیلین اور میوز کی اولاد ہیں چنانچہ انکا کلام اکثر تقریبوں اور عام تہواروں کے موقعہ پر پڑھا جاتا ہے اور اس طرح نہ صرف افراد کو بلکہ پورے پورے شہروں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ بعض قربانیوں اور مجالس عیش و طرب کے انعقاد سے بزمانہ حیات اور نیز بعد مرگ تمام گناہ و معاصی کی تلافی ممکن ہے۔ ان کے عقیدہ کے مطابق ان رسوم کی ادائیگی انسان کو آخرت میں سزا اور جزا سے آزاد کر دیتی ہے اور ان سے غفلت عذاب الیم کا باعث ہوتی ہے۔

جب اس قسم کے خیالات اس طرح پھیلائے جاتے ہیں اور اس قدر مختلف طریقوں سے عامۃ الناس کے روبرو انھیں بار بار دہرایا جاتا ہے تو اسکا نتیجہ ان نوخیز دماغوں پر کیا ہوگا جو ہر چیز کو سطحی طور پر سنکر اس سے نتائج کا استخراج کر لیتے ہیں۔ انکے پیش نظر بہترین زندگی کی کیا تصویر ہوتی ہوگی اور راہ خیر و برکت کا کیا نقشہ سامنے آتا ہوگا جس پر چلکر وہ فلاح حاصل کر سکے۔ قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ آیا عدل و ایمانداری انھیں ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا سکتی ہے یا معراج کمال تک رسائی کے لیے مکاری اور بے ایمانی لازمی ہے۔ کیونکہ آپ ہی غور فرمایئے میں لاکھ نیک سہی لیکن اگر مجھے ایماندار تسلیم نہیں کیا جاتا تو میری تمام نیکی اور منصف مزاجی بیکار بلکہ باعث نقصان ہے۔

لیکن اگر باوجود ظلم و ناانصافی کے میں کسی طرح نیک اور ایماندار مشہور ہو جاؤں تو پھر کیا کہنا۔ اسی دنیا میں جنت ہو گئی۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ جب ظاہر باطن پر غالب آتا ہے تو میں کیوں نہ ظاہر ہی کی پابندی کروں۔ مکان کے ہر چہار طرف تقدس اور نیکی، عدل و انصاف کی فضائے جاں نواز ہو لیکن مکین ظلم اور بے ایمانی میں فرد۔ ایک تصویر سے اپنے چہرہ کو خوشنما بنا لوں لیکن پیچھے وہی مکار لومڑی کی دم ہو جس کا ذکر آرکی لوکس نے کیا ہے۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ برائی کا پوشیدہ رکھنا کچھ سہل کام نہیں۔ بیشک یہ صحیح ہے لیکن دنیا میں کوئی بڑا کام سہل نہیں ہوتا یہ بات قطعی ہے کہ اگر دنیا میں آرام و آسائش، مسرت و اطمینان کے آرزومند ہو تو بس اسی راہ کو اختیار کرو۔ ہمارا راز کا پوشیدہ رکھنا۔ اس کے لیے خفیہ انجمنیں بناؤ۔ سیاسی جماعتیں قائم کرو۔ اور یہ کیوں؟ ماہرین فن خطابت سے عدالتوں اور مجمعوں کو اپنی بات باور کرانا سیکھو اور اس طرح کچھ تو ترغیب و تلبیس اور کچھ جبر و تعدی سے بلا خوف سزا اپنی بے ایمانی کے ثمرات حاصل کرو۔ یہاں ممکن ہے کوئی کہے کہ دیوتاؤں کو کس طرح دھوکا دوگے۔ انھیں کس طرح ترغیب و تلبیس سے قائل کر سکوگے؟ تو اس کا جواب دو حال سے خالی نہیں۔ اولاً یا تو دیوتاؤں کا وجود ہی نہیں، اگر ایسا ہے تو پھر کیا۔ معاملہ صاف ہے۔ یا یہ کہ دیوتا اعمال انسانی سے بیخبر اور اُن سے غیر متعلق ہیں۔ اگر یہ ہے تو بھی تلبیس کی چنداں ضرورت نہیں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیوتاؤں کا وجود ہے اور وہ افعال انسانی کی خبرگیری بھی کرتے ہیں۔ ہم نے اسے تسلیم کیا۔ لیکن ہم کو دیوتاؤں

کے متعلق جو کچھ بھی علم ہے اُس کا ذریعہ یا تو روایات ماضی ہیں یا شعرا کا کلام۔ اور ان لوگوں کے اقوال کے مطابق تو دیوتاؤں پر بھی اثر ڈالا جا سکتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ دعاؤں، قربانیوں اور منّتوں کے ذریعہ انھیں اپنے ارادہ سے ہٹا دیا جائے۔ پھر یا تو ان روایتوں اور شعرا کے کلام کو پورا صحیح مانو یا بالکل جھوٹ متصور کرو۔ اگر ان لوگوں کا کہنا سچ ہے تو پھر کیا ہے۔ بے ایمان ہونا ہی سراسر بہتر ہے کھلے بندوں بے ایمانی کرو البتہ اس بے ایمانی کی کمائی میں سے کچھ قربانیوں اور منتوں میں صرف کرو۔ کیوں کہ آخر ایمانداری میں دھرا کیا ہے۔ یہی نا کہ غالباً عذاب الٰہی سے محفوظ رہو گے لیکن ظلم اور ناانصافی کے فوائد سے تو بہرہ اندوز نہ ہو سکو گے۔ برخلاف اس کے بے ایمانی میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ہر طرح کے جائز و ناجائز فائدے حاصل کرو اور پھر دعاؤں اور قربانیوں کے ذریعہ عذاب الٰہی سے مامون و محفوظ۔ رہا آخرت کا ڈر سو اس کے لیے بھی مختلف رسوم اور شفاعت کرنے والے دیوتا موجود ہیں کم سے کم بڑے بڑے شہروں کا تو یہی عقیدہ ہے اور شعرا اور پیغمبر بھی جو ان دیوتاؤں کی اولاد مانے جاتے ہیں اس امر کے شاہد ہیں۔

اب آپ ہی فرمائیے کہ بھلا کس وجہ سے کوئی شخص عدل و انصاف کو انتہائے ظلم اور بے ایمانی پر ترجیح دے۔ بے ایمانی کے ساتھ تھوڑی سی ظاہری ایمانداری ہو چاہیئے اور بس انسان اپنی زندگی کو بقید حیات اور بعد الموت دیوتاؤں اور آدمیوں دونوں کے نزدیک نہایت آرام و آسائش سے گذار سکتا ہے۔ اگر کسی شخص کو ذرا سا بھی

دماغی یا جسمانی امتیاز یا دولت اور مرتبہ میں تھوڑی سی فوقیت حاصل ہی تو وہ گویا ایمانداری کرنے لگا۔ اس کے سامنے تو عدل کی تعریف کی گئی تو ہنسیگا۔

میں جانتا ہوں کہ دنیا میں ایسے لوگ ہوں گے جو میرے ان دلائل کو نہ مانیگے اور عدل کو ظلم پر ترجیح دینگے۔ لیکن خوب یاد رکھیئے یہ لوگ تک بے ایمان کو قابل معافی ضرور سمجھتے ہوں گے، کیونکہ انھیں یقین ہی کہ کوئی شخص بہ رضا و رغبت ایماندار نہیں ہوتا سوائے اُن لوگوں کے جن کے دلوں کو خدا نے ظلم و نا انصافی سے فطرتاً نفور کر دیا ہی اور جن کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو چکی ہی۔ ان کے علاوہ دوسرے آدمی تو صرف اس وجہ سے ظلم اور بے ایمانی کو بُرا سمجھتے ہیں کہ وہ خود زیادتی عمر۔ کمزوری۔ یا کم ہمتی کی وجہ سے اس کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس کا معمولی ثبوت یہ ہے کہ جب انھیں کچھ قوت اور قدرت حاصل ہو جاتی ہی تو یہ بھی اپنی بساط اور استعداد کے مطابق بے ایمانی اور ظلم شروع کر دیتے ہیں۔

اس صورت حالات کی وجہ ہم نے ابتدائے گفتگو ہی میں عرض کی تھی یعنی یہ کہ قدما سے لیکر ہمارے زمانہ تک جسقدر لوگ عدل و انصاف کے مدح سرا ہوے ہیں سب کے سب نا انصافی کی مذمت اور عدل کی تعریف اس سے حاصل شدہ اعزاز و منافع اور شہرت کو مدنظر رکھکر کرتے ہیں۔ دفاتر نظم و نثر کے اوراق الٹ جائیے آپ کہیں نہ پائیں گے کہ کسی شخص نے بھی ان صفات کی حقیقی ماہیت پر بحث کی ہو یہ بتلایا ہو کہ انسانی اور خدائی نگاہ سے پوشیدہ رہ کر بھی یہ صفات روح انسانی پر

کیا کیا اثرات پیدا کرتی ہیں۔ یا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ عدل روح کی اعلیٰ ترین حسنات اور ظلم بد ترین معائب ہے۔ اگر ہمیں بچپن سے یہی سکھایا جاتا تو آج بجائے اسکے کہ کوئی دوسرا شخص برائی سے ہمارا محافظ و نگراں ہو ہم خود شدید ترین اپنے محافظ ہوتے کہ مبادا ہماری روح میں یہ ارذل ترین برائی پیدا ہو جائے۔ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا سب تھریسی میکس اور اُن کے ساتھیوں کے خیالات کی ترجمانی تھی۔ بلکہ ممکن ہے وہ اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں اپنا مفہوم ادا کرتے۔

لیکن میں نے جو یہ سب کچھ عرض کیا اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ بھی فریق مخالف کے خیالات اسی انداز سے ظاہر فرمائیں۔ صرف ظلم پر عدل کی فوقیت کے اظہار پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ یہ بھی فرمائیے کہ ان صفات میں وہ کونسا اثر ہے جو متصف کو نیک یا بد بنا دیتا ہے البتہ گلاکن کی درخواست کا ذرا خیال رہے کہ شہرت اور عزت کا ذکر بھی نہ آنے پائے بلکہ میں تو یہاں تک عرض کرونگا کہ جب تک آپ حقیقت امر کے بالکل برعکس صفات سے متصف ہونے کی شہرت فرض نہ کرلیں اس وقت تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آپ حقیقتاً عدل ہی کی تعریف کر رہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ سمجھیں تو چنداں بیجا نہ ہوگا کہ آپ صرف مصلحتاً ہم لوگوں کو ظلم و ناانصافی سے محترز رہنے کی تلقین فرمارہے ہیں اور فی الحقیقت آپ کے نزدیک بھی تھریسی میکس ہی کی رائے صحیح ہے کہ انصاف و عدل فریق قوی کی اغراض کی پابندی کا نام ہے اور ظلم و ناانصافی میں صرف کمزور کا نقصان ہے اور قوی کا سراسر فائدہ۔

آپ اس بات کا تو اقرار کر ہی چکے ہیں کہ عدل محاسن کی اُس اعلیٰ قسم سے تعلق رکھتا ہی جس کی پابندی صرف عمدہ نتائج کی اُمید پر نہیں بلکہ اُس کی ذاتی خوبی کی وجہ سے بھی کرنا ضروری ہی یعنی اس کی حیثیت بھی وہی ہی جو دوسری ایسی حقیقی (نہ کہ رسمی) خوبیوں کی ہی جیسے باصرہ، سامعہ، علم، تندرستی وغیرہ۔

آپ جو عدل کی خوبیاں بیان فرمائیں تو اس میں براہ کرم ذرا ایک بات کا خیال رکھیں یعنی یہ کہ وہ کیا خوبی یا بُرائی ہی جو اسپر کاربند ہونے یا نہ ہونے سے خود بخود درونما ہوجاتی ہی۔ کیونکہ دوسرے لوگ اگر عدل کی تعریف میں اس کے بعض لوازم مثلاً عزت و شہرت سے استدلال کریں تو میں اسے چنداں قابل اعتراض نہ سمجھوں لیکن آپ سے تو مجھے زیادہ بلند و ارفع باتیں سُننے کی توقع ہی کہ آپنے تمام عمر اسی اہم مسئلہ پر غور و فکر میں صرف فرمائی ہی۔ مجھے اُمید ہی کہ میری توقعات کا خیال کر کے آپ صرف عدل کی فضیلت بیان کرنے پر اکتفا نہ کرینگے بلکہ اس بات پر پوری پوری روشنی ڈالیں گے کہ یہ صفت فی نفسہ بلا لحاظ اس امر کے کہ کوئی دیکھتا اور جانتا ہی یا نہیں متصف کی روحانی حالت کو کیسا بنا دیتی ہی"

یوں تو میں ہمیشہ سے گلاکن اور ایڈیمینٹس کی قابلیت کا معترف تھا اس گفتگو کو سُنکر تو میرا دل بہت ہی خوش ہوا اور میں نے کہا۔

"سچ ہی تم قابل باپ کے قابل بیٹے ہو۔ اور گلاکن کی تعریف میں جنگ مگارا میں ممتاز ہونے کے بعد جو مدحیہ الفاظ شاعر نے استعمال کیے تھے وہ بالکل بجا و قعہ

تھا۔ یقیناً تم پر یہ خدا کا خاص فضل ہی کہ اگرچہ تم نے ابھی ابھی عدل کے خلاف ظلم، ناانصافی کی طرف سے اسقدر عمدہ طریقہ سے پیروی کی تاہم تم خود ان چیزوں کو دلسے بُرا جانتے ہو، تم ہی بتاؤ کہ اگر کوئی شخص تمہارے عمل اور تمہارے اصلی خیالات سے ناواقف ہو اور پھر تمہاری یہ تقریر سُنے تو اُسے کس قدر غلط فہمی ہو۔ لیکن جس قدر قوی مجھے تمہارے صحیح عقیدہ کا یقین ہی اسی قدر قوی اعتراف مجھی اپنی دقتوں کا ہی میں اپنے کو دوگونہ مشکل میں مبتلا پاتا ہوں۔ ایک طرف تو اپنی بے بضاعتی کا احساس اور یہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہوگیا ہی کہ آپ لوگ ان دلائل سے مطمئن نہیں ہو جو میں نے تھریسی میکس کے جواب میں پیش کی تھیں۔ حالانکہ میں نے برعم خود انصاف وعدل کی فضیلت کا کامل ثبوت دیدیا تھا۔ دوسری طرف اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن نہیں کہ خاموش ہوں کہ جب تک سینہ میں سانس آتا ہی اور زبان میں یارائے گفتار ہی اُس وقت تک یہ محال ہی کہ عدل وانصاف کے خلاف کچھ سنوں اور اپنی استعداد کے مطابق اس کی تردید نہ کروں چنانچہ اپنی بساط کے موافق اس وقت بھی عدل کی کچھ نہ کچھ حمایت ضرور کرونگا۔"

گلاکن وغیرہ نے بھی اصرار کیا کہ سلسلہ کلام کو ختم نہ ہونے دو اور خواہش ظاہر کی کہ کامل غور وخوض کے بعد عدل وظلم کی اصلی ماہیت دریافت کی جائے اور پھر ان کے مختلف فوائد اور مضرتیں معلوم کی جائیں۔ چنانچہ میں نے اس طرح سلسلۂ کلام شروع کیا۔ "ہم جس مسئلہ پر اب غور کرنا چاہتے ہیں وہ کوئی معمولی

اور سہل مسئلہ نہیں بلکہ اس کے لیے بہت دقت نظر درکار ہی۔ اور چونکہ اپنی ناقابلیت سے ڈرتا ہوں اس لیے مناسب ہی کہ یہ طریقہ تحقیق اختیار کیا جائے میں ایک مثال سے اپنا مطلب آپکو سمجھا دوں۔ فرض کیجیے ایک آدمی کی بصارت کمزور ہی اور آپ اُس سے ایک باریک خط کی تحریر فاصلہ سے پڑھوانا چاہتے ہیں لیکن ہمارے کسی ساتھی کے علم میں وہی تحریر جلی قلم میں بھی موجود ہی تو یہ اُس شخص کی خوش قسمتی ہوگی کہ وہ پہلے اس جلی قلم عبارت کو پڑھ لے اور پھر اُس باریک تحریر کو دیکھے۔

ایڈمینٹس :- اس میں کیا شک ہی۔ لیکن آخر اس مثال کو معاملہ زیر غور سے کیا تعلق؟

میں :- میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ دیکھیے جس طرح عدل و انصاف کو افراد سے منسوب کیا جاتا ہی اسی طرح ریاستوں اور حکومتوں سے بھی تو اسے متعلق کرتے ہیں؟ کیوں ٹھیک ہی نا؟

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- اور ریاست ایک فرد سے بڑی ہوتی ہی۔

ایڈ :- بلاشبہ۔

میں :- تو ممکن ہی اس بڑی چیز میں عدل کی صفت بھی زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہو اور اس لیے امکان ہی کہ یہاں آسانی سے اس کا پتہ چل جائے،

لہذا اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو نظام حکومت میں پہلے اس کی تلاش کریں اور پھر اسی تحقیق کو افراد پر منطبق کر دیں۔

ایڈ:- رائے ہی تو نہایت مناسب۔

میں:- میرے خیال میں اگر ہم ایک شہر یا ریاست کے تدریجی نشو و نما کا خاکہ اپنے ذہن میں کھینچیں تو اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں عدل و ظلم کی تدریجی افتاد کا بھی پتہ چلتا جائے گا۔

ایڈ:- غالباً۔

میں:- اس طرح ممکن ہی کہ مسئلہ زیر تحقیق کے حل میں آسانی ہو جائے۔

ایڈ:- جی ہاں۔

میں:- تو پھر آپ کی رائے میں یہ تحقیق شروع کی جائے؟ ..... کام سہل نہیں ہی اس لیے پہلے ہی سوچ سمجھ لیجیے۔

ایڈ:- میں خوب سوچ چکا۔ ضرور شروع کیجیے۔

میں:- اچھا تو سُنیئے۔ میرے خیال میں شہروں اور بستیوں کے قیام کی اصلی وجہ یہ ہی کہ ہر فرد کی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے وہ دوسرے افراد کا محتاج ہی۔ آپ کی کیا رائے ہی یہی وجہ ہی یا کچھ اور؟

ایڈ- نہیں۔ اور کیا وجہ ہو سکتی ہی؟

میں:- گویا ضروریات کی کثرت اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے

دوسروں سے مدد کی احتیاج انسان کو مجبور کرتی ہو کہ وہ ہر کام میں کوئی شریک یا مددگار تلاش کرے۔ اور جب یہ تمام شرکا و معاونین ایک مقام پر جمع ہوکر بود و باش اختیار کر لیتے ہیں تو اسی کا نام شہر ہو جاتا ہی۔

ایڈ:- بیشک۔

میں:- اور یہ لوگ جو ایک دوسرے سے اشیا کا مبادلہ کرتے ہیں تو اس میں ہر فریق کو یقین ہوتا ہی کہ میرا فائدہ ہی۔

ایڈ:- ہاں اور کیا۔

میں:- اچھا تو اب شہر یا ریاست کی ایک ذہنی تصویر تیار کریں یہ تو معلوم ہی ہوگیا کہ اس کی اصل اور ابتدائی وجہ ہماری فطری ضروریات اور احتیاجات ہیں

ایڈ:- بیشک۔

میں:- اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ زندگی کو قائم رکھنے اور ہلاکت سے محفوظ رہنے کے لیے پہلی احتیاج غذا ہی۔

ایڈ:- یقیناً۔

میں:- پھر رہنے کے لیے مکان۔ پہننے کے لیے کپڑے وقس علیٰ ہذا۔

ایڈ:- بے شبہ۔

میں:- اب غور کیجیے کہ اس شہر میں ان ضروریات کی فراہمی کس طرح ہوگی۔ شروع شروع میں ایک کاشتکار ہونا چاہیئے اور ایک معمار۔ پھر ایک جولاہے کی بھی

ضرورت ہوگی۔ کہئے تو ایک موچی یا اور کسی ایسے ہی شخص کا اضافہ بھی کریں۔

ایڈ:۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔ ان لوگوں کا وجود از بس ضروری ہے۔

میں:۔ گویا چھوٹے سے چھوٹے شہر میں چار یا پانچ آدمی ضرور ہونگے۔

ایڈ:۔ ظاہر ہے۔

میں:۔ اور یہ تو فرمائیے۔ یہ لوگ کام کس طرح کریں گے؟ کیا اپنی اپنی محنت کی پیداوار ایک مقام پر جمع کر دیا کریں گے۔ مثلاً کیا کاشتکار چاروں آدمیوں کے لیے غلہ پیدا کریگا اور اپنی ذات کے لیے غلہ پیدا کرنے میں جتنی محنت کرنی پڑتی ہے اس سے چوگنی محنت کریگا یا اسے دوسروں سے مطلق سروکار نہ ہوگا اور صرف اپنے لیے چوتھائی وقت میں اور چوتھائی محنت سے غلہ پیدا کریگا اور باقی اوقات میں اپنے لیے مکان تعمیر کریگا۔ کپڑے بنائیگا جوتا سیئے گا۔ تاکہ خود ہی اپنی تمام ضروریات کو بلا مدد غیرے پورا کرلے۔

ایڈ:۔ میری رائے میں تو غالباً یہ اچھا ہوگا کہ وہ اپنے ذمہ صرف کاشت کا کام لے لے اور باقی چیزوں کی تیاری سے سروکار نہ رکھے۔

میں:۔ ہاں غالباً یہی بہتر طریقہ ہے۔ تمہارے کہنے سے مجھے بھی خیال پیدا ہوا کہ کوئی دو آدمی ایک سے نہیں ہوتے کوئی کسی کام کے لیے موزوں ہوتا ہے کوئی کسی کے لیے۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟

ایڈ:- میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں:- کام کی عمدگی کا خیال کرکے کونسی صورت زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہی؟ آیا ایک آدمی ایک ہی کام کرے یا سب کام؟

ایڈ:- اگر ایک ہی کام کیا جائے تو کام بہتر ہوگا۔

میں:- اور یہ بھی مسلم ہی کہ ہر کام کے لیے ایک مناسب وقت ہوتا ہی۔ اگر اسے ہاتھ سے جانے دیا تو پھر موقع واپس نہیں آتا۔

ایڈ:- جی ہاں۔ اس میں کیا کلام ہی۔

میں:- ہاں۔ اس لیے کہ کام تو وقت اور کرنیوالے کی فرصت یا عدیم الفرصتی کا خیال نہیں کرتا۔ کام کرنے والے کو بس اُس کے پیچھے پڑا رہنا چاہیئے تاکہ صحیح وقت پر کام ہو جائے۔

ایڈ:- بیشک۔

میں:- ان باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ کام کی سہولت مقدار اور عمدگی غرض ہر اعتبار سے یہی بہتر ہی کہ ایک شخص مناسب اوقات میں ایک ہی کام کرے اور دیگر مشاغل کو ترک کر دے۔ اور یہ ایک کام وہی ہو جس کے لیے وہ فطرتاً موزوں بنایا گیا ہی۔

ایڈ:- جی ہاں۔

میں:- یوں تو پھر ہمارے شہر کے لیئے چار سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت

پڑے گی، ہل یا اور ضروری آلات زراعت کسان خود تو تیار کریگا نہیں نہ معمار اپنے اوزار خود بنا سکیگا۔ نہ جولاہا یا موچی۔

ایڈ:۔ اور کیا۔

میں:۔ گویا بڑھئی اور لہار بھی ہماری چھوٹی سی خیالی ریاست کے رکن ہونگے خدا کا شکر ہے کہ ہمارا شہر رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اس میں اگر چرواہوں اور دوسرے مویشی پالنے والوں کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو کیا برائی ہے۔ ہماری ریاست کچھ ایسی زیادہ تو بڑھ نہ جائیگی ور کسانوں کے لیے عمدہ مویشیوں کی فراہمی کا انتظام ہو جائیگا۔ نیز جولاہوں کو اون اور موچیوں کو چمڑا آسانی سے ملجایا کریگا۔

ایڈ:۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔ ان تمام افراد کی یکجائی کے باوجود اس میں شک نہیں کہ ہماری ریاست بہت بڑی تو نہ ہوگی۔ لیکن ہاں اب اسے بہت چھوٹا بھی نہیں کہہ سکتے۔

میں:۔ ہاں ایک بات تو رہ ہی گئی۔ شہر کے لیے کوئی موقع تو تلاش کر دیں ایسی جگہ ملنا تو تقریباً ناممکن ہے جہاں ہر چیز مہیا ہو اور کسی چیز کی درآمد کی ضرورت نہ پڑے

ایڈ:۔ بالکل محال!

میں:۔ اس لیے ہمارے شہر کے باشندوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہونا چاہیے

جو دوسرے شہروں سے اشیاء ضروری لایا کرے۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ لیکن اگر یہ لوگ خالی ہاتھ گئے اور اپنے ساتھ وہ چیزیں نہ لے گئے جنکی ضرورت اس دوسرے شہر کے باشندوں کو ہو تو لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خالی ہاتھ لوٹینگے بھی

ایڈ:۔ لازمی طور پر۔

میں:۔ اس لیے ہمارے شہر کی تیار کردہ اشیاء صرف ہماری ہی ضروریات کے لیے کافی نہ ہونی چاہئیں بلکہ مقدار اور عمدگی دونوں کے اعتبار سے لازم ہے کہ وہ دوسرے شہروں میں بھی قابل قبول ہوں۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ اس کے معنی ہیں کہ کچھ اور کسانوں اور کاریگروں کی ضرورت ہوگی

ایڈ:۔ اور کیا۔

میں:۔ نیز درآمد برآمد کا کام کرنے والوں کی بھی ضرورت پڑے گی یعنی تاجروں کی۔

ایڈ:۔ یقیناً۔

میں:۔ اور اگر سامان تجارت کو سمندر پار لیجانا ہو تو ایک کثیر تعداد ہوشیار ملاحوں کی درکار ہوگی۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں :- آپ کو یاد ہوگا کہ ان تمام لوگوں کو یکجا کرنے اور ریاست کی ترتیب دینے کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ باہم اپنی اپنی اشیاء کا مبادلہ کر سکیں۔ یہ مقصد آپ اپنے خیالی شہر میں کس طرح حاصل کریں گے؟

ایڈ:- ظاہر ہے کہ خرید و فروخت کے ذریعہ سے۔

میں :- اس کے لیے ایک جائے مبادلہ یعنی بازار اور ایک ذریعہ مبادلہ یعنی نقود کی ضرورت پڑیگی۔

ایڈ:- بیشک۔

میں :- فرض کیجئے کہ ایک کسان مبادلہ کے لیے کوئی چیز لے کر بازار میں آیا لیکن اتفاق سے کوئی شخص اس وقت بازار میں ایسا موجود نہیں جو اس سے مبادلہ کر سکے۔ ایسی صورت میں کیا یہ اپنا تمام کام دھندا چھوڑ کر بازار میں بیکار پڑا انتظار کرتا رہے گا؟

ایڈ:- ہرگز نہیں۔ بازار میں ایسے لوگ موجود ہوں گے جو لوگوں کی ضروریات سے واقف ہوتے ہیں اور خرید و فروخت کا کام اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اچھی ریاستوں میں یہ کام عموماً ان لوگوں کے سپرد ہوتا ہے جو جسمانی حیثیت سے بہت کمزور اور کسی دوسرے کام کے لائق نہیں ہوتے۔ انکا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ بازار میں موجود رہیں۔ اگر کوئی بیچنے والا آئے تو جنس لے کر اُسے نقد دیدیں اور اگر خریدنے والا آئے تو نقد لے کر جنس فراہم کر دیں۔

ہوگا۔اس قسم کے دوکانداروں کو جنکا تمام تر کاروبار اپنے ہی شہر میں محدود ہو غالباً "خوردہ فروش" کہنا مناسب ہوگا بمقابلہ اُن لوگوں کے جو مختلف ممالک اور شہروں میں خرید و فروخت کرتے ہیں اور جنھیں ہم نے "تاجر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

میں:۔یعنی ہماری ریاست میں ایک طبقہ ان چھوٹے دوکانداروں کا بھی

ایڈ:۔جی ہاں۔درست۔

میں:۔اس کے علاوہ ایک ایسا طبقہ بھی تو ہوتا ہی جس کے افراد دماغی قوتوں کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کی ہمسری نہیں کرسکتے لیکن جسمانی حیثیت سے بہت قوی اور توانا ہوتے ہیں۔یہ لوگ اپنی محنت فروخت کرتے ہیں اور اُجرت لیکر دوسروں کا کام کرتے ہیں۔اس معاوضہ کا نام مزدوری ہے۔

ایڈ:۔جی ہاں۔

میں:۔ان مزدوری پیشہ لوگوں سے بھی ہماری ریاست کی آبادی میں اضافہ ہوگا؟

ایڈ: بیشک۔

میں:۔یہ سب تو ہوچکا۔اب آپ کی رائے میں ہماری ریاست مکمل ہوگئی یا نہیں؟

ایڈ:۔میرے خیال میں تو ہوگئی۔

میں: لیکن اس میں عدل اور نا انصافی کہاں ہیں؟ آخر یہ چیزیں بھی پیدا ہونگی یا نہیں؟

ایڈ: یہ صفات باشندوں کے باہمی لین دین اور کاروباری تعلقات کے سلسلہ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ کہاں پیدا ہونگی۔

میں: بیشک آپ کا خیال صحیح ہے۔ تو پھر آیئے دیکھیں اور تحقیقات کو جاری رکھیں۔ ہم نے شہر تو قائم کر ہی لیا اب سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہیے کہ باشندوں کا طرز بود و ماند کیا ہوگا۔ یہ لوگ غلہ پیدا کریں گے۔ شراب بنائیں گے۔ جوتے اور کپڑے سئیں گے۔ اور مکانات بھی تعمیر کریں گے۔ جب پہننے سینے کا سامان ہو جائیگا تو دوسرے مشاغل میں مصروف ہوں گے۔ محنت مشقت کرینگے۔ گرمیوں میں عموماً برہنہ تن اور ننگے پاؤں رہیں گے، سردی میں کپڑوں جوتوں کا معقول انتظام رکھیں گے۔ جو اور گیہوں کا آٹا گوندھ کر اچھی اچھی روٹیاں پکائیں گے۔ چٹائی یا صاف پتوں کا دسترخوان بنا کر اس پر یہ چیزیں چنیں گے اور بال بچوں کو ساتھ لیکر ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور شراب خانہ ساز سے لذت خمار حاصل کریں گے۔ سروں پر پھولوں کے گجرے ہوں گے اور اپنے دیوتاؤں کی تعریف میں گیت گائیں گے اور اس طرح خوش خوش اپنی زندگی گذار دینگے۔ اس امر کا بھی خیال رکھیں گے کہ خاندان میں آدمیوں کی تعداد ذرائع معاش سے بڑھ نہ جائے تاکہ جنگ و فلاکت کی دستبرد سے محفوظ رہ سکیں۔

گلاکن :- ریاست کا نمک، بھائیصاحب۔ غذا میں ذرا زبان کے چٹخارے کا تو خیال رکھا ہوتا۔

میں :- بیشک۔ معاف فرمائیے۔ میں بھول گیا۔ زبان کے مزے کے لیے نمک۔ زیتون کا تیل اور بالائی وغیرہ کافی ہیں۔ یہ لوگ اپنے دیہاتیوں کی طرح ساگ اور ترکاریاں اُبال لیا کرینگے۔ انجیر۔ سیمیں اور مٹر پھلوں کا کام دینگے۔ کبھی کسی چیز کی گٹھلیاں بھون لیا کریں گے۔ اور شراب ذرا اعتدال سے پئیں گے۔ اس قسم کی غذا استعمال کرکے میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ تندرستی اور آرام کے ساتھ بڑھاپے کی عمر تک پہنچ جائیں گے اور اپنی اولاد کے لیے بھی اپنی جیسی زندگی ترکہ میں چھوڑ جائینگے۔

گلاکن :- خوب جناب خوب، اگر آپ جانوروں کے ایک شہر کا انتظام کرتے تو غالباً وہ بھی ایسا ہی ہوتا۔ حیوانوں کو بھی تو اس سے بُری غذا نہیں دیجاتی۔

میں :- تو پھر آپ ہی اپنی راے فرمائیے۔

گ :- راے کیا۔ کم از کم ان غریبوں کے لیے دنیاوی زندگی کی معمولی آسائشیں تو مہیا ہونی چاہئیں۔ اگر ان کے آرام کا کچھ بھی خیال ہے تو اُنکے اُٹھنے بیٹھنے کے لیے آرام کرسیاں، کھانا کھانے کے لیے میزیں وغیرہ درکار ہیں۔ غذا میں انھیں طرز جدید کے مطابق چٹنیاں۔ اچار اور مٹھائیاں ملنی چاہئیں۔

میں :- میں اب سمجھا۔ آپ کی راے میں ہمارے پیش نظر محض ایک ریاست ہی نہیں بلکہ ایک آرام طلب اور عیش پسند ریاست کے نشو و نما کا سوال ہے میرا تو

اس میں کچھ ایسا نقصان نہیں۔ کیونکہ غالباً مؤخرالذکر قسم کی ریاست میں زیادہ آسانی سے معلوم ہو سکیگا کہ عدل اور ظلم کیونکر رونما ہوتے ہیں جیسے تو اپنے خیال کے مطابق ایک ریاست کا صحیح اور عمدہ نظام زندگی مرتب کر دیا تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اکثر لوگ اس سادہ طرز زندگی کو پسند نہیں کرتے اور ان کی رائے میں بھی میز کرسی اور اور دوسرے سامان آرائش و آسائش کی ضرورت ہوگی۔ اور جب یہی ٹھہرا تو مختلف قسم کے روغنیات و عطریات کی بھی ضرورت پڑیگی اور ہمیں محض ضروریات زندگی (مثلاً گھر۔ کپڑا۔ کھانا) سے بہت آگے بڑھنا پڑیگا۔ مصوری، سوزن کاری کے فنون سے کام لینا پڑیگا۔ اور سونے چاندی اور ہاتھی دانت کے زیورات کی فراہمی کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ تو ہمیں اپنی ریاست کی حدود بڑھانی ہونگی۔ سابقہ رقبہ تو ان نئی ضروریات کے لیے کافی نہ ہوگا۔ اور ہمیں اپنے شہر کو ایسے پیشہ والوں سے بھرنا پڑیگا جن کی ضرورت کسی فطری احتیاج کی وجہ سے نہیں ہوتی مثلاً ایک قبیلہ کا قبیلہ شکاریوں کا ایک جماعت ناٹک والوں کی جن کا کام زیادہ تر رنگ و روپ سے رہیگا، کچھ مطرب و مغنی ہوں گے اور کچھ شاعر اور ان کے دم چھلّے۔ بھاٹ نچکیے اور نقال۔ مختلف چیزوں کی تیاری کے لیے اور خصوصاً عورتوں کے لباس وغیرہ کے لیے کاریگروں کی ضرورت پڑیگی یہی نہیں اس کے علاوہ ملازموں کی بھی ضرورت ہوگی مثلاً معلم،

آیائیں، دائیاں، حجام، حلوائی اور باورچی وغیرہ۔ سوروں کے لیے گلہ بانوں کی الگ ضرورت ہوگی جن کی ہماری پہلی ریاست میں حاجت نہ تھی اور اس لیے سابقہ دستورالعمل میں انھیں جگہ نہیں دی گئی تھی۔ اور یہ کیا اگر لوگ گوشت کھانے لگے تو بہت سے جانوروں کے پالنے کا اہتمام کرنا پڑیگا۔

گ:۔ یقیناً۔

میں:۔ اس طرز زندگی میں غالباً بہ نسبت سابق طبیبوں کی بہت زیادہ ضرورت پڑے گی۔

گ: بلاشبہ۔

میں:۔ جو رقبۂ زمین سابقہ باشندوں کے لیے کافی تھا اب چھوٹا پڑیگا

گ:۔ اس میں کیا شک ہے۔

میں:۔ تو ہمیں اپنے ہمسایہ کی زمین میں سے چراگاہوں اور جوتنے بونے کے لیے تھوڑا بہت ٹکڑا ضرور دبانا پڑیگا۔ اور اگر ہمارے ہمسایہ بھی ہماری طرح فطری احتیاج کی حدود سے تجاوز کرکے مال و دولت کی ہوس میں گرفتار ہوگئے تو وہ بھی اسی طرح ہماری زمین غصب کرنے کی فکر کریں گے۔

گ:۔ بیشک۔ اس سے تو کوئی مفر نہیں۔

میں:۔ تو کیوں بھائی گلاکن اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیں جنگ کرنا پڑیگی۔

گلاکن:۔ یقیناً۔

میں :- قطع نظر اس کے کہ جنگ فی نفسہ سود مند ہے یا ضرر رساں ہم نے یہ معلوم کر لیا کہ جنگ کے اسباب بھی وہی ہیں جن سے ریاست کے دوسرے مصائب خواہ شخصی ہوں یا اجتماعی پیدا ہوتے ہیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اس مرتبہ بھی ہمیں اپنی ریاست کی مزید توسیع کرنی ہوگی۔ اور اکی تو ایک پوری فوج کا اضافہ ضروری ہوگا جو باہر جا کر حملہ آور کا مقابلہ کر سکے اور ہمیں اور ہماری مملوکہ اشیاء کو اُن کے دستبرد سے محفوظ رکھے۔

گ :- کیوں کیا ہم لوگ خود اپنی حفاظت نہ کر سکیں گے؟

میں :- ہاں اگر وہ اُصول جسے ہم نے اپنی ریاست کے دستور کی ترتیب کے وقت تسلیم کیا تھا صحیح ہے تو بیشک ایسا ممکن نہیں۔ تمھیں یاد ہوگا کہ وہ اُصول یہ تھا کہ ایک آدمی بہت سے فنون میں کامیابی کے ساتھ مشغول نہیں ہو سکتا۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- تو کیا جنگ کرنا آپ کی رائے میں کوئی فن نہیں؟

گ :- یقیناً ہے۔

میں :- پھر کیا اس میں اتنی توجہ درکار نہیں ہوتی جتنی جوتا سینے میں؟

گ :- خوب! کیوں نہیں، ضرور ہوتی ہے۔

میں :- ہم نے موچی کو کاشتکاری یا معماری کے کام کی اجازت محض

اس لیے نہیں دی تھی کہ ہمارے جوتے اچھے تیار ہوں۔ اور اسپر کیا موقوف ہے ہر شخص کو صرف وہ ایک کام تفویض کیا گیا تھا جس کے لیے وہ فطرتاً خاص طور پر موزوں ومناسب ہو، یہی کام اسے عمر بھر انجام دینا چاہیئے کہ اس کے ہاتھ سے ترقی کے مواقع نہ نکل جائیں اور وہ اپنے فن میں ماہر ہو جائے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ہمارے لیے اس سے زیادہ اور کونسی بات اہم ہوگی کہ سپاہی کا کام خوبی کیسا تھ انجام دیا جائے۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ جنگ کوئی ایسا آسان فن نہیں کہ آدمی دوسرے مشاغل مثلاً کاشتکاری وغیرہ میں بھی مصروف رہے اور سپاہی کا کام بھی انجام دیتا رہے۔ یوں تفریح ہی تفریح میں تو آدمی تاش اور شطرنج تک کا ماہر نہیں بن سکتا مہارت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اوائل عمر ہی سے ایک کام میں مشغول رہے اور کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے۔ جس طرح خالی اوزار آدمی کو اہل حرفہ نہیں بنا سکتے اسی طرح صرف ہتھیاروں سے آدمی مدافعت کے قابل نہیں ہو جاتا جب تک اچھی طرح انکا استعمال کرنا نہ جانتا ہو محض آلات حرب سے مسلح ہو کر اور ہاتھ میں ایک سپر لے کر ایک ہی دن میں آدمی جنگجو سپاہی تو نہیں بن سکتا۔

گ :۔ بیشک ایسے ہتھیار تو ملتے نہیں کہ آدمی خود بخود انکا استعمال سیکھ لے۔

س :۔ چنانچہ ہمارے محافظوں کے فرائض جس قدر اہم ہوں گے اسی قدر زیادہ وقت اور مہارت۔ توجہ اور محنت کی ضرورت ہوگی۔

گ :۔ بلاشبہ۔

میں:- ہاں، اور اس کام کے لیے بھی فطری مناسبت ضروری ہے۔

گ:- بیشک۔

میں:- یعنی ہمیں انتخاب سے کام لینا ہوگا کہ کون طبائع شہر کی حفاظت کے لیے مناسب ہیں اور کون نہیں۔

گ:- یقیناً۔

میں:- یہ انتخاب کچھ آسان نہیں لیکن خیر ہمیں ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔

گ:- ہرگز نہیں۔

میں:- حفاظت اور نگرانی کرنے کے معاملہ میں کیا ایک جوان صالح کی مثال نسلی کُتے کی سی نہیں؟

گ:- میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا۔

میں:- میرا مطلب یہ ہے کہ حفاظت کرنیوالا جوان بھی کُتّے کی طرح نگاہ کا تیز ہو اور جب دشمن کو دیکھ لے تو حملہ کرنے میں چستی سے کام لے۔ نیز مضبوط بھی ہو کہ اگر دشمن کو پکڑ لے اور اُس سے لڑنا پڑے تو اُس پر غالب آجائے۔

گ:- بیشک یہ تمام صفات نہایت ضروری ہیں۔

میں:- اور جنگ کرنے کے لیے بہادری کا ہونا لازمی ہے۔

گ:- بیشک۔

میں:- لیکن کیا کوئی جانور، گھوڑا ہو یا کتّا بغیر جرأت کے بہادر ہو سکتا ہے۔

تم نے دیکھا ہوگا کہ جرأت پر کسی کو فتح حاصل نہیں ہوتی اور اس کی موجودگی روح کو نڈر اور قوی بنا دیتی ہے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اب ہمیں صحیح اندازہ ہو گیا کہ محافظوں میں کیا کیا جسمانی صفات ہونی چاہئیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور دماغی صفات کے متعلق بھی یہ اندازہ ہو گیا کہ جرأت کا ہونا ضروری ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- لیکن یہ بھی تو احتمال ہے کہ جری لوگ آپس میں اور دوسروں سے وحشیانہ برتاؤ کریں گے۔

گ :- بلاشبہ یہ عیب تو بڑی مشکل سے رفع ہو سکتا ہے۔

میں :- حالانکہ چاہیئے کہ یہ لوگ دشمنوں سے سختی اور دوستوں سے نرمی کا برتاؤ کریں ورنہ یوں تو قبل اس کے کہ کوئی دشمن ان کی تباہی کا باعث ہو یہ خود اپنے آپ کو برباد کر لیں گے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن خیر اس کا علاج کیا ہے۔ ہمیں ایسے آدمی کہاں ملیں گے جو خوش طبع اور حلیم ہوں اور ساتھ ہی جرأت بھی رکھتے ہوں۔ کیونکہ یہ دونوں صفات

ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

گ :۔ بیشک ایسا تو ہی۔

میں :۔ مگر بڑی دقت تو یہ ہی کہ جہاں ان صفات میں سے ایک کی بھی کمی ہوئی تو وہ آدمی اچھا محافظ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ان صفات کا یکجا ہونا ناممکن سا معلوم ہوتا ہی یعنی دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوے کہ اچھے محافظ کا ملنا محال ہی۔

گ :۔ آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں مجھے بھی یہی اندیشہ ہی۔ اس گفتگو سے میں کچھ پریشان سا ہو گیا اور مجھے سابقہ گفتگو پر تھوڑا سا غور کرنا پڑا۔

میں :۔ مہربان من ہماری پریشانی بالکل ناگزیر تھی اور مجھے اسپر مطلق تعجب نہیں۔ ہم نے خود ہی اس شکل کو بالکل فراموش کر دیا جو ابتدا میں ہمارے پیش نظر تھی۔

گ :۔ وہ کیا؟

میں :۔ میرا مطلب یہ ہی کہ ایسے طبائع بھی موجود ہیں جن میں یہ متضاد صفات یکجا پائی جاتی ہیں۔

گ :۔ مثلاً۔

میں :۔ اکثر جانوروں میں آپ کو اس کی مثالیں ملیں گی چنانچہ خود کتا بہت اچھی مثال ہی۔ آپ یہ تو جانتے ہی ہونگے کہ اچھی نسل کے کتے ہمیشہ واقفکاروں سے اچھی طرح پیش آتے ہیں اور اجنبیوں سے بُری طرح۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- تو پھر ایسے محافظین کا ملنا بھی ناممکن یا قوانین قدرت کے خلاف نہیں ہوسکتا جن میں یہ دونوں صفتیں موجود ہوں۔

گ :- صحیح ہے۔

میں :- گویا جو لوگ حفاظت کے کام کے لیے موزوں ہونگے ان میں جرأت کے علاوہ ایک فلسفی کی سی صفات بھی ہونی چاہئیں۔

گ :- میں جناب کا مفہوم بالکل نہیں سمجھا۔

میں :- میں جس صفت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں وہ کتّے میں بھی پائی جاتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ایک جانور میں اسکا وجود بڑی عجیب بات ہے۔

گ :- آخر وہ صفت ہے کیا؟ میں تو اب بھی نہیں سمجھا۔

میں :- بھائی اس میں کونسی دشواری ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کتا کسی اجنبی شخص کو دیکھتا ہے تو غصہ کرتا ہے اور جب کسی جان پہچان والے کو دیکھتا ہے تو خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ حالانکہ نہ اول الذکر سے اسے کبھی کوئی نقصان پہنچا ہے اور نہ مؤخر الذکر سے کوئی فائدہ۔ تم نے اس عجیب و غریب صفت پر شائد کبھی غور نہیں کیا؟

گ :- ہاں تعجب ہے مجھے اس سے پہلے کبھی اس کا خیال نہیں ہوا البتہ اب محسوس کرتا ہوں کہ آپ کا ارشاد بالکل واقعہ ہے۔

میں :- سوچو تو سہی کہ کتے کا یہ قدرتی وصف کس قدر عجیب ہے۔ کتا گویا ایک حقیقی فلسفی ہے!

گ :- یہ کیوں کر؟

میں :- چونکہ اس کے نزدیک دوست اور دشمن کے درمیان وجہ امتیاز علم اور جہل ہے اور وہ جانور علم کا کیسا شیدائی ہوگا جو جہل کے مقابلہ میں علم کو پسندیدگی کا معیار مقرر کرے۔

گ :- بجا ارشاد ہے۔

میں :- اور علم کی محبت و عقل و حکمت کی الفت دونوں مرادف ہیں۔ اور اسی کو دوسرے لفظوں میں فلسفہ کہتے ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- تو پھر کیا ہم یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انسانوں میں بھی وہی شخص دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریگا جو بالطبع عقل اور علم سے محبت رکھتا ہو۔

گ :- کیوں نہیں ہم یقیناً یہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔

میں :- لہٰذا ریاست کا بہترین محافظ ہونے کے لیے جہاں جرأت و دلیری، طاقت و چستی کی ضرورت تھی وہاں فلسفی ہونا بھی لازمی قرار پایا۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- ہمیں اس بات کا پتہ تو چل گیا کہ محافظوں کے لیے کس قسم کی طبائع ضروری ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کیا انتظام کیا جائے میرا گمان ہے کہ اس مسئلہ پر غور کرنے سے ہمارے اصلی مقصد تحقیق پر بھی کافی روشنی پڑیگی یعنی یہ کہ ریاست میں عدل و ظلم کس طرح پیدا ہو کر نشو و نما پاتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو اس سوال پر غور کیا جائے ورنہ بیکار سلسلۂ کلام کو طول دینے سے کیا حاصل۔

ایڈ :- میرے خیال میں اس مسئلہ کی تحقیق سے بہت مفید نتائج برآمد ہونیکی امید ہے۔

میں :- اگر یہ بات ہے تو میری رائے میں باوجود خوف طوالت کے اس سلسلہ کو ختم نہ کرنا چاہیئے۔

ایڈ :- ہرگز نہیں۔

میں :- تو آؤ سمجھ لیں کہ کچھ وقت خیالی فسانہ گوئی میں ہی صرف ہوا جس کا عنوان ہے "اپنے محافظوں کی تعلیم و تربیت"!

ایڈ :- ضرور۔

میں :- پھر کیسے انھیں کیا تعلیم دینی چاہیے؟ میرے نزدیک تو رسماً جو تعلیم کی جاتی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے یعنی جسم کے لیے ورزش اور روح و دماغ کے لیے موسیقی

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اور اس میں کیا کچھ نقصان ہے کہ ہم تعلیم موسیقی سے شروع کریں اور

پھر بعد کو ورزش جسمانی سکھائیں۔

ایڈ:۔ کوئی نقصان نہیں۔

میں:۔ اور موسیقی میں تو علم ادب بھی شامل ہوگا۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ اور ادب میں سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ ان دونوں قسموں کی تعلیم دینی ہوگی اور میری رائے میں ابتدا جھوٹے ادب سے ہونی چاہیئے۔

ایڈ:۔ یہ کیسے؟ میں سمجھا نہیں۔

میں:۔ کیوں۔ آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ بچوں کو جو قصّے کہانیاں سنائی جاتی ہیں وہ اگرچہ حقیقت سے بالکل مبرّا نہ سہی تاہم اکثر وبیشتر محض فسانہ ہی فسانہ ہوتی ہیں۔ یہ کہانیاں اس وقت سنائی جاتی ہیں جب بچہ ورزش جسمانی کے لائق نہیں ہوتا۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ ورزش جسمانی سے پہلے موسیقی کی تعلیم دینے کا یہ مطلب تھا۔

ایڈ:۔ بجا ہے۔

میں:۔ اور آپ یہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ ہر کام کا آغاز ہی

اس کا سب سے اہم حصہ ہوتا ہے خصوصاً بچوں اور دوسری نازک چیزوں کے معاملہ میں کہ اسی زمانہ میں اخلاق کا نشو و نما ہوتا ہے اور مطلوبہ اثرات بہت آسانی سے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔

ایڈ :۔ بیشک۔

میں :۔ تو کیا ہم اپنے بچوں کو ہر کس و ناکس کے تصنیف کردہ قصے سُننے دیں گے اور کیا یہ جائز ہے کہ ہم ان کے دماغوں کو بڑے ہونے پر جن خیالات و جذبات کا جولانگاہ دیکھنا چاہتے ہیں بچپن میں اس کے بالکل مخالف خیالات انکے ذہن نشین ہونے دیں۔

ایڈ :۔ ہرگز نہیں۔

میں :۔ اس لیے سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ فسانہ نگاروں کی نگرانی کے لیے ایک محکمہ نظارت قائم کیا جائے۔ ناظر اچھے قصوں کو منظور کرلیں اور بُروں کو خارج کر دیا کریں۔ پھر ماؤں اور دائیوں کو یہ حکم دیدیا جائے کہ بچوں کو صرف منظور شدہ قصے سنائیں اور جس طرح وہ اب اپنے ہاتوں سے بچوں کے جسم کو سنوارتی ہیں اس سے زیادہ شوق و محبت کے ساتھ ان کہانیوں کے ذریعہ ان کے دماغوں کو مزین کریں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر اکثر رائج الوقت کہانیاں خارج کردینی چاہئیں

ایڈ :۔ جناب کا اشارہ کن کہانیوں کی طرف ہے؟

میں :۔ آپ کے بڑے بڑے اور مشہور افسانے درحصل ان چھوٹی کہانیوں

کے یہ نمونہ ہیں کیوں کہ یہ سب ایک ہی نوع کی مختلف اقسام ہیں اور ان سب میں خیالات کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ایڈ۔ بہت ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن میں ہنوز نہیں سمجھا کہ آپ کن قصوں کو مشہور متصور کرتے ہیں۔

میں :۔ میرا مطلب ہومر، ہیسیاڈ اور ان شعرا کی تصنیف کردہ قصوں سے ہے جو نوع انسانی کے مشہور ترین فسانہ گو گذرے ہیں۔

ایڈ :۔ لیکن حضرت ان لوگوں کے کون سے قصوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔ اور ان میں آپ کیا معائب پاتے ہیں؟

میں :۔ سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں جھوٹے بیانات ہوتے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ جھوٹ بھی بُرے قسم کا جھوٹ۔

ایڈ :۔ مثلاً۔

میں :۔ ان کی مثال وہ غلط بیانیاں ہیں جو دیوتاؤں اور مشاہیر کے متعلق ان قصوں میں کی جاتی ہیں۔ اور اس غلط بیانی کی مثال بالکل اس تصویر کی سی ہے جسے اصل سے مطلق مشابہت نہ ہو۔

ایڈ :۔ بیشک۔ یہ بات درحقیقت مستحق مواخذہ ہے۔ لیکن ایسا کوئی قصہ تو بتلائیے۔

میں :۔ سب سے پہلے تو وہ بڑی اور بُری دروغ گوئی ہے جو شاعر نے

یورانس کے متعلق کی ہیں میرا اشارہ ان بیانات کی طرف ہے جو ہیسیاڈ نے یورانس کے اعمال اور کرونس کے انتقام کے متعلق کیے ہیں۔ پھر خود کرونس کے افعال اور ان کے بدلے میں اس کے بیٹے نے جو جو تکالیف اپنے باپ کو دیں اگر سب سچ بھی ہوں تو بھی بلا سوچے سمجھے کم عمر لوگوں کے سامنے ان کا بیان کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور میری راے میں تو ان افسانوں کو ہمیشہ کے لیے قعر خاموشی میں مدفون کر دیا جاے۔ لیکن اگر ان واقعات کا بیان کیا جانا ایسا ہی ضروری ہے تو کسی قربانی کے موقع پر چند مخصوص اشخاص کے سامنے خفیہ طور پر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس موقع کے لیے بجاے ایک معمولی سور کی قربانی کے کسی قیمتی اور کمیاب جانور کی قربانی فرض قرار دینی چاہیے تاکہ سامعین کی تعداد حتی الوسع کم ہو۔

اید :- آپ کی راے نہایت مناسب ہے۔ یہ قصے بہت ہی قابل اعتراض ہیں۔

میں :- تو پھر ہم اس قسم کے تمام قصوں کو اپنی ریاست میں ممنوع قرار دیں گے۔

لہ یورانس یونانی ادب قدیم میں آسمان کے دیوتا کا نام ہے اسکی شادی زمین کی دیوی گیا سے ہوئی تھی اور اسکی کثرت سے اولاد تھی۔ یورانس اپنی اولاد سے سخت نفرت کرتا تھا اور سب کو قید کر رکھا تھا گیا کے اشارہ سے اسکے بیٹے کرونس نے اسپر حملہ کیا اور تخت سے اُتار دیا۔ کرونس کے برسر تخت آنے پر اُس کے بیٹے زیس نے یہی سلوک اس کے ساتھ کیا اور اپنے باپ کو سخت اذیت پہنچائی۔

کیونکہ کمسن اور جوان آدمیوں کے دل میں ہرگز یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیئے کہ سخت سے سخت جرم کے ارتکاب میں بھی چنداں زیادہ بُرائی نہیں ہے اور وہ اپنے باپ تک کو ہر طریقے سے سزا دینے اور اذیت پہنچانے میں صرف ایک اعظم ترین دیوتا کے طرز عمل کا اتباع کرتے ہیں۔

ایڈ:۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں اور میری رائے میں بھی ان قصوں کا کہنا یکلخت بند کر دینا چاہیئے۔

میں:۔ اس کے علاوہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے محافظ آپس میں لڑنے جھگڑنے کو بدترین عادت متصور کریں تو ہمارا فرض ہے کہ انھیں آسمانی جنگوں کے متعلق ایک حرف بھی نہ سننے دیں نہ اُن سازشوں اور باہمی تنازعات کا مطلق ذکر کرنا چاہیے جو دیوتاؤں کے درمیان بتلائے جاتے ہیں کیوں کہ یہ تمام کی تمام روائتیں سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ نہ ہم کو ان روایات کا ذکر کرنا چاہیئے جنھیں دیوتاؤں کے باہمی معرکہ آرائیوں کے حالات بیان کیے جاتے ہیں اور نہ کپڑوں پر ان معرکوں کے کشیدے کاڑھنے کی اجازت دینی چاہیئے۔ نیز ان دیگر بے شمار جھگڑوں کے متعلق بھی ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے جو دیوتاؤں اور مشاہیر یا ان کے احباب و اقربا میں ہوئے۔ اگر یہ لوگ باور کریں تو ہم تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہیں کہ جنگ و جدال سخت ناپاک کام ہے اور آج تک اپنے شہروں میں کبھی جھگڑا فساد نہیں ہوا۔ زمانہ طفولیت میں ان بچوں کے سامنے یہ باتیں

ضعیف العمر عورتوں اور معمر لوگوں کو بیان کرنی چاہئیں۔ اور اس کے بعد جب ذرا بڑے ہو جائیں تو شعرا کو ایسے خیالات نظم کر کے ان کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔ مگر اس قسم کے بیانات کہ ہیفیسٹس نے اپنی ماں ہیری کو باندھ کر ڈال دیا یا دوسرے موقع پر زیس نے اسے اس قصور پر مار کر نکال دیا تھا کہ اس نے مار پڑتے وقت اپنی ماں کی طرفداری کی تھی ہم ہرگز اپنی ریاست میں روا نہ رکھیں گے خواہ شاعر نے انھیں تمثیلاً و استعارتاً ہی کیوں نہ استعمال کیا ہو۔ کیونکہ ایک کمسن آدمی یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ اس سے لفظی معنی مراد ہیں یا محض تمثیل۔ اور اس عمر میں ذہن کی حالت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جس چیز کا اثر ہو گیا بس پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے۔ اور اسی لیے یہ بات اور بھی ضروری ہے کہ بچپن میں جو قصے کہانیاں سنائی جاتی ہیں ان میں اخلاق حسنہ اور پاک خیالات کا نمونہ پیش کیا جائے۔

اڈ:۔ جناب کا یہ فرمانا تو بالکل درست ہے لیکن یہ کہیے کہ اگر کوئی آپ سے پوچھ بیٹھے کہ اس قسم کی کہانیاں ملیں گی کہاں سے تو آپ کے پاس کیا جواب ہے؟

س:۔ برادر عزیز۔ تم اور میں اس وقت ایک شاعر کی حیثیت نہیں رکھتے

لہ ہیفیسٹس آگ اور آگ سے متعلق فنون کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ ہومر نے دیوتاؤں کے جائے قیام یعنی اولمپس سے اس کے اخراج کا مفصل بیان دیا ہے وہ صرف اس قصور پر کہ اس نے کسی وقت اپنی ماں ہیری کو باپ کی زد و کوب سے محفوظ رکھنا چاہا تھا۔
ہیری۔ آسمانوں کی ملکہ تھی۔ زیس کی بہن بھی تھی اور بیوی بھی!

بلکہ ہم تو ایک یاست کا نظام اساسی مرتب کر رہے ہیں۔ اور ریاست کے بانیوں کا کام صرف اس قدر ہے کہ شعرا کو وہ طرز بتلا دیں جس پر قصے لکھنا چاہیئے نیز انھیں ان کی حدود سے آگاہ کر دیں۔ لیکن ان کے ذمہ یہ کام ہرگز عائد نہیں ہوتا کہ وہ خود ہی قصے کہانیاں تصنیف بھی کریں۔

ایڈ :۔ درست۔ لیکن خیر یہ طرز کیا ہونا چاہیئے؟

میں :۔ شاعروں کو ہر قسم کی نظم میں اس امر کا خاص التزام رکھنا چاہیئے کہ خدا کو بالکل حقیقت کے مطابق ظاہر کریں۔ اس میں مثنوی، غزل یا قصیدہ کی کوئی قید نہیں۔

ایڈ :۔ خوب۔

میں :۔ اور خدا فی الحقیقت خیر و برکت ہے۔ اس کے اچھے ہونے سے کسے انکار ہو سکتا ہے، اس لیے نظم میں بھی اس کی یہی حقیقت پیش کرنی چاہیئے۔

ایڈ :۔ بیشک۔

میں :۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ اچھی چیز نقصان دہ نہیں ہوتی۔

ایڈ :۔ بلاشبہ۔

میں :۔ اور نقصان دہ نہ ہونے کے یہی معنی تو ہیں کہ کسی کو اس سے ضرر نہیں پہنچتا۔

ایڈ :۔ اور کیا۔

میں :- اور جس چیز سے کوئی ضرر یا نقصان نہیں پہنچتا وہ برائی کا سبب کیوں کر ہو سکتی ہے؟

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- اور آپ غالباً یہ بھی تسلیم کر لینگے کہ اچھی چیز فائدہ رساں یعنی باعث فلاح ہوتی ہے۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اس تمام تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیر اور اچھائی صرف خیر کا سبب ہو سکتی ہے۔ اسے آپ ہر چیز کی وجہ نہیں قرار دے سکتے۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- گویا عوام کے خیال کے خلاف ہماری رائے یہ ہے کہ خدا جو عبارت ہے خیر و برکت سے ہر چیز کا خالق نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف چند چیزوں کی تخلیق کا تو سبب ضرور ہے لیکن اکثر کا نہیں۔ اس لیے کہ حیات انسانی بیشتر عیوب و مضرتوں سے مملو ہے۔ ان عیوب کی تخلیق کا سبب کہیں اور تلاش کرنا چاہیے کیونکہ خدا کے ساتھ تو صرف خیر و برکت کی تخلیق منسوب کی جا سکتی ہے۔

ایڈ :- میری رائے میں بھی جناب کا یہ خیال بالکل بجا ہے۔

میں :- لہٰذا ہم ہومر اور دوسرے شعرا کے تمام ایسے بیانات کو باور کرنے سے انکار کریں گے کہ "بارگاہ زیوس کے آستانہ پر دو ظرف رکھے ہیں۔ ایک میں

اچھی تقدیریں ہیں، دوسرے میں بُری جس آدمی کو زئیس ان دونوں میں سے کچھ کچھ حصہ دیتا ہی وہ اگر کبھی آرام و مسرت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں اور کبھی آلام مصائب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن جن غریبوں کو صرف بُری تقدیر والے ظرف سے حصہ ملتا ہی وہ تمام لذائذ دنیا سے محروم، ابدی احتیاج کی زندگی گذارتے ہیں" نہ ہم تسلیم کریں گے کہ "زئیس ہر خیر و شر کا سبب ہی"۔ یا اگر کوئی شخص ۱؎ دروغ حلفی اور عہد شکنی کو جو فی الواقع پنڈارس کی کارستانی تھی ایتھینی اور زئیس کی طرف منسوب کرے تو ہم ہرگز اسے نہ مانیں گے۔ نہ ہمارے نزدیک یہ بات قابل قبول ہی کہ تھیمس ۲؎ اور زئیس نے دیوتاؤں کو جنگ وجدال پر آمادہ کیا" اسی طرح ہم اپنے نوجوان طبقہ کو ایسکلس کے اس قسم کے اقوال بھی نہ سننے دیں گے کہ "جب خدا کسی خاندان کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہی تو اس میں افعال قبیحہ کی بنا ڈال دیتا ہی" یا اگر کوئی شاعر نیوبی ۳؎ کے مصائب یا خاندان پیلاپ کی تکالیف

۱؎ (حاشیہ صفحہ ۱۱۰) زئیس یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ جنگ میں شکست و فتح، قیام امن۔ اور معیار خیر و شر کا مقرر کرنا اور قوانین اخلاق کی نگرانی سب اس کے ذمہ تھی۔ اس کی کئی بیویاں تھیں اور نہایت کثیر الاولاد تھا۔

۲؎ تھیمس یورانس (صفحہ ۱۱۸) کی بیٹی اور زئیس کی بیوی تھی اسے یونانی زمین کے توازن و تناسب کی دیوی مانتے تھے۔

۳؎ نیوبی ایمفئین شاہ تھیبس کی بیوی تھی۔ اس کے بہت سے بیٹے تھے۔ ماں نے غرور کے کیتو سے مقابلہ کرنے لگی کہ اس کے صرف دو بیٹے تھے اپولو

یا جنگ ٹروجن کے حالات نظم کرے تو اسے اس امر کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ چاہیئے کہ ان واقعات کو ذات باری کی طرف منسوب کرے اور اس نسبت پر اصرار ہی ہو تو اس کی کوئی نہ کوئی تاویل ضرور ہونی چاہیئے مثلاً یہ کہ خدا نے یہ سب کچھ حق و انصاف کی حمایت میں کیا تھا اور اسکا اصلی مقصد بدکاروں کی تادیب و اصلاح تھا۔ یہ ہرگز نہ کہنا چاہیئے کہ یہ سزا انکی تخریب کا باعث ہوئی۔ ہاں شاعر یہ لکھ سکتا ہے کہ برے لوگ تکلیف اور مصیبت میں اس لیے مبتلا رہتے ہیں کہ وہ اپنی برائی کی وجہ سے سزا کے مستحق ہیں اس سزا سے ان کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اسطرح انھیں کا فائدہ ہوتا ہے لیکن ایک صحیح اصولوں پر مرتب ریاست میں کوئی مصنف نظم یا نثر میں یہ کہنے کا مجاز نہ ہوگا کہ خدا لوگوں کے ساتھ برائی کرتا ہے۔ کیوں کہ اس قسم کے بیانات سخت ناپاک ضرر رساں اور مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

ایڈ:۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں اور اس قانون کی تائید کیلیے تیار ہوں۔

میں:۔ گویا ہمارا ایک اصول یا ہمارے قانون کی ایک دفعہ یہ قرار پائی کہ خدا ہر چیز کا پیدا کرنے والا نہیں بلکہ صرف خیر و نیکی کا خالق ہے اس دفعہ کی پابندی تمام شعراء اور متکلمین پر لازم ہوگی۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۱) اور آرٹمس ان دونوں نے نیوبی کے تمام بچوں کو قتل کر ڈالا اور خود بیچاری نیوبی کو زیئس نے پتھر کا کر دیا۔ اس حالت میں بھی یہ اپنے بچوں کی موت پر اشک افشانی کرتی رہی!

ایڈ:- ضرور۔

میں :- اور دوسرے اصول کے متعلق آپ کی رائے کیا ہی؟ کیا آپ کے نزدیک خدا ایک جادوگر یا بھانمتی ہی کہ کبھی ایک شکل میں ظاہر ہوتا ہی اور کبھی دوسرے روپ میں۔ کیا وہ ہر گھڑی اپنی صورت تبدیل کرتا رہتا ہی اور اس تغیر شکل سے ہمیں دھوکا دیتا ہی۔ یا کہ وہ اپنی مخصوص شکل میں ازل سے ابد تک بلا تغییر و تبدیل دائم و قائم ہی؟

ایڈ:- میں بلا غور کیے ہوے اس سوال کا جواب نہیں دیسکتا۔

میں :- لیکن آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ اگر کسی چیز میں کوئی تغیر و تبدل پیدا ہو تو یا تو اس تبدیلی کی وجہ خود اس شے کا ذاتی فعل ہوتا ہی یا پھر کسی خارجی سبب سے یہ تبدیلی رونما ہوتی ہی۔

ایڈ:- جی ہاں۔ دونوں میں سے ایک صورت لازمی ہی۔

میں :- اور غالباً آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ کوئی چیز جب اپنی بہترین حالت میں ہو تو اس میں تغیر کا بہت کم احتمال ہوتا ہی۔ مثلاً کامل تندرستی اور صحت کے زمانہ میں جسم انسانی خورونوش سے بہت کم متغیر ہوتا ہی۔ یا اگر کوئی پودا خوب سرسبز وشاداب ہو تو آندھیوں اور دھوپ سے مقابلۃً بہت کم متاثر ہوگا۔

ایڈ:- بیشک۔

میں :- اسی طرح عقلمند اور بہادر طبائع اسباب خارجی سے بہت کم پریشان

ہوتی ہیں۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ یہی اُصول میری رائے میں دیگر اشیا مثلاً اسباب آرائش مکانات وملبوسات وغیرہ پر بھی عائد ہوتا ہے کہ یہ چیزیں جس قدر عمدہ اور اچھی بنی ہوں گی اسی قدر امتداد زمانہ اور دوسرے اسباب سے کم متاثر ہوں گی۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ گویا ہر چیز جس قدر اچھی ہوگی اُسیقدر اُس میں تغیر کا امکان کم ہوتا ہے خواہ یہ چیز انسانی دستکاری کا نتیجہ ہو قدرت کی مصنوعہ ہو یا دونوں کی متحدہ مساعی کا حاصل۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ لیکن خدا اور اس کے متعلقہ صفات تو ہر حیثیت سے بہترین اور کامل ترین ہیں۔

ایڈ:۔ بلاشبہ۔

میں:۔ لہٰذا خارجی اثرات تو اُسے شکل تبدیل کرنے پر مجبور کر نہیں سکتے۔

ایڈ:۔ ہرگز نہیں۔

میں:۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ خود اپنی ذات میں یہ تغیرات پیدا کرتا ہو۔

ایڈ:۔ جی ہاں اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کی شکل میں تبدیلی ہوتی ہے تو

پھراس کی صرف یہی ایک صورت ہو۔

میں :۔ بہت مناسب۔ لیکن اب سوال یہ ہو کہ اگر وہ اپنی شکل تبدیل کرتا ہو تو پہلے سے بہتر اور زیادہ خوبصورت شکل اختیار کرتا ہو یا بری اور بدنما۔

ایڈ :۔ اگر تبدیل شکل کا ہونا تسلیم ہی کرلیا جاے تو صرف یہی ایک صورت ممکن ہو کہ وہ پہلے سے بُری شکل اختیار کرے۔ کیونکہ صورت وسیرت کے اعتبار سے اسمیں کوئی نقص یا کمی تو ہی نہیں کہ اسے رفع کرکے بہتر شکل میں رونما ہوسکے۔

میں :۔ اس میں آدمی یا خدا کی کچھ تخصیص نہیں کوئی بھی تو اپنے کو بدشکل نہیں بنانا چاہتا۔

ایڈ :۔ ہاں۔ ہرگز نہیں۔

میں :۔ تو پھر یہ ناممکن ہو کہ خدا اپنی شکل متغیر کرے۔ اس سے بہتر اور خوبتر شکل کا خیال تک فہم وادراک سے باہر ہو اس لیے یہ ماننا پڑیگا کہ خدا اپنی اصلی شکل پر ہمیشہ قائم رہتا ہو۔

ایڈ :۔ بیشک یہ تو لازمی بات ہو۔

میں :۔ لہذا کسی شاعر کو اس بات کی اجازت نہ ہونی چاہیے کہ دیوتاؤں پر اس قسم کے اتہام لگاے کہ " وہ اجنبی باشندوں کا بھیس بدل کر ہمارے شہروں میں ادھر اودھر مارے مارے پھرتے ہیں " نہ پروٹیس[1] اور تھیٹس پر جھوٹے بہتان

---

[1] پروٹیس سمندکا دیوتا تھا۔ یہ مستقبل کا تمام حال بتاسکتا تھا لیکن جب کبھی یہ

لگانے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ نہ ہمارے لیے اس طرح کے قصوں کی اشاعت جائز ہو کہ ہیرے ایک بچارن کا لباس پہنکر دریائے آرگس کی بیٹی آناکس کے لیے دربدر بھیک مانگتی پھرتی تھی۔ اس قسم کے تمام جھوٹے بیانات کو بکقلم مسترد کرنا چاہیئے۔ ہاں۔ یہ بات بھی نظر استحسان سے نہیں دیکھی جاسکتی ہو کہ مائیں شعرا کے اس قسم کے کلام کو باور کرکے اپنے بچوں کو ڈرائیں کہ رات کے وقت دیوتا مختلف شکلوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ایک تو دیوتاؤں کی تحقیر ہوتی ہو اور دوسرے خود بچوں کے دل چھوٹے ہوجاتے ہیں۔

ایڈ:۔ نعوذ باللہ۔ اس قسم کی روائتیں تو سراسر ناجائز ہیں۔

میں:۔ اچھا اب یہ تو طے ہوگیا کہ خدا تغیر پذیر نہیں لیکن یہ تو ممکن ہو کہ وہ خود جادو ٹونے سے ایسا اثر ڈالے کہ ہمیں اس کی شکلیں مختلف نظر آئیں۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔ یہ تو ممکن ہو۔

میں:۔ لیکن کیا تم یہ گمان کرسکتے ہو کہ خدا لفظاً یا عملاً جھوٹ بول سکتا ہو؟

ایڈ:۔ میں اس کا جواب نہیں دیسکتا۔

میں:۔ آخر آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ حقیقی جھوٹ سے خدا کیا انسان تک نفرت کرتا ہو۔

ایڈ:۔ آپ کا مطلب کیا ہو؟ میں نہیں سمجھا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲۲) کسی کے ہاتھ آجاتا تو پیشنگوئی سے بچنے کے لیے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرلیتا تھا۔

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان دانستہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ اپنے وجود کے اعلیٰ ترین جزو کو اہم ترین معاملہ کے متعلق دہوکے میں رکھے۔

ایڈ :- میں اب بھی آپ کا مفہوم نہیں سمجھا۔

میں :- نہ سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے خیال میں میں کوئی باریک بات کہہ رہا ہوں، حالانکہ میرا مطلب تو بالکل صاف ہے۔ دیکھیئے انسان کا اہم ترین جزو کیا ہے؟ اس کی روح۔ اور اس کو اہم ترین حقائق سے غیر مطلع یا اُن کے متعلق دہوکے میں رکھنا کوئی انسان گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ ہر شخص اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔

ایڈ :- بیشک اس سے زیادہ قابل نفرت بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

میں :- اور اسی روح کو دہوکا دینے اور جہل میں رکھنے کو میں نے حقیقی جھوٹ سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ظاہر الفاظ میں جو جھوٹ بولا جاتا ہے وہ درحقیقت اسی سقم روحانی کا ایک عکس ہوتا ہے۔

ایڈ :- درست۔

میں :- چنانچہ حقیقی جھوٹ سے ہر ایک نفرت کرتا ہے کیا دیوتا کیا انسان۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- البتہ لفظی جھوٹ بعض اوقات نا قابل نفرت ہی نہیں بلکہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً دشمنوں کے مقابلہ میں۔ یا فرض کرو کہ اپنا کوئی دوست جنون کے دورہ میں مبتلا ہے اور اس میں کوئی نقصان کرنا چاہتا ہے تو اس وقت جھوٹ کو

دوا اِستعمال کر سکتے ہیں۔ یا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جب ہم ازمنۂ قدیم کے متعلق افسانے تصنیف کریں اُس وقت اس جھوٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کے حقیقی حالات تو معلوم ہوتے نہیں اس لیے جھوٹے واقعات گھڑ کر حتی الوسع حقیقت سے قرب حاصل کرتے اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ مگر کیا اس قسم کی کوئی ضرورت خدا کو بھی پڑ سکتی ہے؟ کیا وہ بھی قدیم واقعات سے ناواقف ہے اور اس لیے مجبوراً جھوٹ بولتا ہے؟

ایڈ:۔ نعوذ باللہ۔ کسقدر مضحکہ انگیز خیال ہے!

میں:۔ یعنی اس شاعرانہ جھوٹ کی تو خدا کو ضرورت نہیں پڑتی۔

ایڈ:۔ ہرگز نہیں۔

میں:۔ اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے ڈر کر جھوٹ بولتا ہے؟

ایڈ:۔ یہ بھی کہیں خیال میں آنے کی بات ہے؟

میں:۔ اچھا تو اس کے شاید کچھ پاگل یا دیوانے دوست ہوں اور اُنکی خاطر دوا از جھوٹ بولنا پڑتا ہو؟

ایڈ:۔ پاگل بھی کہیں خدا کے دوست ہو سکتے ہیں!

میں:۔ تو پھر اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ خدا جھوٹ بولے۔

ایڈ:۔ بیشک کوئی وجہ نہیں۔

میں :۔یعنی خدا جھوٹ بولنے کی مطلق قابلیت نہیں رکھتا۔

ایڈ :۔بیشک۔

میں :۔گویا ہم نے یہ ثابت کردیا کہ خدا سادگی اور صداقت کا ایک کامل نمونہ ہے اپنے قول اور فعل میں بالکل سچا ہے مطلق تغیر پذیر نہیں۔ اور اپنے کسی قول یا علامت سے سوتے جاگتے کبھی کسی کو دہوکا اور فریب نہیں دیتا۔

ایڈ :۔میں آپ کی رائے سے حرف بحرف متفق ہوں۔

میں :۔یعنی آپ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں کہ تقریر و تحریر کے متعلق دوسرا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ دیوتاؤں کو جادوگر اور بہروپیہ نہ بتلایا جائے۔ نہ انپر تغیر پذیر ہونے یا انسان کو دہوکا دینے کے اتہامات لگائے جائیں۔

ایڈ :۔مجھے یہ اصول منظور ہے۔

میں :۔اس لیے اگرچہ ہم ھومر کے مداحوں میں سہی لیکن ہم اس جھوٹے خواب کو ہرگز بہ نظر استحسان نہیں دیکھ سکتے جو ھومر کے بیان کے مطابق زیس نے اگامیمنان[۱] کو دکھایا۔ نہ ہم ایسکلس کے ان اشعار کی تعریف کرسکتے ہیں جن میں تھیٹس کا یہ بیان نقل ہے کہ " اپولو نے میری شادی کے موقع پر میری اولاد کی تعریف و تبریک میں گانا گایا تھا۔ اور وعدہ کیا تھا کہ میری نسل عرصہ تک قائم اور تمام بیماریوں سے مامون رہیگی۔ اور ہر حیثیت سے مجھے خوش نصیب بتا کر

---

[۱] اگامیمنان مَیسِنی کا بادشاہ اور ٹرائے کے مقابلہ میں یونانیوں کا سردار تھا۔

باآوازبلند میری روح کو تسلی دی تھی۔ میں سمجھتی تھی چونکہ یہ الفاظ ایک دیوتا کی زبان سے نکلے ہیں اس لیے یہ پیشین گوئی ہرگز غلط ثابت نہیں ہو سکتی لیکن ستم ظریفی دیکھو کہ اسی دیوتا نے جس نے اس دعوت کے موقع پر یہ کچھ کہا تھا آج میرے بیٹے کو قتل کر ڈالا۔"

دیوتاؤں کے متعلق ہم جب کبھی اس قسم کی باتیں سنیں تو ہمیں اپنے غصہ اور ناراضی کا اظہار کرنا چاہیئے۔ یہ اہتمام کرنا چاہیئے کہ ایسے اشعار کبھی عام شاہراہوں پر نہ پڑھے جائیں۔ اساتذہ کو منع کرنا چاہیئے کہ ایسے قصّوں کو بچوں کی تعلیم میں استعمال نہ کریں۔ اور یہ سب اس لیے کہ ہمارا مقصد اصلی یہ ہے کہ ہمارے محافظ جہاں تک ممکن ہو دیوتاؤں کے سچے پرستار اور اُنکے مشابہ و مماثل ہوں۔

ایڈ:- میں ان اُصولوں سے پورا اتفاق کرتا ہوں اور بہ حیثیت قانون انہیں تسلیم کرنے پر تیار ہوں۔

تیسری کتاب

تعلیم اور فنون

میں نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا "دینیات کے اصول تو ہم گویا طے کر چکے یعنی یہ کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے شاگرد دیوتاؤں اور والدین کی عظمت اور عزت کریں اور آپس میں صلح و آشتی اور محبت و دوستی کی قدر کریں تو اس کے لیے لازم ہے کہ بچپن ہی سے انھیں ایک خاص قسم کے قصے کہانیاں سنائی جائیں اور ان کے علاوہ دوسری قسم کے قصوں کی بھنک بھی ان کے کان تک نہ پہنچے۔

ایڈیمنٹس۔ جی ہاں۔ ان اصولوں کی صحت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے؟

میں۔ لیکن صرف اس قدر تو کافی نہیں۔ اگر ان لوگوں کو دلیر اور باہمت بنانا مقصود ہے تو اس کے علاوہ اور چیزوں کی تعلیم بھی ضروری ہوگی۔ اور یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ ان کے دل سے موت کا خوف بالکل دور ہو جائے کیونکہ جو شخص موت سے خائف ہو وہ بلند ہمت کیسے ہو سکتا ہے؟

ایڈ۔ آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔

میں :- لیکن وہ شخص موت کے خوف سے کیونکر بری ہو سکتا اور شکست و غلامی پر موت کو کیسے ترجیح دے سکتا ہے جو عالم زیریں کو حقیقی و اصلی یقین کرتا اور اسے سخت مہیب جانتا ہو؟

ایڈ :- بیشک یہ ممکن نہیں۔

میں :- تو ہمیں اس قسم کے قصوں پر بھی ایک محکمہ نظارت قائم کرنا ہوگا اور اُن کے راویوں سے درخواست کرنی ہوگی کہ اس عالم کی محض بُرائی ہی بُرائی نہ بیان کیا کریں بلکہ اس کی تعریف کریں کیونکہ ان کے بیانات ایک تو جھوٹ ہیں اور دوسرے ہمارے آیندہ سپاہی بننے والے نوجوانوں کی تخریب کا باعث ہوتے ہیں۔

ایڈ :- بلاشبہ۔ ہم پر یہ فرض عائد ہوگا۔

میں :- چنانچہ اس قسم کے بہت سے ضرر رساں قطعات ہمیں اپنے علم ادب سے یک قلم خارج کرنے پڑینگے۔ مثلاً وہ قطعہ جس کے شروع میں ہے کہ "میں ایک غریب و مفلس آدمی کی زمین پر غلامی کا کام کرنے کو اس پر ترجیح دیتا ہوں کہ مُردوں پر بادشاہت کروں[1]" ہمیں وہ اشعار بھی قلم انداز کرنے ہونگے جن میں پلیوٹو کے اس خطرہ کا ذکر ہے کہ "کہیں عالم زیریں کے وہ خوفناک قصر اور غلیظ اور گندے ایوان جن سے دیوتا تک نفور ہیں دوسری فانی نیا

---

[1] اوڈیسی

غیر فانی ہستیوں کی نگاہوں کو بھی نہ دیکھنا پڑیں ہے" نیز یہ الفاظ کہ "یا عجب اس عالم میں روحیں بھی ہیں در طرح طرح کی مہیب شکلیں بھی لیکن دماغ و عقل کا کہیں پتہ نہیں ہے[۲]"

یا تیری سیاس کے متعلق یہ الفاظ کہ " اسے تو موت کے بعد بھی پرسیفون نے دماغ عطا کیا تاکہ وہ سب میں زیادہ عقلمند ہو ورنہ یوں تو تمام روحیں بس ایک سایہ کی حیثیت رکھتی ہیں جو ادھر سے ادھر متحرک ہے"

یا یہ الفاظ کہ " جسد عنصری سے جدا ہوکر روح اپنی قسمت پر گریہ کناں اور مردانگی اور شباب کو الوداع کہتی ہوئی عالم زیریں کیطرف پرواز کر گئی"

یا یہ کہ " روح ایک دنحراشں چیخ مار کر دھوئیں کی شکل میں زمین کے نیچے روپوش ہوگئی"

یا پھر یہ کہ " روحیں ادھر ادھر حرکت کرتے وقت اس طرح چلا رہی تھیں جیسے کسی تیرہ و تار غار میں جب چمگادڑ کے پنجوں سے اپنی لٹک چھوٹ جاتی ہے تو وہ چیخ مار کر ادھر ادھر اڑتا ہے اور دوسرے چمگادڑوں کا جسم پکڑ کر لٹک جاتا ہے"

ہمیں یقین ہے کہ ان قطعات کے اخراج پر ہومر اور دوسرے شعرا کو ناخوشی کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ اس کا سبب یہ تو ہے نہیں کہ یہ قطعات شعریت سے عاری یا عوام کے لیے دلفریب نہیں ہیں بلکہ بحیثیت شعر کے ان میں جس قدر

ع۲ ایلیاڈ ع۳ ایلیاڈ ع۴ اودیسی ع۵ ایلیاڈ ع۶ اودیسی

حسن خوبی ہی اُسی قدر ان سے ہمارے نوجوانوں کو زیادہ نقصان پہونچنے کا احتمال ہی اس لیے کہ ہم انھیں آزاد انسان بنانا چاہتے ہیں جو غلامی سے زیادہ خائف ہوں اور موت سے کم۔

ایڈ :- بیشک ۔

میں :- یہی نہیں ۔ ہمیں تو ان تمام مہیب ناموں کا بھی اخراج کرنا ہوگا جن سے عالم زیریں کو موسوم کیا جاتا ہی یا بھوتوں پریتوں کا ذکر جنکے نام ہی سے آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ممکن ہی اس قسم کے قصوں سے کوئی مفید نتیجہ بھی مترتب ہو سکے لیکن ساتھ ہی یہ خوف ہی کہ ہمارے محافظین کی طبائع میں ان سے ڈر اور زنانیت کے جذبات زیادہ پیدا ہو جائیں گے۔

ایڈ :- ہاں یہ اندیشہ تو ہی۔

میں :- تو پھر کیا ان تمام چیزوں کو یکقلم خارج کر دینا چاہیئے۔

ایڈ :- اور کیا ؟ یقیناً۔

میں :- اور ان کے بجاے زیادہ مفید اور حوصلہ افزا ترانے تصنیف کرنے اور ان لوگوں کو سُنانے چاہیئں۔

ایڈ :- ضرور۔

میں :- ان نظموں میں جو بڑے بڑے مشاہیر کے رونے پیٹنے اور

واویلا کرنے کا تذکرہ ہی کیا اسے بھی نکال دیا جائے؟

ایڈ:۔ بیشک جو حشر دوسری لغویات کا ہوا ہے وہی انکا ہونا چاہیئے

میں:۔ لیکن کیا ہم ایسا کرنے میں حق بجانب ہوں گے؟۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ہمارا خیال تو یہی ہے۔ کہ ایک نیک آدمی کو چاہیے کہ اپنے کسی نیک ہمراہی کی موت کو مصیبت عظیم متصور نہ کرے۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ چنانچہ اس دوست سے دائمی جدائی پر اظہار رنج و افسوس بھی نہ کرنا چاہیئے جیسا کہ مصیبت کے وقت کیا جاتا ہے۔

ایڈ:۔ ہاں۔ ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔

میں:۔ اس کے علاوہ ہمارا یہ بھی تو عقیدہ ہے کہ نیک آدمی اپنی ذات اور اپنی خوشی کے لیے خود کافی ہے اور اس وجہ سے دوسروں کی اعانت کا بہت کم محتاج ہے۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ چنانچہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں اسے کسی بھائی بیٹے کی موت یا کسی قیمتی متاع دنیاوی کے تلف ہوجانے کا بہت کم افسوس ہوگا۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ اس لیے ان واقعات پر کبھی گریہ وزاری بھی نہ کریگا۔ اور اس

قسم کے جو مصائب بھی پیش آئیں گے انھیں کشادہ پیشانی سے برداشت کریگا۔

ایڈ:۔ اوروں کے بہ نسبت ایسی چیزوں کا بہت کم اثر ہوگا۔

میں:۔ تو پھر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشہور اور برگزیدہ لوگوں کے متعلق جہاں کہیں رونے پیٹنے اور چیخنے چلانے کی روایتیں ہوں انہیں خارج کردیں اور ان حرکات کو عورتوں یا بُری قسم کے مردوں کے ساتھ منسوب کریں تاکہ محافظ ملک کی تعلیم حاصل کرنے والے اس قسم کے افعال کو ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔

ایڈ:۔ بالکل درست۔

میں:۔ گویا ہمیں ایک بار ہومر اور دوسرے شعراء سے درخواست کرنی ہوگی کہ وہ ایک دیوی کے بیٹے یعنی اکیلیس[1] کے متعلق یہ نہ بیان کریں کہ وہ کبھی بیقراری سے زمین پر لوٹتا اور مضطربانہ کروٹیں بدلتا تھا اور کبھی سمندر کے کنارے دوڑا دوڑا پھرتا تھا یا دونوں مٹھیوں میں راکھ بھر بھر کر سر پر ڈالتا تھا۔ نہ ایک دیوتا کے عزیز پیرآیم[2] کی نسبت یہ روایت کریں کہ وہ خاک پر لوٹ لوٹ کر اور حاضرین کا نام زور زور سے پکار کر دعائیں اور التجائیں کرتا اور دادرسی کا طالب ہوتا تھا۔[3] ہم ہومر سے نہایت خلوص کے ساتھ یہ التجا بھی کریں گے کہ اپنے کلام میں دیوتاؤں کو تو شکوہ و شکایت کرتا ہوا نہ ظاہر کرے اور اگر

---

۱ ایلیاد ۲-۳ ایلیاد

دیوتاؤں کا ذکر کرنا ایسا ہی ضروری ہی تو کم سے کم سب سے بڑے دیوتا کو تو اسقدر سخت غلط بیانی سے معاف رکھے کہ اُس کی طرف ذیل کے الفاظ منسوب کیے جائیں " الامان - الامان - میں اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ میرے ایک دوست کا پیچھا کر کے اُسے شہر کے چاروں طرف دوڑایا جا رہا ہی - اور میں اس سے کسقدر غمناک و رنجیدہ ہوں ! " یا یہ کہ " حیف صد حیف میرے نصیب پر کہ انسانوں میں عزیز ترین انسان کی قسمت میں یہ ہی کہ میں اس کے بیٹے پیٹرو کلس کے ہاتھوں نیچا دیکھے ۔"

کیونکہ عزیز من ! اگر نوجوان لوگ دیوتاؤں کے متعلق اس قسم کی روائیتیں سنیں گے تو بجائے اس کے کہ ان کی حماقت پر ہنسیں ان پر بالکل دوسرا اثر مترتب ہوگا - وہ سمجھیں گے کہ جب دیوتاؤں کا یہ حال ہی تو پھر انسان کے لیے یہ حرکات کیسے باعث ذلت ہو سکتی ہیں - چنانچہ اگر گریہ و بکا کرنے کی کوئی تحریک ان کی طبیعت میں ہوگی تو وہ ہر گز اُسے دبانے کی کوشش نہ کریں گے - اور بجائے اس کے کہ شرم سے کام لیں اور اپنی طبیعت پر قابو حاصل کریں وہ ہر ذرا ذرا سی بات پر ہمیشہ روتے پیٹتے پھرا کریں گے ۔

ایڈ :- جی ہاں - یہ تو بالکل سچ ہی -

میں :- لیکن جیسا کہ ہمارے گذشتہ دلائل نے ثابت کر دیا ہی ایسا تو

ع۱ ایلیاد ع۲ ایلیاد

ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ اور جب تک ہماری دلیلیں غلط ثابت نہ ہو جائیں ہمیں ان کے نتائج پر قائم رہنا ضرور ہے۔

ایڈ:- بیشک۔

میں۔ اس کے علاوہ میری رائے میں محافظین کو زیادہ ہنسنے کا بھی عادی نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ قہقہہ لگانے کے بعد تقریباً ہمیشہ ردعمل کے طور پر ایک پژمردگی سی طاری ہو جاتی ہے۔

ایڈ:- میرا بھی یہی خیال ہے۔

میں:- چنانچہ کسی معزز آدمی کی نسبت ہرگز یہ نہ بیان کرنا چاہیئے کہ مارے ہنسی کے بے قابو ہو گیا۔ اور جب انسان کے متعلق یہ احتیاط لازمی ہے تو پھر دیوتاؤں کی نسبت تو اس کا اور بھی زیادہ اہتمام ہونا چاہیئے۔

ایڈ:- یقیناً۔ دیوتاؤں کے متعلق تو بقول آپ کے اور بھی اشد احتیاط درکار ہے

میں:- تو ہم دیوتاؤں کے متعلق ہرگز اس قسم کے بیانات نہ روا رکھیں گے جیسے کہ ھومر نے کیے ہیں کہ " ھی فیس ٹس کو مکان کے گرد گھبراہٹ میں چکر لگاتے دیکھ کر دیوتاؤں کی مبارک محفل میں ایک ایسا قہقہہ پڑا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا"[1]

ایڈ:- ہاں آپ کے خیالات کے بموجب تو ہرگز ایسے بیانات کو جائز نہ رکھنا چاہیئے۔

---

[1] ایلیاد

میں :۔ خیر بھائی۔ ان خیالات کی ذمہ داری میرے ہی سر سہی۔ ہر حال اس میں ذرا شک نہیں کہ اس قسم کے بیانات ہرگز قابل پذیرائی نہیں۔ (خیر اسے جانے دیجیے) اس کے علاوہ اور اہم امور بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ راستبازی و سچ کی بہت زیادہ وقعت ہونی چاہیئے۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اگر جھوٹ دیوتاؤں کے لیے بالکل بیکار اور انسان کے لیے صرف دوا مفید ہے تو پھر اس دوا کے استعمال کو صرف طبیبوں تک محدود رکھنا چاہیئے عوام کو اس سے کوئی سروکار نہ ہو۔

ایڈ :۔ ہرگز نہ ہونا چاہیے۔

میں :۔ تو اگر کسی کو جھوٹ بولنے کا منصب حاصل ہو سکتا ہے تو صرف ریاست کے حکمرانوں کو۔ انھیں تو اجازت ہونی چاہیئے کہ فلاح عام کے لئے دشمنوں سے یا خود اپنے شہریوں سے جھوٹ بول سکیں۔ لیکن ان کے علاوہ کسی اور شخص کو ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ یہ اختیار بس حکام تک محدود ہے اور کوئی دوسرا شخص جو اپنا ان حکام سے جھوٹ بولے تو اس کے جرم کی مثال بالکل ایسی بلکہ اس سے بھی زیادہ بری ہوگی کہ ایک مریض اپنی جسمانی حالت کے متعلق طبیب سے سچ نہ بولے یا یہ کہ ملاح جہاز کی حقیقی کیفیت سے ناخدا کو آگاہ نہ کرے اور مسافروں یا دوسرے ملاحوں کی حالت سے اسے بالکل بیخبر رکھے۔

ایڈ :۔ بالکل بجا۔

میں :- تو اگر کوئی حاکم کسی دوسرے شخص کو خواہ وہ پجاری ہو یا حکیم۔ نجّار ہو یا کوئی اور اہل حرفہ وہ در ریاست میں جھوٹ بولتے ہوئے پکڑلے تو اُسے چاہیئے کہ اس شخص کو سخت سزا دے کیونکہ اس کی یہ حرکت کشتی حکومت کو غرق کرانے کی ایسی ہی صلاحیت رکھتی ہی جیسی کہ گذشتہ بالا مثال۔

ایڈ :- بیشک ایسا ہی کیا جائیگا بشرطیکہ ہمارے مرتب کردہ نظام پر کبھی عمل کیا جائے اور ہمارے الفاظ مبدل بہ حقیقت ہو جائیں۔

میں :- خیر۔ دوسری بات یہ ضروری ہی کہ ہمارے نوجوان عفیف اور ضابط نفس ہوں۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اور عفت اور ضبط نفس کے دو ہی خاص اجزا ہیں۔ یعنی حکام کی اطاعت اور لذائذ جسمانی کے بارہ میں اپنی طبیعت پر قابو اور ضبط۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں تو ہمیں ان کلمات کی تحسین کرنی چاہیئے جو ھومر نے ڈیامیڈ کی زبان سے ادا کیے ہیں کہ " میرے دوست! خاموش بیٹھو اور میرے احکام کی اطاعت کرو"[۱] یا اس کے بعد والے جملے کہ " وہ یونانی جنکے ہر نفس کے ساتھ بہادری اور شجاعت نکلتی تھی اپنے قایدین سے ڈرتے ہوئے

---

[۱] ایلیاد

خاموشی سے بڑھے جاتے تھے "[1] اور اسی قسم کے دوسرے خیالات کی بھی تعریف کرنی چاہیئے۔

ایڈ :- ضرور۔

میں :- اور اس بیان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ حکام کو یوں پکارا جائے کہ "اے نشہ مے میں سرمست کتے کی سی آنکھیں اور ہرن کا سا دل رکھنے والے[2]"، یا اس کے بعد والے الفاظ۔ کیا یہ یا اسی قسم کی گستاخیوں کا ذکر جو نثر یا نظم میں اس طرح ہے گویا معمولی اشخاص نے حکام کے ساتھ یہ بدکلامیاں کیں آپ کی رائے میں مناسب ہے یا نہیں؟

ایڈ :- یقیناً نامناسب ہے۔

میں :- ممکن ہے یہ اشعار تفریح طبع کا سامان بہم پہونچاتے ہوں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ یہ باتیں عفت و ضبط نفس کے تو بالکل منافی ہیں اور اس لیے ہمارے نوجوانوں کو ان سے نقصان پہونچنے کا احتمال ہے۔ غالباً آپ کو مجھ سے اتفاق ہوگا۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اور معزز آدمیوں کی زبان سے یہ الفاظ روایت کیے جائیں کہ "دنیا میں اس سے زیادہ شاندار چیز اور کیا ہوگی کہ دسترخوان پر

---

[1] اودیسی [2] اودیسی

طرح طرح کے کھانے چنے ہوں۔ ساقی مینا سے ساغر میں شراب منتقل کرتا ہوا ور پھر اُس کا دَور چلے[۱]" یا یہ کہ "اس عالم میں سب سے زیادہ بدنصیب وہ آدمی ہے جو بھوک کی وجہ سے جان دے[۲]" تو اس کا اثر سامعین پر بہ لحاظ عفت وضبط نفس کے کیا ہوگا؟ اور یہی نہیں زی اس ہی کا قصہ لیجئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تمام عالم محو خواب اور صرف زی آس بیدار تھا اور مختلف تدابیر پر غور کر رہا تھا کہ ھیری نظر آئی اور وہ اپنی تمام تدابیر غلبہ شہوت کے باعث بھول گیا۔ حتیٰ کہ ھیری کو اپنے جھونپڑے کے اندر تک نہ لے گیا اور وہیں زمین پر اس سے مباشرت کرنا چاہی اور اس سے کہا کہ ہم تم جب پہلی مرتبہ "اپنے والدین کی لاعلمی میں[۳] ملے تھے اُس وقت بھی مجھ پر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی تھی۔ یا وہ دوسرا فسانہ جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ اسی قسم کے اعمال کی وجہ سے ھی فیس ٹس نے اریس اور ایفرودائٹ کو زنجیر سے جکڑ دیا تھا[۴]۔

ایڈ :۔ میری رائے میں اس قسم کا کوئی قصہ بھی بیان نہ کرنا چاہیئے۔

میں :۔ لیکن اگر کسی مشہور شخص سے استقلال و پامردی کے کام انجام پائے ہیں یا ہمت کے کلمات اُس کی زبان سے نکلے ہیں تو یہ باتیں تو ضرور ان نوجوانوں کو سنانی چاہیئں۔ مثلاً یہ جملے کہ "اسنے اپنے سینہ پر ہاتھ

---

[۱] اوڈیسی — [۲] اوڈیسی — [۳] ایلیاد — [۴] اوڈیسی

مارا اور اپنے دل کو ملامت کر کے کہا کہ اے دل تو نے اس سے سخت باتیں برداشت کی ہیں۔ اسے بھی برداشت کر۔[1]

ایڈ:۔ بیشک یہ باتیں تو انھیں ضرور سنانی چاہئیں۔

میں:۔ اس کے بعد ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ یہ لوگ نذریں اور تحفہ تحائف قبول نہ کریں اور ان میں دولت و زر کی ذرا محبت نہ ہو۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ چنانچہ ہمیں اُن کے سامنے کبھی یہ نہ کہنا چاہیے کہ نذروں سے بڑے بڑے دیوتا، اور رواجب الاحترام بادشاہ تک ہر کام کے کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں۔ نہ ہمیں ایکی لیس کے استاد فنی نکس کی تحسین کرنی چاہیئے کہ اس نے اپنے شاگرد کو یہ نصیحت کی کہ یونانیوں کی نذریں قبول کر کے اُن کی امداد پر طیار ہوجائے لیکن جب تک نذر نہ ملے اپنے غصہ کو ہرگز کم نہ کرے۔ اور نہ ہمیں یہ باور کرنا چاہیئے کہ خود ایکی لیس اسقدر لالچی تھا کہ اس نے ایگا ممنان کی نذر قبول کرلی اور روپیہ کی ادائگی کے بعد باوجود سابقہ انکار کے ھکٹر کی نعش واپس کردی۔

ایڈ:۔ بیشک۔ اس قسم کے جذبات اور انکے بیان کو ہرگز بہ نظر پسندیدگی نہ دیکھنا چاہیئے۔

---

[1] اودیسی

میں - سچ پوچھو تو مجھے ھومر سے ایک طرح کا اُنس سا ہی لیکن جہاں اس نے ایکی لیس سے اس قسم کے ذمیمہ صفات کو منسوب کیا ہی - یا یہ یقین ظاہر کیا ہی کہ یہ صفات فی الحقیقت اس کے ساتھ منسوب کی جا سکتی ہیں تو میرے خیال میں وہ ایک سخت معصیت کا مرتکب ہوا ہی - اسی طرح میں ہرگز اس بیان کو بھی قابل پذیرائی نہیں سمجھتا جو بارگاہ اپولو میں ایکی لیس کے گستاخانہ کلام کے متعلق ھومر نے اس طرح نظم کیا ہی کہ "اے دیوتاؤں میں سب سے زیادہ قابل نفرت دیوتا ! اے دراز دست اور دُور انداز ! تو نے میرے ساتھ دغا کی - میرے بس میں ہوتا تو تیرے برابر بن کر دکھلاتا۔[1]" نہ میرے نزدیک یہ بات قابل یقین ہی کہ ایکی لیس نے دریائی دیوتا سے سرکشی کی اور اُس کی خدائی تک پر دست درازی کا ارادہ کیا۔[2] یا یہ کہ اس نے اپنے بالوں کی نذر پیٹروکلس کی نعش پر چڑھائی حالانکہ پہلے سے انھیں دریائی دیوتا اسپرکی اس کے نام سے معنون کر چکا تھا۔[3] یا یہ روایت کہ اس نے پیٹروکلس کی قبر کے گرد ھکٹر کو گھسیٹا۔[4] اور قیدیوں کو زندہ جلا دیا۔[5] میں تو ان باتوں پر ہرگز یقین نہیں کر سکتا اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے شہری یہ باور کریں کہ شیران جیسے حکیم کا شاگرد اور ایک دیوی کا بیٹا جس کا باپ پی لی اس اشرف الناس اور

---

[1] ایلیاد [2] ایلیاد [3] ایلیاد [4] ایلیاد [5] ایلیاد

زی :- اس کی تیسری پشت میں تھا اسقدر مخبوط الحواس ہوگیا ہو کہ ایک ہی وقت میں اسپر دو بظاہر مخالف جذبات حاوی ہوں یعنی ایک طرف تو لالچ اور طمع سے مملو کمینہ پن ہو اور دوسری طرف دیوتاؤں اور انسانوں کی ایسی انتہائی تحقیر۔

ایڈ :- بیشک آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔

میں :- اسی طرح ہم تو سی دان کے بیٹے تھی سی اس یا زی اس کے بیٹے پیری تھس کے متعلق ارتکاب زنا کی روایات کو ہرگز سچ نہ مانیں گے اور نہ ہم اجازت دے سکتے ہیں کہ اس قسم کے قصے ہماری ریاست میں بیان کئے جائیں۔ مشاہیر عہد اور دیوتاؤں کے اخلاق کے ساتھ ہرگز اس قسم کے ناپاک اور نفرت انگیز افعال کو منسوب کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ہم شاعروں کو ہدایت کریں گے کہ یا تو وہ ان افعال قبیحہ کو ان لوگوں سے منسوب نہ کریں یا پھر انہیں دیوتاؤں کی اولاد نہ بتائیں۔ کیوں کہ یہ دونوں باتیں تو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس کے علاوہ ہم شعراء کو اس عقیدہ کی تلقین کی اجازت بھی نہیں دے سکتے کہ دیوتا ہی برائیوں کے خالق بھی ہوتے ہیں یا مشاہیر اور معمولی انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ خیالات نہ تو مفید ہیں اور نہ صحیح اور یہ ہم پہلے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ دیوتا برائی کا باعث نہیں ہو سکتے۔

ایڈ :- بلاشبہ۔ ہرگز نہیں ہو سکتے۔

میں :- اس کے علاوہ سننے والوں پر ان قصوں کا کتنا برا اثر پڑیگا کیونکہ ہر شخص افعال شنیعہ کے ارتکاب کے بعد یہ عذر پیش کر سکتا ہے کہ اس قسم کے افعال تو دیوتاؤں کی اولاد اور زی اس اغز اتک سے سرزد ہوے ہیں جن کا آبائی قربان گاہ جبل ایدا کی مرتفع چوٹی پر آسمان سے باتیں کرتا ہے اور جن کی رگوں میں اب تک دیوتاؤں کا خون رواں ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان قصوں کا بالکل خاتمہ کر دیا جائے۔ مبادا یہ ہمارے نوجوانوں کی تخریب کا باعث ہوں۔

ایڈ :- ضرور۔

میں۔ ہم چونکہ اس وقت اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں کہ کس قسم کے مضامین کے بیان کی اجازت دی جائے اور کون کون ممنوع قرار دیے جائیں اس لیے ذرا پھر سوچ لیجیے کہ کوئی مضمون رہ تو نہیں گیا۔ دیوتا اور ان کی اولاد۔ مشاہیر اور عالم زیریں کے متعلق تو ہم طے کر چکے۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- غالباً اب اس مسئلہ کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے متعلق کس قسم کے بیانات کی اجازت دینی چاہیے؟

ایڈ :- اور کیا بظاہر تو یہی باقی ہے۔

میں :- لیکن غالباً ہم لوگ فی الحال تو اس کا جواب دینے کے اہل نہیں ہیں۔

ایڈ :- یہ کیوں ؟

میں :- اس لیے کہ اس ضمن میں ہمیں لا محالہ یہ کہنا ہوگا کہ شاعروں اور فسانہ نگاروں نے انسان کے متعلق انتہائی غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ مثلاً یہ کہ شریر لوگ راحت و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور نیکوں کو ہمیشہ مصائب و آلام سے دست و گریبان ہونا پڑتا ہے۔ یا یہ کہ اگر باز پرس نہ ہو تو جبر و نا انصافی میں بہت فائدہ ہے اور عدل و انصاف میں چاہے دوسروں کا فائدہ ہو اپنا ذاتی تو نقصان ہی ہے۔ اور ہم لوگ اپنے خیال کے مطابق انھیں یقیناً ایسے بیانات سے منع کریں گے بلکہ ان کے برعکس بیان کرنے کا حکم دیں گے۔

ایڈ :- اور یہی کرنا بھی چاہیئے۔

میں :- یہ تو درست ہے۔ لیکن اگر آپ اس کو تسلیم کیے لیتے ہیں تو گویا آپ نے اس اصول کو بالواسطہ قبول کر لیا جس پر ہم شروع سے بحث کر رہے ہیں۔

ایڈ :- ہاں بیشک آپ کا یہ ارشاد تو بالکل بجا ہے۔

میں :- لہذا ہم اس وقت تک اس سوال کا کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتے جب تک کہ عدل کی حقیقی ماہیت معلوم نہ ہو جائے اور یہ ظاہر نہ ہو کہ عادل شخص کو عدل سے فی نفسہ کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں خواہ وہ بظاہر عادل معلوم ہو یا نہ ہو۔

ایڈ :- بالکل صحیح۔

میں :- اچھا۔ شاعری کے نفسِ مضمون کے متعلق تو کافی بحث ہو چکی۔ آؤ۔ اب ذرا طرزِ ادا کے متعلق کچھ گفتگو کریں تاکہ اس مسئلہ کے دونوں اجزاء کی تحقیق مکمل ہو جائے۔

ایڈ :- میں صحیح طور پر آپ کا مفہوم نہیں سمجھا۔

میں :- تو میں سمجھاتا ہوں۔ آپ غالباً اس طرح سمجھ لیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ تمام کی تمام شاعری اور فسانہ نگاری چند واقعات کے بیان پر مشتمل ہے جو زمانہ ماضی۔ حال یا استقبال میں سے کسی نہ کسی زمانہ سے متعلق ہے۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- اچھا۔ اور بیان کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں یعنی یا تو خالص واقعہ نگاری ہو یا نقلِ کلام یا ان دونوں کا مرکب۔

ایڈ :- میں پھر آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں :- تم جی میں ہنستے ہو گے کہ یہ کیسے استاد سے سابقہ پڑا ہے جو اپنا مفہوم بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس لیے ایک برے مقرر کی طرح میں پورے مضمون پر بحث کرنے سے احتراز کرتا ہوں اور اپنے مفہوم کو صاف کرنے کے لیے بطور تمثیل اس کے ایک جزو کو علیحدہ کیے لیتا ہوں۔ اچھا تو سنو۔ تم نے غالباً ایلیاد کے شروع کے شعر تو پڑھے ہوں گے جن میں کرائی سس نے اپنی بیٹی کی

رہائی کے لیے آگا ممنان سے درخواست کی ہو اور آگا ممنان غضبناک ہوکر اس سے بگڑ گیا۔ چنانچہ جب کرائی سس اپنے مقصد میں ناکام ہوا تو اس نے دیوتا سے اَفیبئون پر نزول عذاب کی دعا مانگی ہو۔ ہاں تو اس جملہ تک کہ "اس نے تمام یونانیوں سے عموماً اور اَتریدِس کے دونوں بیٹوں سے جو قوم کے سردار تھے خصوصاً درخواست کی" شاعر خود اپنی طرف سے واقعہ بیان کر رہا ہو اور کسی دوسری شخصیت میں روپوش نہیں ہونا چاہتا۔ لیکن اس کے بعد وہ کرائی سس کی زبان اختیار کرتا ہو اور یہ یقین دلانا چاہتا ہو کہ مقرر ھومر نہیں بلکہ خود وہ معمر پجاری ہو۔ چنانچہ ٹرائی، اور اتھاکا کے واقعات اور نیز اُدیسی میں وہ یہ دونوں طرق بیان استعمال کرتا ہو۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- دونوں صورتوں میں یعنی خواہ شاعر اپنی زبان سے واقعہ بیان کرے یا وقتاً فوقتاً کسی دوسرے کی تقریر دوہرائے نظم کو واقعہ نگاری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- لیکن جب شاعر دوسرے شخص کا بھیس اختیار کرتا ہو تو لازمی طور پر اس کی یہ کوشش ہوتی ہو کہ اس کا طرز بیان اس شخص سے حتی الوسع مماثل ہو جائے جس کی زبان سے تقریر بیان کی جا رہی ہو۔

ایڈ:- اور کیا۔

میں:- اور اپنی شخصیت کو دوسرے شخص میں اس طرح جذب کر دینے کو ہی، خواہ یہ باعتبار آواز کے ہو یا بلحاظ حرکات و سکنات شخص مذکور کی نقل کہتے ہیں۔

ایڈ:- درست۔

میں:- شاعر جب اس تدبیر کو اختیار کرتا ہے تو اسے نقالی یا نقل کلام کہتے ہیں۔

ایڈ:- جی۔

میں:- لیکن اگر شاعر ہر جگہ خود ہی ظاہر رہے اور اپنے کو پوشیدہ کرنے کی کہیں کوشش نہ کرے تو وہ نظم تذکرہ یا خالص بیان ہو جاتی ہے۔ اپنے موضوع کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے تاکہ آپ پھر یہ کہیں کہ "میں نہیں سمجھا" میں ان دونوں اقسام میں تفریق کر کے بتلاتا ہوں۔

دیکھیے۔ اگر ہومر یہ کہتا کہ کرائی سس اپنے ہاتھ میں زر فدیہ لیے ہوئے آیا اور تمام اہل [یونان] سے عموماً اور ان کے سرداروں سے خصوصاً اپنی لڑکی کی رہائی کی درخواست نہایت لجاجت کے ساتھ کرنے لگا" اور اس کے بعد اگر شاعر کرائی سس کی زبان سے تقریر ادا کرنے کے بجائے خود ہی بیان کو جاری رکھتا تو پھر نقل کلام نہ ہوتی بلکہ اسے تذکرہ یا خالص بیان کہتے۔ اور نظم کی صورت حسب ذیل ہوتی (چونکہ میں شاعر نہیں ہوں اس لیے قواعد نظم کو بالائے

طاق رکھتا ہوں)۔ پجاری آیا اور اُس نے یونانیوں کی طرف سے دیوتاؤں کی بارگاہ میں اُن کی فتح اور کامرانی کی دعا مانگی تاکہ وہ ٹرائے پر قابض ہو کر صحیح سلامت اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ زرِ فدیہ قبول کر کے اُس کی لڑکی کو رہا کر دیا جائے اور دیوتا کی تعظیم و تکریم کی جائے۔ اس کلام کو سُنکر دوسرے یونانیوں نے تو پجاری کی عزت کی اور اس کی درخواست پر اظہارِ قبولیت کیا لیکن آگا ممنان کو اسپر غصہ آیا اور اس نے اس پجاری کو حکم دیا کہ نکل جائے اور پھر کبھی وہاں نہ آئے ورنہ اُسکا عصا اور جبہ و دستار کچھ کام نہ آئے گا۔ آگا ممنان نے یہ حکم بھی صادر کیا کہ کرائی سس کی لڑکی رہا نہ کی جائے بلکہ آرگس میں اس کے ہمراہ رہ کر اپنی عمر گذارے۔ اسکے بعد بیچارے پجاری کو پھر حکم دیا کہ اگر صحیح سلامت واپس جانا چاہتا ہے تو زیادہ غصہ نہ دلائے اور فوراً چلا جائے۔ بیچارہ مارے خوف کے خاموش وہاں سے چلا آیا۔ لیکن لشکر سے باہر نکل کر اپولو کو مختلف ناموں سے پکارا اور اپنے تمام وہ اعمالِ نیک یاد دلائے جو اُس کی خوشنودی کیلیے کیے تھے مثلاً قربانیاں، مندروں کی تعمیر وغیرہ۔ اور اُس سے اب ان اعمال کا اجر چاہا اور التجا کی کہ اس کے آنسوؤں کا بدلہ آگا ممنان پر آسمانی تیر برسا کر لیا جائے وقس علی ہذا۔ اس طرح نظم خالص بیانِ واقعہ کی صورت اختیار کر لیتی۔

ایڈ:۔ میں اب سمجھ گیا۔

میں :- اب اس کے بالکل خلاف تصور کرو۔ یعنی یہ کہ تمام درمیانی اشعار کو نکال دو اور صرف مکالمہ رہنے دو۔

ایڈ :- ہاں، میں سمجھا۔ جیسے ناٹک میں ہوتا ہے۔

میں :- تم میرا مفہوم بالکل ٹھیک سمجھے۔ اور میرا خیال ہے کہ جو بات پہلے تمہاری سمجھ میں نہ آتی تھی وہ اب بالکل صاف ہو گئی ہوگی یعنی شاعری اور فسانہ نگاری میں کبھی تو بالکل نقل بیان ہوتی ہے مثلاً ناٹک میں یا پھر اس کے بالکل برعکس یعنی جب شاعر تمام واقعات خود ہی بیان کرتا ہے جس کی بہترین مثال dithyramb ہے یا پھر ان دونوں اقسام کی آمیزش ہوتی ہے مثلاً مثنوی اور دیگر اصناف سخن میں۔

ایڈ :- بیشک۔ اب جا کر میں آپ کا مفہوم سمجھا۔

میں :- ہاں۔ ذرا اس کا خیال رہے کہ ہم لوگ شاعری کے نفس مضمون کے متعلق فیصلہ کر چکے ہیں اس وقت صرف طرز بیان کا مسئلہ درپیش ہے۔

ایڈ :- جی ہاں مجھے اس کا خیال ہے

میں :- اس یاد دہانی سے میرا مطلب یہ تھا کہ ہمیں فن نقالی کے متعلق تصفیہ کرنا ہے کہ آیا شاعروں کو قصوں کے بیان کرنے میں نقل سے کام لینے کی اجازت ہونی چاہیئے یا اس کو مطلق ممنوع قرار دینا چاہیے اور اگر اجازت دیجائے تو پوری آزادی ہو یا صرف جزوی۔ اور پھر اگر جزوی طور پر اجازت ہو تو کن اجزا کی

تخصیص کی جائے۔

ایڈ:۔ آپ شاید یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہماری ریاست میں ناٹک کی دونوں قسموں یعنی المیہ اور فرحیہ دونوں کی اجازت ہونی چاہیئے یا نہیں!

میں:۔ ہاں میں یہی دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ممکن ہے کوئی اور بات بھی اس سوال سے پیدا ہو جائے جس کا مجھے مطلق علم نہیں۔ ہم تو سلسلہ کلام کے ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ جہاں بھی پہنچا دے۔

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ تو پھر بتلائیے کہ ہمارے محافظین کو نقال ہونا چاہیئے یا نہیں؟ لیکن ہاں۔ ہم تو اس بات کا فیصلہ ابتدا گفتگو میں ہی کر چکے ہیں جب ہم نے یہ طے کیا تھا کہ ایک آدمی صرف ایک کام کر سکتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص بہت سے کام کرنا چاہیگا تو وہ کسی میں بھی شہرت و امتیاز حاصل نہیں کر سکتا۔

ایڈ:۔ بلاشبہہ۔

میں:۔ یہی اصول نقالی پر منطبق ہوتا ہے۔ ایک آدمی ایک ہی چیز کی نقل اچھی طرح کر سکتا ہے۔ بہت سی چیزوں کی نہیں کر سکتا۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔ ہرگز نہیں کر سکتا۔

میں:۔ تو اے ایڈی مین تس! جب خود نقالی کی دو قریب التعلق اقسام مثلاً المیہ اور فرحیہ ناٹک مین ایک ہی آدمی مہارت تامہ

نہیں ہم پہنچا سکتا تو پھر تم ہی فیصلہ کرو کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہی شخص زندگی کے مہمات اُمور کو بھی طے کرے اور وہی مختلف دوسری چیزوں کا نقال بھی ہو۔

ایڈ :۔ بیشک ایک آدمی تو دونوں اصناف نقالی پر بھی عبور نہیں کر سکتا۔

میں :۔ جیسے ایک ہی آدمی اچھا رجز خواں اور اچھا مسخرا، دونوں نہیں ہو سکتا۔

ایڈ :۔ بیشک۔

میں :۔ اے عزیز۔ انسانی فطرت کے نقود تو اس سے بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنائے گئے ہیں۔ اور جس طرح ایک آدمی بہت سے کام اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا اسی طرح بہت سی چیزوں کی نقل بھی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ نقل کیا ہے؟ ان حقیقی افعال کا ہی تو عکس ہے۔

ایڈ :۔ بیشک۔

میں :۔ اگر ہم اب تک اپنے ابتدائی خیال پر قائم ہیں کہ محافظین کا کام بس یہ ہے کہ تمام چیزوں سے قطع تعلق کر کے ریاست میں حریت و آزادی کے قیام کو اپنا مقصد وحید قرار دیں۔ اسی کو اپنا ہنر بنائیں۔ اور کسی ایسے شغل میں نہ پڑیں جو اس مقصد کے حصول میں ممد و معاون نہ ہو تو یہ نتیجہ بالکل بدیہی ہے کہ انھیں کسی دوسری چیز کی نقالی نہ کرنی چاہیئے۔ اور اگر وہ کسی کی نقل کریں بھی تو ایسے لوگوں کی جن کے مکارم اخلاق اُنکے مقصد زندگی کے لیے موزوں اور اس کے شایاں ہوں، مثلاً شجاع۔ متقی۔ مقدس اور حریت پسند افراد کی۔ اور

انھیں کبھی کسی بخیل یا کمینہ آدمی کی نقل میں ماہر نہ ہونا چاہیئے۔ کہ کہیں نقل کرتے کرتے وہ مطابق بہ اصل نہ ہو جائیں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ اگر کوئی شخص ابتدائے زندگی سے کسی چیز کی نقل کرنا شروع کر دیتا ہے اور عرصہ تک اُسے جاری رکھتا ہے تو اُسے اس کی عادت سی پڑ جاتی ہے جو فطرت ثانیہ بنکر جواہر۔ آواز۔ دماغ سب کو متاثر کر دیتی ہے۔

ایڈ:- بیشک۔

میں:- ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو جو ہمارے زیر تربیت ہیں اور جنھیں نیک انسان بنانا ہمارا مقصد ہے۔ ہرگز کسی عورت کی نقل نہ کرنے دیں جو اپنے شوہر سے جھگڑتی ہو یا اپنی خوشحالی اور آرام و آسائش کے زعم باطل پر دیوتاؤں تک سے مقابلہ اور اُن کے روبرو تفاخر پر آمادہ ہو۔ یا کسی مصیبت کے باعث روتی پیٹتی ہو اور خصوصاً جب کہ بیمار ہو۔ حالت زچگی میں ہو یا کسی پر عاشق ہو گئی ہو۔

ایڈ:- بیشک۔ ہرگز اس کی اجازت نہ دینی چاہیئے۔

میں:- نہ ان لوگوں کو لونڈیوں غلاموں کا روپ بدلنا چاہیئے اور نہ کسی قسم کے غلامانہ افعال کرنے چاہیئں۔

ایڈ:- ہرگز نہیں۔

میں:- اور یقیناً انھیں بزدل اور ایسے بدکردار آدمیوں کی نقل بھی نہ کرنی

چاہیئے جو ہماری تمام تعلیمن کے خلاف عامل ہوں یعنی جو نشہ میں مدہوش ہو کر یا بہ ثبات ہوش وحواس ایک دوسرے کی ہنسی اُڑائیں یا کوسیں اور گالیاں دیں یا جو خود اپنی ذلّت یا اپنے ہمسایوں کے خلاف قولاً یا فعلاً گناہ کے مرتکب ہوتے ہوں۔ اسی طرح محافظین کو ایسے مردوں اور عورتوں کے اقوال واعمال کی نقل کرنا نہ سکھانا چاہیئے جو مبتلا رجنون ہوں، کیونکہ بدی اور شر کی طرح جنون بھی جاننے پہچاننے کی چیز ہے عمل پیرا ہونے اور نقل کرنے کی چیز نہیں۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- نہ انھیں سناروں، لوہاروں، ملاحوں یا دیگر اہل حرفہ کی نقل کرنی چاہیئے۔

ایڈ :- یقیناً۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ان فنون کی طرف توجہ کرنے کی تو انھیں اجازت نہیں ہے۔

میں :- اور اسی طرح گھوڑوں کے ہنہنانے، بیلوں کے چلانے، روانیٔ دریا کی دھیمی آواز، اور سمندر کے تموج کے مہیب شور یا بجلی کی کڑک یا اسی قسم کی اور چیزوں کی نقل بھی ان لوگوں کو نہ کرنی چاہیئے۔

ایڈ :- یہ تو مجنونوں کے کام ہیں۔ اور اگر جنون اور پاگل پن ممنوع ہے تو یہ بھی ممنوع ہونا چاہیئں۔

میں :- اگر میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں تو غالباً آپ کا مطلب یہ ہے

کہ کسی چیز کے کہنے میں ایک اچھا شخص بس ایک ہی طرز بیان اختیار کر سکتا ہے اور اس طرز کے علاوہ دوسرا طرز صرف وہی لوگ روا رکھیں گے جو اس نیک شخص کی بہ اعتبار تعلیم و تربیت بالکل ضد ہوں؟

ایڈ:- یہ دو طرز کونسے ہیں -

میں:- فرض کرو کہ ایک نیک اور عادل آدمی کوئی چیز بیان کرتے کرتے کسی دوسرے نیک انسان کے عمل یا قول پر پہنچا، تو میرا گمان ہے کہ وہ اس کا روپ اختیار کرنا چاہیگا اور اس نقل سے مطلق شرمندہ نہ ہوگا مثلاً جب یہ دوسرا شخص مضبوطی اور عقلمندی سے کوئی کام کر رہا ہے تو یہ قائل نہایت خوشی سے اس کی قائم مقامی کرنا چاہیگا۔ لیکن اگر یہ نیک شخص بیماری یا عشق میں مبتلا ہے، یا نشہ میں چور، تو یہ قائل ذرا مشکل سے ہی اس کی نقالی پر آمادہ ہوگا، اور اگر کہیں کسی ایسے اخلاق کا ذکر ہے جو اس کے شایان شان نہیں، تو اسے تو وہ مطالعہ تک نہ کرے گا۔ ایسے شخص کو حقارت کی نظر سے دیکھے گا اور اگر کبھی اس کی نقل کرے بھی تو صرف ان لمحوں کی جب اس سے کوئی نیک کام ہو رہا ہو۔ ورنہ ان افعال کی نقل سے تو وہ سخت شرمندہ ہوگا۔ جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوے۔ نہ وہ نیچ قسم کے لوگوں کی سی سج دھج اختیار کریگا۔ کہ ان تدابیر کے استعمال سے (الا بصورت مزاح) وہ اپنے کو بہت بلند پاتا ہے اور اس کا دماغ ان سے بالطبع نفور ہے۔

ایڈ:- میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

میں:- گویا وہ ایسا طرز بیان اختیار کریگا جیسا کہ ھومر کے کلام سے ہمنے مثالاً پیش کیا تھا یعنی اس کے طریقۂ ادا میں خالص بیان اور نقل دونوں کی آمیزش ہوگی۔ اول الذکر زیادہ ہوگا اور مؤخر الذکر کم۔ کیوں آپ متفق ہیں؟

ایڈ:- یقیناً۔ یہی نمونہ تو ہے جو ایسے مقرر کو اختیار کرنا چاہیئے۔

میں:- لیکن ایک اور قسم کے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو ہر قسم کی چیز بیان کرسکتے ہیں۔ یہ جتنے برے ہوتے ہیں اُتنے ہی بے جھجک اور بدلگام بھی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے سب کچھ اچھا ہے۔ یہ ہر چیز کی نقل کے لیے تیار رہیں اور صرف مزاح میں نہیں بلکہ صدق دل سے۔ اور اسپر طرہ یہ کہ بڑے سے بڑے مجمع کے سامنے۔ میں نے جیسے پہلے ذکر کیا تھا اس قسم کا آدمی بجلی کی طرح کڑکنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ طوفان آب و باد کا شور، پہیوں اور چرخیوں کی گھڑگھڑاہٹ اور ڈھول، بانسری یا کسی اور آلۂ موسیقی کی آواز وغیرہ سب کی نقالی کی کوشش اس سے ممکن ہے، وہ کتے کی طرح بھونک سکتا ہے، بھیڑ کی طرح ممیں ممیں کرسکتا اور مرغ کی طرح بانگ دے سکتا ہے۔ اس کا تمامتر ہنر آواز و اشارات کی نقالی میں صرف ہوتا ہے، اور اُس کے طرز ادا میں خالص بیان کو بہت کم جگہ ملتی ہے

ایڈ:- بیشک ایسے لوگوں کا تو یہی طریقہ ہوگا۔

میں:- تو گویا دو قسم کے طرز بیان یہ ہوئے؟

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ غالباً تم مجھ سے اتفاق کروگے کہ ان طرزہائے بیان میں ایک سادہ ہے جس میں زیادہ تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ اور اگر وزن اور بحر بھی اسی سادگی کا لحاظ کرکے اختیار کی جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر قائل صحیح طور پر اپنا سلسلہ کلام جاری رکھے تو اس کے طرز بیان میں کم و بیش یکسانیت قائم رہے گی۔ وہ ایک ہی وزن قائم رکھے گا (کیونکہ تبدیلیوں کی ضرورت ہی نہیں) اور غالباً بحر بھی شروع سے آخر تک ایک ہی استعمال کرے۔

ایڈ:۔ بالکل درست۔

میں:۔ لیکن دوسرے طرز بیان میں طرح طرح کے اوزان اور مختلف قسم کی بحروں کی ضرورت پڑے گی۔ طریقہ بیان میں چونکہ ہر طرح کی تبدیلی ہوتی ہے اس لیے اگر موسیقی اور طرز بیان میں مطابقت رکھنی ہو تو وزن اور بحر کا بدلنا بھی لازمی ہے۔

ایڈ:۔ یہ بھی بالکل بجا ارشاد ہے۔

میں:۔ اور کیا یہ دو طرز بیان یا انکی باہمی آمیزش تمام شعر پر اور الفاظ کے ذریعہ اظہار خیال کی تمام شکلوں پر حاوی نہیں؟ جب کبھی بھی کوئی شخص کچھ کہتا ہے تو یا تو ان دو طریقوں میں سے کوئی ایک اختیار کرتا ہے یا پھر دونوں کو ملا کر اپنا کام نکالتا ہے۔

ایڈ:۔ بیشک یہ سب برحا وی ہیں۔

میں:۔ تو پھر ہم اپنی ریاست میں یہ تینوں طریقے داخل کر لیں یا دو اصلی طریقوں میں سے صرف ایک منتخب کریں یا اس کے ساتھ دونوں کی آمیزش سے جو طرز پیدا ہوتا ہے اُسے بھی شامل کر لیں۔

ایڈ:۔ میں تو صرف اچھائی اور خوبی کی نقالی کو جگہ دینا چاہتا ہوں۔

میں:۔ ہاں، لیکن باہمی آمیزش سے جو طرز پیدا ہوتا ہے وہ بھی تو نہایت دلپذیر ہے۔ اور یوں تو وہ طرز بچوں، اُن کے کھلانے والوں، بلکہ عام طور پر تمام دنیا میں سب سے زیادہ مقبول ہے جو تمہارے منتخبہ طرز کی ضد ہے اور جس میں مُنھ سے کچھ کہے بغیر اشارات و حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کیا جاتا ہے۔

ایڈ:۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا۔

میں:۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ تم یہ دلیل دوگے کہ یہ طرز ہماری ریاست کے لیے موزوں نہیں۔ کیوں کہ اس ریاست میں تو فطرت انسانی دو رخی یا چند رخی ہوتی ہی نہیں، یہاں تو ایک شخص بس ایک ہی کام کرتا ہے۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔ اسی لیے تو یہ طرز نہایت ہی غیر موزوں ہے۔

میں:۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری ریاست میں اور صرف ہماری ہی ریاست میں تم چمار کو چمار ہی پاؤ گے، ناخدائی کرتے نہ دیکھو گے۔ کسان کو کسان کے کام میں ہی مشغول دیکھو گے منصف کا فرض ادا کرتے نہ پاؤ گے۔ سپاہی بس سپاہی

ہوگا، ساتھ ساتھ تاجر نہ ہوگا وقس علیٰ ہذا۔

ایڈ:۔ سچ ہے۔

میں:۔ چنانچہ اگر کبھی ان حضرات میں سے جو ہر چیز کی نقالی کمال ہنرمندی کے ساتھ کرتے ہیں کوئی صاحب ہماری ریاست میں آجائیں گے اور اپنی شاعری اور ہنرمندی کی نمائش کرنا چاہیں گے تو ہم بیشک ان کی بڑی تعظیم کریں گے اور بحیثیت ایک دلکش مقدس، اور حیرت انگیز ہستی کے انکی پرستش تک کریں گے، لیکن ساتھ ہی انھیں مطلع بھی کردیں گے کہ ہماری ریاست میں ان جیسے اشخاص کا وجود ممنوع ہے اور قانون ان کے قیام کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اُن کے جسم پر خوشبودار آمیزہ مل کر اور اُن کے سر پر اُون کا ایک ہار پہنا کر ہم ان بزرگ کو کسی دوسرے شہر کو چلتا کردیں گے۔ کیونکہ اپنی روح کی صحت کے لیے ہم زیادہ سخت اور ناتراشیدہ شعرا اور افسانہ گو چاہتے ہیں جو صرف نیک لوگوں کی نقل کریں اور صرف انھیں نمونوں کی اتباع کریں جن کا ذکر ہم سپاہ کی تعلیم کے ضمن میں کرچکے ہیں۔

ایڈ:۔ قدرت شرط ہے۔ انشاءاللہ ضرور ایسا کریں گے۔

میں:۔ عزیز من، اب سمجھو کہ موسیقی یا ادبی تعلیم کا وہ حصہ جو قصوں اور افسانہ گوئی سے متعلق ہے وہ تو ختم ہوا۔ کیونکہ ان کے نفس مضمون اور طرز بیان دونوں پر ہم بحث کرچکے۔

ایڈ :- جی ہاں - میرا بھی یہی خیال ہے۔

میں :- اس کے بعد نغمہ اور راگ کا نمبر آتا ہے۔

ایڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- ہم اگر اپنی گذشتہ آرا کے پابند ہوں تو ہر شخص بتلا سکتا ہے کہ اس بارہ میں ہم کیا کہیں گے۔

گلاکن : ہنسکر بولے کہ اس آپ کے "ہر شخص" میں تو میں مشکل ہی سے آتا ہوں - کیونکہ میں آپ کو فوراً بے سوچے سمجھے نہیں بتلا سکتا کہ ان کے متعلق کیا فیصلہ ہونا چاہیئے - ہاں کچھ بعض قیاس و ظن سے کام لے سکتا ہوں۔

میں - خیر آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ گیت یا ترنم میں تین حصے ہوتے ہیں، الفاظ، اسلوب، اور وزن (ایقاع) یہ تو میں فرض کیئے لیتا ہوں کہ آپکو اتنا علم ہے۔

گ :- ہاں - اتنا علم تو آپ فرض کر سکتے ہیں۔

میں :- جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے تو اس بارہ میں تو ان الفاظ میں جو موسیقی میں استعمال کیے جائیں اور ان میں جو اس میں مستعمل نہ ہوں یقیناً کوئی فرق نہ ہونا چاہیئے - دونوں ایک ہی قانون کے تابع ہوں گے اور یہ قوانین پہلے متعین کیے جا چکے ہیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- سب اسلوب اور وزن تو ان کا انحصار الفاظ پر ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- مطالب شعر اور نفس مضمون پر بحث کرتے ہوئے ہم نے کہا تھا کہ ہمیں شکوہ شکایت اور غم کے ترانوں کی ضرورت نہیں ہے۔

گ :- جی۔

میں :- ہاں تو وہ کونسے اسلوب ہیں جن سے غم ظاہر ہوتا ہے۔ آپ موسیقی سے واقف ہیں اس لیے بتلا سکتے ہیں۔

گ :- آپ کا اشارہ جن اسلوبوں کی طرف ہے وہ مخلوط لیڈای یا کامل لیڈای یا ان کے مماثل اسلوب ہیں۔

میں :- تو پھر انھیں اپنے ہاں سے خارج کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مردوں کا تو ذکر ہی کیا یہ اسلوب تو ان عورتوں کے لیے بھی بیکار ہیں جو اپنے ذاتی صفات حسنہ کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- اس کے علاوہ مخموری، نرمی، بے ستی و کاہلی بھی ہمارے محافظین کے اخلاق کے شایاں نہیں۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اور نرمی اور مخموری کے اسلوب کونسے ہیں؟

گ - اینونی اور لیدیائی - انھیں متغافل و مسترخ بھی کہتے ہیں۔

میں :- کیا ان کا کوئی فوجی استعمال نہیں ہو سکتا؟

گ :- جی نہیں - یہ تو اس مقصد کے بالکل برعکس ہیں - ان اسالیب کو خارج کر دینے کے بعد بس اب دودی اور فریجی اسلوب باقی رہ گئے۔

میں :- میں تو ان اسالیب وغیرہ سے بالکل واقف نہیں لیکن ہاں میں ایک جنگی اسلوب ضرور چاہتا ہوں - جو اس انداز و لہجہ کی ترجمانی کر سکے جو ایک بہادر انسان سے خطرہ میں عزم کرتے وقت ظاہر ہوتا ہے - یا اُس وقت جب اس کا مقصد فوت ہو رہا ہو اور ناکامی کے آثار نمایاں ہوں، اس کے جسم پر پے بہ پے کاری زخم لگ رہے ہوں، موت کا سامنا ہو یا کوئی اور سخت مصیبت درپیش، اور وہ اس طوفان حوادث کے ہر لطمۂ موج کو پامردی و استقلال کے ساتھ برداشت کرنا چاہے - اس کے علاوہ ایک اور اسلوب بھی مجھے درکار ہے جو آزادی اور امن کے وقت آدمی کے کام آسکے جب ضرورت و احتیاج کا دباؤ نہ ہو اور وہ اپنے خدا کو دعا سے راضی کر رہا ہو یا انسانوں کو ترغیب و ترہیب سے یا اس کے برعکس جب ترغیب و ترہیب کے باعث وہ خود کسی بات کے ماننے پر آمادگی ظاہر کرتا ہو - یا ایسا اسلوب جو اس حالت کی ترجمانی کر سکے جب ایک شخص دانشمندی سے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے اور اپنی کامیابی سے از خود رفتہ نہیں ہو جاتا بلکہ اُسے برداشت کر کے اعتدال و دانشمندی کو ہات سے نہیں

جانے دیتا۔ بس آپ سے مجھے یہی دو اسلوب درکار ہیں یعنی ضرورت کا اور آزادی کا، خوش قسمتی کا راگ اور بدنصیبی کا، ہمت و شجاعت کی لے اور عفت واعتدال کا نغمہ میرے لیے یہ چھوڑ دیجیے۔ باقی مجھے درکار نہیں۔

گ :- اور یہ دو بس وہی دوری اور فریجی اسلوب ہیں جن کا میں نے ذکر کیا۔

میں :- تو ہمارے نغموں میں بس یہی دو اسلوب مستعمل ہوں گے۔ لہذا ہمیں نہ بہت سے مختلف اسالیب کی ضرورت پڑیگی نہ ہر اسلوب پیدا کرنیوالے آلات کی۔

گ :- جی ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہ ہو گی۔

میں :- گویا ہمیں اس پیچیدہ نکونے ہارپ بجانیوالوں کی ضرورت نہ پڑے گی اور نہ ہمیں کئی تار والے عجیب عجیب آلات موسیقی کے بنانے والے درکار ہوں گے۔

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اور مزمار بنانے اور بجانے والوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ مختلف مقامات موسیقی کی باہم آمیزش کے اعتبار سے تو مزمار تمام تار والے آلات سے بڑا ہے۔ تمام سروں کی مخلوط موسیقی بھی اسی کی نقالی ہے۔ پھر کیا اسے ریاست میں داخل کیا جائیگا؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اس طرح شہر والوں کے لیے بس عود اور ستار رہ جاتے ہیں

گانوں میں چرواہے بانسری رکھ سکتے ہیں۔

گ :- اس دلیل سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

میں :- بہرحال اگر اپولو کے آلہ کو مرسیاس کے آلہ پر ترجیح دی گئی تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔

گ :- ہاں۔ اس میں بھلا کیا تعجب !

میں :- کلب مصری کی قسم تھوڑی دیر پہلے جس ریاست کو عیش طلب اور آرام پسند کہا تھا اب تک بلا ارادہ ہم اسے پاک ہی کرتے رہے ۔

گ :- جی ہاں۔ ہم نے بہت ٹھیک کیا۔

میں :- تو آؤ اس تنقیہ کو پورا ہی کر دیں۔ اسالیب کے بعد قدرتاً وزن اور ایقاع کا سوال ہے میری رائے میں تو یہ بھی انھیں قواعد کی پابند ہوں کیونکہ ہر قسم کے مخلوط اوزان کی تلاش بیکار ہے۔ ہمیں وہ اوزان دریافت کر لینے چاہئیں جو ایک ہموار اور شجاع زندگی کی ترجمانی کر سکیں اور جب یہ معلوم ہو گئے تو پھر تال اور سُر تو الفاظ سے مطابق کیے جائیں گے نہ کہ الفاظ تال و سُر کے۔ یہ اوزان کون کون ہوں یہ آپ بتلائیے۔ اسالیب کی طرح ان کا سبق بھی آپ ہی کو دینا ہوگا۔

گ ۔لیکن سچ یہ ہے کہ میں کچھ نہیں بتلا سکتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جیسے چار آوازوں سے تمام اسلوب بن جاتے ہیں اسی طرح وزن کے بھی تین اصول ہیں جن سے تمام اوزان ترتیب دیے جاتے ہیں۔ میرا علم بس اسقدر ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ کس قسم کی زندگی کی نقل ہیں سو اس کا جواب دینے سے بندہ قاصر ہے۔

ہیں :- اچھا تو آؤ ڈیمن کو اپنے مشورہ میں شریک کریں۔ اس سے پتہ چل جائیگا کہ کون اوزان کم ظرفی، گستاخی، غصہ، یا دیگر معائب کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے خلاف محاسن کے اظہار کیلیے کونسی بحریں مناسب ہیں۔ مجھے کچھ یونہیں سا یاد پڑتا ہے اس نے ایک پیچیدہ کریٹی بحر کا ذکر کیا ہے اور ایک بہادری کی بحر کا۔ اور ان کو اس نے کچھ خاص ترتیب سے رکھا تھا جو میں نہیں سمجھ سکا۔ بحر کو مصرع کے ٹکڑوں کے اُتار چڑھاؤ کے اعتبار سے مساوی کر دیا تھا۔ جس میں طویل کے بعد صغیر اور صغیر کے بعد طویل ٹکڑا آتا تھا۔ اور اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو اس نے ایک آیامبی اور ایک تروشی بحر کا بھی ذکر کیا تھا اور ان میں صغیر و طویل کی تعیین کر دی تھی۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ اگر بعض جگہ اس نے پوری بحر کی تعریف یا تنقیص کی تھی تو کہیں مختلف ٹکڑوں کی روانی کو بھی اس کا مورد قرار دیا تھا۔

بہرحال بہتر ہے کہ یہ معاملات ڈیمن ہی پر چھوڑ دیے جائیں۔ کیونکہ ہمارے لیے اس مضمون کا تجزیہ بہت ہی دشوار ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- لیکن اس بات کے سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں کہ حسن و خوبی کا وجود یا عدم اچھی یا بُری بحر کا لازمی نتیجہ ہے۔

گ :- اس میں کیا شبہ ہے۔

میں :- اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اچھے اوزان اچھے انداز بیان کے ساتھ چلتے ہیں اور بُرے بُرے انداز کے ساتھ۔ اسی طرح بحر اور اسلوب موسیقی کے حسن و قبح کے بھی تابع ہیں۔ کیونکہ ہم نے یہ تو اصولاً مان ہی لیا ہے کہ بحر اور اسلوب الفاظ کے پابند ہیں نہ کہ الفاظ اُن کے۔

گ :- بیشک۔ انھیں الفاظ کا پابند ہونا چاہیئے۔

میں :- اور کیا الفاظ اور انداز بیان کا انحصار روح کی کیفیت پر نہ ہوگا؟

گ :- یقیناً۔

میں :- اور باقی تمام چیزیں انداز بیان پر منحصر ہونگی۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- گویا انداز بیان اور اسلوب حسن کلام اور خوبی بحر سب کے سب سادگی پر مبنی ہیں۔ سادگی سے میرا مطلب ایک صحیح طور پر مرتب دماغ اور اخلاق کی حقیقی سادگی سے ہے نہ اس سادگی سے جو بیوقوفی کا دوسرا نام ہے۔

گ :- سچ ہے۔

میں :- اگر ہمارے نوجوانوں کو اپنا حقیقی مقصد زندگی پورا کرنا ہی تو کیا انھیں ہمیشہ اس حسن و تناسب کو اپنا مقصد نہ قرار دینا چاہیئے۔

گ :- بلاشبہ۔ چاہیئے۔

میں :- اور سچ تو یہ ہی کہ فن مصوری بلکہ تمام دیگر تخلیقی فنون اس سے لبریز ہیں۔ مثلاً فن تعمیر، پارچہ بافی، سوزن کاری اور دوسری تمام چیزوں کی تیاری۔ یہی نہیں بلکہ قدرت کی تمام حیوانی یا نباتی کائنات میں یہ حسن یا اسکا عدم پایا جاتا ہی اور بدصورتی اور عدم تناسب یا حرکات غیر مرتبہ، بُرے الفاظ اور بُری فطرت سے اسی طرح وابستہ ہیں جیسے حسن و تناسب نیکی اور خوبی کی بہنیں ہیں اور ان سے مشابہ۔

گ :- بالکل سچ ہی۔

میں :- اچھا کیا ہماری نگرانی بس یہاں ختم ہو جاے؟ اور کیا ہمارا یہ مطالبہ صرف شعرا سے ہوگا کہ وہ اپنے کلام میں صرف نیکی اور خیر کا جلوہ دکھائیں۔ ورنہ بصورت دیگر ہم انھیں ریاست سے خارج کر دینگے؟ یا اس نگرانی کو دیگر ماہرین فنون پر بھی عائد کیا جاے گا اور کیا ان کے لیے بھی سنگتراشی، تعمیر، یا دیگر فنون تخلیقی میں خیر و نیکی کے اضداد شر، بے اعتدالی، عدم عفت، کم ظرفی اور بدقماشی کے اظہار کو ممنوع قرار دیا جائیگا۔ اور اگر انھوں نے اس قاعدہ کی پابندی نہ کی تو ہم انھیں اپنی ریاست میں کام نہ کرنے دینگے۔ مبادا ہمارے شہریوں کا مذاق

آلودہ ہوجائے۔ ہم ہرگز معائب اخلاق کی فضا میں اپنے محافظین کی نشوونما کے روادار نہیں ہوسکتے کہ اس کی مثال تو ایسی ہی ہوگی کہ ہم نے ان جانداروں کو ایسی زہریلی چراگاہ میں چھوڑ دیا ہے جہاں وہ روزانہ کچھ نہ کچھ مضر اور سمی بوٹیاں کھاتے رہیں اور رفتہ رفتہ اپنی روح کی آلودگی کے لیے گندگی کا کافی مؤثر ذخیرہ فراہم کریں۔ ہمارے ماہرین فن تو وہ لوگ ہونے چاہئیں جو حسن وجمال کی اصلی حقیقت کو دیکھ سکیں اور یہ صورت اسی وقت ممکن ہوگی کہ ہمارے نوجوان صحت وتندرستی کی زمین پر آباد ہوں، دیکھیں تو جمال کا نظارہ کریں، اور سنیں تو کان تک حسن کا ہی ترانہ آئے۔ وہ ہر چیز کی خوبی سے متمتع ہوں اور حسن وجمال کی فراوانی ان کے سامعہ وباصرہ کو اس طرح متاثر کرے کہ گویا کسی پاک تر عالم سے صحت افزا نسیم کے جھونکے آرہے ہیں تاکہ ابتداء عمر سے ہی ایک غیر محسوس طور پر اُن کی روح میں حسن معقول کے ساتھ مماثلت اور ہمنوائی پیدا ہوجائے۔

گ:۔ اس سے بہتر اور کونسی تعلیم ہوسکتی ہے!

س:۔ یہی وجہ تو ہے کہ موسیقی کی تعلیم دوسری تمام تعلیموں سے زیادہ مؤثر ہے۔ کیونکہ آپ کی یہ بحر اور اسلوب یہ توازن وتناسب روح کے اندر تک اپنی راہ نکال لیتے ہیں اور سختی کے ساتھ اس پر اپنا تصرف کرلیتے ہیں پھر جس کی تعلیم صحیح ہے اُس کی روح کو حسن وجمال کا تحفہ دیتے ہیں، اور جو روح بری تعلیم پاتی ہے بدصورت ومکروہ بنجاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جس شخص کے وجود مخفی (روح) کو صحیح تعلیم

نصیب ہوئی ہو وہ نہایت ذکاوت کے ساتھ کارخانہ قدرت یا فنون کی غلطیاں اور فروگذاشتوں کو محسوس کرلیگا۔ اور جہاں ایک طرف اپنے مذاق صحیح کے باعث اپنی روح کو محاسن و مکارم سے بہرہ یاب کرکے اس کی تعریف و توصیف کریگا اور اس سے لطف اندوز ہوگا تو اُس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف معائب و مخارب کی مذمت بھی کریگا اور اُن سے نفور ہوگا۔ اور یہ سب کچھ ایسی کم سنی کے عالم میں کہ وہ اس تعریف یا مذمت کے وجوہ تک نہ بیان کرسکیگا۔ لیکن جب اسے عقل و شعور آئے گا تو اپنے اس دیرینہ دوست کو پہچان کر اس کا خیر مقدم کریگا جس سے اس کی تعلیم نے اسے عرصہ سے مانوس کر رکھا تھا۔

گ:۔ میں آپ سے اس بارہ میں پورا اتفاق کرتا ہوں کہ ہمارے نوجوانوں کو موسیقی کی تعلیم دینی چاہیئے اور انھیں اصول پر جو آپنے بیان فرمائے۔

س:۔ جب ہم کسی زبان کی عبارت پڑھنا سیکھتے ہیں تو ہمیں اطمینان اسی وقت ہوتا ہی کہ اس کے تمام حروف تہجی سے (جو تھوڑے ہی ہوتے ہیں) واقف ہوجائیں۔ البتہ اس طرح کہ ان کی تمام ممکن شکلوں سے خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی اور اُن کی تمام مختلف ترتیبوں سے آشنا ہوجائیں۔ اور خواہ یہ حروف کم جگہ گھیریں یا زیادہ ہم انھیں بے اعتنائی سے نہ دیکھیں بلکہ ہر موقع پر ان کے پہچاننے کی کوشش کریں اور عبارت پڑھنے میں اس وقت تک اپنے کو پورا ماہر نہ تصور کریں جبتک کہ ان حروف کو ہر جگہ بآسانی نہ پہچان لیا کریں۔

گ :- جی۔

میں :- یا جس طرح ہم پانی یا آئینہ میں حروف کے عکس کو اسی وقت پہچان سکتے ہیں جب پہلے خود حروف سے آشنا ہوں کیونکہ ایک ہی فن اور تعلیم سے ان دونوں کا علم ممکن ہے۔

گ :- ہی۔ درست۔

میں :- اسی طرح میرا خیال ہے کہ ان محافظین کے طبائع میں جن کی تعلیم ہمارے سپرد ہے کبھی بھی موسیقی اور تناسب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک وہ عفت و اعتدال، شجاعت، جود و سخا، شان و شوکت وغیرہ اور اُن کے اضداد کی ضروری شکلوں سے واقف نہ ہوں۔ اور اُن کے پرتو کو ہر جگہ اور ہر ترتیب میں پہچان نہ سکیں۔ اور خواہ یہ بڑی چیزوں میں رونما ہوں یا چھوٹی میں ہم ان کی طرف سے بے اعتنائی نہ کریں بلکہ انھیں ایک فن اور علم کا موضوع بحث خیال کریں۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اور جب ایک جمیل روح کی مناسبت ایک حسین جسم کے ساتھ پیدا ہو جائے اور دونوں ایک ہی قالب میں ڈھال دیے جائیں تو صاحب بصیرت کے لیے یہ سب سے زیادہ نظر فریب منظر ہوگا۔

گ :- بیشک۔ اس سے زیادہ خوبصورت اور کیا چیز ہو گی۔

میں :- اور جو حسین تر ہو وہی محبوب تر بھی ہوگا۔

گ :- بیشک۔ آپ یہ فرض کر سکتے ہیں۔

میں :- اور جس شخص کے اندر روح کا تناسب موجود ہو وہ تو محبوب تر چیز سے ہی سب سے زیادہ محبت کریگا۔ ایک غیر مرتب و غیر متناسب روح کو تو وہ ہرگز عزیز نہیں رکھ سکتا۔

گ :- یہ سچ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ نقص اُس کی روح میں پایا جائے ورنہ اگر صرف کوئی جسمانی عیب ہو تو اُسے یہ گوارا کر لیگا اور اس کے باوجود ایک چیز کو محبوب رکھ سکتا ہے۔

میں :- میں سمجھا۔ آپ کو شاید اس قسم کا تجربہ ہے۔ اور میں آپ سے متفق ہوں لیکن میں ذرا ایک سوال اور کرلوں یعنی کیا کثرت مسرت و حظ کو عفت اور اعتدال سے کوئی تعلق و مناسبت ہے؟

گ :- یہ کیسے ممکن ہے؟ مسرت و شادمانی اسی طرح انسان کو اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے قاصر کر دیتی ہے جس طرح غم و کرب۔

میں :- اور کیا اسے عام طور پر نیکی سے کوئی مناسبت ہوسکتی ہے؟

گ :- کچھ نہیں۔

میں :- اور کوئی مناسبت بے اعتدالی اور سفاہت میں ہے؟

گ :- بیشک۔ بہت زیادہ۔

میں :- کیا شہوانی محبت سے زیادہ قوی کوئی اور حظ و مسرت ہے؟

گ :- نہیں۔ نہ اس سے زیادہ مجنونانہ۔

میں :- حالانکہ حقیقی محبت تو حسن اور نظام کی محبت ہے جس میں اعتدال پسندی و عفت بھی ہو اور باہمی تناسب بھی۔

گ :- بالکل صحیح۔

میں :- لہذا حقیقی محبت کے پاس تو بے عفتی اور جنون کو پھٹکنا بھی نہ چاہیئے

گ :- بیشک۔

میں :- چنانچہ عاشق و معشوق دونوں کو جنون و بے عفتی سے کچھ سروکار نہ ہونا چاہیئے اگر ان کی محبت صحیح نوع کی محبت ہے تو طرفین میں سے کسی کو ان جذبات سے تعلق نہیں ہو سکتا۔

گ :- بیشک۔ ان جذبات کو تو ان کے پاس بھی نہ آنا چاہیئے۔

میں :- لہذا ہم جس شہر کی بنیاد رکھ رہے ہیں تم اس کے لیے یہ قانون مقرر کر دو گے کہ ایک دوست اپنے محبوب کے ساتھ بس اسی درجہ کی بے تکلفی برتے جیسی اپنے بیٹے سے برتتا ہے اور یہ بھی نیک نیتی کے ساتھ اور اس کی اجازت سے تمام روابط شخصی میں اسے اس قاعدہ کا پابند ہونا چاہیئے اور اس سے تجاوز ممنوع۔ اور اگر وہ کبھی اس سے تجاوز کرے تو بد مذاقی اور دناءت کے جرم کا مرتکب متصور ہو۔

گ :- میں آپ سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔ بس۔ موسیقی کے متعلق اسقدر کافی ہے۔ اس بحث کا خاتمہ بھی خوب ہوا۔ کیونکہ موسیقی کا مقصد اصلی اگر حسن وجمال کی محبت نہ ہو تو اور کیا ہو؟

گ:۔ بیشک میرا صاد ہے۔

میں:۔ موسیقی کے بعد ورزش جسمانی کا نمبر آتا ہے کہ بچوں کو اب یہ سکھائی جائے۔

گ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ موسیقی کیطرح ورزش جسمانی کی تعلیم بھی اوائل عمر ہی میں شروع ہونی چاہیئے۔ اس کی تعلیم پر بہت توجہ کی ضرورت ہے اور اسے تمام عمر جاری رکھنا ہے۔ میرا تو عقیدہ ہے۔ اور میں اس بارہ میں آپ سے اپنی راے کی تصدیق چاہتا ہوں لیکن بہرحال میرا عقیدہ ہے کہ جسم اپنی خوبی سے روح کو ترقی نہیں دیتا بلکہ اس کے برعکس ایک صالح روح اپنی خوبی سے حتی الامکان جسم کی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ کیوں۔ آپ کی کیا راے ہے؟

گ:۔ جی ہاں۔ میں بھی آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں:۔ چنانچہ دماغ کی کافی تربیت ہوجاے تو ہم جائز طور پر جسم کی نگہداشت کا کام اُسیر چھوڑ سکتے ہیں، چنانچہ غیرضروری تفصیل سے بچنے کے لیے یہاں اس موضوع پر ایک اجمالی ساخاکہ تیار کرتے ہیں۔

گ:۔ بہت خوب۔

میں:۔ یہ تو ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ ان لوگوں کو مسکر اشیاسے پرہیز کرنا ہوگا

اور ایک محافظ کے لیے تو ازبس ضروری ہو کہ وہ کبھی نشہ میں مدہوش اور دنیا و مافیہا سے بے خبر نہ ہو جائے۔

گ:- جی ہاں۔ اور کیا۔ اگر خود محافظ کے لیے ایک اور نگراں اور محافظ کی ضرورت ہو تو عجیب مضحکہ انگیز بات ہوگی۔

میں:- پھر ان کی غذا کے متعلق کیا کہتے ہو؟ یہ خیال رہے کہ یہ لوگ بہت بڑے معرکہ کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ کیوں ہی نہ؟

گ:- بیشک۔

میں:- کیا ہمارے معمولی ورزش کرنے والوں کی عادات جسمانی ان لوگوں کے لیے بھی مناسب ہوں گی؟

گ:- ہاں۔ کیوں نہیں۔

میں:- میرے خیال میں تو ان لوگوں کی جسمانی کیفیت کچھ اونگھتی، سوتی، اور غالباً صحت کے لیے مضر ہوتی ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ یہ کسرتی لوگ ساری عمر سوتے سوتے ہی گنوا دیتے ہیں اور جہاں ذرا اپنے معمول سے ادھر اودھر ہٹے کہ شدید علالت اور مرض سے دست و گریبان ہونا پڑتا ہو۔

گ:- جی ہاں۔ یہ تو ضرور سچ ہو۔

میں:- اس لیے میری رائے میں ہمیں اپنی جنگجو ورزشی لوگوں کے لیے اس سے بہتر تربیت کا انتظام کرنا ہوگا۔ ان لوگوں کی حالت تو ہشیار کتوں کی سی ہونی

چاہیے جن کا سامعہ و باصرہ بہت تیز ہو۔ ایام جنگ میں آب و ہوا کی تبدیلی یا غذا کے تغیر کا اُن پر کچھ اثر نہ ہو اور نہ گرمی کی سخت تپش یا سرما کی شدید سردی سے اُن کی تندرستی کو کوئی نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔

گ:- میرا بھی یہی خیال ہے۔

میں:- عمدہ ورزش بھائی سچ پوچھو تو اس سادہ موسیقی کی جڑواں بہن ہے جس کا بیان ہم نے ابھی ابھی کیا تھا۔

گ:- یہ کیسے۔

میں:- یہ اس طرح کہ میرے نزدیک اس موسیقی کی طرح ورزش کی بھی ایک قسم ہے جو نہایت عمدہ اور سادہ ہے خصوصاً فوجی ورزش کی۔

گ:- آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں:- تمھیں میرے مفہوم کا پتہ ھومر سے چل جائے گا۔ دوران جنگ میں وہ اپنے مشاہیر کو دعوتوں تک میں سپاہیانہ کھانے کھلاتا ہے مثلاً یہ لوگ (Hellespont) کے کنارہ پر ہیں لیکن ان کے دسترخوان پر مچھلی موجود نہیں انھیں اُبلا گوشت تک نہیں ملتا، بس آگ پر ذرا سینک کر کھا لیتے ہیں۔ اس لیے کہ سپاہیوں کے لیے یہی زیادہ آرام دہ ہے۔ تھوڑی سی آگ جلائی اور کام چلا لیا۔ دیگچی اور کڑاہی کا گھڑاگ ساتھ لیے پھرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

گ:- سچ ہے۔

میں :- اور غالباً یہ کہنے میں میں غلطی نہیں کرتا کہ میٹھی چٹنیوں کا تو ھومر کے کلام میں کہیں ذکر ہی نہیں۔ لیکن انہیں ممنوع قرار دینے میں ھومر کچھ اکیلا نہیں یہ تو تمام پیشہ ور پہلوان خوب جانتے ہیں کہ اگر آدمی اچھی حالت میں رہنا چاہے تو ان چیزوں سے پرہیز لازمی ہے۔

گ :- جب انھیں اس کا علم ہے تو وہ بالکل ٹھیک کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا استعمال نہیں کرتے۔

میں :- بالفاظ دیگر آپ سیراکوزد Syracuse کی دعوتوں اور سسلی کی لطیف طباخی کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔

گ :- جی ہاں میری تو یہی رائے ہے۔

میں :- اور اگر یہ عمدہ جسمانی حالت قائم رکھنی ہے تو غالباً آپ یہ اجازت بھی نہ دینگے کہ یہ کسی حسین کار نتھی دوشیزہ کو اپنا دوست بنائیں۔

گ :- یقیناً۔ ہرگز نہیں۔

میں :- اور نہ آپ غالباً اثینا کے حلوائیوں کی نفیس مٹھائیوں کو ہی پسند کریں گے۔

گ :- کبھی نہیں۔

میں :- ان غذاؤں اور اس طریقہ بود و باش کی صحیح مثال اس نغمہ کی سی ہے جو سب کے سب اسالیب اور نہایت مختلف بحروں میں مرتب کیا گیا ہو۔

گ :- بالکل۔

میں :- موسیقی میں تو اس پیچیدگی اور اُلجھاؤ سے بے راہ روی اور بدمذاقی پیدا ہوتی ہے، لیکن ورزش میں مرض پیدا ہوگا۔ اور جس طرح موسیقی کی سادگی سے روح میں عفت و اعتدال کے محاسن پیدا ہوتے ہیں ورزش میں یہ صحت جسمانی کا باعث ہوگی۔

گ :- بجا ہے۔

میں :- لیکن جب کسی ریاست میں بے عفتی و بے اعتدالی اور امراض جسمانی کی کثرت ہو تو ہمیشہ طب اور انصاف کے بڑے بڑے ایوان تعمیر ہوتے ہیں۔ اور طبیب و مقنن خوب بڑھا بڑھا کر اپنے پیشوں کی تعریف کرتے ہیں کہ اب تو غلام ہی نہیں بلکہ احرار شہر بھی ان میں گہری دلچسپی لینے لگے۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- لیکن تم ہی بتاؤ کہ تعلیمی حالت کے بُرے اور شرمناک ہونے کا اس سے قوی اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ صرف معمولی کاریگروں اور نیچ قسم کے لوگوں کو ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کو بھی جو تعلیم یافتہ ہونے کے مدعی ہیں عمدہ طبیبوں و منصفوں کا دست نگر ہونا پڑے۔ کیا یہ عمدہ تربیت اور صحیح پرورش کے فقدان کی روشن دلیل اور ایک نہایت شرمناک بات نہیں کہ اُسے قانونی یا طبی مشورہ کے لیے باہر جانا پڑے کہ خود اُس کے ملک میں یہ چیز نایاب ہے اور اس طرح وہ اپنے کو دوسروں کے ہاتھ میں دیدے، اور انھیں معاملات میں حَکَم اور اپنے اوپر قادر تسلیم کرلے۔

گ:- بیشک۔ یہ تو سب سے زیادہ ذلت کی بات ہے۔

میں:- واقعی "سب سے زیادہ"؟ ذرا سوچو۔ کیا خرابی کی ایک اور منزل اس کے آگے نہیں جس میں آدمی یہی نہیں کہ ساری عمر مقدمہ بازی کرتا رہے اور کبھی مدعی کبھی مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے تمام دن عدالتوں میں گنوائے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی بدمذاقی کے باعث اس حرکت پر فخر بھی کرتا ہو۔ ایسا آدمی سمجھتا ہے کہ فنِ بے ایمانی کا امام ہے۔ بُرے سے بُرے طریقے اختیار کرنے میں اُسے مطلق عار نہیں، ہر جگہ نکل بیٹھ کر سکتا ہے اور سانپ کے سے پیچ و خم کھا کر ہر سوراخ سے نکل سکتا ہے اور اپنے کو عدالت کی ضرب سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور یہ سب کچھ آخر کیوں؟ ایسی چھوٹی چھوٹی اور ذلیل باتوں کے لیے جو قابل اظہار بھی نہیں ہوتیں۔ یہ غریب نہیں جانتا کہ اپنی زندگی اس طرح مرتب کرنا بہت زیادہ ارفع اور اعلیٰ ہے کہ آدمی اونگھتے ہوئے منصفوں کی خدمات سے بالکل مستغنی ہو۔ تم ہی کہو کہ اس شخص کی حالت کیا اور بھی ذلیل نہیں؟

گ:- بیشک۔ یہ تو اور بھی شرمناک ہے۔

میں:- اور یہ کون کم شرمناک بات ہے کہ لوگ طب کی اعانت کے طلبگار ہوں۔ اور یہ نہ صرف کسی زخم کے اندمال کی خاطر یا کسی دماغی مرض کے موقع پر بلکہ محض اس لیے کہ خود اپنی کاہلی و سستی اور مذکورہ عادات زندگی کے باعث حضرات اپنے جسم کو رطوبات و ریاح سے بھر کر ایک دلدل سا بنا لیتے ہیں۔ اور اسکلی پی اس

کی ہوشیار ذریات کو اس بات کا موقع دیتے ہیں کہ نفخ، نزلہ، زکام وغیرہ امراض کے نت نئے نام تراشیں۔

گ:۔ جی ہاں۔ یہ لوگ تو امراض کے کچھ عجیب نئے نئے نام رکھتے ہیں۔

میں:۔ مجھے تو یقین نہیں کہ اسکلی پی اس کے زمانہ میں بھی یہ سارے امراض تھے۔ اور یہ نتیجہ میں نے اس سے نکالا کہ ھومر کے کلام میں ذکر ہی کہ جب یوری پائیلس زخمی ہوا تو اس نے جو کے ستو ملا کر خوب شراب پی اور پنیر کھایا۔ یہ چیزیں یقیناً حار ہیں لیکن اسکلی پی اس کے جو متبع اور پیرو وہاں جنگ ٹرو جن میں موجود تھے انھوں نے اس خاتون کو جو شراب کا پیالہ لائی تھی کچھ برا بھلا نہ کہا بلکہ الٹے پیٹرو کلس معالج کو ملامت کی۔

گ:۔ خوب۔ ایسی حالت میں کسی شخص کو یہ پلانا تو عجیب سی بات ہی۔

میں:۔ نہیں۔ کچھ ایسی تعجب کی بات نہیں۔ عام خیال یہ ہی کہ پہلے پہل یعنی زمانہ ھیرو ڈی کس سے قبل اسکلی پی اس کا یہ جتھا موجودہ نظام طبی پر عمل پیرا نہ تھا۔ کیونکہ سچ پوچھو تو یہ تو امراض کی پرورش کرنا ہی لیکن ھیرو ڈی کس رائض تھا اور خود بھی کچھ یونہی بیمار سا آدمی تھا چنانچہ ریاضت اور علاج معالجہ کی باہم آمیزش سے اس نے پہلے تو خود اپنے کو مبتلائے مصیبت کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور پھر ساری دنیا کو اس میں گرفتار کیا۔

گ:۔ یہ کیسے؟

میں :۔ سسک سسک کر مرنے کا طریقہ ایجاد کرکے ! وہ ایک مہلک مرض میں مبتلا تھا اور ہمیشہ اسی کی نگہداشت میں لگا رہتا تھا۔ اس مرض سے نجات کا امکان تو تھا نہیں بس ساری زندگی خدمتگار کی طرح گذار دی۔ یہی ایک کام تھا کہ اپنی پاسبانی کیا کرے، غذا وغیرہ میں ذرا معمول سے تجاوز کیا اور تکلیف میں مبتلا ہوا۔ غرض اپنے علم کے ذریعہ یونہی مر مر کر جیسے تیسے اپنے بڑھاپے تک پہنچ گیا۔

گ ۔ فن میں مہارت کا اچھا انعام ملا !

میں :۔ ہاں۔ یہ انعام اسی آدمی کا حق تھا جو یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اگر اسکلی پی اس نے اپنے جانشینوں کو جسم کی خدمت گذاری کا یہ فن نہیں سکھایا تو یہ فروگذاشت طب کے اس شعبہ سے ناواقفیت یا ناتجربہ کاری کی بنا پر نہ تھی بلکہ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ ایک منتظم ریاست میں ہر فرد کے لیے ایک کام ہوتا ہے جس کا انجام دینا اس کے لیے ضروری ہے اور اُسے یہ فرصت نصیب نہیں کہ برابر بیمار رہ سکے۔ ہم معمولی کاریگروں کے بارہ میں تو اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ جہاں ذرا مالدار آدمیوں کا معاملہ ہوتا ہے تو اس سے چشم پوشی کرنے لگتے ہیں۔

گ :۔ یہ کیسے ؟ آپ کا کیا مطلب ہے ؟

میں :۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب ایک بڑھئی بیمار پڑ جاتا ہے تو وہ طبیب سے کوئی

تیز اور زود اثر دوا مانگتا ہے۔ اس کا علاج تو بس یہی ہے کہ جلاب لے لیا یا فصد کھلوالی۔ بدن پر داغ دلوا دیا، یا عمل جراحی کرا لیا۔ اور کوئی صاحب اس کے لیے غذا کا ایک پورا انتظام تجویز کریں اور ہدایت کریں کہ اپنے سر کو یوں لپیٹا باندھا کرو یا اسی قسم کی اور باتیں بتائیں تو وہ صاف کہہ دیتا ہے کہ مجھے بیمار پڑے رہنے کی مہلت نہیں اور ایسی زندگی سے کیا حاصل جو اپنے معمولی کام پر صرف ہونے کے بجائے اپنے مرض کو پالنے میں گذرتی ہو۔ وہ ایسے طبیب کو خیرباد کہتا ہے اور اپنے معمول پر کاربند ہوتا ہے۔ اور یا تو جھٹ پٹ اچھا ہو کر اپنا کام کرنے لگتا ہے۔ یا اگر اس کا جسم جواب دے چکا ہے تو مر کر اپنی تمام مصیبتوں کو ختم کر دیتا ہے۔

گ :- اس شخص کے سے حالات میں تو اسی حد تک طب کی مدد لینی چاہیے۔

میں :- ہاں۔ دنیا میں اس کا ایک کام اور مقصد ہے۔ اور جب اپنے کام ہی سے محروم رہا تو پھر ایسی زندگی سے کیا حاصل!

گ :- درست۔

میں :- لیکن مالدار آدمیوں کا حال بالکل دوسرا ہے۔ ہم اُن کے متعلق گمان ہی نہیں کرتے کہ انھیں زندہ رہ کر دنیا میں کوئی خاص کام بھی انجام دینا ہے۔

گ :- ہاں۔ یہ تو عموماً بیکار سمجھے جاتے ہیں۔

میں :- تو شاید تم نے فوسائی لڈیس کا یہ مقولہ نہیں سُنا کہ جب آدمی

اپنی معاش کی طرف سے مطمئن ہو جائے تو اس کو طلب خیر اور عمل صالح میں مشغول ہونا چاہیئے۔

گ :۔ جی نہیں۔ میں نے نہیں سنا۔ میری رائے میں تو یہ مشغلہ ذرا اور پہلے شروع ہو تو بہتر ہے۔

میں :۔ خیر۔ اس بات پر مناظرہ بیکار ہے۔ ہمارے سامنے اب یہ سوال ہے کہ آیا مالدار آدمی کے لیے نیکی اور خیر پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے یا وہ اس کے بغیر بھی اپنی زندگی گذار سکتا ہے؟ اور اگر لازمی ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی یہ بے عنوانیاں جو نجاری یا دیگر دستکاریوں میں دماغ کے صحیح طور پر کام کرنے میں حارج تھیں کیا اسی طرح فوسائی لڈیس کے خیال کی تکمیل میں حائل نہ ہوں گی؟

گ :۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ جسم پر توجہ کی اس درجہ زیادتی جب وہ ورزش جسمانی کے قواعد سے متجاوز ہو جائے یقیناً عمل صالح پر بہت برا اثر رکھتی ہے۔

میں :۔ ہاں۔ اور اسی طرح یہ بے عنوانیاں، امور خانہ داری، انتظام فوجی، اور ریاست کے کسی عہدہ یا منصب کے ساتھ بھی نہیں نبھ سکتیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر مطالعہ، فکر و تدبر، اور خودشناسی کے ساتھ تو یہ بالکل ہی نہیں کھپتیں۔ لوگ ہمیشہ اس شبہ میں گرفتار رہتے ہیں کہ در دیا دوران سر فلسفہ کے

مطالعہ سے وابستہ ہو سکتا ہے۔ اور اس طرح اعلیٰ معنوں میں خیر پر عمل پیرا ہونا یا اس کی آزمائش کرنا مطلقاً مسدود ہو جاتا ہے۔ آدمی کو ہر دم یہ خیال لگا رہتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ چنانچہ ہمیشہ اپنے جسم کے متعلق ہی متفکر و متردد رہتا ہے

گ :- بیشک۔ یہ امر بہت قرین قیاس ہے۔

س :- چنانچہ میرا خیال ہے کہ دانشمند اسکلی پی اس اپنے ہنر کا اثر بس ان لوگوں پر ظاہر کرتا تھا جو معمولاً صحیح الجثہ ہوں اور جن کی عادات زندگی بھی اچھی ہوں لیکن اتفاق سے انھیں کوئی خاص بیماری ہو گئی ہو۔ اس قسم کے امراض کو وہ جلاب یا عمل جراحی سے رفع کرکے انھیں حسب معمول زندگی بسر کرنے کا مشورہ دیتا تھا۔ اور اس میں اس کے پیش نظر ریاست کی فلاح و بہبود رہتی تھی لیکن وہ کبھی ایسے آدمیوں کا علاج نہ کرتا ہوگا جن کے جسم میں مرض بالکل گھس گیا ہے کہ انھیں لیکر ذرا سا مادہ فاسد ادھر سے نکالے ذرا سی دوا ادھر سے پہنچائے اور اس کے تدریجی عمل سے انھیں تندرست بنانے کی لاحاصل کوشش کرے۔ وہ بیماری ناکارہ اور بے سود زندگیوں کو طول دینا نہ چاہتا تھا۔ نہ وہ اس میں مدد ہونا چاہتا تھا کہ کمزور والدین اپنے سے کمزور اولاد پیدا کریں اگر ایک شخص معمولی طریقہ سے زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کا تندرست کرنا لاحاصل ہے کہ یہ شفا نہ اس کے لیے مفید ہو سکتی ہے نہ ریاست کے لیے۔

گ :- معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسکلی پی اس کو بڑا مدبر تسلیم کرتے ہیں۔

میں :- اور اس کی صفات کی توضیح اس کے بیٹوں نے کی۔

یہ لوگ زمانہ قدیم کے مشاہیر تھے۔ انھوں نے اُن دواوں کا استعمال کرایا تھا جن کا میں نے ذکر کیا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ جب پنڈ ارس نے مینی لاس کو زخمی کیا ہی تو ان لوگوں نے "زخم میں سے خون چوس لیا اور اُس پر سکن دوائیں لگا دیں" لیکن انھوں نے مینی لاس یا یو دی ماِس کے لیے اکل و شرب کی کوئی تجویز پیش نہ کی۔ ان کے خیال میں ایک ایسے انسان کے لیے جو مجروح ہونے سے قبل تندرست تھا اور منضبط عادات رکھتا تھا بس یہی ادویہ کافی تھیں چنانچہ گو مریض نے پرمنی شراب کا ایک جام بھی پی لیا تھا تاہم اچھا ہوگیا ہاں انھیں دائم المریض اور بے احتیاط لوگوں سے مطلق سروکار نہ تھا۔ کیونکہ ان کی زندگیاں نہ خود ان کے لیے مفید تھیں نہ اوروں کے لیے۔ فن طب ایسے لوگوں کے فائدے کے لیے مرتب نہیں کیا گیا تھا اور چاہے یہ حضرات مال و دولت میں میداس کے ہمسر ہوں اسکلی پی اس کے بیٹے اُن کے علاج سے صاف انکار کر دیتے۔

گ :- بڑے دانشمند تھے یہ لوگ۔ واہ، واہ رے اسکلی پی اس کے بیٹو!

میں :- ظاہر ہی۔ لیکن پھر بھی یہ ناٹک لکھنے والے کہاں مانتے ہیں۔ اجتے کہ پنڈار سنے اگرچہ اسکلی پی اس کو اپولو کا بیٹا تسلیم کیا ہی تاہم اس کے متعلق یہ بھی لکھ مارا ہی کہ رشوت دیکر ایک مرتبہ اسے اس بات پر آمادہ کر لیا گیا تھا کہ ا

قریب المرگ مالدار شخص کا علاج کرکے اُسے اچھا کردے۔ چنانچہ اس کی پاداش میں اُس پر بجلی گری۔ لیکن اپنے متذکرہ صدر اُصول کی بنا پر ہم تو اُن لوگوں کے یہ دونوں متضاد بیانات تسلیم نہیں کرسکتے۔ اگر اسکلی پی اس ایک مقدس دیوتا کی اولاد تھا تو وہ لالچی اور حریص نہ ہوگا اور اگر اتنا لالچی تھا تو دیوتا کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔

گ:۔ سقراط۔ یہ سب کچھ درست و بجا۔ لیکن میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں یعنی کیا ایک ریاست میں اچھے طبیب درکار نہیں؟ اور کیا بہترین طبیب وہ نہیں ہوتے جنھوں نے اچھی بُری دونوں حالتوں کے زیادہ سے زیادہ مریضوں کا علاج کیا ہو۔ اسی طرح کیا بہترین منصف وہی لوگ نہیں ہوتے جو ہر قسم کے اخلاقی طبائع سے آشنا ہوں؟

میں:۔ بیشک مجھے اچھے طبیب اور اچھے منصف درکار ہیں۔ لیکن یہ بھی جانتے ہو کہ میں کس کو اچھا سمجھتا ہوں؟

گ۔ فرمائیے۔

میں:۔ ہاں۔ اگر بن پڑا تو سمجھاتا ہوں۔ لیکن یہ تبلا دوں کہ آپ نے اس سوال میں دو ایسی چیزیں یکجا کردی ہیں جو ایک سی نہیں۔

گ:۔ یہ کیسے؟

میں:۔ یہ ایسے کہ آپ نے طبیبوں اور منصفوں کو ملا دیا ہے۔۔۔۔۔۔ بہترین اور ماہر طبیب تو وہ لوگ ہیں جنھیں عہد شباب سے لیکر آگے ہمیشہ اپنے فن کے علم کیساتھ

ساتھ امراض کا زیادہ سے زیادہ تجربہ بھی ہوا ہی۔ ممکن ہی کہ خود اُن کی تندرستی بہت اچھی نہ ہو اور خود ان کے بدن میں طرح طرح کے امراض جاگزیں ہوں۔ کیونکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اصلاح بدن کے لیے انکا آلہ خود ان کا بدن نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہم کبھی یہ روا نہ رکھتے کہ یہ بیمار رہیں یا بیمار رہ چکے ہوں۔ لیکن یہ تو بدن کا علاج دماغ سے کرتے ہیں، البتہ اگر دماغ بیمار ہو چکا ہی تو پھر وہ کسی چیز کی اصلاح نہیں کر سکتا۔

گ :- بالکل درست۔

س :- لیکن منصف کا حال بالکل جدا گانہ ہی۔ یہ دماغ کا علاج دماغ سے کرتا ہی اس لیے اس کی تربیت ہرگز بُرے اور شریر دماغوں کے ساتھ نہ ہونی چاہیے نہ یہ چاہیے کہ عہد شباب سے لیکر وہ آیندہ برابر ایسے بُرے لوگوں سے ملتا رہا ہو اور جرائم کی پوری فہرست سے بھی اس لیے واقفیت پیدا کرے کہ بآسانی دوسروں کے جُرم کا پتہ لگالے جس طرح طبیب خود اپنے ذاتی احساس سے دوسروں کے جسمانی عوارض کا بآسانی پتہ چلا سکتا ہی۔ صحیح فیصلہ اور محاکمہ کے لیے جس شریف دماغ کی ضرورت ہی اُسے عہد شباب میں کبھی نہ تو جرم کا تجربہ ہونا چاہیئے نہ خود جرائم سے آلودہ یہی وجہ ہی زمانہ شباب میں اکثر نیک لوگ بھولے بھالے معلوم ہوتے ہیں اور بے ایمان لوگوں کو انھیں تختۂ مشق بنانیکا اسی لیے موقع ہوتا ہی کہ خود اُن کی روح میں شر اور بُرائی کی کوئی مثال موجود نہیں ہوتی۔

گ :- جی ہاں -ان لوگوں کو نہایت آسانی سے فریب دیا جا سکتا ہے۔

میں :- اسی وجہ سے تو منصف کو جوان نہ ہونا چاہیئے۔ منصف کو شر کی پہچان آجانی چاہیئے، لیکن خود اپنی ذات اور روح سے نہیں بلکہ دوسروں میں کثرت سے اس کی ماہیت کا مشاہدہ کرکے۔ اس کا رہنما علم ہو نہ کہ ذاتی تجربہ۔

گ :- بیشک۔ منصف کی بہترین شکل تو یہی ہے۔

میں :- (اور آپ نے پوچھا تھا کہ میں کسے اچھا سمجھتا ہوں، تو عزیز من) میں تو ایسے آدمی کو اچھا جانتا ہوں۔ اس لیے کہ اچھا وہی ہے جس کی روح اچھی ہے لیکن وہ مکار اور شبہ کرنیوالی طبیعت کا شخص جس کا ذکر تم نے ابھی کیا تھا جس سے خود متعدد جرائم کا ارتکاب ہو چکا ہے اور جو اپنے کو شرارت کا استاد تصور کرتا ہے اسکا تو یہ حال ہے کہ جب کبھی اپنے ہمجنسوں کے مجمع میں ہوگا، تو اس کی احتیاط اور اُس کی چالاکی حیرت انگیز ہوگی کیونکہ یہ سب کو اپنے معیار سے جانچتا ہے۔ لیکن جب یہ شخص معمر اور تجربہ کار نیک آدمیوں کی صحبت میں جاتا ہے تو پھر اپنے بیجا شبہات کے باعث بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔ یہ غریب ایماندار آدمی کو پہچان ہی نہیں سکتا کہ خود اُس کی ذات میں ایمانداری کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ لیکن چونکہ دنیا میں بُروں کی تعداد اچھوں سے زیادہ ہے اور اسے اکثر بُروں سے ہی سروکار رہتا ہے اس لیے وہ خود اور نیز دوسرے لوگ اسے عقلمند ہی سمجھتے ہیں کوئی اُسے بیوقوف نہیں جانتا۔

گ :- آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔

میں :- الغرض ایسا شخص اس دانشمند اور نیک منصف کا کام نہیں دیسکتا جس کی ہمیں تلاش ہے۔ بُرائی کبھی اچھائی کو نہیں پہچان سکتی۔ البتہ ایک صالح طبیعت، جسے زمانہ نے تعلیم دی ہو، نیکی اور بدی دونوں کا علم حاصل کرسکتی ہے میری رائے میں عقل وعرفان نیکوں کا حصہ ہے بدوں کا نہیں۔

گ :- میری بھی یہی رائے ہے۔

میں :- لہٰذا ہم جس قانون یا جس طب کی اجازت اپنی ریاست میں دینگے وہ یہ ہے: یہ فنون عمدہ اور صالح طبائع کی کارفرمائی کریں گے اور صحت روحانی اور جسمانی کی فراہمی ان کے ذمہ ہوگی۔ لیکن جن لوگوں کے جسم مریض ہیں یہ انھیں چھوڑ دینگے کہ خود مرجائیں اور ناپاک اور ناقابل اصلاح روحوں کو یہ ختم کردینگے۔

گ :- مریض اور ریاست دونوں کے لیے یہی بہتر صورت ہے۔

میں :- چنانچہ ہمارے نوجوان جنکی تعلیم عفت خیز اور اعتدال آموز موسیقی کے ذریعہ ہوئی ہے، قانونی چارہ جوئی کرنے میں نہایت تردد کریں گے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- اسیطرح موسیقی داں جو اسی راستہ پر چلکر معمولی اور نہایت سادہ ورزش جسمانی کریگا اسے بھی سوائے بعض اشد ضروری حالتوں کے طب سے کچھ سروکار نہو گا۔

گ :- یقیناً۔

میں :- یہ موسیقی داں جو ورزش کرے گا اس کا مقصد اپنی طبیعت کے عنصر شجاعت کو تحریک دینا ہی نہ کہ طاقت بڑھانا۔ وہ عام پہلوانوں کی طرح ورزش اور غذا کو محض اپنے رگ پٹھے درست کرنے کا ذریعہ نہیں بناتا۔

گ :- درست۔

میں :- اور جیسا کہ لوگ اکثر سمجھتے ہیں موسیقی اور ورزش جسمانی کے دو فنون کی غایت جدا جدا تربیت روح اور ترقی جسم نہیں۔

گ :- پھر آخر ان کی اصلی غرض کیا ہی؟

میں :- میں تو سمجھتا ہوں کہ دونوں فنوں کے سکھانے والوں کے پیش نظر تربیت روح ہی ہوتی ہی۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- کیا آپ نے کبھی نہیں دیکھا کہ صرف ورزش جسمانی پر تمامتر توجہ صرف کرنے سے دماغ پر کیسا اثر پڑتا ہی یا محض موسیقی پر توجہ کرنے سے جسم پر؟

گ :- یہ اثر کیونکر ظاہر ہوتا ہی؟

میں :- اس طرح کہ ایک سے طبیعت میں سختی اور درشتی پیدا ہوتی ہی اور دوسرے سے نرمی اور نسائیت۔

گ :- جی ہاں۔ میں اتنا تو جانتا ہوں کہ محض ورزش کرنیوالا پہلوان بہت کچھ

وحشی ہو جاتا ہی اور صرف موسیقی پر توجہ کرنے والا نرمی اور رقت قلب میں حدِ جائز سے تجاوز کر جاتا ہی۔

میں :- لیکن در اصل یہ سختی اور درشتی طبیعت کی اُس کیفیت سے پیدا ہوتی ہی جس کی اگر صحیح تربیت ہو تو شجاعت اور جرأت پیدا ہوں۔ لیکن جب اس پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہی تو یہی سختی و وحشت پیدا کرتی ہی۔

گ :- میں سمجھتا ہوں۔

میں :- اس کے برعکس فلسفی میں نرمی کی صفت ہوگی۔ لیکن اِس میں بھی اگر غلو ہو گیا تو یہی نرمی ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیگی۔ اور اگر صحیح تعلیم ہو تو معتدل نرمی پیدا ہوگی۔

گ :- بجا۔

میں :- اور ہماری رائے میں محافظین میں یہ دونوں صفات ہونی چاہئیں!

گ :- لازماً۔

میں :- اور ان دونوں میں ایک تناسب بھی ضروری ہی؟

گ :- بلاشبہ۔

میں :- اسی متناسب و مرتب روح میں عفت و اعتدال بھی ہونگے اور جرأت و شجاعت بھی!-

گ :- جی ہاں۔

میں :- برخلاف اس کے غیر متناسب روح بزدل اور ناتراشیدہ ہوگی۔
گ :- بیشک۔

میں :- اور اسی طرح جب انسان اپنے کو موسیقی سے متاثر ہونے اور کانوں کے ذریعہ اپنی روح میں ان شیریں و نرم یا المناک ترانوں کو داخل ہونے دے جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور جب اسکی ساری زندگی نغمہ سرائی اور انبساط موسیقی میں صرف ہو تو اس عمل کے ابتدائی مدارج میں تو اس کی طبیعت میں لوہے کا سا لوچ پیدا ہو جائیگا اور بجائے ترد شکن اور بیکار ہونے کے وہ نہایت مفید و کارآمد بنجائیگا، لیکن اگر نرم کرنے کا یہ عمل ذرا زیادہ جاری رہا تو دوسری منزل پھر گلنے اور ضائع ہونے کی ہی حتی کہ یہ سارا جذبہ فنا اور روح کی ساری قوت زائل ہو کر وہ جنگ آزمائی کے معیار کے مطابق نہایت کمزور انسان رہ جائیگا۔
گ :- بالکل درست۔

میں :- یہ جذبہ اگر اس میں فطرتاً کمزور ہی تو یہ تبدیلی جلد رونما ہو جاتی ہی اور اگر قوی ہی تو موسیقی کی قوت اسے کمزور کر کے اس کی طبیعت کو چڑچڑا بنا دیتی ہی وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہی اور پھر فوراً ٹھنڈا بھی پڑ جاتا ہی۔ اس جذبے کے بجائے وہ اب نہایت ذکی الحس اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہی اور قوت عمل اُس سے بالکل سلب ہو جاتی ہی۔
گ :- بجا۔

میں :- یہی حال ورزش جسمانی کا ہے۔ اگر کوئی شخص سخت ورزش کرے وہ بہت کھانیوالا بھی ہو یعنی موسیقی اور فلسفہ کے دلدادہ کا بالکل عکس تو اس کے جسم کی خوبی پہلے اس میں کچھ غرور اور یہی مذکورہ جذبۂ جرأت پیدا کرتی ہے اور وہ اپنے میں پہلے سے دوچند مردانگی محسوس کرنے لگتا ہے۔

گ :- جی۔

میں :- لیکن پھر کیا ہوتا ہے؟ اگر وہ یہی کرتا رہے اور کسی دوسری طرف توجہ نہ کرے، علمی مشاغل سے کوئی سروکار نہ رکھے تو تعلیم و تحقیق، تخیل و تہذیب سے کوئی لگاؤ نہ ہونے کے باعث جو تھوڑی بہت ذہانت و ذکاوت اس میں ہو بھی وہ کمزور، کند، اور اعمیٰ ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ نہ کبھی پیدا ہونے پاتا ہے نہ نشو و نما حاصل کرتا ہے اور نہ اس کے حواس کا گرد و غبار ہی صاف ہونے پاتا ہے۔

گ :- سچ ہے۔

میں :- بالآخر غیر مہذب اور فلسفہ سے نفور ہو جاتا ہے۔ ترغیب کا آلہ تو کبھی استعمال ہی نہیں کرتا۔ اس کی حالت ایک وحشی درندہ کی سی ہوتی ہے۔ ہمہ تن تشدد و خونخواری، کہ اسے معاملہ کا کوئی دوسرا طریقہ آتا ہی نہیں۔ اور سلیقہ مندی و حسن عمل سے یکقلم نابلد، کامل جہالت اور برائی میں اپنی زندگی گذارتا ہے۔

گ :- بالکل درست۔

میں :- اور چونکہ فطرت انسانی دو اصول سے مرکب ہے یعنی جری اور فلسفیانہ

اس لیے میں تو کہوں گا کہ کسی دیوتا نے ان دونوں اصول کے مقابل (اور بالواسطہ جسم کی مطابقت سے) انسان کو دو فن عطا کیے ہیں تاکہ ان دو اصولوں کو آلات موسیقی کے تاروں کی طرح ڈھیلا کر کے اور کس کر ضروری تناسب پیدا کرلے۔

گ: ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے۔

میں:- تو جو شخص موسیقی اور ورزش جسمانی کو بہترین تناسب کے ساتھ ملاتا اور بہترین طریقہ سے روح کے ساتھ ان کی مطابقت کرتا ہے وہ دراصل تار سے نغمہ نکالنے والوں کی نسبت بہتر معنوں میں ماہر موسیقی کہلانے کا مستحق ہے۔

گ:- آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے۔

میں:- اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری ریاست کی حکومت ہمیشہ قائم رہے تو سرداری کے لیے ایک ایسے غیر معمولی شخص کی ہمیشہ ضرورت رہیگی۔

گ:- بیشک۔ اس کا وجود تو ازبس ناگزیر ہے۔

میں:- اچھا تو تربیت جسمانی اور تعلیم (ذہنی) کے لیے ہمارے اصول یہ ہیں۔ اب شہریوں کے رقص، سیر وشکار، ورزش اور گھوڑ دوڑ، اور کسرتی مقابلوں کے متعلق زیادہ تفصیلی بحث کرنے سے کیا حاصل ہے یہ سب تو عام اصول کے پابند ہیں اور جب یہ اصول معلوم ہوگیا تو انکا فیصلہ کرنے میں چنداں دشواری نہیں۔

گ:- یقیناً اس میں کوئی مشکل نہ ہوگی۔

میں:- اب اور کونسا سوال باقی رہا؟ اب یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ کون حاکم

ہوگا اور کون محکوم۔

گ:- بیشک۔

میں:- اس میں تو کچھ شبہ کی گنجائش نہیں کہ زیادہ عمر والے کم عمر لوگوں پر حکومت کریں۔

گ:- ظاہر ہے۔

میں:- اور ان میں سے بھی وہی حکومت کریں جو بہترین ہوں۔

گ:- یہ بات بھی بالکل صاف ہے۔

میں:- اچھا اب بتلاؤ کہ بہترین کاشتکار تو وہی ہوتا ہے نا جو کاشتکاری میں سب سے زیادہ منہمک رہے؟

گ:- جی ہاں۔

میں:- اور چونکہ ہمیں اپنے شہر کے لیے بہترین محافظ درکار ہیں تو کیا یہی وہ لوگ نہ ہوں گے جن میں محافظ بننے کے صفات سب سے زیادہ موجود ہیں۔

گ:- بیشک۔

میں:- اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ وہ دانشمند اور مستعد ہوں اور ریاست کا خاص خیال رکھیں۔

گ:- بیشک۔

میں:- اور انسان اسی چیز کا سب سے زیادہ خیال رکھیگا جس سے اُسے محبت ہو

گ :- یقیناً۔

میں :- اور غالباً اُسی چیز سے محبت زیادہ ہوگی جس کے اغراض و مقاصد خود اُس کے سے ہوں اور اس کے خیال میں جس چیز کی اچھائی یا بُرائی سے خود اُس پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہو۔

گ :- بالکل درست۔

میں :- چنانچہ اس کے لیے انتخاب ضروری ہے۔ ہم محافظین میں سے اُن لوگوں کو دیکھیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی میں ملک کی بہبود کے لیے سب سے زیادہ اشتیاق ظاہر کیا ہے اور اغراض ملکی کے خلاف کوئی کام کرنے سے ہمیشہ سب سے زیادہ نفور رہے ہیں۔

گ :- ہاں یہی ٹھیک آدمی ہوں گے۔

میں :- پھر ہر عمر میں ان پر نظر رکھنی ہوگی تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنے عزم پر قائم ہیں یا نہیں۔ اور کہیں کبھی جبر و تشدد یا ترغیب و نظر فریبی سے یہ ریاست کے متعلق اپنے فرض کے احساس کو فراموش یا پس پشت تو نہیں ڈالدیتے۔

گ :- پس پشت کیسے ڈالنا!

میں :- میں سمجھاتا ہوں۔ آدمی کے دماغ سے کسی عزم کے نکل جانے کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو ایسا خود اس کے ارادہ سے ہو یا خلاف ارادہ۔ خود اپنے ارادہ سے تو اسوقت جب وہ کسی کذب سے نجات پاتا اور بہتر علم حاصل کرتا ہے؛ اور خلاف

ارادہ اسوقت جب وہ کسی حق و صداقت سے محروم ہوتا ہی۔

گ :- عوام کا بالا ارادہ نکل جانا تو میں سمجھ گیا لیکن بلا ارادہ کا صحیح مفہوم سمجھنا ابھی باقی ہے۔

میں :- کیوں۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ انسان اچھائی اور خیر سے تو خلاف ارادہ محروم کیا جاتا ہی اور برائی اور شر سے بہ خوشی؟ کیا کسی صداقت کو کھو دینا برا اور کسی صداقت کا حاصل کر لینا اچھا نہیں؟ اور آپ غالباً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اشیاء کو اسطرح جاننا جیسی کہ وہ ہیں صداقت کا حاصل کرنا ہی؟۔

گ :- جی۔ میں اس پر متفق ہوں کہ انسان حق و صداقت سے خلاف مرضی محروم کیا جاتا ہے۔

میں :- اور بلا ارادہ محرومی کیا سرقہ، جبر یا نظر فریبی سے عمل میں نہیں لائی جاتی

گ :- میں ابھی تک آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں :- مجھے اندیشہ ہی کہ کہیں میں المیہ ناٹک لکھنے والوں کی طرح گنجلک اور تاریک گفتگو تو نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب بس اتنا ہی کہ بعض لوگوں میں ترغیب سے تبدیلی پیدا ہوتی ہی اور بعض میں بھول سے۔ اول الذکر کے عقائد کو دلیل چرا لیتی ہی اور مؤخر الذکر کے عقائد کو زمانہ۔ چنانچہ ان دونوں حالتوں کو میں نے سرقہ سے تعبیر کیا۔ اب تو آپ سمجھے؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- رہا جبر - تو جبر سے ان لوگوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے جنھیں کسی کرب یا رنج کی شدت اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کرے۔

گ :- میں اب سمجھ گیا - آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

میں :- اور نظر فریبی ان کی ہوتی ہے جن کے خیالات عیش و مسرت کے نرم یا حزن و خوف کے سخت اثر سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ آپ غالباً اسے بھی تسلیم کریں گے؟

گ :- بیشک جس چیز سے دھوکا ہو اُسے نظر فریب کہہ سکتے ہیں۔

میں :- اس لیے جیسا کہ میں ابھی کہہ رہا تھا ہمیں ان لوگوں کو ڈھونڈنا چاہیے جو خود اپنے اس عقیدہ کے بہترین محافظ ہوں کہ جو کچھ ان کے نزدیک ریاست کے اغراض کے مطابق ہو وہی ان کی زندگی کا طرز عمل ہوگا۔ ہمیں زمانہ شباب سے برابر ان پر نظر رکھنی چاہیے اور ان سے ایسے کام کرانے چاہئیں جن میں اس عقیدہ کو بھول جانے یا اس میں دھوکہ کھا جانے کا بہت احتمال ہو۔ اور جو پھر بھی اسے نہ بھولے نہ دھوکہ کھائے اُسے منتخب کر لینا چاہیئے، اور جو اس آزمایش میں ناکام رہے انھیں خارج کر دینا چاہیئے۔ کیوں یہی بہترین طریقہ ہے نا؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- ان لوگوں کے لیے کچھ محنت مشقت، کچھ تکلیف اور مقابلے بھی تجویز کرنے چاہئیں تاکہ یہ اپنی ان صفات کا مزید ثبوت دے سکیں۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- اس کے بعد انھیں نظر فریبی سے آزمانا چاہیے اور دیکھنا چاہیئے کہ اس امتحان میں ان کا کیا رویہ رہتا ہے۔ یہ گویا تیسری آزمایش ہے۔ جس طرح لوگ بچھیروں کو شور اور گڑبڑ میں دیکھنے لیجاتے ہیں کہ کہیں بھڑکتے تو نہیں، اسی طرح ہمیں بھی ان نوجوانوں کو مختلف قسم کے خطرات سے گذارنا چاہیے، اس کے بعد مسرتوں سے جیسے بھٹی میں سونے کی جانچ ہوتی ہے اس سے بھی زیادہ تکمیل کے ساتھ ہمیں ان کی جانچ پرکھ کرنی چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ آیا یہ تمام نظر فریبیوں کے خلاف مسلح ہمیشہ نیک کردار اور خود اپنے اور اس موسیقی کے جو انھوں نے حاصل کی ہے اچھے محافظ ہیں یا نہیں۔ اور آیا طرح طرح کے حالات میں ایسی متوازن و متناسب طبیعت قائم رکھ سکتے ہیں یا نہیں جو فرد اور ریاست دونوں کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔ جو شخص لڑکپن، جوانی اور بڑی عمر پر پہونچنے کے بعد الغرض ہر عمر میں اس آزمایش سے کامیاب اور کھرا نکلا ہو اسے ریاست کا حکمراں اور محافظ مقرر کرنا چاہیئے۔ زندگی میں اس کی عزت ہو اور بعد موت بھی۔ اس کے لیے مقبرہ اور بڑی سے بڑی عزازی یادگاریں تعمیر ہوں۔ مگر جو اس امتحان میں ناکام رہیں انھیں لازماً خارج کردینا چاہیئے میری راے میں تو محافظین و حکام کے انتخاب و تقرر کا یہ طریقہ ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے ایک عام بیان ہے اور میں اس کے مطلق صحیح ہونے کا مدعی نہیں۔

گ :- جی۔ اس عام بیان سے میں بھی متفق ہوں۔

میں :- اور غالباً صحیح معنوں میں لفظ محافظ کا اطلاق اسی طبقۂ اعلےٰ پر

ہونا چاہیئے جو ہمیں خارجی دشمنوں سے بچائیں اور شہریوں میں داخلی امن برقرار رکھیں، تاکہ مؤخر الذکر میں ہمیں نقصان پہونچانے کی خواہش اور اول الذکر میں اس کی قوت نہ رہے۔ جن نوجوانوں کو ہم نے پہلے محافظ کا لقب دیا تھا مناسب ہے کہ انہیں اب ان حکام کے اصولوں کا مددگار و معاون کہا جائے۔

گ:- میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں:- تو ہم پھر کس طرح وہ دروغ مصلحت آمیز تراشیں جس کا ہم ابھی تھوڑی دیر ہوئی ذکر کر رہے تھے، یعنی وہ شاندار جھوٹ جو ممکن ہو تو حکام کو بھی دھوکا دے سکے یا کم سے کم باقی تمام شہر کو!

گ:- یہ جھوٹ کیسا؟

میں:- نہیں کوئی نئی بات نہیں۔ بس ایک قدیم فونیقی افسانہ چاہیے جس میں ایسی چیزوں کا ذکر ہو جو کسی دوسری جگہ اور ہمارے زمانہ سے قبل واقع ہوئی ہیں (جیسے شاعر اکثر کہتے اور لوگوں کو باور کرا دیتے ہیں) نہ معلوم پھر کبھی ایسا ہونا ممکن ہو یا نہیں اور اگر ایسا واقع بھی ہو تو قابل یقین سمجھا جائے یا نہیں۔

گ:- کیوں کیوں آپ کے الفاظ منہ سے نکلتے نکلتے رکتے کیوں ہیں؟

میں:- آپ جب میرا ما فی الضمیر سن لینگے تو غالباً اس جھجک پر متعجب نہ ہونگے

گ:- تو ڈر کا ہیکا ہے۔ فرمائیے۔

میں:- اچھا۔ عرض کرتا ہوں۔ اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کس طرح آنکھیں

چار کروں اور کن الفاظ میں اس بے جھجک اور دلیرانہ جھوٹ کا اظہار کروں جسے میں رفتہ رفتہ پہلے حکام تک بعدہ سپاہ کو اور سب سے آخر میں عوام کو پہنچانا چاہتا ہوں۔ سنیئے ان سے کہا جائیگا کہ ان کا زمانہ شباب ایک خواب تھا اور جو تعلیم و تربیت انھوں نے ہم سے حاصل کی محض ایک ظاہری شکل و نمود تھی۔ دراصل اس زمانہ میں مادر ارض کے رحم کے اندر ان کی تشکیل اور انکا تغذیہ ہو رہا تھا۔ وہیں یہ خود بھی بنائے گئے اور ان کے آلات و اسلحہ بھی۔ جب ان سب کی تکمیل ہو چکی تو انکی ماں 'زمین' نے انھیں اوپر بھیجا۔ چنانچہ ان کا ملک ان کی ماں اور نیز انکی دائی ہے۔ اس کی فلاح چاہنا ان کا فرض اور اسے حملوں سے بچانا انپر لازم ہے۔ انھیں چاہیے کہ اس کے شہریوں کو اسی بھومی کے بچے اور اپنا بھائی جانیں گے۔

سچ ہے، اس کذب کے اظہار میں آپکا تذبذب بجا تھا۔

میں :- جی۔ ابھی تو اور باقی ہے۔ میں نے صرف نصف بیان کیا ہے۔ ہم اس قصہ میں کہیں گے کہ اے شہریو! تم آپس میں بھائی بھائی ہو، لیکن خدا نے تمھیں مختلف طریقہ پر بنایا ہے۔ تم میں سے بعض میں حکمرانی کی قوت ہے اور انکے اجزائے ترکیبی میں خدا نے سونے کی آمیزش کی ہے۔ اسی وجہ سے انکی عزت بھی سب سے زیادہ ہے، بعض دوسرے چاندی سے بنے ہیں اور یہ مددگار ہیں جنھیں کسان اور کاریگر بننا ہے ان کی ترکیب میں پیتل اور لوہا شامل کیا ہے۔ اور یہ خصائص نوعی عموماً ان کی اولاد میں بھی قائم رہینگے۔ مگر چونکہ اصل سب کی

ایک ہی اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہوگا کہ سونے والے والدین کے سیمین بچہ یا سیمین والدین کے زریں اولاد ہو۔ خدا تمام حکام کے سامنے بہ حیثیت اصول اول اس کا اعلان کرتا ہی کہ اور تمام چیزوں کے مقابلہ میں انھیں نجابت نسل کی سب سے زیادہ حفاظت کرنی چاہیئے۔ ہمیشہ انھیں اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے کہ اولاد میں کن اجزا کی آمیزش ہوتی ہی کیونکہ اگر زریں یا سیمیں طبقہ کی اولاد میں پیتل یا لوہے کا میل ہو تو قانون قدرت تبدیل مراتب کا طالب ہوتا ہی۔ حاکم کو اسباب پر ذرا ترس نہ آنا چاہیئے کہ اس کا بچہ تنزل کرکے کسان یا دستکار ہو رہا ہی۔ اسی طرح اگر دستکاروں کی اولاد میں سونے یا چاندی کی آمیزش ہو تو ان کا اعزاز بڑھتا اور وہ محافظ شہر یا مددگاروں کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کاہن کا قول ہی کہ جس ریاست کا محافظ پیتل یا لوہے والا آدمی ہو وہ تباہ ہو جائیگی۔ تو جناب من وہ قصہ یہ ہی۔ کیوں اس افسانہ کو باور کرانیکا بھی کچھ امکان ہی؟

گ:- ایک پشت میں تو ممکن نہیں۔ موجودہ نسل کو یہ باور کرانیکی تو کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہیں آتی۔ البتہ ان لوگوں کی اولاد یا ان کی اولاد کی اولاد کو یہ افسانہ باور کرایا جاسکتا ہی۔ اور ہمچنیں سلسل۔

میں:- ہاں۔ میں اس دقت کو خود محسوس کرتا ہوں۔ تاہم اس قسم کا عقیدہ ان لوگوں کو شہر کے اور نیز باہم ایک دوسرے کے متعلق غور و فکر کرنے پر آمادہ

کریگا۔ خیر۔ افسانہ کے متعلق بس اسقدر کافی ہی۔ اب یہ خودبخود 'افواہ' کے پروں پر اڑکر تمام میں پھیلتا رہیگا۔ آؤ۔ ہم اپنے گیتی نژاد سورماؤں کو مسلح کریں اور انھیں حکام کے زیر سیادت آگے بڑھائیں۔ یہ لوگ ادھر اودھر دیکھ بھال کر ایک ایسی جگہ تلاش کریں کہ اگر اندرون ملک میں کوئی شورش برپا ہو تو یہ اس بغاوت کو بآسانی دبا سکیں نیز ان دشمنوں سے اپنے کو مامون رکھ سکیں جو بھیڑیوں کی طرح باہر سے گلہ پر چھاپہ مارتے ہیں۔ جگہ کا انتخاب کرکے یہ لوگ وہاں اپنے ڈیٹرے ڈالدیں، متعلقہ دیوتاؤں پر قربانی چڑھائیں اور اپنی جاے قیام کی تعمیر میں مصروف ہوجائیں۔

گ:۔ بالکل درست۔

میں:۔ یہ قیام گاہ ایسی ہونی چاہیئے کہ گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی سے ان کی حفاظت کرسکے۔

گ:۔ آپ کا مطلب غالباً ان کے مکانوں سے ہی۔

میں:۔ جی۔ لیکن سپاہیوں کے مکان ہوں دوکانداروں کے نہیں۔

گ:۔ کیوں۔ ان میں کیا فرق ہی؟

میں:۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں۔ سُنیے، اگر کوئی گڈریہ ایسے محافظ کتے پالے جو عدم تربیت بھوک، یا کسی بُری عادت کی وجہ سے بھیڑوں پر مُنہ ڈالیں اور انھیں تنگ کریں اور حفاظت کے بجاے خود بھیڑیے کا کام دیں تو یہ کیسی لغو اور

بری حرکت ہوگی

گ :- بیشک، یہ بہت بری بات ہے۔

میں :- چنانچہ ہمیں بھی ہر ممکن اہتمام کرنا چاہیئے کہ ہمارے مددگار محافظ جو عام شہریوں سے زیادہ قوی ہوں گے کہیں ضرورت سے زیادہ قوی نہ ہو جائیں اور بجائے یار و مددگار کے ایک وحشی ظالم کا کام نہ کریں۔

گ :- جی ہاں۔ اس بارہ میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔

میں :- اور کیا ایک حقیقی عمدہ تعلیم بہترین احتیاط نہیں ؟

گ :- ان کی عمدہ تعلیم تو ہو ہی چکی ہے۔

میں :- نہیں۔ مجھے تو اس درجہ اعتماد نہیں۔ ہاں میرا عقیدہ ہے کہ انھیں عمدہ تعلیم یافتہ ہونا ضرور چاہیئے کہ صحیح تعلیم ہی خواہ اس کی نوعیت کچھ ہو انھیں مہذب اور متمدن بنائے اور ان کے تعلقات باہمی اور زیر دستوں سے اُن کے برتاؤ کو انسانیت کا رویہ بنانے میں سب سے قوی مؤثر قوت ثابت ہوگی۔

گ :- بجا۔

میں :- اور صرف تعلیم ہی نہیں ان کی توقیام گاہیں اور ان کی تمام املاک اسی قسم کی ہونی چاہیئے کہ نہ بہ حیثیت محافظان کے محاسن کو کم کرے اور نہ انھیں دوسرے شہریوں پر دست درازی کرنے کی ترغیب دلا سکے۔ غالباً ہر سمجھدار شخص مجھ سے اتفاق کرے گا۔

گ :- لازماً۔

میں :- اچھا تو اگر انھیں ہمارے خیال کے مطابق پورا اترنا ہی تو دیکھیں انکا طرز معاشرت کیا ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہی کہ سوائے اشد و مطلق ضروری اشیار کے کسی کے پاس اپنی کوئی ذاتی ملک نہ ہوگی، نہ ان کے پاس کوئی اپنا نج کا مکان ہوگا نہ گودام جس میں کوئی دوسرا آنا چاہے اور نہ آسکے ان کی غذا میں صرف ایسی چیزیں شامل ہوں گی جن کی ضرورت تربیت یافتہ اور صاحب جرأت وعفت جنگ آزماؤں کو ہوتی ہی۔ انھیں شہریوں سے ایک مقررہ شرح تنخواہ کے وصول کرنے کا معاہدہ کرانا چاہیئے تاکہ ان کے سالانہ اخراجات کی کفالت ہوسکے، بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ سب کے سب ایک جگہ رہیں اور ایک جگہ کھانا کھائیں، جس طرح لشکر میں سپاہی کرتے ہیں۔ ہم انھیں بتلائینگے کہ سیم و زر تو تمھیں خدا کی طرف سے عطا ہوچکا ہی، جب وہ اعلیٰ دھات خود تمھارے اندر موجود ہی تو پھر اس میل کی تمھیں کیا ضرورت جو انسانوں میں رائج ہے، تم ہرگز اس عطیۂ سماوی کو اس آمیزش ارضی سے آلودہ اور ناپاک نہ کرو کہ یہ رائج اور عام دھات بہت سے ناپاک اعمال کی وجہ ثابت ہوئی ہی، اور خاص و اعلیٰ دھات تمھارے قبضہ میں ہی وہ بالکل پاک ہی۔ چنانچہ سارے شہر میں بس انھیں لوگوں کو سونا چاندی نہ چھونا چاہیئے۔ یہ لوگ نہ تو سونا چاندی پہنیں نہ انکے برتنوں سے کچھ پئیں نہ اس چھت کے تلے رہیں جہاں سونا چاندی موجود ہی۔ ان کی نجات اسی میں ہی

اور اسی طرح یہ ریاست کی نجات کرا سکتے ہیں۔ اور اگر کہیں ان کے پاس اپنے ذاتی مکانات یا زمینیں یا اپنا ذاتی زر و مال ہوا تو یہ بیشک اچھے تاجر اور کسان تو بن جائیں گے لیکن محافظ نہ رہیں گے۔ بجائے معین و مددگار ہونے کے یہ دشمن اور ظالم ہو جائیں گے۔ یہ دوسروں سے نفرت کریں گے، دوسرے ان سے۔ یہ اوروں کے خلاف سازش کریں گے، اور ان کے خلاف؛ خارجی دشمنوں سے زیادہ اندرونی مخالفتوں کے خوف میں ان کی زندگی گذریگی اور خود ان کی اور نیز ریاست کی تباہی کا وقت قریب آ جائے گا۔ ان وجوہ کی بنا پر کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں کہ ہماری ریاست کا ایسا ہی نظام ہونا چاہئے اور محافظین کے مکانات اور نیز دیگر امور کے متعلق بھی یہی ضوابط مقرر کرنا چاہئیں۔

گ:۔ بیشک۔

چوتھی کتاب

سلسلہ کلام یہاں تک پہنچا تھا کہ ایڈیمینٹس نے بات کاٹ کر یہ سوال کیا "یہ تو فرمائیے کہ اگر کوئی شخص یہ شکایت کرے کہ آپ نے اس طبقہ کے لوگوں کی خوشی اور آرام کا کوئی خاص خیال نہ رکھا تو آپ کیا جواب دیں گے۔ اور سچ تو یوں ہی کہ یہ خود انھیں لوگوں کی غلطی ہوگی کہ ان کے آرام و آسائش کا سامان مہیا نہ ہو۔ سارا کا سارا شہر دراصل انکا ہی اور یہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ دوسرے زمین خرید سکتے ہیں، اُسپر عالیشان اور آراستہ محلات تعمیر کرا سکتے ہیں، دیوتاؤں کے نام پر بیج کی قربانیاں بھی چڑھا سکتے ہیں، انھیں اجازت ہی کہ اپنے دوستوں کی دعوتیں کریں، سیم و زر اور عیش و آسایش کے تمام ضروریات کے ذخائر انکے پاس موجود ہوں، لیکن یہ غریب ہیں کہ شہر میں کرایہ کی فوج کی طرح تعینات ہیں اور بس اپنے فوجی فرائض کی انجام دہی میں ہمہ تن مصروف!"

میں :- ہاں، بیشک آپ صحیح فرماتے ہیں اور دیکھیے اس خدمت کے صلے میں انھیں محض کھانا دیا جاتا ہی، تنخواہ یا معاوضہ کچھ نہیں۔ چنانچہ اگر یہ سیر یا

سفر کو جانا چاہیں تو اپنے طور پر نہیں جا سکتے، نہ اپنی محبوبہ عورتوں کو تحائف دے سکتے ہیں، اور نہ اوروں کی طرح جو خوشحال سمجھے جاتے ہیں دوسری خواہشات کے پورا کرنے کے لیے دام صرف کر سکتے ہیں۔ آپ نے شکایات میں یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں شامل نہیں کیں۔

ایڈ:- اچھا تو اب انھیں بھی شامل سمجھیئے۔

میں:- تو آپ پوچھتے یہ ہیں کہ ہم اس اعتراض کا کیا جواب دے سکیں

ایڈ:- جی ہاں۔

میں:- اسی پرانی ترکیب پر عمل کرنے سے ہمیں اس مسئلہ کا حل بھی ہو جائے گا۔ اور ہمارا جواب مختصراً یہ ہو گا کہ اگرچہ ان حالات میں بھی یہ کچھ بعید از قیاس اور تعجب کی بات نہ ہو گی کہ یہ لوگ اپنے کو آسودہ اور خوش پائیں، تاہم اگر ایسا نہ بھی ہو تو ہمارا مقصد اس ریاست کی ترتیب و اس نظام کی تدوین میں خاص طور پر کسی ایک طبقہ کی خوشحالی کو ملحوظ رکھنا بلکہ جہاں تک ہو سکے پوری ریاست کو خوشحال بنانا ہے۔ کیونکہ ہمارا گمان کہ اسی قسم کی ریاست میں عدل و انصاف کے ملنے کی سب سے زیادہ کی جا سکتی ہے؛ برخلاف اس کے کسی غیر منتظم ریاست میں ناانصافی کا ملنا قرین قیاس ہے چنانچہ ان دونوں قسم کی ریاستوں کو دیکھنے کے بعد ہم کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکیں گے جس کی تحقیق میں ہم مشغول ہیں (یعنی

انصاف کی ماہیت) فی الحال ہم خوشحال ریاست کی تنظیم کر رہے ہیں اور کسی خاص طبقہ یا بعض ارکان کی خوشحالی کا خیال کر کے نہیں بلکہ تمام ریاست کو بہ حیثیت مجموعی خوشحال بنا کر تھوڑی دیر میں ہم اُس کے بالکل متضاد نظام پر نظر ڈالیں گے۔ اچھا آپ ہی غور کیجیے کہ اگر ہم کسی مورت کو رنگ رہے ہوں اور کوئی شخص ہمارے پاس آئے اور لگے ہمیں الزام دینے کہ تم سب سے خوبصورت حصے پر سب سے خوشنما رنگ نہیں لگاتے چنانچہ دیکھو آنکھیں جسم کا حسین ترین حصہ ہیں لیکن تم نے بجائے خوشنما ارغوانی رنگ کے انھیں کالا رنگ دیا ہے تو کیا ایسے آدمی کے لیے یہ جواب کافی نہ ہوگا، کہ بھائی ہم آنکھوں کو اتنا خوبصورت نہیں بنانا چاہتے کہ وہ پھر آنکھیں نہ رہیں، نہ دوسرے اعضا کو اتنا خوشنما بنا سکتے ہیں کہ اُن کی اصلی حیثیت ہی باقی نہ رہے۔ ہاں تم یہ دیکھو کہ ہر حصہ کو اس کا اصلی اور حقیقی رنگ دیکر ہم پورے مجسمہ کو خوبصورت بناتے ہیں یا نہیں، بعینہ اسی طرح آپ معاملہ زیر غور میں بھی ہمیں اس بات پر مجبور نہ کیجیے کہ ہم طبقہ محافظین کو اس قدر خوش حال بنا دیں کہ پھر وہ محافظ ہی باقی نہ رہیں؛ ورنہ پھر اسی اصول پر ہم سے یہ مطالبہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہمارے کسان لباس فاخرہ زیب تن کریں، ان کے سروں پر چھوٹے چھوٹے تاج ہوں، یہ جب چاہیں زمین جوتیں جب چاہیں نہ جوتیں یا ہمارے کمہار آرام کرسیوں پر چین سے لیٹے مزے کریں، سامنے آگ جلتی ہو شراب کی بوتلیں رکھی ہوں اور وہاں ایک طرف چاک بھی پڑا ہو کہ جب ذرا جی چاہے اور

جتنی دیر ناگوار خاطر نہ ہو اس سے بھی ذرا شغل کر لیا کریں۔ اور اسی قسم کے
آسائش ہم تمام دوسرے طبقوں کے لیے بھی فراہم کریں تاکہ اس طرح سے
کا شہر نہایت خوشحال ہو جائے۔ لیکن براہ نوازش ہمیں تو اس قسم کے
سے معاف ہی رکھیے کیونکہ آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی صورت میں نہ تو
کسان رہیگا نہ کمہار اور نہ دوسرے پیشے والے جن کے مجموعے سے
عبارت ہے اپنی صحیح حالت قائم رکھ سکیں گے۔ اور پھر دوسرے پیشوں میں
چنداں ایسا نقصان بھی نہیں، مثلاً اگر جوتے بنانے والا اپنے کام میں ہوشیار
نہیں نااہل ہے اور جس فن سے واقف نہیں اس کا مدعی ہے تو یہ ریاست کے
کوئی زیادہ خطرہ کی بات نہیں لیکن اگر قانون اور ریاست کے محافظ صرف
میں محافظ ہوں درحقیقت کچھ نہ ہو تو یہ تو سرے سے پوری کی پوری ریاست
کی تباہی کا باعث ہونگے، کیونکہ یہی لوگ تو ریاست میں عام مرفہ الحالی
پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جہاں ہمارا مقصد حقیقی محافظین کا
طبقہ پیدا کرنا ہے جن میں ریاست کو نقصان پہونچانے کی کم سے کم صلاحیت
وہاں ہمارے فرضی معترض کے پیش نظر دہقانوں کا ایک مجمع ہے جو کسی تعطیل
سلسلہ میں خوشی سے جشن منا رہے ہیں نہ کہ ایک ریاست کے شہری۔ ہمیں
دیکھنا چاہیئے کہ طبقہ محافظین کی ترتیب میں ہمارا مقصد اُن کے لیے زیادہ
زیادہ آرام و آسائش مہیا کرنا ہے، یا ہمارا فرض یہ ہے کہ یہ آرام و آسائش کل

کو بہ حیثیت مجموعی میسر ہو اور ہم محافظین اور اُن کے مددگاروں کو اس امر کی ترغیب دیں یا اسے مجبور کریں کہ وہ اپنے فرائض کو بہترین طریقے سے انجام دینے کے وسائل پر غور و فکر کرتے رہیں۔ اسی طرح دوسرے پیشہ والوں کو بھی ترغیب دیں یا مجبور کریں تاکہ پورا شہر مرفہ الحال اور منتظم ہو جائے اور پھر اس خوشحالی سے ہر طبقہ حسب مراتب اور بقدر امکان فائدہ اُٹھائے۔

ایڈ:۔ میرے خیال میں آپ جو کچھ فرماتے ہیں بالکل صحیح ہے۔

میں:۔ نہ معلوم آپ اسی سے متعلق ایک دوسرے بیان کو بھی قابل پذیرائی سمجھیں گے یا نہیں؟

ایڈ:۔ وہ کیا؟

میں:۔ ذرا یہ تو سوچئے کہ دوسرے اہل حرفہ بھی ان چیزوں سے کیا اسی طرح متأثر ہوں گے؟

ایڈ:۔ کن چیزوں سے؟

میں:۔ میرا مطلب دولت اور افلاس سے ہے۔

ایڈ:۔ کس طرح؟

میں:۔ سنئے، یوں۔ کیا آپ کے خیال میں متمول ہو جانے کے بعد کمہار اپنے ہنر پر پہلی سی توجہ کرے گا؟

ایڈ:۔ ہرگز نہیں۔

میں :- پہلے سے زیادہ کاہل اور بے پروا ہو جائیگا؟

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- یعنی بہ حیثیت کمہار پہلے سے بُرا ہو جائیگا؟

ایڈ :- بہت بُرا۔

میں :- برخلاف اس کے اگر غربت اور افلاس کے باعث وہ اپنے کام کے لیے آلات اور پیشہ کی دوسری ضروریات فراہم نہیں کرسکتا تو لازمی ہے کہ وہ ادنیٰ درجہ کے برتن بنائے اور اُس کے لڑکے اور دکان پر دوسرے کام کرنے والے پیشہ کی عمدہ تعلیم حاصل نہ کرسکیں۔

ایڈ :- بلاشبہ

میں :- یعنی یہ دونوں چیزیں دولت اور افلاس خود کاریگر کو اور اس کے مال کو بُرا بناتے ہیں۔

ایڈ :- اور کیا۔

میں :- گویا ہمیں چند اور ایسی چیزوں کا علم ہوگیا جن پر ہمارے محافظین کو خاص طور پر نگاہ رکھنی چاہیے تاکہ وہ نظر بچا کر کہیں ہمارے شہر میں داخل نہ ہوں۔

ایڈ :- وہ کیا چیزیں ہیں؟

میں :- یہی دولت اور افلاس۔ کیونکہ اگر اول الذکر سے تعیش، کاہلی اور بے
پیدا ہوتے ہیں تو مؤخر الذکر بھی کم ظرفی، کمینہ پن، ہنر میں نقص اور تغیر کا باعث ہ

ایڈ :- بیشک یہ درست ہی لیکن اس کے ساتھ ہی ذرا یہ بھی تو سوچیے کہ اگر ہمیں میدان جنگ میں کسی دوسرے شہر سے اور خصوصاً کسی مالدار او رزیادہ آباد شہر سے مقابلہ کرنا پڑا تو دولت بغیر ہم کیا کر سکیں گے؟

میں :- ہاں، اگر اس قسم کا مخالف شہر ایک ہو تو البتہ اس سے جنگ کرنا دشوار ہوگا لیکن اگر دو ہوے تو پھر تو آسانی ہو جائیگی۔

ایڈ :- یہ کیسے؟

میں :- سب سے پہلی بات تو یہ ہی کہ اگر بالفرض ہمیں جنگ کرنی پڑی تو جہاں ہمارے مخالف مالدار لوگ ہوں گے وہاں ہماری امتیازی خصوصیت سپہ گری ہوگی۔

ایڈ :- یہاں تک تو بات بیشک صحیح ہی۔

میں :- تو پھر اڈی مینٹس کیا تمھیں اس بات کا یقین نہیں ہی کہ ایک شخص جس نے گھونسا چلانے کی خوب تعلیم پائی ہو وہ نہایت آسانی کے ساتھ دو دبلے موٹے اور مالدار آدمیوں سے لڑ سکتا ہی جو اس ہنر سے یکقلم نابلد ہوں۔

ایڈ :- دونوں سے ایک ہی وقت میں تو شاید مشکل ہو۔

میں :- کیوں؟ اگر وہ پہلے کچھ پالی دے اور جیسے ہی مخالفوں میں سے ایک دوسرے سے ذرا آگے بڑھ آے بس اس پر وار کرے اور اسے ریل دے اور اسی طرح چلچلاتی دھوپ میں چند مرتبہ کرے تو میں تو سمجھتا ہوں کہ دو کیا دو سے زیادہ مخالفوں کو زیر کرلے گا۔

ایڈ:- ہاں، اگر ایسا کرے تو چنداں تعجب کی بات تو نہ ہوگی۔

میں:- اور فن حرب کے مقابلہ میں تو اُمرا، گھونسہ بازی کے اُصولوں اور اُن پر عمل کرنے کے طریقوں سے پھر بھی زیادہ واقف ہوتے ہیں۔

ایڈ:- جی ہاں۔

میں:- تو ظن غالب ہی کہ ہمارے سکھائے ہوے سپاہیوں کو اپنے سے دوگنی یا تگنی تعداد کا مقابلہ کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوگی۔

ایڈ:- ہاں، میں مان گیا۔ آپ ہی صحیح فرماتے ہیں۔

میں:- لیکن اس سے قطع نظر، فرض کرو کہ ہم ان دو حریفوں میں سے ایک کے پاس یہ سچا پیام کسی سفیر کے ہاتھ بھیجیں کہ ہم تو سیم وزر کا استعمال کرتے نہیں اور نہ اس کی ہمارے شہر میں اجازت ہی۔ ہاں آپ کے یہاں البتہ یہ جائز ہی، اس لیے آپ اپنی افواج کو ہم سے لا ملائیے اور مخالفین کا تمام مال و ملک آپ کا ہو جائیگا تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اس اطلاع کے بعد کوئی شخص پسند کریگا کہ وہ دبلے اور خوفناک کتوں کے مخالف جنگ کرے اور ان کتوں کے ساتھ ہو کر موٹی لیکن نازک بھیڑوں کا شکار نہ کرے؟

ایڈ:- کوئی کیوں ایسا کرنے لگا۔ لیکن کیا فریق مخالف کی تمام دولت کا ایک شہر میں چلا جانا اس شہر کے لیے خطرہ کا باعث نہ ہوگا جو مالدار نہیں ہی؟

میں:- خوب! سبحان اللہ!! میں جناب کو اس خیال پر مبارکباد دیتا ہوں

کہ آپ کسی ایسی چیز کو بھی "شہر" کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں جو ہمارے مرتب کردہ نظام کا پابند نہ ہو۔

ایڈ:۔ کیوں، تو آپ پھر اسے کیا کہیں گے؟

میں:۔ انکے لیے تو بھائی کوئی اور بڑا شاندار سا نام ہونا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک کئی شہروں کا مجموعہ ہے ایک شہر کہاں!! ان میں کم سے کم دو شہر تو ضرور ہیں جو ایک دوسرے سے متخاصم ہیں یعنی ایک غریبوں کا شہر اور ایک امیروں کا۔ اور پھر ان میں بھی اور کئی کئی شہر ہیں۔ اگر آپ انھیں ایک شہر سمجھیں تو سخت غلطی ہوگی انھیں بالکل جدا جدا شہر تصور کر کے اگر آپ ایک طبقہ کو دوسرے کا مال متاع دیں گے تو ہمیشہ آپ کے دوست زیادہ ہونگے اور دشمن کم۔ اور میں تو خیال کرتا ہوں کہ جب تک آپ کے شہر میں سلیقہ کے ساتھ انھیں اصولوں پر حکومت ہوگی جو ہم نے ابھی مرتب کیے ہیں تو فی الحقیقت یہ بہت بڑا شہر ہوگا۔ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ یہ بڑے شہر کی حیثیت سے مشہور بھی ہوگا البتہ واقعاً بہت بڑا ہوگا چاہے اسکی فوج ہزار آدمیوں سے زیادہ پر مشتمل نہ ہو۔ کیونکہ آپ کو اتنا بڑا شہر نہ یونان میں ملیگا نہ اس کے باہر غیر متمدن ممالک میں۔ اگرچہ ایسے شہر بہت سے ملیں گے جو بظاہر اس سے چند گونہ بڑے معلوم ہوتے ہوں۔ آپ اس معاملہ میں مجھ سے اختلاف تو نہیں کرتے؟

ایڈ:۔ نہیں، مطلق نہیں۔

میں :- اور یہی ہمارے حکمرانوں کے لیے ریاست کی وسعت کو متعین کرنیکا معیار ہوگا جس کے مطابق وہ ریاست کے لیے ایک مناسب قبۂ زمین مقرر کر دینگے اور اس کے باہر کسی اور چیز سے سروکار نہ رکھیں گے۔

ایڈ :- وہ معیار کیا ہو؟

میں :- یہی کہ جہاں تک شہر کی توسیع اُس کی وحدت یا اُسکے ایک شہر ہونے میں حائل نہ ہو وہاں تک اُسے بڑہنے دیا جائے اُسکے آگے ہرگز نہیں۔

ایڈ :- بیشک یہ قاعدہ ہو تو خوب۔

میں :- تو پھر ہم اپنے محافظین پر یہ فرض اور عائد کریں گے کہ وہ اس امر کا خیال رکھیں کہ شہر نہ تو بہت چھوٹا ہو نہ دیکھنے میں بہت بڑا۔ بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت اسکی وحدت اور اسکا کافی بالذات ہونا ہو۔

ایڈ :- یہ تو ایک معمولی سا فرض ہو جو انکے سپرد کیا جا سکتا ہو۔

میں :- اسپر ہم ایک دوسرے اس سے بھی معمولی فرض کا اضافہ کرینگے جس کا سرسری سا تذکرہ ہم اس وقت کر چکے ہیں جب اثنا گفتگو میں ہم نے کہا تھا کہ یہ مناسب ہوگا کہ اگر طبقہ محافظین میں کوئی بچہ ادنےٰ قسم کا پیدا ہو تو اُسے نیچے کسی دوسرے طبقہ میں بھیجدیا جائے اور نیچے کے طبقوں میں اگر کوئی غیر معمولی خوبی کا بچہ پیدا ہو تو اُسے طبقہ محافظین میں جگہ دیجائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے شہریوں کو بھی اس کام پر لگانا چاہیئے جسکے لیے قدرت نے انھیں بنایا ہو؛ یعنی ہر شہری کو کوئی ایک کام دیا جائے تاکہ ہر ایک

پنے مخصوص کام کو انجام دے اور اس طرح ایک انسان بنے نہ کہ چند، اور پھر ان کی مجموعی مساعی سے جو شہر پیدا ہو وہ ایک شہر ہو نہ کہ کئی شہروں کا مجموعہ۔

ایڈ:- ہاں، یہ پہلے سے بھی زیادہ معمولی فرض ہے۔

میں:- بیشک، ہماری ان ہدایات و احکام پر عمل کرنا کوئی دشوار کام نہیں جیسا ممکن ہے کہ بعض لوگ خیال کریں۔ بلکہ اگر ہمارے محافظین بس ایک اہم بات کو ہر وقت پیش نظر رکھیں تو یہ تو نہایت معمولی باتیں ہو جائیں گی۔

ایڈ:- وہ بات کیا ہے؟

میں:- تعلیم اور تربیت۔ کیونکہ اگر اچھی تعلیم دیکر انھیں سمجھدار انسان بنا دیا جائے تو پھر وہ آسانی سے ان تمام مسائل کا حل معلوم کر سکیں گے جنکا ہم نے تذکرہ کیا ہے یا جنھیں ہم نے فی الحال نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً مرد اور عورت کے تعلقات ازدواج، اور توالد و تناسل، جن سب میں حتی الوسع اس مقولہ کا خیال رکھنا چاہیے کہ "دوستوں میں تمام چیزیں مشترک ہوتی ہیں"۔

ایڈ:- جی ہاں، یہ سب سے بہتر تدبیر ہے۔

میں:- اور سچ یہ ہے کہ جب ریاست کی ابتدا ایک مرتبہ صحیح طریقہ پر ہو گئی تو پھر یہ جیسے جیسے بڑھتی ہے اس سے ایک ترقی دوار کا ظہور ہوتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے طریقہ حسنہ پر عامل ہونے سے اچھی طبائع پیدا ہوتی ہیں اور اچھی طبائع اس عمدہ تعلیم کی مدد سے اور بھی بہتر بنجاتی ہیں اور دوسرے حیوانوں کی طرح منجملا و صفات کے صفت

توالدمیں بھی ترقی ہوتی ہے۔

ایڈ :- بیشک، یہ تو قدرتی بات ہے۔

میں :- چنانچہ مختصراً ریاست کے نگرانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس اصول کی سختی سے پابندی کریں اور بالا اپنے علم کے اس میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دیں، بلکہ ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں اس کی حفاظت کریں اور وہ اصول یہ ہے کہ تعلیم کی ہر دو اصناف ورزش اور موسیقی کے موجودہ مقررکردہ نظام میں کوئی تجدید یا ترمیم روانہ رکھیں بلکہ اسی پر سختی سے کاربند رہیں۔ لہذا جب یہ کہا جائے کہ لوگ اس گیت پر سب سے زیادہ توجہ کرتے ہیں جو بالکل نیا ہو اور جس کی موسیقی مغنی پر چھا جاتی ہو تو اندیشہ ہے کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ شاعر کا مفہوم صرف نئے گیتوں سے ہی نہیں بلکہ جدید طریقۂ موسیقی سے بھی ہے اور اس میں بھی جدت قابل تعریف بات ہے۔ حالانکہ اس میں جدت ہرگز قابل تحسین نہیں اور نہ ان الفاظ کا یہ مفہوم ہے۔ موسیقی کے نئے طریقوں کے اجرا سے تو سخت پرہیز کرنا چاہیے کہ اس سے ریاست کا وجود ہی معرض خطر میں آجاتا ہے، کیونکہ اس میں تجدید و تبدل اہم ترین سیاسی نظامات کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ کم سے کم "ڈیمون" کا یہی خیال ہے اور میں اسے یقین کرتا ہوں۔

ایڈ :- میرا شمار بھی اس خیال کے مؤیدین میں ہی کیجیے۔

میں :- جہاں تک میں دیکھ سکتا ہوں، یہ موسیقی ہی وہ نقطہ ہے جہاں ہمارے محافظین کو اپنے حفاظت خانہ کی تعمیر کرنی چاہیئے۔

ایڈ :- ہاں، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں سے بے آئینی خاموش اور غیر محسوس طریقے سے داخل ہوتی ہے۔

میں :- ہاں شر و فساد کا گمان بھی نہیں ہوتا اور یہ تفریح کے بھیس میں آجاتی ہے

ایڈ :- اور شر و فساد بپا بھی کیا کرتی ہے؟ صرف یہ کہ جہاں ذرا قدم جما لیا کہ بس لگی رفتہ رفتہ خاموشی سے لوگوں کے رسوم و اطوار پر اثر ڈالنے اور اس طرح قوت پکڑ کر باہمی معاہدوں میں اپنا ظہور کرنے۔ پھر کیا ہے، اب تو اسکا حملہ قانون ملکی و اساسی پر اس دیدہ دلیری سے شروع ہوتا ہے کہ انجام کار ہر چیز خواہ جماعتی ہو خواہ شخصی ایک مرتبہ درہم برہم ہو جاتی ہے۔

میں :- سچ کہتے ہو، یہ ایسی ہی چیز ہے۔

ایڈ :- میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں :- لہذا کیا ہمیں اس امر کا انتظام بھی نہ کرنا چاہیے کہ شروع ہی سے ہمارے بچوں کی تفریح جائز حدود سے باہر نہ ہونے پائے کیونکہ جہاں ایک مرتبہ بچوں کو ناجائز تفریحوں کا لپکا پڑ گیا بس پھر ناممکن ہو جاتا ہے کہ یہ بڑے ہو کر نیک اور وفادار آدمی بن سکیں۔

ایڈ :- بلاشبہ۔

میں :- اور اگر شروع ہی سے موسیقی کے ذریعہ بچوں کے دماغ میں وفاداری کے خیالات جاگزیں ہو جائیں تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس ہوگا۔ یہ وفاداری انکی

ترقی کا باعث ہوگی، اُس کا ظہور اُن کے ہر عمل میں ہوگا اور اگر ریاست کے نظامات میں سے کوئی بفرض محال ضائع بھی ہو جائے تو انکا یہ جذبہ اُسے از سرِ نو پیدا کر دے گا۔

ایڈ:۔ بیشک، یہ بالکل سچ ہے۔

میں:۔ اور ان لوگوں کی نظر اِن چھوٹے چھوٹے اخلاق و آداب پر بھی ضرور رہیگی جنھیں دوسروں نے، جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں پس پشت ڈالدیا ہے۔

ایڈ:۔ آپ کا مطلب کن آداب سے ہے؟

میں:۔ مثلاً بزرگوں کی موجودگی میں خوردوں کا متانت اور خاموشی سے بیٹھنا، جب وہ آئیں تو اُٹھ کر اُن کی تعظیم کرنا، جھک کر آداب بجالانا، والدین کا ہر طرح خیال رکھنا، یا مثلاً سر کے بال ٹھیک بنانا، جوتے کپڑے اور ذاتی آرائش کا مناسب خیال کرنا وغیرہ۔ کیوں بھائی، ٹھیک ہے نا؟

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ لیکن ان باتوں کے متعلق قانون بنانا تو احمقانہ سی بات ہوگی، میں تو جانتا ہوں کہ ایسا ہوتا نہیں اور نہ میرے خیال میں ان اُمور کی بابت لفظی قانون کچھ پائدار ثابت ہو سکتا ہے۔

ایڈ:۔ بیشک، کیسے ہو سکتا ہے؟

میں:۔ البتہ تعلیم کے ذریعہ جو رجحان پیدا کر دیا جائے وہ ان تمام چیزوں کے

مؤثر ہوتا ہے؛ کیونکہ اچھی چیز اچھی کو اور بری بری کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- چنانچہ میرے خیال میں ہمیں توقع کرنی چاہیے کہ جو نظام ہم نے مرتب کیا ہے اس سے کوئی کامل اور مہتم بالشان نتیجہ ضرور مترتب ہوگا، خواہ یہ نتیجہ اچھا ہو یا برا۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اسی وجہ سے میں متذکرہ امور کے متعلق قوانین کی ترتیب ضروری نہیں سمجھتا۔

ایڈ :- اور یہی قرین عقل ہے۔

میں :- لیکن کچھ اور معاملات بھی تو ہیں ان کے متعلق کیا رائے ہے؟ مثلاً بازار میں لوگوں کی باتیں، لین دین، یا اہل حرفہ کے باہمی معاہدات کسی پر اتہام لگانے یا حملہ کر دینے کے متعلق قانونی چارہ جوئی یا فہرست وکلا کی تدوین؛ یا محاصل سرکاری کا مسئلہ؛ یا بازار یا بندرگاہ پر چنگی لینے کا سوال اور بازار، پولیس اور چنگی وغیرہ کے تمام قواعد و ضوابط۔ کیا ہمیں ان سارے معاملوں کے متعلق بھی قانون تیار کرنا چاہیے؟

ایڈ :- نہیں۔ میرے خیال میں تو نیک و تعلیم یافتہ آدمیوں کو ان امور کے متعلق ہدایات دینا محض تضیع وقت ہے، کیونکہ اکثر و بیشتر ان لوگوں کو صحیح قانون

کے خود معلوم کرلینے میں کوئی دقت نہ پڑیگی۔

میں :- ہاں۔ بشرطیکہ خدا ان کو ان قوانین کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے جو ہم بتا چکے ہیں۔

ایڈ :- ورنہ بصورت دیگر تکمیل قانون کے لیے یہ لوگ اپنی ساری عمر جدید قوانین نافذ کرنے اور ان میں نئی نئی ترمیمیں کرنے میں صرف کردینگے۔

میں :- آپ کے خیال میں ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہوگی جو اگرچہ بیمار ہیں لیکن اپنے نفس پر قابو نہ رکھنے کے باعث ایک مضر صحت طریقہ زندگی کو ترک نہیں کرسکتے۔

ایڈ :- جی، انکی مثال بس بعینہ یہی ہے۔

میں :- اور سبحان اللہ، یہ لوگ زندگی بھی کیا خوب بسر کرتے ہیں، ہمیشہ طبیبوں کے تختہ مشق ہیں، لیکن فائدہ کا تو ذکر ہی کیا اپنے امراض کو اور زیادہ شدید اور پیچیدہ بنا لیتے ہیں، البتہ یہ آس ہمیشہ لگی رہتی ہے کہ کوئی تو کبھی ایسی دوا بتا ہی دیگا جس سے شفا کلی حاصل ہو جائیگی۔

ایڈ :- جی ہاں، ان مریضوں کی تو یہی حالت ہوتی ہے۔

میں :- اور لطف یہ کہ یہ لوگ ہر اس شخص کو اپنا دشمن جانتے ہیں جو انھیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا اور انھیں یقین دلاتا ہے کہ جب تک آپ اپنی شراب خواری عیاشی، پرخوری، اور کاہلی نہ چھوڑینگے اسوقت تک نہ کوئی دوا کام دیسکتی ہے، نہ

نہ تیزابوں کا استعمال اور جراحی اور نہ جھاڑ پھونک اور گنڈے تعویذ سے کام چلسکتا ہے۔

ایڈ :- اس میں کیا لطف ہے کہ ایک آدمی تو آپ کو سچی نصیحت کر رہا ہے اور آپ ہیں کہ خفا ہوئے جاتے ہیں!

میں :- معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے؟

ایڈ :- نہیں، ہرگز نہیں دیکھتا۔

میں :- لہذا اگر سارا شہر کا شہر انھیں لوگوں کی طرح کاربند ہو تو یہ بھی آپ پسند نہ کریں گے، اور کیا افراد کی طرح ریاستیں بھی اس مرض میں مبتلا نہیں ہوتیں کہ باوجود اپنے قانون اساسی کی خرابی اور اُس کے نقائص کے یہ اپنی رعایا کو اُسکے چھیڑنے اور تبدیل کرنے سے روکتی ہیں، اور اگر کوئی ایسی کوشش کرے تو اُسے سزائے موت دیجاتی ہے۔ ہاں، وہ شخص البتہ نہایت اچھا، عقلمند اور قابل عزت و احترام سمجھا جاتا ہے جو موجودہ نظام کے ماتحت رہ کر انکی خدمت انجام دے، اور خوشامد درآمد اور ذلیل طریقوں سے انکی خوشنودی حاصل کرے، اُنکی خواہشوں کو پہلے سے تاڑلے اور انھیں پورا کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔

ایڈ :- بیشک میں تو ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں دیکھتا اور نہ اس طرز عمل کو قابل پسندیدگی سمجھتا ہوں۔

میں :- اور کیا ان لوگوں کی ہمت اور ہوشیاری قابل داد نہیں جو ایسی

ریاستوں کی خدمت کے لیے آمادہ بلکہ اسکے متمنی رہتے ہیں۔

ایڈ:۔ ہاں، ہو گی۔ لیکن ان لوگوں کی نہیں جو بہت سے آدمیوں سے اپنی تعریف سنکر خود اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ واقعاً نہایت عقلمند مدبر ہیں

میں:۔ ارے کیوں، بھائی تم کیا کہتے ہو۔ ان بیچاروں پر ظلم نہ کرو۔ تمہارے خیال میں اگر ایک شخص ہی جو پیمائش کے متعلق ایک حرف نہیں جانتا اور اسی جیسے بہت سے جاہل لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تم دو گز اونچے ہو تو کیسے ممکن ہے کہ وہ انپر یقین نہ کرلے۔

ایڈ:۔ جی ہاں، یہ تو ممکن نہیں۔

میں:۔ تو پھر ان غریبوں سے کیوں خفا ہوتے ہو؟ یہ تو بڑے دلچسپ لوگ ہیں، جو اس خیال میں مگن ہیں کہ اُمور مذکورہ کے متعلق اپنی دائمی قانون سازی اور ترمیموں سے یہ ان بے ایمانیوں کا سدباب کرسکیں گے جو معاہدوں میں آئے دن کیجاتی ہیں، اور ان دوسری مشکلوں کا حال بھی معلوم کرلینگے جن کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ یہ بیچارے یہ نہیں سوچتے کہ فی الحقیقت ایک ہزار سر والے جانور کے سر کاٹنے کی سعی لاحاصل میں مشغول ہیں۔

ایڈ:۔ بیشک، انکا شغل اس سے زیادہ نتیجہ خیز نہیں۔

میں:۔ اور میں تو ایک حقیقی قانون ساز کا، خواہ وہ بُری ریاست میں ہو یا اچھی میں، ہرگز یہ فرض نہیں سمجھتا کہ وہ قانون وحکومت کے شعبوں کے متعلق

اپنا سر کھپائے، کیونکہ اول الذکر صورت میں تو یہ سارے ضوابط سراسر بے سود ہونگے اور موخر الذکر حالت میں ہر شخص بعض قواعد خود معلوم کر لے گا اور بعض خود بخود سابقہ تعلیم کی وجہ سے منکشف ہو جائیں گے۔

ایڈ:- تو اب بہ حیثیت قانون ساز کے ہمارے لیے کیا کام باقی رہا؟

میں:- ہمارے لیے تو کچھ باقی نہیں رہا۔ لیکن دیلفی اپولو کے لیے قانون سازی کا سب سے اہم اور سب سے عمدہ اور سب سے زیادہ مہتم بالشان کام باقی ہے۔

ایڈ:- وہ کیا ہے؟

میں:- عبادت گاہوں کی تعمیر، قربانیوں اور دیوتاؤں اور مشاہیر کے متعلق دیگر مراسم کا تعین؛ مُردوں کے جلانے کا طریقہ، اور ان تمام رسوم کے متعلق ہدایات جنکا اختیار کرنا ساکنان عالم بالا کی خوشنودی کے لیے ضروری ہے۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ہم انکے متعلق کچھ نہیں جانتے اور اپنے نظام حکومت کی ترتیب میں ان معاملات کی بابت ہمیں سوائے اپنے قدیم قومی ترجمان کے اور کسی کی نصیحت یا مشورہ پر کاربند نہ ہونا چاہیئے؛ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ دیوتا ہے جو مرکز ارضی سے اپنے آدمفلوس کے پر جلال تخت پر بیٹھا ہوا تمام اس قسم کے معاملات پر ہماری قوم کے تمام افراد کے فرائض کی ترجمانی کرتا ہے۔

ایڈ:- آپ بالکل صحیح ارشاد فرماتے ہیں ہمیں بیشک یہی کرنا چاہیئے۔

میں:- اچھا تو، ابن ارسطن اب ہماری ریاست کی تنظیم مکمل ہو گئی،

چنانچہ تمہارا دوسرا فرض اب یہ ہی کہ نور و بصیرت کا کچھ سرمایہ ساتھ لیکر، اور اپنے بھائی اور پالیمارکس وغیرہ کی مدد سے اس جستجو میں لگ جاؤ کہ اس ریاست میں عدل و انصاف کہاں ہی اور ظلم و ناانصافی کہاں؛ تاکہ دونوں کا فرق معلوم ہو جائے اور یہ ظاہر ہو سکے کہ اگر کوئی آدمی خوشی و مسرت حاصل کرنا چاہتا ہی تو اُسے ان میں سے کس چیز کی ضرورت ہوگی اور یہ کہ آیا اس حقیقت سے تمام دیوتا اور انسان آگاہ بھی ہیں؟

گلاکن :- جی نہیں، یوں کام نہیں چلیگا۔ یہ جستجو تو آپ نے اپنے ذمہ لی تھی اور یہ فرمایا تھا کہ اگر میں نے عدل و انصاف کی حتی الوسع مدد نہ کی تو میں ایک گناہ کا مرتکب ہونگا۔

میں :- ہاں، سچ ہی۔ مجھے یاد ہی میں نے یہ کہا تھا اور میں اس کے لیے تیار ہوں۔ ہاں، ذرا آپ لوگ بھی مدد فرمائیں۔

گ :- ہاں، حاضر ہیں۔

میں :- پھر تو مجھے اُمید ہی کہ ہم جس چیز کی تلاش میں ہیں اس کا پتہ ضرور لگا لیں گے۔ اچھا، سُنیئے چونکہ ہم نے اپنی ریاست کی بالکل صحیح تنظیم کی ہی اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بدرجۂ اتم ایک عمدہ ریاست ہوگی۔ آپکی کیا رائے ہی؟

گ :- ہونا تو چاہیئے۔

میں :- یعنی بہ الفاظ دیگر یہ ریاست ذی عقل و حکیم، باہمت و شجاع،

ضابطِ نفس و عفیف اور منصف و عاقل ہوگی (کہ اچھائی انھیں چار صفات سے عبارت ہے)

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ چنانچہ ان چار صفات میں سے اگر ہم چند کا پتہ ریاست میں لگالیں تو باقی ماندہ دوسری صفات پر مشتمل ہوگا۔

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ فرض کیجیے کہ کوئی اور چیز چار اشیاء پر مشتمل ہوتی اور ہم ان میں کسی ایک کے متلاشی ہوتے، تو اُسوقت دو صورتیں ممکن تھیں، یعنی یا تو یہ چیز ہمیں دوسرے تین اجزاء سے پہلے معلوم ہوجاتی اور ہم مطمئن ہوجاتے، یا پھر ہم ان تین کو پہلے معلوم کرلیتے تو شئے مطلوبہ خود بخود معلوم ہوجاتی، اس لیے کہ وہ سوائے باقی ماندہ کے اور کیا ہوسکتی ہے؟

گ :۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔

میں :۔ تو پھر معاملہ زیرِ تحقیق میں کہ اس میں بھی چار صفات زیرِ بحث ہیں، ہم کیوں نہ یہی طریقہ اختیار کریں؟

گ :۔ ضرور کرنا چاہیے۔

میں :۔ اچھا، تو شروع کیجیے۔ پہلی صفت تو آسانی سے دکھائی دیتی ہے، لیکن اسی سلسلہ میں ایک عجیب بات پیش نظر آتی ہے۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- دیکھیئے، ہماری ریاست اسی حد تک یا اسی لیے تو عقلمند و حکیم ہے، کہ وہ محتاط و دُور اندیش ہے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور یہ دور اندیشی اور احتیاط کی صفت بجائے خود ایک قسم کا علم ہے، کیونکہ لوگ جہل سے ارادۃً محتاط اور دُور اندیش نہیں بنتے بلکہ علم سے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- لیکن ہماری ریاست میں تو بہت سے مختلف اقسام کے علم ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- تو کیا ہماری ریاست اپنے بخاروں کے علم کی وجہ سے عقلمند یا دُور اندیش و محتاط کہلائیگی۔

گ :- ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس علم کی وجہ سے تو یہ فن نجاری کے اعتبار سے عمدہ خیال کی جائے گی۔

میں :- ہاں، تو پھر کیا لکڑی کی جہاز سازی کے متعلق جس علم سے کام لیا جاتا ہے اُس کا وجود ہماری ریاست کو عقلمند کے لقب کا مستحق کر دیگا۔

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- تو شاید آہنی جہازوں کی تعمیر کا علم یا اسی قسم کی اور کوئی چیز یہ استحقاق

بخشدے گی؟

گ :- نہ یہ بخش سکتی ہو نہ دہ۔

میں :- اسی طرح فن زراعت کا علم ہمیں اسکا مستحق کر دیگا کہ ہم اپنی ریاست کو ایک عمدہ زراعتی ریاست کہہ سکیں لیکن اسے اس بنا پر عقلمند نہیں کہہ سکیں گے

گ :- بیشک۔

میں :- تو پھر بتائیے کہ ہماری اس نئی ریاست میں کوئی صنف علم ایسی بھی ہی جو شہریوں کے ایسے طبقہ میں پائی جاتی ہو جو ریاست کے کسی جزو تک اپنی کارروائیاں محدود نہ رکھتا ہو بلکہ اس کے پیش نظر ریاست من حیث الریاست ہو اور اس کل کے داخلی اور خارجی تعلقات با حسن وجوہ ترتیب دیتا ہو۔

گ :- بیشک ہی۔

میں :- وہ علم کونسا ہی اور کن لوگوں میں پایا جاتا ہی۔

گ :- وہ علم ہی ہمارا علم تحفظ ذاتی، اور وہ اس حکمراں جماعت میں پایا جاتا ہی جسے ہم نے جماعت محافظین کے نام سے موسوم کیا ہی۔

میں :- اس علم کے وجود کی وجہ سے آپ ریاست کو کیا کہتے ہیں۔

گ :- میں اسے محتاط، دور اندیش اور عقلمند کہتا ہوں۔

میں :- اچھا اب فرمائیے کہ ہماری ریاست میں یہ طبقہ زیادہ تعداد میں ہوگا یا ٹھٹیرے؟

گ :۔ ٹھٹیرے کہیں زیادہ ہوں گے۔

میں :۔ تو کیا اور سب طبقوں کے مقابلہ میں جو دیگر علوم و فنون کے جاننے کی وجہ سے مختلف ناموں سے موسوم ہوتے ہیں یہ محافظین کا طبقہ تعداد میں کم ہوگا؟

گ :۔ ہاں، یہ سب سے قلیل التعداد ہوگا۔

میں :۔ یعنی وہ سب سے چھوٹے گروہ یعنی طبقہ حکمراں کا علم ہوتا ہے جو کسی ریاست کو جو مطابق فطرت مرتب کیگئی ہو مجموعی حیثیت سے عقلمند کہلائے جانیکا مستحق بناتا ہے اور وہ جماعت ریاست میں سب سے قلیل التعداد جماعت ہے جس کا حق اور فرض اس علم سے کام لینا ہے جو تمام دوسرے علوم کے مقابلہ میں حقیقی عقلمندی کہلایا جا سکتا ہے۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ اچھا تو ہم نے کسی نہ کسی طرح منجملہ چار کے ایک صفت کا پتہ تو لگا لیا اور نیز اس جزو ریاست کا جہاں یہ جاگزیں ہے۔

گ :۔ میرے خیال میں تو ٹھیک پتہ چلا لیا ہے۔

میں :۔ اسی طرح یقیناً ہمت اور شجاعت کی صفت کا پتہ لگانا بھی چنداں مشکل نہ ہوگا جس کی موجودگی ریاست کو شجاع و بہادر کہلانے کا مستحق کرتی ہے اور نہ ریاست کے اس حصہ کے معلوم کرنے میں کچھ دشواری ہوگی جس میں یہ صفت

پائی جاتی ہے۔

گ :۔ یہ کیسے؟

میں :۔ کسی شہر کی بزدلی یا بہادری پر رائے دینے کے لیے سوا اس طبقے کے جو اُسکی حفاظت کے لیے جنگ کرتا اور اُس کی جانب سے میدان میں آتا ہے اور کسی طبقہ کو کوئی کیوں دیکھنے لگا۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ اور اسی وجہ سے میں خیال کرتا ہوں کہ ریاست کی بزدلی یا بہادری دوسرے طبقوں کے ساتھ لازماً وابستہ نہیں۔

گ :۔ جی ہاں، نہیں ہے۔

میں :۔ لہذا کسی شہر کی شجاعت اور بہادری عقلمندی کی طرح اُس کے ایک حصہ کی صفات پر مبنی ہے، کیونکہ اس حصہ میں ایسی قوت ہے کہ لوگوں میں ان چیزوں کے متعلق صحیح خیالات کو ہمیشہ بے خلل قائم و محفوظ رکھتا ہے جن سے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے اور لوگوں کو اس امر کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ یہ چیزیں دراصل ویسی ہی ہیں جیسی کہ مجوزہ نظام تعلیم میں قانون ساز جماعت نے ظاہر کیا ہے۔ اور کیا یہی کام بہادری و شجاعت نہیں؟

گ :۔ میں ٹھیک سمجھا نہیں، ذرا مہربانی فرما کر دوہرا دیجیے۔

میں :۔ میں کہتا ہوں کہ بہادری ایک طرح کی حفاظت ہے۔

گ :- کس قسم کی حفاظت ؟

میں :- اُس خیال کی حفاظت جو قانون نے تعلیم کے ذریعہ اشیاء کے قابل خوف یا ناقابل خوف ہونے کے متعلق پیدا کیا ہی۔ اور جب میں نے اس خیال کے بلا خلل اور بالتواتر قیام کا ذکر کیا تو میرا مقصد یہ تھا کہ یہ خیال راحت والم، آرزو اور خوف کی متخالف کیفیتوں میں برابر پورے طور پر قائم رہے اور اسے کبھی ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ آپ چاہیں تو میں اسے ایک برمحل تمثیل سے زیادہ واضح کردوں؟

گ :- ضرور۔

میں :- آپ جانتے ہیں کہ جب رنگریز اون کو ارغوانی رنگنا چاہتا ہی تو اون کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم یعنی سفید اون لیتا ہی، اور پھر بہت سے ابتدائی مراحل طے کرتا ہی تاکہ اُس پر رنگ چوکھا چڑھے۔ اس سب عمل کے بعد اُسے رنگنا شروع کرتا ہی اور جب اس طرح اون رنگا جائے تو اس کا رنگ پختہ ہوتا ہی اور چاہے بلا صابون کے دھویئے چاہے صابون سے رگڑیے اس رنگ کی چمک کم نہیں ہوتی، اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو نتیجہ ظاہر ہی۔

گ :- ہاں، ورنہ رنگ کچھ عجیب بُری طرح اُتر جاتا ہی۔

میں :- اس سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ ہم اپنے سپاہیوں کے انتخاب اور انھیں ورزش اور موسیقی کی تعلیم دینے میں اس قدر محنت و جانفشانی کیوں کر رہے تھے

ہم چاہتے تھے کہ ان پر قوانین کا رنگ چڑھائیں تاکہ فطری جوہر قابل اور عمدہ تعلیم سے قابل خوف اشیا و نیز دیگر معاملات کے متعلق ان کے خیالات پختہ او اَمٹ ہو جائیں اور یہ رنگ راحت و آرام، الم و تکلیف، خوف و آرزو جیسی رنگ کاٹنے والی چیزوں سے بھی نہ اڑ سکے کہ یہ چیزیں اس امر میں اچھے سے اچھے کھار اور صابون سے زیادہ مؤثر ہوتی ہیں۔ میں اسی قوت کو جو قابل خوف اور ناقابل خوف اشیا کے متعلق صحیح اور آئینی خیالات کو محفوظ رکھتی ہے ہمت اور جرأت سے تعبیر کرتا ہوں اور آپ معترض نہ ہوں تو اسی نام سے اسے موسوم کروں۔

گ:۔ نہیں، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان معاملات کے متعلق صحیح رائے اگر بلا تعلیم کے قائم بھی ہو جائے، جیسے حیوانوں اور غلاموں میں تو آپ اسے جائز متصور نہ فرمائیں گے اور اس کے لیے کوئی اور نام تجویز کریں گے۔

میں:۔ بلا شبہ۔

گ:۔ تو پھر میں ہمت اور جرأت کی یہ تعریف قبول کرتا ہوں۔

میں:۔ کم سے کم شہریوں کی شجاعت و ہمت کی تعریف تو اسی کو سمجھیے کسی آئندہ موقع پر اس معاملہ پر اور تفصیل سے گفتگو کریں گے، اس وقت تو ہمارا اصلی مقصود انصاف کی ماہیت دریافت کرنا ہے اور اس غرض کے لیے ہم نے بس شجاعت و ہمت کی کافی تحقیق کر لی۔

گ :- بیشک آپ کا ارشاد بجا ہی۔

میں :- اب دو چیزیں باقی رہیں جن کا سُراغ ریاست میں لگانا ہی یعنی عفت و ضبط نفس اور دوسرے انصاف جو اس ساری تحقیق کا سبب ہے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اگر ہم عفت کے متعلق پریشان نہ ہوں تو کیا طریقہ ہی کہ انصاف کی حقیقت معلوم کرلیں ؟

گ :- میرے علم میں تو کوئی ایسا طریقہ ہی نہیں اور نہ میں چاہتا ہوں کہ بلا عفت کی حقیقت معلوم کیے انصاف کی ماہیت کا انکشاف ہو جاے۔ لہذا اگر آپ مجھے ممنون کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اسی کو لیجیے۔

میں :- کیوں نہیں، مجھے آپ کی خاطر ضرور منظور ہی۔

گ :- اچھا تو شروع کیجیے۔

میں :- بہت مناسب۔ میرے خیال میں عفت میں بہ نسبت سابقہ صفات کے تناسب و توازن کی شکل زیادہ پائی جاتی ہی۔

گ :- کیسے ؟

میں :- عُرف عام میں عفت شہوات و خواہشات نفسانی پر قابو اور غلبہ کا نام ہی۔ مثلاً لوگ عام بول چال میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو اپنے اوپر کیسا قابو ہی اور اسی قسم کے دوسرے محاوروں میں اس خیال کا اثر جھلکتا ہی۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ لیکن یہ محاورہ "اپنے اوپر قابو ہونا" کیسا تمسخر انگیز ہی جس شخص کو اپنے پر قابو ہی وہ اگر اپنا آقا ہی تو خود ہی غلام بھی ہی اور پھر غلام ہی آقا ہی! کیونکہ ان تمام صفتوں کا مورد تو اسی کی ذات ہی۔

گ :۔ اور کیا۔

میں :۔ میرے خیال میں اس کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہی کہ خود انسان میں یعنی اُس کی روح میں مختلف اجزا ہیں، ایک اچھا اور ایک برا اور جب یہ فطری جزو خیر جزو سو پر غالب ہوتا ہی تو کہتے ہیں کہ انسان کو اپنے اوپر قابو ہی اور ایسا کہنے سے گویا اس شخص کی تعریف مقصود ہوتی ہی لیکن جب ناقص تعلیم یا بُری صحبت کے باعث اس جزو خیر کی قوت اجزا سو کے کثیر التعداد ہونے کی وجہ سے مغلوب ہو جاتی ہی تو ایسے آدمی کو برائی اور ملامت کے الفاظ سے یاد کرتے اور اسے آوارہ اور نفس کا غلام کہتے ہیں۔

گ :۔ ہاں، بات تو قرین قیاس ہی۔

میں :۔ اب اپنی نظر اس نئی ریاست پر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ دو صورتوں میں سے ایک اس میں بھی پائی جاتی ہی اور اگر عفت اور اقتدار علی النفس کے معنی یہی ہیں کہ اچھا جزو برے پر غالب و حاکم ہو تو یقیناً ہماری ریاست کے متعلق کہا جا سکتا ہی کہ اسے اپنے نفس پر قابو ہی۔

گ :۔ جی، میں نے نظر ڈال لی اور آپ کے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔

میں :۔ آپ غالباً یہ بھی مان لیں گے کہ یہ شہوات و آلام اور آرزوئیں جو نت نئی شکل اختیار کرتی ہیں عموماً بچوں، عورتوں، نوکروں، اور برائے نام آزاد شخصوں میں سے بالکل غیر تعلیم یافتہ اور ناتراشیدہ لوگوں میں پائی جائیں گی۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ برخلاف اسکے وہ سادہ اور معتدل خواہشیں جو عقل سلیم اور خیالات صحیحہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور جن کی رہنمائی برابر عقل کرتی رہتی ہے عموماً اس قلیل التعداد گروہ میں پائی جاتی ہیں جنھیں قدرت کی طرف سے بھی بہترین جوہر ودیعت ہوا ہے اور پھر عمدہ تعلیم اس سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ کیا اسی کے مماثل کیفیت ہماری ریاست میں موجود نہیں جہاں کثیر التعداد عوام کی خواہشات پر قلیل التعداد تعلیم یافتہ جماعت کی خواہشیں اور ان کی عقل غالب ہے۔

گ :۔ جی، موجود ہے۔

میں :۔ پس اگر کسی ریاست کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نفس، اپنی شہوات و خواہشات پر قابو رکھتی ہے تو یقیناً ہماری ریاست اس حکم کی مستحق ہے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- یعنی ہم اسے عفیف کہہ سکتے ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- اسی طرح اگر کوئی ریاست ایسی ہو سکتی ہو جس میں حاکم و محکوم اس معاملہ میں ہم آہنگ و ہم نوا ہوں کہ کسے حکومت کرنی چاہیئے تو وہ یقیناً ہماری ریاست ہو گی۔ کیوں، آپ کی کیا رائے ہو؟

گ :- بلاشبہ، آپ کا خیال صحیح ہو۔

میں :- اچھا اب یہ بتائیے کہ یہ عفت کی صفت کس طبقہ میں موجود ہوگی؛ حاکم میں یا محکوم میں؟

گ :- میں سمجھتا ہوں دونوں میں ہوگی۔

میں :- تم نے دیکھا کہ ہم نے اس پیشگوئی میں چنداں غلطی نہ کی تھی کہ عفت ایک قسم کی ہم آہنگی (ایک طرح کا توازن و تناسب) ہو۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- ایسے کہ جس طرح عقل اور شجاعت ریاست کے مخصوص حصوں میں رہ کر اسے عقلمند اور بہادر بناتے ہیں، وہ حال عفت کا نہیں۔ یہ تو تمام ریاست میں جاری و ساری ہو اور آپ کوئی معیار مقرر کیجیے خواہ عقل و دانش، قوت جسمانی، کثرت تعداد یا کثرت مال یا اور کوئی بھی معیار یہ ہر لحاظ سے قوی، ضعیف اور متوسط

طبقوں میں اتحاد عمل کی ضامن ہوتی ہے۔ لہذا ہم بالکل حق بجانب ہوں گے اگر عفت کی تعریف وہ ہمنوائی کریں جسے ہم نے ریاست یا افراد میں حق حکومت کے متعلق اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کی باہمی یک آہنگی اور اتحاد سے تعبیر کیا ہے۔

گ :- میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔

میں :- بظاہر ہم نے اپنی ریاست میں منجملہ چار کے تین اصول دریافت کر لیے ہیں۔ کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ اب وہ چوتھی چیز کیا ہے جو ریاست کی نیکی کو مکمل کردیگی۔ گمان تو یہ ہے کہ غالباً یہ انصاف ہی ہو۔

گ :- بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

میں :- اچھا تو گلاکن ذرا ہوشیار ہو جاؤ اور آؤ شکاریوں کی طرح گھیرا ڈال لیں اور دیکھتے رہیں کہ کہیں انصاف نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ چیز یہیں کہیں ہے بس تاک میں رہو، ممکن ہے تم ہی پہلے دیکھ لو تو پھر مجھے بھی خبر دیدینا۔

گ :- خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن میں بہت ممنون ہونگا اگر آپ مجھے اپنے نقش قدم پر چلنے والا متصور فرمائیں، جو آپ کے پیچھے پیچھے آرہا ہے اور جو کچھ اُسے دکھایا جاسے اُسے دیکھ البتہ لیتا ہے۔

میں :- اچھا بھائی، تو پھر دعا میں میرے شریک ہو اور پیچھے پیچھے چلے آؤ۔

گ :- ہاں ہاں، آپ رہنمائی کیجیے، میں چل رہا ہوں۔

میں :- راہ نہایت دشوار گذار ہی اور ایک دشت ناپیدا کنار حائل ہی ہر چہار طرف ظلمت ہی اور منزل سخت کٹھن، لیکن بہر حال قدم بڑھائے چلنا چاہیے۔

گ :- بیشک

میں :- دیکھو دیکھو، گلاکن، وہ دیکھو، مجھے یہاں کچھ رستہ کا نشان سا معلوم ہوتا ہی؛ اب خدا نے چاہا تو شکار بچکر نہ جائیگا۔

گ :- مبارک ہو۔

میں :- واللہ، ہم لوگ سخت حماقت میں مبتلا ہیں

گ :- یعنی۔

میں :- معلوم ہوتا ہی کہ ہم جس چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ تو خود ہمارے پیروں پر پڑی لوٹ رہی ہی، لیکن ہماری نظر اسپر نہیں پڑتی۔ جیسے اکثر لوگ کسی گم شدہ چیز کی تلاش میں پھرتے ہیں حالانکہ یہ چیز خود اُن کے ہاتھ میں موجود ہوتی ہی، اسی طرح ہم نے بھی اصلی چیز کو دیکھنے کے بجائے اپنی نظر کہاں کہاں دُور دُور پہنچائی اور شاید یہی وجہ ہی کہ ہماری جستجو اب تک بے سود رہی۔

گ :- اسکا کیا مطلب ہی؟

میں :- مطلب کیا ہی، یہ کہ ہم ابھی ابھی اسی چیز کے متعلق باہم گفتگو کر رہے تھے اور بلا سمجھے اور بلا جانے ہم نے خود اس کی تعریف بھی کی۔

گ :- بس خدا کے لیے اس تمہید کو ختم کیجیے، میں آپ کی توضیح سننے کے لیے

جنیاب ہوں ۔

میں :- اچھا تو سنیے اور فرمایئے کہ میں ٹھیک کہتا ہوں کہ نہیں۔ شروع ہی میں ریاست کی بنیاد رکھتے وقت ہم نے جو عام اُصول کا رتجویز کیا تھا وہی خود یا تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ انصاف کی حقیقت ہی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے یہ طے کیا تھا اور بار بار اس کی تکرار بھی کی تھی کہ ہماری ریاست میں ہر فرد کا کوئی ایک کام ہونا چاہیئے جس کے لیے اُسمیں قدرتاً بہترین صلاحیت ہو ۔

گ :- بیشک ، یہ طے کیا تھا۔

میں :- اور ہم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے بھی سُنا ہی خود اپنے کام سے کام رکھنا اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہ کرنا انصاف ہی، بلکہ خود ہم نے یہی بات بارہا کہی ہی۔

گ :- جی ، کہی تو ضرور ہی۔

میں :- گویا یہ معلوم ہوتا ہی کہ کسی شکل سے خود اپنا کام کرنا انصاف ہی۔ آپ سمجھے کہ میں نے اس نتیجہ کا کہاں سے استخراج کیا؟

گ :- نہیں ، میں نہیں سمجھا ۔ مہربانی کرکے بتا دیجیے۔

میں :- اپنی ریاست کی تجزی کرتے ہوے جب ہم نے ان تین صفات یعنی حکمت، شجاعت اور عفت کو علیحدہ کر دیا تو میرے خیال میں چوتھی صفت وہ ہونی چاہیئے تھی جس نے ان تینوں صفات کا ریاست میں پیدا ہونا اور انکا قائم رہنا ممکن

بنایا۔ اور یہ ہم طے ہی کر چکے ہیں کہ اس چوتھی صفت کا نام عدل و انصاف ہوگا۔

گ :- بیشک۔

میں :- اب اگر یہ تصفیہ کرنا ہو کہ ان چاروں صفات میں سے کونسی صفت ریاست کی خوبی کی تکمیل میں سب سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے تو بڑی دشواری کا سامنا ہوگا۔ کیا سب سے اہم چیز حاکم و محکوم کے خیالات کی باہمی یک آہنگی ہے؟ یا اس سے زیادہ اہمیت سپاہ کے وفاداری کے ساتھ اس یقین پر قائم رہنے کو حاصل ہے جو مختلف چیزوں کے قابل خوف یا ناقابل خوف ہونے کے متعلق ان میں پیدا کیا گیا ہے؟ یا حکمراں طبقہ میں عقل و حکمت کا وجود؟ یا پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کہیں ریاست کی تمامتر خوبی اس چوتھے اصول کی رہین منت تو نہیں جسکی وجہ سے ہر زن و مرد، چھوٹا بڑا، عبد و حُر، حاکم و محکوم، یا کاریگر غرض ہر ایک بس اپنے مفوضہ کام میں مشغول رہتا ہے اور دوسری چیزوں میں بیجا مداخلت نہیں کرتا۔

گ :- اس سوال کا جواب تو واقعاً نہایت دشوار ہے۔

میں :- یعنی کم سے کم یہ چوتھا اصول جس کی وجہ سے ہر شخص کا عمل اپنے مفوضہ کام تک محدود ہے اہمیت کے لحاظ سے باقی تین صفات کی ہمسری کر سکتا ہے۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- اگر ایسا ہے تو پھر کیوں نہ اسی کو عدل سے تعبیر کریں؟

گ :- ہاں، ضرور کرنا چاہیے۔

میں :- اچھا، اسی مسئلہ پر دوسری طرح غور کرو۔ پھر دیکھیں کہ یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں؟ اچھا، فرمائیے کہ آپ حکام ریاست کو مقدمات قانونی کا فیصلہ کرنا تفویض کریں گے؟

گ :- بیشک۔

میں :- اور اس فیصلہ کرنے میں انھیں سب سے زیادہ اس امر کا خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی شخص دوسرے کی ملک پر متصرف نہ ہوسکے اور نہ اپنی ذاتی ملک سے محروم کیا جائے۔

گ :- بلا شبہ، یہی تو انکا مخصوص فرض ہوگا۔

میں :- اسی لیے نا کہ یہ طرز عمل عادلانہ اور منصفانہ ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- لہذا اس خیال کے بموجب بھی اپنی مخصوص ذاتی ملک پر تصرف رکھنا اور اپنے مخصوص مفوضہ فرض کو انجام دینا انصاف کا مرادف ہے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اب ذرا غور کیجیے کہ آپ اور میں متفق الرائے ہیں یا نہیں؟ اگر ایک بڑھئی چمار کا کام کرنے لگے یا ایک چمار بڑھئی کا، اور یہ آپس میں ایک دوسرے اوزار بدل لیں اور دوسری خصوصیات بھی ایک دوسرے کی اختیار کرلیں یا یوں ہو کہ ایک ہی شخص دونوں کام کرنے لگے تو کیا اس سے ریاست کا کچھ بہت بڑا نقصان

ہو جائے گا؟

گ :۔ کچھ ایسا شدید نقصان تو نہ ہوگا۔

میں :۔ لیکن اگر کوئی کاریگر یا اہل حرفہ میں سے کوئی شخص اپنی دولت، تعلقات، جسمانی طاقت یا کسی اور وجہ سے اس درجہ اُبھر جائے کہ لگے سپاہ کے کام میں دخل دینے، یا کوئی سپاہی محافظین ریاست کے کام میں دخل دینے لگے درآنحالیکہ اس کی ذرہ بھی صلاحیت نہیں رکھتا، اور پھر یہ لوگ مثال مذکورہ صدر کی طرح اپنے آلات اور خصوصیات تبدیل کر لیں؟ یا اگر ایک ہی شخص ایک ہی وقت میں کئی اہم فرائض ادا کرنے کی کوشش کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی و مداخلت بیچاری ریاست کے لیے سخت تباہی کا باعث ہوگی۔

گ :۔ ہاں، یقیناً ہوگی۔

میں :۔ لہٰذا چونکہ ان تین طبقوں میں باہم مداخلت یا ایک سے دوسرے میں تبدیلی سراسر ریاست کے نقصان کا باعث ہے اس لیے ہم بجا طور پر اسے بالفاظ صریح ایک عمل قبیح سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ اور آپ اس بات کو تو یقیناً تسلیم کرینگے کہ اپنی ریاست کے ساتھ ایسی سخت برائی کرنا بڑی ناانصافی ہے۔

گ :۔ بلاشک۔

س: - اچھا یہ تو نا انصافی ہوئی - اب اس کے برعکس اہل حرفہ، سپاہ، اور محافظین ریاست کا اپنے اپنے مفوضہ فرائض پر قائم رہنا اور صرف اسی کو انجام دینا انصاف ہے اور یہی چیز ریاست میں بھی انصاف کی صفت پیدا کرتی ہے -

گ: - میں اس خیال میں آپ سے حرف بحرف متفق ہوں -

س: - نہیں نہیں، ابھی اسقدر قطعی رائے نہ دینی چاہیئے - ہاں اگر اس خیال کا تطابق انفرادی حالت سے کیا جاسے اور وہاں بھی انصاف کی ماہیت یہی معلوم ہو تو البتہ ہم اسپر صاد کر سکتے ہیں؛ اور اگر ایسا نہوا تو پھر از سر نو تحقیقات کریں گے - فی الحال اسی تحقیق کو جاری رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ شروع ہی اس خیال سے کی گئی تھی کہ اگر ہم پہلے کسی بڑی چیز میں اس انصاف کی صفت کو معلوم کرلیں تو پھر آسانی سے افراد میں بھی اس کا پتہ لگ سکیگا - وہ بڑی چیز ریاست قرار دیگئی چنانچہ ہم نے بہتر سے بہتر ریاست ترتیب دی کہ اس میں عدل و انصاف ضرور پائے جائیں گے - اس طرح جس حقیقت کا نشان ملا ہے اُسے اب فرد پر عائد کیجیئے - اگر مطابقت ہوگئی تو کیا کہنا، اور اگر فرد کچھ مختلف ہوا تو پھر ریاست کیطرف رجوع کرینگے اور اس نظریہ کو دوبارہ آزمائیں گے - ان دونوں کے تصادم سے ممکن ہے وہ روشنی پیدا ہو جس میں عدل چمک اُٹھے اور اس وقت جو نظارہ ہمارے پیش نظر ہوگا اُسے ہم اپنی روح میں پیوست کرلینگے -

گ: - ہاں، یہ تو پھر ہوگا ہی؛ آپ جو کچھ فرماتے ہیں ضرور کیجیئے -

میں :- اچھا، دو چیزیں ہیں، ایک بڑی ایک چھوٹی۔ دونوں کو ایک نام سے پکارتے ہیں، تو جہاں تک ان کے ایک نام سے موسوم ہونے کا تعلق ہے وہ مماثل ہیں یا نہیں؟

گ :- ہیں۔

میں :- تو اگر صرف عدل کا تصور پیش نظر رکھا جائے تو عادل انسان ایک عادل ریاست کا مثل ہوگا۔

گ :- جی ہاں، ہوگا۔

میں :- اور ریاست کو عادل ہم نے اس وقت قرار دیا تھا جب اس کے تینوں طبقے علیحدہ علیحدہ اپنے مفوضہ کام میں مشغول ہوں اور ریاست کا شجاع حکیم اور عفیف ہونا انھیں تین طبقوں کی دیگر صفات و خواص پر منحصر قرار پایا تھا۔

گ :- درست۔

میں :- یہی حال فرد کا بھی ہے۔ ہم فرض کر سکتے ہیں کہ اس کی روح میں بھی وہی تین اصول ہیں جو ریاست میں پائے جاتے ہیں اور چونکہ یہ فرد بھی ان سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے اسلیے اسے بھی جائز طور پر انھیں الفاظ سے بیان کر سکتے ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور لیجیے، پھر ایک آسان سا سوال آن پہنچا، کہ آیا روح میں یہ تین اصول موجود بھی ہیں یا نہیں؟

گ :- آسان سوال ہے! نہیں، یہاں بھی وہ ضرب المثل سچ اُترتی ہے کہ اچھی چیز ہمیشہ دشوار بھی ہوتی ہے۔

میں :- بالکل سچ ہے؛ اور میں نہیں سمجھتا کہ ہم جو طریقہ استعمال کر رہے ہیں، وہ اس سوال کے صحیح حل کے لیے کافی بھی ہے۔ صحیح طریقہ دوسرا ہے اور اس سے زیادہ طویل۔ تاہم اس سے بھی ہم غالباً ایسے نتیجہ پر تو پہنچ ہی جائیں گے جو سابقہ تحقیق کی سطح سے پست نہ ہوگا۔

گ :- تو کیا یہ کافی نہیں؟ بحالت موجودہ میں تو اسپر قانع ہوں۔

میں :- ہاں ہاں، میں بھی مطمئن ہو جاؤنگا۔

گ :- تو پھر اس خیال کے تعاقب میں کمزوری نہ پیدا ہو۔

میں :- کیا ہمیں یہ نہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ اُصول اور عادات جو ریاست میں ہوتی ہیں وہی ہم سب میں بھی پائی جائیں گی۔ اور فرد ہی سے یہ چیزیں ریاست میں پہنچتی ہیں، ورنہ اور کون ذریعہ ہو سکتا ہے؟ مثلاً غصہ یا شجاعت کی صفت لیجیے یہ خیال کس درجہ مسخر انگیز ہوگا کہ یہ صفت جب ریاست میں پائی جاتی ہے تو ان افراد سے حاصل نہیں ہوتی جنمیں یہ واقعاً موجود ہے۔ مثال کے لیے اہل تھریس اہل سیتھیا یا بالعموم تمام شمالی اقوام کو دیکھ سکتے ہیں؛ یہی حال حبِّ علم کا ہے جو ہمارے ملک کا خاص شیوہ ہے یا حبِّ زر کا جو اہل مصر و فونیقیا کے ساتھ وابستہ کیجاتی ہے۔

گ :- بالکل درست۔

میں :۔ اس کے سمجھنے میں تو کوئی دقت نہیں۔

گ :۔ مطلق نہیں۔

میں :۔ لیکن جب سوال یہ ہو کہ یہ اُصول تین ہی ہیں یا صرف ایک تو مسئلہ اسقدر آسان نہیں رہتا یعنی کیا ہم اپنی طبیعت کے ایک حصہ سے علم حاصل کرتے ایک سے غصہ اور خفگی کرتے، اور تیسرے سے اپنی شہوات طبعی کی تسکین کے آرزومند ہوتے ہیں؟ یا ہر قسم کے کام میں پوری روح عمل کرتی ہے؟ اصل مشکل تو اس بات کے فیصلہ میں ہے۔

گ :۔ بیشک، مشکل تو یہی ہے۔

میں :۔ اچھا تو کوشش کر کے اب یہ معلوم کریں کہ یہ اصول ایک ہی ہے یا مختلف۔

گ :۔ یہ معلوم کیسے ہو؟

میں :۔ ایسے :۔ ظاہر ہے کہ کوئی چیز اپنے ایک ہی حصہ میں ایک وقت اور ایک ہی چیز کے تعلق میں دو متضاد طریقوں سے عامل یا معمول نہیں ہو سکتی چنانچہ جب کبھی ان چیزوں میں یہ تضاد واقع ہوتا ہے جو بظاہر ایک معلوم ہوتے ہیں تو ہم جان لیتے ہیں کہ یہ دراصل ایک نہیں مختلف چیزیں ہیں۔

گ :۔ درست۔

میں :۔ مثلاً کیا کوئی چیز ایک وقت اور اپنے ایک ہی حصہ میں ساکن اور متحرک دونوں ہو سکتی ہے؟

گ:- ناممکن۔

میں:- پھر بھی اچھا یہی ہو کہ ان الفاظ کے معنی کو زیادہ متعین کر لیا جائے
مبادی ہم بعد کو بھٹک جائیں۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کرو جو کھڑا ہی اور ساتھ ہی
اپنا سر اور اپنے ہاتھ ہلا رہا ہی۔ ایک شخص کہہ سکتا ہی کہ ایک ہی آدمی ایک وقت
میں ساکن بھی ہی متحرک بھی۔ اس کا جواب ہم یہ دیں گے کہ اس کا ایک حصہ متحرک
ہی اور ایک حصہ ساکن۔

گ:- بہت بجا۔

میں:- معترض اگر اور موشگافی کرے اور کہے کہ جب لٹو اپنی کیل پر چکر کرتا
ہی تو تو اس کا کوئی حصہ ہی نہیں بلکہ پورا کا پورا لٹو ایک ہی وقت میں ساکن بھی
ہوتا ہی اور متحرک بھی (اور وہ یہی بات ہر اس چیز کے متعلق کہہ سکتا ہی جو ایک نقطہ
پر گردش کرتی ہو) تو ہم اس اعتراض کو بھی تسلیم نہ کریں گے۔ اس لیے کہ ان صورتوں
میں حرکت اور سکون دونوں اس چیز کے ایک ہی حصہ میں نہیں پائے جاتے ہیں
ان چیزوں میں ایک محور ہوتا ہی ایک قطر۔ محور تو ساکن کھڑا رہتا ہی اس لیے کہ وہ
اپنے زاویہ قائمہ سے انحراف نہیں کرتا اور قطر چکر کاٹتا ہی، اور اگر گردش میں محور بھی
دائیں بائیں، آگے پیچھے جھک جائے تو پھر کسی اعتبار سے اس جسم میں سکون باقی
نہیں رہتا۔

گ:- جی ہاں، ان مختلف کیفیات کے بیان کرنے کا یہی صحیح طریقہ ہی۔

میں :- تو ہم ان اعتراضوں سے پریشان نہ ہوں گے، نہ اس بات کو باور کرینگے کہ کسی چیز کا ایک ہی حصہ ایک ہی وقت میں اور ایک ہی چیز کے تعلق میں دو متضاد طریقوں سے عامل یا معمول ہو سکتا ہے۔

گ :- میرے خیال کے مطابق تو یقیناً نہیں ہو سکتا۔

میں :- پھر بھی اس خیال سے کہ کہیں ہم اس قسم کے اعتراضات کی تحقیق پر مجبور نہ ہوں اور طول طویل مفصل بحث کے بعد انکا ابطال کریں ہم انکا مہمل ہونا فرض کیے لیتے ہیں اور اس باہمی سمجھوتے پر آگے چلتے ہیں کہ اگر کہیں یہ مفروضہ بالآخر غلط ثابت ہو گیا تو ہم تمام ان نتائج کو جو اس سے منتج ہوئے ہیں واپس لے لیں گے۔

گ :- جی ہاں، یہ بہترین صورت ہے۔

میں :- اچھا، کیا قبول ورد، خواہش و تنفر، جذب و دفاع سب کے سب متضاد نہیں، خواہ معروف حیثیت سے لو یا مجہول، کہ اس سے انکے متضاد ہونے پر تو کوئی اثر پڑتا نہیں۔

گ :- جی ہاں، یہ سب متضاد ہیں۔

میں :- اچھا تو بھوک، پیاس اور عام طور پر تمام خواہشات، نیز ارادہ و آرزو ان سب کو مذکورۂ بالا کیفیات کی قسم اول ہی سے تو متعلق کریں گے۔ کیوں ہی کہیں گے نا کہ روح شئے مطلوب کی متلاشی ہوتی ہے، یا جس چیز کی تملیک کی آسے خواہش ہے، اسے اپنی طرف کھینچنا چاہتی۔ یا جب کوئی شخص چاہتا ہے کہ یہ چیز مجھے

دی جائے۔ تو اُس کی روح اس خواہش کو پورا کرنے کی آرزو میں اپنی خواہش کا اظہار اپنے سر کو حرکت دے دیگی اس طرح کرتی ہو گو یا اس سے کوئی سوال کیا گیا تھا اور اسنے اُسے قبول کیا۔

گ:۔ بہت ٹھیک۔

میں:۔ اور نارضامندی، تنفر اور فقدان خواہش کے متعلق کیا کہیگا؟ کیا انھیں رد و دفاع کی متضاد تقسیم میں نہ رکھیگا؟

گ:۔ بیشک۔

میں:۔ عام طور پر تو خواہشات کے متعلق اس بیان کو صحیح تسلیم کرلیں اور آؤ اب ان خواہشوں کی ایک خاص تقسیم کریں اور ان میں بھوک اور پیاس کو لیں کہ یہ سب سے زیادہ ظاہر اور معروف خواہشیں ہیں۔

گ:۔ اچھا، انھیں کو لیجیے۔

میں:۔ ایک کا مقصد کھانا ہی، دوسرے کا پینا۔

گ:۔ جی۔

میں:۔ اور یہیں ایک نکتہ پیدا ہوتا ہی۔ یعنی کیا پیاس روح کی پینے کی اور محض پینے کی آرزو کا نام نہیں۔ یعنی پینے کے ساتھ کوئی اور صفت نہیں لگی ہی، مثلاً گرم یا سرد، زیادہ یا کم، یعنی کسی خاص قسم کا پینا۔ اگر پیاس کے ساتھ گرمی شامل ہو تو خواہش سرد چیز پینے کی ہوگی، اور سردی شامل ہو تو گرم چیز کی۔ اگر

پیاس شدید ہو تو زیادہ پینے کی اور شدید نہیں تو کم کی۔ لیکن خالص پیاس ہی تو محض پینے کی خواہش ہوگی اور کچھ نہیں۔ کہ اسی سے پیاس کی قدرتی تسکین ہوتی ہے جس طرح کھانے سے بھوک کی۔

گ:۔ سادہ خواہش تو سادہ چیز کی ہوتی ہے، اور اگر خواہش کسی صفت سے متصف ہو تو جس چیز کی خواہش ہے وہ بھی متصف ہوگی۔

میں:۔ لیکن اس جگہ ذرا پراگندگی پیدا ہو سکتی ہے اس مخالف کے مقابلہ میں بھی تو بحث کرنی ہے جو ابھی کھڑا ہو کر کہنے لگے کہ کوئی انسان صرف 'پینا' نہیں چاہتا بلکہ اچھی چیز پینا چاہتا ہے۔ کوئی بھی محض غذا نہیں چاہتا بلکہ عمدہ غذا۔ کیونکہ خوبی وعمدگی تو خواہش وطلب کا مورد عام ہے اور پیاس چونکہ ایک خواہش وطلب ہے اس لئے لازماً اچھی چیز کے پینے کی خواہش ہوگی۔ یہی حال اور تمام خواہشات کا ہے

گ:۔ ہاں، مخالف کو کچھ کہنے کی گنجائش تو ضرور ہے۔

میں:۔ تاہم میں اس بات پر قائم ہوں کہ جہاں دو چیزیں باہم اعتباراً و اضافتاً متعلق ہوں تو بعض وقت تو اس علاقہ کے دونوں حصوں کے ساتھ کوئی صفت لگی ہوتی ہے اور بعض میں دونوں سادہ اور بلا کسی صفت کے ہوتے ہیں۔

گ:۔ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

میں:۔ آپ یہ تو جانتے ہیں کہ بڑا، اعتباراً و اضافتاً متعلق ہے چھوٹے سے؟

گ:۔ جی ہاں۔

میں :۔ اور "بہت زیادہ" "بہت کم" سے ؟

گ :۔ جی۔

میں :۔ اور "جو کبھی بڑا تھا" "جو کبھی چھوٹا تھا" سے اسی طرح "آئندہ بڑا ہونیوالا" "آیندہ چھوٹا ہونیوالے" سے۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ یہی حال زیادہ اور کم اور دوسرے نسبتی اور لازم وملزوم کلمات کا ہے مثلاً دوچند اور نصف، بھاری اور ہلکا، تیز اور سُست، گرم اور سرد، یا اور کوئی اسی قسم کے الفاظ۔ کیوں کہ یہ بیان ان سب کے متعلق صحیح نہیں اُترتا؟

گ :۔ جی ہاں اُترتا ہے۔

میں :۔ اور کیا یہی اُصول حکمیات پر عائد نہیں ہوتا؟ حکمت کا مقصد ہے علم (اگر اسے صحیح تعریف فرض کرلیں) لیکن کسی خاص حکمت کا مقصد کسی خاص قسم کا علم ہے۔ مثلاً مکانات بنانے کی حکمت ایک ایسا علم ہے جو دوسرے اقسام علم سے علیحدہ اور ممتاز ہے۔ اور اس لیے اسے تعمیرات کہتے ہیں۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ اس لیے کہ اس میں ایک خاص صفت ہے جو دوسرے علوم میں نہیں۔

گ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ اور یہ مخصوص صفت اس میں اس لیے ہے کہ اسکا ایک خاص مقصد اور

ایک خاص موضوع ہے۔ یہی بات دوسرے علوم و فنون کے متعلق بھی سچ ہے۔

گ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اگر میں نے اپنے مفہوم کو واضح کر دیا ہے تو اب آپ میرے اصلی مطلب کو سمجھ لیں گے کہ میں نے نسبۃً لازم و ملزوم کلمات کے متعلق کیا کہا تھا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اگر ایسے کسی علاقہ کے ایک لفظ کو تنہا اور سادہ رکھو تو دوسرا بھی تنہا اور سادہ ہوگا۔ اگر ایک کے ساتھ کوئی صفت ہو دوسرے کے ساتھ بھی کوئی صفت ہوگی، میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ لازم و ملزوم کی صفت ایک ہی ہو یعنی تندرستی کا علم تندرست اور مرض کا علم لازماً مریض ہے، یا خیر و شر کے علوم اسی وجہ سے اچھے اور برے ہیں۔ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب لفظ "حکمت" یا "علم" بجائے خود مطلقاً استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس کے موضوع کے ساتھ کوئی صفت لگی ہو مثلاً اس جگہ ماہیت صحت و مرض تو اس سے وہ حکمت متعین و معرف ہو جاتی ہے اور اسے صرف علم و حکمت نہیں کہتے بلکہ علم طب کہتے ہیں۔

گ:۔ میں اب اچھی طرح سمجھ گیا اور میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں:۔ تو کیا پیاس اصلاً اسی قسم کا اضافی و اعتباری لفظ نہیں جس کا بین علاقہ...

گ:۔ ہاں، پیاس کا علاقہ پینے کے ساتھ ہے۔

میں:۔ کسی خاص قسم کی پیاس خاص قسم کے پینے سے علاقہ رکھتی ہے لیکن اگر محض پیاس کو لیں تو وہ نہ زیادہ ہے نہ کم، نہ اچھی ہے نہ بری، نہ کسی خاص قسم کی چیز پینے کی بلکہ محض

پینے کی۔

گ :- بیشک۔

میں :- پیاسے کی روح، جہانتک پیاس کا تعلق ہے صرف پینا چاہتی ہے، اسی کی متلاشی ہوتی اور اسی کے حصول کی کوشش کرتی ہے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- اب کوئی ایسی چیز فرض کیجیے جو پیاسی روح کو پینے سے دور کھینچتی ہو تو یہ چیز اس پیاس سے مختلف ہو گی جو اسے جانور کی طرح پینے کی طرف کھینچ رہی ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں کوئی چیز ایک ہی وقت میں اپنے اسی حصہ سے اسی چیز پر دو متضاد طریقوں سے عمل نہیں کر سکتی۔

گ :- ہاں، یہ تو ناممکن ہے۔

میں :- جیسے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تیرانداز کے دونو ہاتھ ایک ہی وقت میں کمان کو اپنی طرف بھی کھینچتے ہیں اور اپنے سے دور بھی کرتے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ہاتھ سے کمان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسرے سے اُسے دور کرتا ہے۔

گ :- بالکل درست۔

میں :- کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی پیاسا ہو اور پھر بھی پینا نہ چاہے؟

گ :- ہاں، اکثر ایسا ہوتا ہے۔

میں :- تو ایسی حالت میں پھر آپ کیا کہیں گے؟ یہی نا کہ روح میں ایک چیز ہے جو

پینے کا حکم دیتی ہے، اور ایک دوسری چیز ہے جو اس سے منع کرتی ہے، اور یہ دوسری قوت ترغیب شرب دینے والی سے مختلف اور قوی تر ہے؟

گ :- جی ہاں، یہی کہوں گا۔

میں :- منع کرنے والی قوت عقل سے مشتق ہے اور رغبت دلانے والی طاقت جذبہ اور مرض سے پیدا ہوتی ہے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- یعنی ہم بجا طور پر فرض کر سکتے ہیں کہ یہاں دو مختلف قوتیں ہیں جس سے انسان تعلیل و توجیہ کرتا ہے اسے روح کا اصول عقلی کہتے ہیں، دوسرے کو جس سے آدمی محبت کرتا، بھوکا پیاسا ہوتا، یا کسی دوسری خواہش کی تحریک محسوس کرتا ہے غیر عقلی یا اشتہائی اصول کہہ سکتے ہیں، اور مؤخر الذکر مختلف لذات اور انکی تکمیل و تسکین کا معاون ہوتا ہے۔

گ :- جی ہاں، ہم جائز طور پر انہیں مختلف قرار دے سکتے ہیں۔

میں :- اچھا تو پھر قطعی طور پر تسلیم کر لیں کہ روح میں دو اصول (قوتیں) ہوتے ہیں اور ہاں جذبہ اور غصہ؟ کیا یہ کوئی تیسرا اصول ہے، یا انہیں مذکورہ اصول میں کسی سے ملتا جلتا ہے؟

گ :- میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ خواہشات سے ملتا جلتا ہے۔

میں :- مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ ایک قصہ سنا تھا اور میں تو

بھائی سے سچ بھی مانتا ہوں۔ "قصہ یہ تھا کہ اگلائیون (Aglaion) کا بیٹا لیونٹی اس (Leontius) ایک دن پیرے اس (Piraeus) سے واپس آتا تھا، شمالی فصیل کے باہر کی طرف مقتل میں اُسے کچھ لاشیں زمین پر پڑی دکھائی دیں۔ اسکے جی میں خواہش پیدا ہوئی کہ انھیں دیکھے، مگر ساتھ ہی کچھ نفرت اور خوف کا احساس بھی ہوا تھوڑی دیر تک یہ اندرونی کشمکش جاری رہی اور اسنے اپنی آنکھیں ہاتھوں سے ڈھانپ لیں، لیکن بالآخر اس سے نہ رہا گیا، دیکھنے کی خواہش غالب آئی، چنانچہ آنکھوں کو خوب زور سے پھاڑ کر یہ لاشوں کی طرف یہ کہتا ہوا دوڑا: "لو دیکھ لو، کمبختو! اب جی بھر کر اس دلفریب نظارہ کا تماشہ کرلو۔"

گ :- میں نے خود یہ قصہ سنا ہی۔

میں :- اس قصہ سے یہ سبق ملتا ہی کہ کبھی کبھی غصہ خواہش سے اس طرح برسرپیکار ہوتا ہی گویا یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔

گ :- جی ہاں، اس کا یہی مطلب ہی۔

میں :- اسکے علاوہ بھی آپ نے بہتیری ایسی صورتیں دیکھی ہونگی جنمیں انسان کی خواہشات بجبر اس کی عقل پر غالب آجاتی ہیں، تو پھر وہ اپنے کو ملامت کرتا اور اس اندرونی جبر و تشدد پر خفا ہوتا ہی اور اس کشمکش میں جس کی مثال ایک ریاست کے مختلف مخالف گروہوں کی کشاکش کی سی ہی اس کی دلیری (Spirit) عقل کی طرفدار ہوتی ہی۔ لیکن غالباً تم نے نہ تو خود اپنی ذات میں دیکھا ہوگا نہ کسی اور میں کہ جب

عقل نے ایک دفعہ فیصلہ کر دیا کہ میری مخالفت نہ کیجائے تو اسکے بعد نفس لوامہ (SPIRIT) نے خواہشات کا ساتھ دیا ہو۔

گ :۔ ہرگز نہیں۔

میں :۔ فرض کیجیئے ایک شخص کو احساس ہو کہ وہ غلطی پر ہے، تو اس کی فطرت جسقدر شریف ہو گی اُسی قدر وہ ان تکالیف (مثلاً بھوک، پیاس، سردی وغیرہ) پر کم غصہ محسوس کریگا، جو شخص مجروح نے اُس پر ڈالی ہوں۔ یہ تو ان سزاوں کو جائز تصور کرتا ہے اور اسی لیے اس کا غصہ اپنے متحرک ہونے سے انکار کرتا ہے۔

گ :۔ سچ ہے۔

میں :۔ لیکن جب وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کے ساتھ بُرائی کی گئی ہے تو وہ غصے سے پیچ و تاب کھانے لگتا ہے، اب یہ اپنے کو حق بجانب جانتا ہے، چنانچہ بھوک پیاس، سردی وغیرہ کی تکلیفیں برداشت کرکے اس میں عزم و استقلال و فتح حاصل کرنیکا جذبہ اور بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کی شریف فطرت اسوقت تک ٹھنڈی نہیں پڑتی جب تک یا تو دشمن کو قتل نہ کردے یا خود قتل نہ ہو جائے یا پھر یہ ہو کہ اپنے پاسبان گڈریے یعنی عقل کی آواز نہ سُنائی دیجائے کہ "بس کتے بس اب زیادہ مت بھونک"؟

گ :۔ خوب، یہ تو نہایت کامل تمثیل ہے۔ ہم تو کہہ ہی رہے تھے کہ ہماری ریاست میں معاونین گتے ہوں گے اور حکام کی آواز سُنیں گے جو بمنزلہ گڈریوں کے ہونگے۔

میں :- میں دیکھتا ہوں کہ آپ نے میرا مفہوم پوری طرح سمجھ لیا ہے لیکن ہاں ایک نکتہ اور ہے جس پر میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا غور کریں۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- آپ کو یاد ہوگا کہ پہلے پہل جذبہ اور نفس لوامہ (SPRIT) خواہشات کی قسم معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اب تو ہم اس کے بالکل خلاف کہیں گے۔ کیونکہ روح کی کشاکش میں نفس لوامہ (SPRIT) اصول عقلی کا جانبدار رہتا ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- لیکن ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے یعنی کیا جذبہ عقل سے مختلف ہے؟ یا اسی کی ایک قسم؟ بحالت ثانی روح میں بجائے تین قوتوں کے دو ہی ہوں گی یعنی قوت عقلی و قوت اشتہائی۔ یا یوں ہے کہ جیسے ریاست میں تین طبقے تھے یعنی تاجر، معاون، اور مشیر۔ اسی طرح فرد کی روح میں بھی ایک تیسرا عنصر ہے یعنی نفس لوامہ (SPRIT) اور اگر بری تعلیم اسے خراب نہ کر ڈالے تو یہ فطرتاً عقل کا معاون ہوتا ہے۔

گ :- ہاں، اسے تو ایک تیسرا اصول ہونا چاہیئے۔

میں :- ہاں، بشرطیکہ جس طرح یہ خواہشات سے مختلف ثابت ہو چکا ہے، اسی طرح عقل سے بھی مختلف ثابت ہو جائے۔

گ :- یہ تو آسانی سے ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچوں میں نفس لوامہ (SPRIT) تو پیدائش کے وقت سے ہی موجود ہوتا ہے، لیکن ان میں سے اکثر کو

عقل کا استعمال کافی دیر میں آتا ہے اور بعض کو تو کبھی آتا ہی نہیں۔

میں :۔ بہت خوب۔ اور یہ تو آپ وحشی جانوروں میں بھی دیکھ سکتے ہیں جو آپ کی بیان کی صداقت کا مزید ثبوت ہے۔ ہم پہلے بھی اس کا ذکر کر چکے ہیں، اور اب پھر ھومر کے یہ الفاظ پیش کرتے ہیں کہ "وہ اسنے اپنا سینہ پیٹا اور اپنے غضبناک نفس کو ملامت کی" کیونکہ اس مصرعہ میں ھومر نے صاف طور پر اس قوت کے وجود کو تسلیم کیا ہے جو برے بھلے کی تمیز کرتی ہے اور اسے اس غیر عقلی غصہ سے مختلف مانا ہے جسے یہ (عقل) ملامت کرتی ہے۔

گ :۔ بہت درست۔

میں :۔ خدا کا شکر ہے کہ موجوں کے تھپیڑے کھانے کے بعد ہم بالآخر ساحل پر آن لگے اور اس بات پر متفق ہو گئے کہ جو اصول ریاست میں ہوتے ہیں وہی فرد میں بھی ہوتے ہیں اور ان کی تعداد تین ہے۔

گ :۔ جی۔

میں :۔ کیا اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ فرد بھی اسی طرح اور اسی صفت کے باعث عقلمند و حکیم ہوتا ہے جیسے ریاست۔

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ جو صفت ریاست میں شجاعت کا باعث ہے وہی فرد کی شجاعت کا سبب ہے اور فرد اور ریاست کا علاقہ دیگر محاسن میں بھی یکساں ہے۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- اور ہم فرد کو بھی اسی طرح عادل تسلیم کرینگے جیسے ریاست کو کیا تھا؟

گ :- لامحالہ۔

میں :- خوب یاد ہوگا کہ ریاست کا عدل تو یہ تھا کہ تینوں طبقے اپنا اپنا کام انجام دیتے رہیں۔

گ :- اسے بھولنا تو بہت مشکل ہے۔

میں :- اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیئے کہ وہ فرد عادل ہوگا جس کی طبیعت کی مختلف صفات اپنا اپنا کام کریں اور وہ خود بھی اپنا مفوضہ کام انجام دے۔

گ :- جی ہاں، یہ بھی ضرور یاد رکھنا چاہیئے۔

میں :- پھر کیا یہاں بھی اصول عقلی کو حکومت نہ کرنی چاہیئے کہ یہ حکیم ہے اور روح کی نگرانی اسی کے سپرد ہے اور عنصر نفس کو اس کا ماتحت اور معاون ہونا چاہیئے

گ :- بیشک۔

میں :- اور جیسے ہم کہہ رہے تھے موسیقی اور ورزش کا متحدہ اثر انہیں اتحاد و یگانگت پیدا کردیگا۔ اچھے اچھے اقوال اور اسباق سے عقل کی نشو و نما اور تقویت ہوگی اور ہم آہنگی اور اوزان سے نفس کی وحشت میں اعتدال، نرمی اور تہذیب پیدا ہو جائیگی۔

گ :- بالکل بجا۔

میں :- جب ان دونوں کی نشو و نما اور تعلیم ہو چکے گی اور یہ اپنے اپنے وظائف سے آشنا ہو جائیں گے تو پھر یہی اس اصول اشتہائیہ پر حکومت کرینگے جس پر ہم سب کی روحوں کا سب سے بڑا حصہ مشتمل ہے اور جو بالطبع سیر نہیں ہوتا۔ یہ دونوں اس پر نگراں رہیں گے تاکہ کہیں لذات جسمانی کی کثرت سے پھول کر اور اپنے قوت حاصل کرکے یہ اصول اشتہائیہ اپنے حقیقی حیطۂ اثر سے تجاوز نہ کرنے پائے اور لگے ان اجزائے روح پر اپنا تسلط جمانے اور انھیں اپنا حلقہ بگوش بنانے جو طبعی طور پر اس کے ماتحت نہیں اور اس طرح حیات انسانی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

گ :- نہایت درست۔

میں :- یہ دونوں ملکر کیا خارجی حملوں سے کل روح اور کل جسم کے بہترین محافظ نہ ہوں گے؟ ایک مشورہ دیگا، دوسرا اس کی قیادت میں لڑیگا، اور شجاعت کے ساتھ اُس کے احکام اور مشوروں کی بجا آوری کریگا۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور شجاع اسے سمجھنا چاہیے جس کا نفس لوامہ (SPRIT) لذت والم، خوشی اور رنج میں عقل کے اُن احکام پر قائم رہ سکے کہ کس چیز سے ڈرنا چاہیے اور کس سے نہیں!

گ :- بجا۔

میں :- حکیم اور عقلمند اُسے کہیں گے جس میں یہ چھوٹا سا عنصر موجود ہو، جو

حکومت کرتا اور احکام دیتا ہے۔ یہ بات پہلے سے فرض کرلی گئی ہے کہ یہ حصہ تینوں اجزا اور نیز کل کے اغراض و مقاصد سے بخوبی واقف ہے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- پھر کیا عفیف اسے نہ کہوگے جسمیں یہ سب عناصر باہم دوستانہ یک آہنگی رکھتے ہیں، جسمیں عقل کا حکمراں عنصر اور نفس (لوامہ) اور خواہشات کے ماتحت عناصر یکساں اس امر پر متفق ہیں کہ عقل کو حکومت کرنی چاہیے اور اس کے خلاف بغاوت بھی نہیں کرتے۔

گ :- بیشک ریاست اور فرد دونوں میں عفت کی اصلی کیفیت یہی ہے۔

میں :- اور اس کی تشریح تو ہم بار بار کرچکے ہیں کہ ایک انسان کس طرح اور کس صفت کی وجہ سے عادل ہوتا ہے!

گ :- جی۔

میں :- کیا فرد میں عدل کچھ دھندلا اور کم روشن ہے اور یہاں بھی اسکی ماہیت وہی ہے جو ریاست میں تھی یا کچھ مختلف؟

گ :- میرے خیال میں تو کوئی اختلاف نہیں۔

میں :- میں نے اسلیئے پوچھا کہ اگر اب بھی ہمارے ذہن میں اس کی بابت کچھ شبہات باقی ہوں تو چند روزمرہ کی عام مثالوں سے میرے بیان کی تصدیق ہوجائے گی۔

گ :- کیسی مثالیں؟

میں :- مثلاً اگر ہمارے سامنے یہ معاملہ پیش ہو تو کیا ہم یہ تسلیم نہ کرینگے کہ ایک عادل ریاست یا ایک ایسا شخص جس کی تربیت ایسی ریاست کے اصولوں میں ہوئی ہو اس میں بمقابلہ ایک غیر منصف شخص کے سونے چاندی کی ایک امانت کو اڑانے کے کم امکانات ہیں۔ کیوں کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے؟

گ :- کوئی نہیں۔

میں :- کیا ایک عادل انسان یا شہری کبھی اہانت مذہب یا سرقہ کا مرتکب ہو سکتا ہے یا اپنے دوست یا ملک کے ساتھ دغا بازی اور غداری کر سکتا ہے؟

گ :- کبھی نہیں۔

میں :- کبھی اپنی قسم اور عہد توڑ سکتا ہے؟

گ :- ناممکن۔

میں :- ارتکاب زنا، اہانت الدین، فرائض دینی کی نافرمانی، کا جتنا کم احتمال اس شخص سے ہے اور کسی سے نہ ہوگا۔

گ :- جی، کبھی نہیں۔

میں :- وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کا ہر جزو اپنا کام انجام دے رہا ہے، چاہے یہ کام حکومت ہو یا محکومی۔

گ :- بیشک۔

میں :- کیا آپ اس بیان سے مطمئن ہیں کہ جو صفت ایسے افراد اور ایسی جماعتوں کو وجود میں لاتی ہے اسی کا نام عدل ہے؛ یا آپ کسی اور انکشاف کی اُمید رکھتے ہیں؟

گ :- نہیں، مجھے تو کوئی اور اُمید نہیں۔

میں :- اچھا تو ہمارا خواب پورا ہوا۔ اور اس تعمیر کے آغاز میں ہمیں جو شبہ ہوا تھا کہ عدل کی اصلی صورت تک کسی الٰہی قوت نے ہمیں پہنچایا ہے، اس کی اب تصدیق ہو گئی۔

گ :- جی ہاں، بیشک۔

میں :- اور وہ تقسیم عمل جس کی رو سے بڑھئی، موچی، اور دوسرے اہل حرفہ سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنا اپنا کام دیکھیں دوسرے کے کام میں دخل نہ دیں، دراصل عدل کا ایک سایہ تھا، اور اسی لیے بہت کار آمد ثابت ہوا۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- لیکن درحقیقت عدل کو انسان کے ظاہر سے سروکار نہیں باطن سے ہے کہ یہی انسان کی اصلی اور اس کی حقیقی غایت ہے۔ عادل آدمی اپنے مختلف اندرونی عناصر کو ایک دوسرے میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا؛ نہ ایک کو دوسرے کا کام کرنے دیتا ہے۔ وہ اپنی باطنی زندگی کو منضبط کر لیتا ہے۔ خود اپنا آقا ہوتا ہے، خود ہی اپنے لیے قانون بنا لیتا ہے، اور اپنی ذات سے برسرپیکار نہیں ہوتا، بلکہ صلح و سلامتی کے ساتھ رہتا ہے۔ جب یہ اس طرح اپنی روح کے تینوں اصول کو (جو بمنزلہ اونچے نیچے اور

متوسط مقامات صوت اور ان کے درمیانی فصل کے ہیں، باہم متحد کر لیتا ہے اور جب کثرت باقی نہیں رہتی بلکہ ایک معتدل اور منضبط طبیعت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر بوقت ضرورت یہ عمل کی طرف اپنا قدم اُٹھاتا ہے، خواہ یہ عمل املاک کے بارے میں ہو یا جسم کے علاج کے متعلق یا کوئی سیاسی یا خانگی معاملہ۔ جو چیز اس متناسب اور یک آہنگ کیفیت کو قائم رکھے یا اس میں ممد ہو اسے یہ نیک اور عادلانہ سمجھیگا بھی اور کہیگا بھی جو علم اس عمل خیر کا باعث ہو اسے حکمت و عقل سے تعبیر کریگا، جو عمل اس کیفیت میں حائج ہو اُسے غیر عادلانہ قرار دیگا اور جو رائے و قیاس اس کی وجہ ہو گی اُسے جہل۔

گ :- آپ نے بالکل ٹھیک حقیقت کا اظہار فرما دیا۔

میں :- بہت خوب۔ تو اگر ہم اب یہ دعویٰ کریں کہ ہم نے عادل انسان اور عادل ریاست کا پتہ چلا لیا اور ان دونوں میں عدل کی ماہیت بھی دریافت کر لی تو غالباً ہم دروغ بیانی کے مرتکب نہ ہونگے ؟

گ :- یقیناً نہیں۔

میں :- تو پھر کیا ہم یہ دعویٰ کریں ؟

گ :- ہاں ہاں، کیوں نہیں۔

میں :- اچھا تو اب نا انصافی پر غور کرنا باقی رہا۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- نا انصافی ان تینوں اصولوں میں کشمکش اور پیکار کی حالت ہوگی ہردم مداخلت بیجا، ہر لحظہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہوتا، روح کے ایک جزو کا کل کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا، ناجائز و ناروا اختیار کا دعویٰ جو باغی رعایا اپنے حقیقی بادشاہ کے خلاف کرتی ہے اگرچہ قدرتاً اس کی باج گذار ہے۔ یہ تمام پراگندگی اور فریب کیا ہے اگر نا انصافی، بے عفتی، بزدلی، جہل اور شر کی شکلیں نہیں

گ :- یقیناً۔

میں :- اگر عدل و نا انصافی کی ماہیت معلوم ہو تو غیر منصفانہ عمل کرنے اور غیر منصف ہونے یا منصفانہ عمل کرنے کے معنی بالکل صاف ہونگے۔

گ :- آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :- ان کی مثال صحت و مرض کی سی ہے۔ روح میں ان کی حیثیت وہی ہے جو جسم میں صحت و مرض کی۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- جو صحیح ہے وہ صحت کا باعث بھی ہوتا ہے، جو مریض ہے وہ مرض پیدا کرتا ہے۔

گ :- جی۔

میں :- عادلانہ اعمال عدل کے باعث ہیں اور غیر عادلانہ نا انصافی کے۔

گ :- یہ تو یقینی ہے۔

میں :- اور صحت پیدا کرنے کے معنی ہیں اجزائے جسم میں فطری نظام حکومت کا قائم کر دینا۔ مرض نام ہے اس فطری نظام سے متغائر حالات کے پیدا ہونیکا۔

گ :- درست۔

میں :- اسی طرح کیا عدل اجزائے روح میں ایک فطری نظام حکومت کے قیام کا نام نہیں اور کیا ناانصافی اس فطری نظام کے مخالف صورت حالات کے پیدا ہونے کو نہیں کہتے ؟

گ :- بیشک۔

میں :- لہذا نیکی و خیر روح کی صحت، اسکی فلاح، اور اس کا حسن ہے برائی اور شر اس کا مرض، اس کی کمزوری اور بدصورتی ہے۔

گ :- درست۔

میں :- اور کیا اعمال صالحہ نیکی کیطرف اور اعمال سیئہ برائی کی طرف نہیں لے جاتے ؟

گ :- یقیناً۔

میں :- اب تک عدل اور ناانصافی کے اعتباری فوائد کے پرانے سوال کا جواب نہیں ہوا۔ عادل بننا، عادلانہ اعمال کرنا، نیکی پہ کاربند ہونا خواہ دیوتا اور انسان دیکھیں یا نہ دیکھیں یہ زیادہ سود مند ہے یا غیر منصف ہونا اور غیر منصفانہ اعمال کرنا بشرطیکہ اصلاح و تادیب ہو۔

گ:۔ میری رائے میں تو یہ سوال اب کچھ مضحکہ خیز سا ہو گیا ہی۔ ہم جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کا نظام جسمانی بگڑ جاتا ہی تو زندگی دو بھر ہو جاتی ہی چاہے پھر اسے طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزوں سے کتنا ہی پُر کرو اور خواہ کتنی ہی دولت اور قوت پاس کیوں نہ ہو۔ تو کیا یہ ممکن ہی کہ جب اُصول حیات کی جڑ آلودہ اور کھوکھلی ہو جائے تو اُس وقت بھی انسان کے لیے زندگی اس لیے کوئی رکھنے کے قابل چیز ہو سکتی ہی کہ سوائے عدل و نیکی کے حصول کے اور ناانصافی سے بچنے کے وہ جو چاہے کر سکتا ہی! اور پھر عدل و ناانصافی، خیر و شر کی ماہیت وہ ہو جو ہم نے بیان کی ہی!

میں:۔ بیشک آپ کے نزدیک یہ سوال مسخر انگیز ہی۔ لیکن پھر بھی چونکہ ہم اس مقام سے قریب ہیں جہاں سے خود اپنی آنکھوں سے حقیقت کا صاف نظارہ ہو سکتا ہی تو پھر راہ میں کیوں رُک جائیں۔

گ:۔ ہاں، ہرگز نہ رُکیے۔

میں:۔ اچھا تو ادھر آؤ۔ اور شر کی مختلف شکلیں دیکھو، میرا مطلب انہی سے ہی جو دیکھنے کے قابل ہیں۔

گ:۔ ہاں ہاں، آپ چلیے میں بھی پیچھے پیچھے آتا ہوں۔

میں:۔ معلوم ہوتا ہی کہ ہماری دلیل اسقدر بلندی پر پہنچ گئی ہی کہ وہاں سے ایک مشاہدہ کی مینار کی طرح آدمی نیچے دیکھ سکتا ہی کہ نیکی و خیر تو ایک ہی ہی لیکن

برائی اور شر کی بیشمار شکلیں ہیں، ان میں سے چار خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔

گ :- وہ کونسی؟

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ روح کی بھی اتنی ہی قسمیں معلوم ہوتی ہیں جتنی ریاست کی مختلف شکلیں ہیں۔

گ :- یعنی کتنی؟

میں :- ریاست کی پانچ قسمیں ہیں اور روح کی بھی پانچ ہیں۔

گ :- یہ کیا قسمیں ہیں؟

میں :- پہلی قسم تو وہ ہے جس کا بیان ہم لوگ کر رہے تھے اور اس کے دو نام ہیں شخصی یا موتمری۔ شخصی اگر ایک ممتاز آدمی حکومت کرے اور موتمری اگر بہت سے آدمی حکومت کریں۔

گ :- درست۔

میں :- لیکن میرے نزدیک یہ دونوں نام ایک ہی قسم کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ عنان حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو یا بہت سوں کے، اگر حکام کی تربیت اس طرح ہوئی ہے جیسی کہ ہم فرض کر رہے ہیں تو ریاست کے اصولی اور بنیادی قوانین ضرور قائم رکھے جائیں گے۔

گ :- بالکل درست۔

پانچویں کتاب

میں :- اچھے شہر اور حقیقی ریاست کا تو یہ حال ہے، اور نیک اور کامل انسان بھی اسی نمونہ کے مطابق ہوتا ہے؛ اور اگر یہ نمونہ صحیح ہے تو دوسرے سب کے سب غلط ہیں۔ پھر اسی طرح برائی بھی وہی ہے جو صرف ریاست ہی کے نظام کو متاثر نہ کرے بلکہ انفرادی روح کے انضباط میں بھی حائل ہو۔ اور یہ چار شکلوں میں رونما ہوتی ہے۔

گ :- وہ کیا؟

میں ان چار برائیوں کو بالترتیب بیان کرنا ہی چاہتا تھا کہ پالیمارکس نے جو ایڈی مینٹس سے ذرا ادھر قریب ہی بیٹھا تھا اپنا ہاتھ بڑھایا اور شانہ کے قریب اس کا کوٹ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، اور خود بھی اس کی طرف ذرا جھک کر آہستہ سے کان میں کچھ کہا۔ میں بس اتنا سن پایا کہ "ہم انھیں جانے دیں یا کیا کریں؟" ایڈی مینٹس نے اس کے جواب میں ذرا اونچی آواز سے کہا "نہیں ہرگز نہیں"۔

میں :- وہ کون غریب ہے جس کی رہائی سے آپ انکار کرتے ہیں؟

ایڈ:- خود جناب!

میں:- کیوں؟ آخر مجھے رہا نہ کرنے کی کیا خاص وجہ؟

ایڈ:- اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ آپ سُست آدمی ہیں۔ اور اس قصّہ کے ایک پورے کے پورے باب سے ہمیں آپ دہوکا دیکر نکال لیجانا چاہتے تھے۔ آپ شاید سمجھتے تھے کہ ہم آپ کے اس ہوائی انداز گفتگو کو نہ معلوم کر سکیں گے۔ آپ نے تو ابھی ایسے فرمایا گویا ہر شخص پر یہ بات بیّن اور ظاہر ہے کہ عورتوں اور بچوں کے معاملہ میں "احباب کے مابین سب کچھ مشترک ہونا چاہیئے"

میں:- تو ایڈی مین ٹس! کیا یہ ٹھیک نہ تھا؟

ایڈ:- بیشک لیکن بہت سی ٹھیک باتوں کی بھی توتشریح کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اشتراک کئی قسم کا ہوتا ہے۔ لہذا براہ کرم تبلائیے کہ آپ کا مقصد کس قسم کے اشتراک سے ہے؟ ہم بڑی دیر سے متوقع بیٹھے تھے کہ آپ شہریوں کی خانگی زندگی کے متعلق کچھ فرمائیں گے؟ کہ ان کے بچے کیسے پیدا ہوں گے؟ پیدائش کے بعد یہ ان کی پرورش کس طرح کریں گے؟ اور بہ الفاظ عام اس اشتراک زن و فرزند کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس لیے کہ ہمارے خیال میں ان معاملات کا اچھا یا بُرا انتظام ریاست کی تحسین یا تخریب پر بہت گہرا اثر رکھیگا۔ اور چونکہ اس سوال کا جواب ہنوز متعین نہیں ہوا اور آپ لگے دوسری ریاست کی طرف متوجہ ہونے، اسیلئے جیسا آپ نے خود سُن لیا، ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک آپ ان سب باتوں کو

بیان نہ کردیں آپ کو ہرگز نہ چھوڑا جائے۔

گلاکن:- اس قرارداد سے میں بھی بالکل متفق ہوں۔

تھریسی میکس:- زیادہ ہنگامہ کی ضرورت نہیں، آپ سمجھئے کہ ہم سب نے سلسے باتفاق رائے منظور کیا۔

میں:- آپ لوگ نہیں جانتے کہ مجھ پر اس طرح چھاپا مار کر آپ لوگ دراصل کیا کر رہے ہیں۔ اللہ۔ آپ ریاست کے متعلق پھر کس مسئلہ کو چھیڑتے ہیں؟ میں تو سمجھا تھا کہ بس میں نے اپنا بیان ختم کیا اور خوش تھا کہ اس مسئلہ کو اسوقت تو خفتہ کر دیا، اپنی خوش نصیبی پر ناز کر رہا تھا کہ آپ لوگوں نے میری گزارش کو شرف پذیرائی بخشا۔ لیکن آپ تو اب مجھے پھر نئے سرے سے چلنے کا حکم دیتے ہیں شاید آپ نہیں جانتے کہ آپ الفاظ کی بھڑوں کے کس چھتے کو چھیڑتے ہیں۔ میں اس آنے والی مصیبت کو سمجھتا تھا اور اسی لیے بچ کر نکلا تھا۔

تھریسی میکس۔ لیکن آپ کے خیال میں آخر ہم لوگ یہاں کس لیے حاضر ہوئے ہیں، چشمۂ حیواں کی تلاش میں یا آپ کی تقریر سننے؟

میں:- درست۔ لیکن آخر تقریر کی بھی تو کوئی انتہا ہوتی ہے۔

گلاکن:- جی، عقلمندوں کے نزدیک اس قسم کی تقریریں سننے کی حد ساری عمر ہے۔ لیکن خیر ہمیں جانے دیجیے، ہمارا خیال نہ کیجئے۔ آپ خود ہمت کیجئے اور اپنے انداز خاص میں اس سوال کا جواب دیجیے، عورتوں اور بچوں کا وہ کیسا اشتراک ہے جو

ہمارے محافظین میں رائج ہونا چاہیئے۔ ولادت اور تعلیم شروع ہونے کے درمیان کے زمانہ میں بچوں کا کیا انتظام ہوگا، کہ اس زمانہ میں بڑی نگہداشت کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیے۔

میں :- بجا و درست۔ لیکن میرے بھولے دوست! اس کا جواب نہایت دشوار ہے۔ گذشتہ بالا نتائج کے مقابلہ میں اس معاملہ پر بہت زیادہ شبہات وارد ہوتے ہیں۔ اول تو اس تجویز کا قابل عمل ہونا مشتبہ، اور پھر دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھو تو اگر قابل عمل سہی تو اس کا مفید اور اچھا ہونا بھی مشتبہ۔ اس لیے میں اس مسئلہ پر گفتگو کرتے جھجکتا ہوں کہ کہیں ہماری آرزوئیں بس ایک خواب ثابت ہوں۔

گلاکن :- بہت ڈریئے نہیں۔ آپ کے سامعین بہت سخت گیری کرینگے؛ ان میں نہ تشکک ہے نہ تخالف۔

میں :- یہ کہکر آپ شاید میری ہمت بندھانا چاہتے ہیں۔

گ :- جی ہاں ؟

میں :- تو میں آپ سے عرض کر دوں کہ آپ اس کے بالکل مخالف عمل کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمت افزائی نہایت خوب ہوتی اگر خود مجھے یقین ہوتا کہ جس چیز پر میں گفتگو کر رہا ہوں اس سے واقف ہوں۔ ان امور مہمہ کے متعلق جن کی آدمی وقعت کرتا اور جنسے محبت رکھتا ہے ایک ایسے مجمع عقلا میں جو سب خود اُس کی

ذات سے اُنس رکھتے ہوں، اعلان حق باعث خوف و تذبذب نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن جب آدمی خود مذبذب ہو اور پھر اس مسئلہ کے متعلق دلیلیں کرے تو یہ خطرناک بات ہے۔ اور یہی حال میرا ہے۔ مجھے اس کا خوف نہیں کہ لوگ مجھ پر ہنسیں گے؛ یہ خوف تو سراسر طفلانہ ہے، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ جہاں اپنے قدم پر پورے اعتماد کی ضرورت ہے وہیں پاؤں لغزش نہ کھائے اور حقیقت سے محروم نہ رہوں اور خود گروں سو گروں کہیں احباب کو بھی ساتھ نہ گراؤں۔ میں انتقام کی دیوی سے دست بدعا ہوں کہ میں جو کچھ کہنے والا ہوں وہ مجھ ہی پر صادق ہو۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ کسی انسان کو بلا ارادہ قتل کر دینا اتنا بڑا جرم نہیں جتنا کہ حسن و خوبی اور اصول عدل و آئین کے متعلق کسی کو دھوکا دینا۔ اور یہ خطرہ ایسا ہے کہ میں دشمنوں میں تو اسے برداشت بھی کر لوں لیکن دوستوں میں ہرگز نہیں کر سکتا۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی ہمت افزائی نے کیا کام کیا؟

گلاکن:- (ہنس کر) اچھا اگر آپ نے یا آپ کے دلائل نے ہمیں کوئی سخت نقصان پہنچایا تو ہم پہلے سے آپ کو قتل کے جرم سے بری کرتے ہیں اور آپ کو دھوکہ یا فریب دینے والا بھی قرار نہ دینگے۔ ہمت کیجئے اور فرمائیے۔

میں:- قانون کی رو سے اگر کوئی شخص رہا کر دیا جائے تو گویا وہ جرم سے بری ہے، اور جو قانون کا دستور ہے وہی بحث و مباحثہ میں بھی سہی!

گ:- تو پھر کیا خیال ہے؟

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ذرا پیچھے ہٹنا پڑیگا، اور اسوقت وہ کہنا ہوگا جو پہلے کہہ چکنا چاہیئے تھا۔ چھا مردوں کا حصہ تو پورا ہوگیا، اب قدرتاً عورتوں کی باری ہے۔ میں اب انکا ذکر کرتا ہوں، اسوجہ سے اور بھی کہ آپ لوگ اصرار کرتے ہیں۔

ہمارے شہریوں کی سی طبیعت اور تعلیم کے لوگوں کے لیے عورتوں اور بچوں کی حیثیت اور ان کے استعمال کے متعلق صحیح نتیجہ پر پہونچنے کا بس ایک ہی راستہ ہے یعنی وہ جس سے ہم نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا تھا، کہ مردوں کی وہ حیثیت ہونی چاہیئے جو گلے میں محافظ و نگراں کتے کی ہوتی ہے۔

گ :- درست۔

میں :- تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ہماری عورتوں کی تولید و تعلیم بھی انہیں یا تقریباً ایسے ہی ضوابط کی پابند ہے۔ اس کے بعد معلوم ہوگا کہ آیا نتیجہ ہمارے ارادہ کے مطابق ہے یا نہیں۔

گ :- کیا، اس سے آپکا کیا مطلب ہے؟

میں :- میرا مفہوم ایک سوال کی شکل میں کہا جا سکتا ہے یعنی کیا کتوں میں تذکیر و تانیث کی تفریق ہوتی ہے؟ یا وہ سب کے سب شکار، نگہبانی اور دیگر فرائض یکساں انجام دیتے ہیں؟ یا ایسا ہوتا ہے کہ ہم صرف نر کتوں کو تو گلہ کی نگہداشت کے لیے چھوڑ دیں اور کتیوں کو یہ سمجھکر گھر پر پڑا رہنے دیں کہ بچے دینا اور انھیں دودھ پلانا

ان کے لیے بس کا فی محنت ہی؟

گ :- نہیں، وہ تو سب یکساں ان کاموں میں شریک ہوتے ہیں، صرف اتنا فرق ہوتا ہی کہ نر ذرا زیادہ مضبوط ہوتے ہیں اور مادہ ذرا کمزور۔

میں :- اچھا بتاؤ کہ اگر دو جانوروں کو ایک سی تربیت اور ایک سی غذا نہ دی جائے تو کیا وہ دونوں ایک ہی کام کر سکتے ہیں؟

گ :- نہیں۔

میں :- چنانچہ اگر عورتوں اور مردوں کے فرائض ایک سے ہیں تو ان کی تعلیم اور پرورش بھی ایک سی ہونی چاہیے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- مردوں کے لیے ہم نے جو تعلیم تجویز کی ہی وہ تو ورزش اور موسیقی ہی۔

گ :- جی۔

میں :- تو کیا عورتوں کو بھی موسیقی اور ورزش جسمانی کی تعلیم دی جائے، نیز فن حرب کی، جس پر یہ بھی مردوں کی طرح عمل پیرا ہوں۔

گ :- جی، نتیجہ تو یہی نکلتا ہی۔

میں :- میرا گمان ہی کہ ہماری تجاویز اس درجہ غیر معمولی ہیں کہ اگر عمل میں آئیں تو شاید مضحکہ انگیز ثابت ہوں۔

گ :- اس میں کیا شک ہی۔

میں :- ہاں، اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز منظر یہ ہوگا کہ اکھاڑے میں عورتیں مردوں کے ساتھ برہنہ ورزش کرتی ہوں خصوصاً ایسی حالت میں کہ انکا زمانہ شباب رخصت ہو گیا ہو، کہ پھر اس وقت تو یہ منظر حسن بھی باقی نہ رہیگا جیسے، تم نے دیکھا ہو بعض معمر لیکن جوشیلے لوگ باوجود اپنی بدصورتی کے سارے بدن کا گوشت لٹکا اور جھریاں پڑی ہیں، اکھاڑوں کی گرد چھانتے پھرتے ہیں۔

گ :- جی، موجودہ خیالات کے مطابق تو یہ تجویز نہایت مضحکہ خیز متصور ہوگی

میں :- لیکن ہم لوگوں نے چونکہ اپنے خیالات کے اظہار کا تہیہ کر لیا ہے، اس لیے ہم ظریف الطبع لوگوں کے ان فقروں کا کچھ خیال نہ کریں گے جو اس جدت کو ہدف ملامت بنائیں، ہمیں اس کی کیا پرواہ ہے کہ وہ موسیقی اور ورزش میں عورتوں کی قابلیت و صلاحیت کا کس طرح ذکر کریں گے، یا انکے زرہ بکتر پہن کر گھوڑوں پر چڑھنے کا کیسا خاکہ اڑائیں گے۔

گ :- بالکل بجا۔

میں :- لیکن جب ایک دفعہ شروع کر دیا تو اس قانون کے ناگوار حصوں کو بھی لینا ہی ہوگا۔ اور ہم ان حضرات سے التجا کرینگے کہ زندگی بھر میں بس ایک مرتبہ تو ذرا سنجیدہ بن بیٹھیں۔ ہم انھیں یاد دلائیں گے کہ بہت دن نہیں ہوے خود اہل یونان کا یہ خیال تھا اور غیر مہذب قوموں میں تو اب بھی موجود ہے کہ کسی برہنہ مرد کو دیکھنا نہایت غیر مناسب و مضحکہ خیز بات ہے! اور جب پہلے پہل اہل کریٹ

اور ان کے بعد اہل نیسی ڈی مونیا نے اس رسم کو شروع کیا تو اس زمانہ کے ظریف بھی بعینہٖ اسی طرح اس جدت کا مذاق اڑا سکتے تھے۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ لیکن جب تجربہ نے بتلا دیا کہ سب چیزوں کا کھلا رکھنا انھیں چھپانے سے بہتر ہے اور ظاہر میں آنکھ پر جو مضحکہ خیز اثر اس منظر کا ہوتا تھا جب وہ عقل کے بہتر اُصولوں کے سامنے غائب ہوگیا تو اس شخص کی بیوقوفی معلوم ہوگئی جو حماقت اور بُرائی کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنے طعن و تمسخر کا نشانہ بناتا اور حسن کے اندازہ کے لیے خیر و خوبی کے علاوہ کوئی اور معیار مقرر کرتا ہے۔

گ :۔ بالکل درست۔

میں :۔ خواہ اس سوال کو مزاح میں لیجیے یا سنجیدگی کے ساتھ سوچیے، سب سے پہلے ہمیں عورت کی فطرت کے متعلق ایک بات پر قائم ہو جانا چاہیے یعنی آیا وہ کلی یا جزوی حیثیت سے مرد کے کاموں میں شریک ہو سکتی ہے یا مطلق نہیں؟ آیا فن حرب منجملہ ان فنون کے ہے جن میں وہ شرکت کر سکتی ہے؟ غالباً تحقیق کے شروع کرنے کا یہی بہترین طریقہ ہوگا اور غالباً اسی سے بہترین نتائج نکل سکیں گے۔

گ :۔ بیشک یہی بہترین طریقہ ہوگا۔

میں :۔ کیوں، تو پھر ہم پہلے اس دلیل کا دوسرا رخ نہ لے لیں یعنی اپنے

خلاف دلیل پیش کریں۔ اس طرح مخالف کا دعویٰ بلا وکالت نہ رہیگا۔

گ :۔ ہاں ہاں، ضرور، کیوں نہیں۔

میں :۔ اچھا تو اپنے مخالفوں کی زبان سے ایک تقریر کریں۔ وہ لوگ کچھ یوں کہیں گے : "جناب سقراط اور گلاکن! اس کی ضرورت ہی کیا کہ کوئی مخالف آپ پر الزام لگائے؟ آپ نے تو خود ریاست کی بنیاد ڈالتے وقت اس اصول کو تسلیم کیا تھا کہ "ہر شخص بس وہی کام کرے جسکے لیے وہ فطرتاً موزوں ہو" اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو یہ بات ہم نے تسلیم ضرور کی تھی۔

" اور کیا عورت اور مرد کی فطرت میں بہت بڑا تفاوت نہیں ہوتا؟" ہم جواب دینگے کہ بیشک ہوتا ہے۔ پھر سوال ہوگا کہ "عورتوں اور مردوں کو جو کام تفویض کیئے جائیں کیا وہ علیحدہ علیحدہ اور ان کی مختلف طبائع کے مناسب نہ ہونے چاہئیں؟" جواب : بیشک ہونے چاہئیں۔ "پھر اگر ایسا ہی تو آپ نے یہ کہکر کیسی بے جوڑ بات کی کہ مرد اور عورتیں جن کی طبائع اس درجہ متباین ہیں سب کے سب یکساں کام کریں؟" کوئی یہ اعتراض کرے تو جناب من! اس کا جواب آپ کے پاس ہے؟

گ :۔ ہاں، اگر کوئی یک یہ سوال پوچھ بیٹھے تو اس کا جواب کچھ سہل نہیں اور میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی طرف سے بھی اس معاملہ کی پیروی کریں۔

میں :۔ میاں گلاکن! یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے اعتراضات ہیں

جنھیں میں پہلے سے سمجھ رہا تھا اور اسی لیے عورتوں اور بچوں کی تملیک اور پرورش کے متعلق کسی قانون کی تدوین کو ہاتھ لگانے سے خائف و متردد تھا۔

گ :- زیس کی قسم! یہ مسئلہ اور چاہے کچھ ہو، آسان تو ہرگز نہیں۔

میں :- ہاں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب آدمی اپنے قد سے زیادہ پانی میں گرا تو چاہے وہ تیرنے کا تالاب ہو یا بحر ذخار اُسے یکساں ہی تیرنا پڑتا ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- تو پھر ہم بھی تیر کر ساحل تک پہونچنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔ اُمید رکھنی چاہیئے کہ آریون کی ڈالفن یا کوئی اور غیبی طاقت مدد کرکے ہمیں بچالے گی۔

گ :- مجھے بھی یہی اُمید ہے۔

میں :- اچھا تو آؤ، دیکھیں کہ اس سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے ہمنے تسلیم کیا تھا کہ مختلف طبائع کے لیے مختلف کام ہونے چاہئیں اور یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ عورتوں اور مردوں کے طبائع مختلف ہیں۔ کیوں تسلیم کیا تھا نا؟ اور اب ہم کیا کہتے ہیں؟ یہ کہ مختلف طبائع کے لیے ایک ہی شغل ہو۔ ہم پر اس بے جوڑ اور متضاد بات کا الزام لگایا جاتا ہے۔

گ :- جی ہاں، بس یہی الزام ہے۔

میں :- فن مناظرہ کی قوت بھی عجب شان رکھتی ہے!

گ :- یہ آپ نے کیوں فرمایا؟

میں :- اس لیے کہ میرے خیال میں اکثر لوگ اپنے ارادہ کے خلاف اس پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ آدمی سمجھتا ہے کہ معقول دلیل دے رہا ہے، لیکن دراصل مناظرہ میں مشغول ہوتا ہے۔ اور یہ صرف اس لیے کہ تقسیم و تعریف نہ کرسکنے کے باعث وہ اپنے موضوع گفتگو سے ہی واقف نہیں ہوتا۔ مناظرہ و مباحثہ کی خاطر محض لفظی مخالفت میں پڑا رہتا ہے اور اصل مسئلہ پر کوئی معقول تحقیق نہیں کرتا۔

گ :- جی ہاں، اکثر ایسا ہوتا ہے؛ لیکن اسے آخر ہم سے یا ہماری بحث کو کیا واسطہ؟

میں :- کیوں، بہت کچھ۔ یقیناً ہمارے لیے بھی بے جانے اسی لفظی بحث میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- ایسے کہ ہم بھی تو نہایت شجاعانہ اور مجادلانہ اسی لفظی حقیقت پر مصر ہیں کہ مختلف طبائع کی مناسبت سے مشاغل بھی مختلف ہونے چاہئیں لیکن ہم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ طبیعت کی یکسانی یا اختلاف کا مفہوم کیا ہے اور ہم نے جب یکساں طبیعت والوں کو ایک سے اور مختلف طبیعت والوں کو مختلف مشاغل سپرد کیے تھے تو آخر یہ تفریق ہم نے کی کیوں تھی؟

گ :- ہاں، بیشک۔ اس کا تو ہم نے بالکل خیال نہ کیا۔

میں :۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے ہم پوچھیں کہ گنجے اور بالدار آدمی میں اختلاف طبیعت ہے یا نہیں۔ اگر ہم اختلاف تسلیم کر لیں اور گنجے لوگ موچی کا کام کرتے ہوں تو کیا ہم تمام بالدار شخصوں کے لیے موچی کا کام ممنوع قرار دیں گے یا اس کے مخالف صورت میں اس کے برعکس؟

گ :۔ یہ تو عجیب دل لگی ہو جائیگی۔

میں :۔ بیشک مذاق ہوگا۔ لیکن جست کیوں؟ اس لیے کہ تعمیر ریاست کے وقت ہمارا مطلب یہ نہ تھا کہ یہ اختلاف ہر معمولی فرق سے عبارت ہے بلکہ صرف وہ فرق پیش نظر تھے جنسے اس فرد کے شغل پر اثر پڑتا ہے۔ مثلاً ہمیں کہنا چاہیئے تھا کہ ایک طبیب اور ایک ایسا شخص جس کے دماغ کو طب سے مناسبت ہو دونوں ایک سی طبیعت رکھتے ہیں۔

گ :۔ درست۔

میں :۔ لیکن طبیب اور بڑھئی کے طبائع مختلف ہیں۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ اب اگر مردوں اور عورتوں میں باعتبار ان مشاغل و فنون کے کوئی فرق ہے جنمیں وہ مصروف ہونا چاہتے ہیں تو پھر تو ہمیں ضرور ایک شغل ایک صنف کو اور دوسرا دوسرے کو تفویض کرنا چاہیئے لیکن اگر فرق صرف اتنا ہے کہ عورتیں بچے جنتی اور مرد بچے پیدا کرتے ہیں، تو میرے نزدیک یہ تو اس امر کا ثبوت نہیں ہے

کہ جس قسم کی تعلیم مرد کو دیجائے وہ عورت کے لیے مناسب نہیں۔ چنانچہ ہم اس خیال پر قائم رہ سکتے ہیں کہ محافظین اور اُن کی بیویاں دونوں کے لیے ایک شغل ہونا چاہیئے۔

گ :- بالکل صحیح۔

میں :- اب ہم اپنے مخالف سے پوچھیں کہ باعتبار مشاغل اور شہری زندگی کے فنون کے لحاظ سے عورت کی طبیعت مرد سے کس طرح مختلف ہے؟

گ :- ہاں، بالکل جائز سوال ہے۔

میں :- اور غالباً وہ بھی آپ کی طرح یہ جواب دیگا کہ فوراً تو اس سوال کا جواب دینا سہل نہیں، البتہ تھوڑے سے غور کے بعد کوئی دشواری نہ رہیگی۔

گ :- جی، غالباً یہی جواب ملیگا۔

میں :- اچھا تو ہم اسے دعوت دیں کہ گفتگو میں ذرا ہمارا ساتھ دے۔ اور مجھے امید ہے کہ ہم اسپر واضح کرسکیں گے کہ عورت کی طبیعت میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کا اثر انتظام ریاست کے کام پر پڑتا ہو۔

گ :- ضرور دعوت دیجیے۔

میں :- ہم اس سے کہیں : " آئیے۔ ہم آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے جو یہ فرمایا کہ کسی میں ایک چیز کا ملکہ ہوتا ہے کسی میں دوسری کا تو اس سے آپ کا مطلب کیا تھا؟ کیا یہ مفہوم تھا کہ ایک آدمی ایک چیز کو آسانی سے حاصل

کر سکتا ہی اور دوسرا مشکل سے، ایک تھوڑا سا علم حاصل کر کے بہت سے انکشافات کر سکتا ہی، دوسرا سخت مطالعہ اور توجہ کے بعد بھی جو کچھ سیکھتا ہی بھلا دیتا ہی ایک کا جسم اُس کے ذہن کا اچھا تابع اور دوسرے کا جسم اُس کے لیے ایک سنگ راہ ہی! ایک شخص جسے قدرت نے کچھ ودیعت کیا ہی اور دوسرا جسے کچھ نہیں ملا، دونو میں یہی وجوہ امتیاز ہو سکتی ہیں۔

گ :۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہی؟

میں :۔ اور کیا آپ انسانی مشاغل میں سے کسی کا نام لے سکتے ہیں جس میں مرد کو بمقابلہ عورت کے یہ صفات زیادہ نہ ودیعت کیے گئے ہوں سنیے، میں آپ کا وقت فرباقی، مربّے اور نان خطائی کی طیاری وغیرہ کے ذکر میں کیوں ضائع کروں کہ ان میں تو عورت درحقیقت افضل معلوم ہوتی ہی اور مرد یہاں آسانی سے زک کھاتے اور اپنی ہنسی اُڑواتے ہیں۔

گ :۔ آپ صحیح فرماتے ہیں۔ عام طور پر عورتیں مردوں سے کم درجہ رکھتی ہیں اگرچہ یہ بھی ضرور ہی کہ بہت سی عورتیں اکثر کاموں میں بہت سے مردوں سے بدرجہا بہتر ہوتی ہیں۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی آپ جو کچھ فرماتے ہیں درست ہی۔

میں :۔ محب من۔ اگر ایسا ہی تو انتظام ریاست کے اعتبار سے کوئی ایسی خاص قابلیت نہیں جو عورت میں بحیثیت عورت ہونے کے اور مرد میں بحیثیت مرد کے موجود ہوتی ہو۔ قدرت کی دین دونوں میں یکساں بٹتی ہی۔ جو مرد کے شغل

ہیں وہی سب عورت کے بھی شغل ہیں۔ ہاں، سب میں عورت مرد سے کمتر درجہ رکھتی ہے۔

گ :- بالکل صحیح۔

میں :- ہاں، تو کیا ہم اپنے قوانین صرف مردوں ہی پر عائد کریں، عورتوں پر کچھ نہیں؟

گ :- بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے!

میں :- ایک عورت میں مرض سے شفا دینے کی قابلیت ہوتی ہے، دوسری میں نہیں۔ ایک ماہر موسیقی ہے اور دوسری کی فطرت میں موسیقی بکلیتہً مفقود۔

گ :- جی۔

میں :- یا ایک عورت کو ورزش جسمانی اور فوجی کاموں کی طرف رغبت ہوتی ہے، دوسری ورزش سے نفور اور جنگ سے بیزار۔

گ :- یقیناً۔

میں :- کوئی عورت فلسفی ہوتی ہے، کوئی فلسفہ کی دشمن کسی میں جرأت ہوتی ہے، کسی میں یہ چیز سرے سے غائب۔

گ :- جی۔

میں :- یعنی کسی عورت کا مزاج محافظین کا سا ہے اور کسی کا نہیں؟ مرد محافظین کا انتخاب بھی تو آخر انھیں اختلافات کی بنا پر ہوا تھا؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- عورت اور مرد دونوں میں محافظ بننے کے صفات موجود ہوتے ہیں! فرق صرف اُن کی اعتباری قوت اور کمزوری کا ہے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- جن عورتوں میں یہ صفات موجود ہوں اُنکا انتخاب کرکے ان مردوں کا ساتھی اور معاون بنانا چاہیئے جنمیں اسی قسم کی صفات ہوں اور جنسے یہ باعتبار صلاحیتٔ اخلاق مشابہ ہوں۔

گ :- بہت درست۔

میں :- اور یکساں طبائع کے لیے ایک سے ہی اشغال بھی چاہئیں۔

گ :- ضرور۔

میں :- چنانچہ جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں، محافظین کی بیویوں کو ورزش اور موسیقی کا کام تفویض کرنے میں کوئی خلاف فطرت بات نہیں گھوم گھام کر ہم پھر اسی نکتہ پر آن پہنچے۔

گ :- یقیناً کوئی خلاف فطرت بات نہیں۔

میں :- لہذا ہم نے جو قانون بنایا تھا وہ مطابق فطرت ہے۔ اور اس لیئے نہ غیرممکن ہے نہ محض ایک آرزو ہی آرزو۔ بلکہ آج کل جو اسکے خلاف عمل ہوتا ہے دراصل یہ قوانین قدرت کی نافرمانی ہے۔

گ :- جی، آپ کا ارشاد معلوم تو صحیح ہوتا ہے۔

میں :- ہمیں پہلے تو یہ دیکھنا تھا کہ ہماری تجاویز پر عمل ممکن بھی ہو یا نہیں اور دوسری بات یہ تھی کہ اگر عمل ہو سکے تو آیا یہ سب سے زیادہ سودمند تجاویز ہیں؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- اب انکا امکان تو مسلم ہو گیا؟

گ :- جی۔

میں :- باقی رہا اسکے کثیر المنفعت ہونیکا ثبوت۔

گ :- بیشک۔

میں :- آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ جو تعلیم مرد کو اچھا محافظ بناتی ہو وہ عورت کو بھی اچھا محافظ بنائیگی کیونکہ ان کی اصلی طبعیت ایک ہو۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اب میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- بہ اعتبار خوبی کیا سب مرد باہم برابر ہیں یا ایک دوسرے سے بہتر ہوتا ہی؟

گ :- دوسری صورت صحیح ہی۔

میں :- اچھا تو ہم جس ریاست کی بنیاد رکھ رہے ہیں اس میں وہ محافظ زیادہ کامل انسان ہونگے جن کی تربیت ہمارے مجوزہ نظام کے ماتحت ہوئی ہو

یا وہ موچی جنھیں صرف موچی گری کی تعلیم ملی ہو ؟

گ :- کیا خوب ! آپ نے بھی کسقدر مضحکہ خیز سوال دریافت فرمایا ہو !!

میں :- جی ، بس مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا - اب یہ فرمائیے کہ ہم ذرا اور آگے بڑھ کر کیا یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے محافظین بہترین شہری ہیں ؟

گ :- سب سے بہتر -

میں :- اور کیا ان کی بیویاں بہترین عورتیں نہ ہوں گی ؟

گ :- بیشک سب سے بہتر ہوں گی -

میں :- اور کیا ریاست کے اغراض کے لیئے اس سے بہتر کوئی بات ہو سکتی ہو کہ اسکے مرد اور عورتیں حتی الوسع اچھے ہوں -

گ :- اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہو ؟

میں :- اگر موسیقی اور ورزش جسمانی کے فنون اس طرح موجود ہوں جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہو تو کیا ان سے یہ نتیجہ مترتب نہ ہوگا ؟

گ :- بیشک -

میں :- تو گویا ہم نے ایسا قانون تیار کر لیا جو یہی نہیں کہ ممکن العمل ہو بلکہ ریاست کے لیے بدرجۂ اولیٰ مفید بھی ہو -

گ :- درست -

میں :- پھر کیا ہو - ہمارے محافظین کی بیویاں کپڑے اتار سکتی ہیں کہ نیکی

ان کا لباس ہے۔ انھیں جنگ آزمائی اور حفاظت ملک کی تکلیفیں بھی اٹھانی ہونگی، البتہ کام کی تقسیم میں عورتوں کو ذرا ہلکا کام دیا جائے کہ یہ بالطبع کمزور ہوتی ہیں ورنہ یوں بہ اعتبار فرائض کے تو سب یکساں ہیں۔ پھر ان برہنہ عورتوں پر جو بہترین محرکات کے باعث جسمانی محنت کرتی ہیں اگر کوئی ہنسے تو وہ "فہم خام کی خوشہ چینی کرتا ہے" اور خود اس چیز سے بیخبر ہے جس پر ہنستا ہے۔ کیونکہ بہترین مقولہ یہ ہے اور ہمیشہ رہیگا کہ "جو چیز مفید ہے وہی شریف ہے، جو مضر ہے وہ ذلیل ہے"

گ:۔ بیشک۔

میں:۔ طبقہ اناث کے متعلق ہمارے قوانین میں ایک دقت تو یہ تھی جس سے الحمد للہ کہ ہم بچ گئے۔ اس خیال کو قانون کا جزو بنانے پر کہ دونوں اصناف کے محافظین کے مشاغل مشترک ہوں شکر ہے کہ نکتہ چینی کا سیلاب ہمیں بہا نہیں لے گیا۔ اس انتظام کے افادہ اور امکان کی شہادت خود ہماری دلیل کی باہمی مطابقت سے فراہم ہوتی ہے۔

گ:۔ جی، وہ بڑی زبردست موج تھی جس سے آپ بچ نکلے۔

میں:۔ لیکن ابھی اس سے بھی زور کی ایک اور آرہی ہے، اسے دیکھیے گا تو پہلی کا کچھ خیال نہ رہیگا۔

گ:۔ اچھا تو چلئے، دیکھوں۔

میں:۔ گذشتہ بالا قانون اور نیز تمام سابقہ قوانین کا ماحصل یہ ہے کہ ہمارے

محافظین کی بیویاں مشترک ہوں، بچے مشترک ہوں، والدین اپنے بچوں کو نہ پہچانیں نہ بچے اپنے والدین کو۔"

گ:۔ بیشک یہ لہر تو پہلی سے کہیں بڑی ہے۔ اور اس قانون کا امکان اور افادہ، دونوں اُس سے بدرجہا زیادہ مشتبہ ہے۔

میں:۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ عورتوں اور بچوں کے مشترک رکھنے کے افادۂ عظیم سے کوئی بھی انکار نہ کریگا۔ البتہ اس کا ممکن العمل ہونا، یہ دوسری بات ہے، اور اس کی لوگ ضرور مخالفت کریں گے۔

گ:۔ میری رائے میں تو دونوں باتوں کے متعلق بہت سے شبہات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

میں:۔ آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ ان دونوں سوالوں کو ملا دیا جائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ اسکے افادہ کو تسلیم کر لیتے اور یوں میں ایک حصہ کے بار ثبوت سے بچ جاتا اور صرف اسکا امکان ثابت کرنا باقی رہ جاتا۔

گ:۔ آپ کی یہ چالاکی تو پکڑی گئی، اب تو دونوں کے ہی دلائل دیجیے۔

میں:۔ خیر راضی برضا۔ لیکن مجھ پر تھوڑی سی عنایت ضرور کیجیے، یعنی اجازت دیجیے کہ میں خیالی پلاؤ پکاؤں جیسے تنہائی میں ٹہلتے ہوئے دن میں خواب دیکھنے والے پکایا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کے وسائل دریافت کرنے سے پہلے (اور اس بارے میں تو وہ شاذ ہی اپنے کو تکلیف دیتے

ہوں) یہ کبھی انکے امکان کے خیال سے اپنے دماغ کو نہیں تھکاتے۔ بلکہ پہلے تو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کی تمام خواہشیں انھیں مل گئیں اور پھر اپنی خیالی تدابیر چلتے ہیں اور ان آرزؤں کے بر آنے کے بعد جو کچھ کرنے کا ارادہ ہو اُسکی تفصیلات سے اپنا دل خوش کرتے ہیں۔ اس وقت چونکہ میرا بھی دل کچھ چھوٹا سا جاتا ہو، اس لیے آپ کی اجازت سے چاہتا ہوں کہ فی الحال امکان کے سوال کو رہنے دوں۔ میں پہلے اس تجویز کو ممکن فرض کیے لیتا ہوں، اور یہ دریافت کرتا ہوں کہ حکام اس انتظام کو چلائیں گے کیسے، پھر یہ ثابت کرونگا کہ اگر اینر عمل ہوا تو ریاست اور محافظ دونوں کو بہت کچھ فائدے حاصل ہوں گے۔ اس لیے اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو پہلے تو میں آپ کی مدد سے اس تجویز کے فوائد پر غور کروں اور بعد میں اس کے قابل عمل ہونے پر۔

گ:- جی نہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

میں:- میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارے محافظ اور اُن کے معاون جن نام کے حامل ہیں اس کے شایاں بھی ہوں تو لازم ہے کہ ایک میں اطاعت شعاری اور دوسرے میں حکم دینے کی قابلیت ہو۔ محافظین خود بھی قوانین کی پابندی کریں، اور جہاں کہیں انھیں اختیار تمیز حاصل ہو وہاں قانون کی غایت اصلی کو پیش نظر رکھیں۔

گ:- درست۔

میں:- بہ حیثیت نافذ قانون آپ نے مردوں کا انتخاب کیا تھا، اب آپ ہی

عورتوں کا انتخاب کرکے انھیں دیجیے۔ جہاں تک ممکن ہو یہ عورتیں اور مرد ایک سی طبیعت کے ہوں سب کے سب مشترک مکانات میں رہیں، اور ساتھ بیٹھکر کھانا کھائیں کسی کے پاس کوئی چیز بھی مخصوص کسی فرد کی ملک نہ ہو۔ یہ سب ساتھ رہیں گے، ساتھ ہی ان سب کی تربیت اور پرورش ہوگی، ورزش جسمانی کے سلسلہ میں ایک دوسرے کا ساتھ ہوگا اور اس طرح ایک لزوم فطری کی کشش ان میں باہمی تعلقات پیدا کردیگی۔ غالباً اس خیال کے لیے "لزوم" کافی معنی خیز لفظ ہے۔

گ :۔ جی کیوں نہیں، لزوم، علم ہندسہ والا "لزوم" نہیں بلکہ دوسری قسم کا جس سے محبت کرنیوالے آشنا ہوتے ہیں اور عامتہ الناس کے لیے اسکی قطعیت برہان اور اسکا تحکم جابرانہ اول الذکر "لزوم" سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔

میں :۔ سچ ہے۔ لیکن اور چیزوں کی طرح اسے بھی ایک منضبط طریقے سے چلنا چاہیئے۔ مبارک لوگوں کے شہر میں تو عیاشی ایک ناپاک فعل سمجھا جائے گا، اور محافظین ضرور اس کی ممانعت کرینگے۔

گ :۔ بیشک اسکی تو اجازت نہ ہونی چاہیئے۔

میں :۔ لہٰذا دوسری بات یہ ہے کہ "تجویز کو حتی الوسع مقدس بنایا جائے" اور تقدس کا معیار یہ ہو کہ جو سب سے زیادہ مفید ہو وہی سب سے زیادہ مقدس ہے۔

گ :۔ بالکل بجا۔

میں :- تو شادیوں کو سب سے زیادہ مفید کیونکر بنایا جا سکتا ہے؟ میں آپ سے یہ سوال اس لیے کرتا ہوں کہ آپ کے مکان میں بہت سے شکاری کُتّے اور اچھی قسم کی چڑیاں دیکھ رہا ہوں، براہ کرم فرمائیے کہ آپ نے کبھی ان کے جوڑا ملانے یا بچے نکالنے کی طرف بھی توجہ فرمائی؟

گ :- کیسی توجہ!

میں :- پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر چند یہ سب جانور اچھی قسم کے ہیں لیکن پھر بھی کیا ان میں سے بعض اوروں سے بہتر نہیں؟

گ :- ہیں۔

میں :- تو آپ سب سے بلا تفریق بچے لیتے ہیں یا صرف بہترین سے؟

گ :- صرف بہترین سے۔

میں :- زیادہ عمر والے جانور چُنتے ہیں یا کم عمر والے یا صرف وہ جو ٹھیک جوان عمر کے ہیں۔

گ :- صرف ٹھیک جوان عمر والے۔

میں :- اور اگر بچے لینے میں کافی نگہداشت نہ کی جائے تو کتوں اور چڑیوں میں بہت انحطاط رونما ہو جائے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- یہی حال گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کا ہے۔

گ :- بیشک۔

میں :- اللہ غنی۔ اگر یہی اُصول نوع انسانی پر عائد کرنا ہو تو ہمارے محافظین کو کسقدر اعلیٰ درجہ کی مہارت کی ضرورت ہوگی۔

گ :- اُصول تو یقیناً یہی عائد ہوگا؛ لیکن اس میں خاص مہارت کی ایسی کونسی بات ہے؟

میں :- اس لیے کہ ہمارے حکام کو جسم سیاسی پر اکثر ادویہ کا استعمال کرنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ جب مریض کو دوا دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی بلکہ کسی مخصوص غذا کا تجویز کردینا ہوتا ہے تو اس کے لیے معمولی سا طبیب بھی کافی سمجھا جاتا ہے؛ لیکن جب دوا دینی ہو تو پھر طبیب کا اچھا ماہر ہونا ضروری ہے

گ :- یہ تو سب درست؛ لیکن آپ کا اشارہ آخر کدھر ہے؟

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ رعایا کی فلاح کے لیے حکام کو ادویہ کذب و فریب کی کافی خوراک درکار ہوگی۔ یہ تو ہم مان ہی چکے ہیں کہ ان چیزوں کا استعمال بطور دوا کے مفید ہوتا ہے۔

گ :- جی، اور ٹھیک مان چکے ہیں۔

میں :- ان چیزوں کا یہ جائز استعمال تزویج و تناسل کے انضباط میں اکثر درکار ہوگا۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- یہ اصول تو ہم بیان کر ہی چکے ہیں کہ ایک صنف کے بہترین افراد کو دوسری صنف کے بہترین افراد سے جتنے زیادہ مرتبہ ہو سکے ملایا جائے اور دونوں اصناف کے بدترین افراد کو جسقدر ہو سکے کم، اور اگر گلہ کو اعلیٰ درجہ کی حالت میں رکھنا منظور رہی تو صرف اول الذکر اتحاد سے جو بچے پیدا ہوں انکی پرورش کرنی چاہیئے دوسروں کی نہیں۔ اب چاہیئے یہ کہ یہ ساری کارروائی صیغۂ راز میں ہو اور بس حکام کو اس کا علم ہو، ورنہ گلہ میں بغاوت کا ایک اور اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

گ :- بالکل بجا۔

میں :- کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم بعض تہوار مقرر کر دیں، ان موقعوں پر دولہا دولہن یکجا ہو سکیں، قربانیاں کی جائیں، شعراء شادی کی نظمیں پڑھیں رہی شادیوں کی تعداد سو اسے مطلقاً حکام کے اختیار تمیزی پر چھوڑنا چاہیئے کہ ان کے پیش نظر ریاست کی اوسط آبادی برقرار رکھنے کا مقصد ہوگا، اسکے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنکا انھیں خیال کرنا پڑیگا؛ مثلاً جنگ، وبا اور دوسری اسی قسم کی چیزوں کے اثرات؛ تاکہ جہاں تک ممکن ہو ریاست نہ تو بہت بڑی ہو جائے نہ بہت چھوٹی۔

گ : یقیناً۔

میں :- اپنی باری کے لیے لوگوں کو چٹھیاں اٹھا کر قسمت آزمائی کرنی

ہوگی یا ایسا ہی اور کوئی عیارانہ طریقہ ایجاد کرنا ہوگا۔ تاکہ کم درجہ کے لوگ جب کبھی یکجا ہونے والے ہوں تو انھیں یہ چٹھیاں اٹھانی پڑیں اور وہ حکام پر الزام نہ لگا سکیں بلکہ خود اپنی بدنصیبی کو اس کا ذمہ دار قرار دیں۔

گ :- ضرور۔

میں :- اور میں تو سمجھتا ہوں کہ اعلیٰ قسم کے بہادر نوجوانوں کو جہاں اور اعزاز و انعام عطا ہوں وہاں اُنکے لیے عورتوں سے خلوت کے معاملہ میں بھی سہولتیں بہم پہنچانی چاہیئیں۔ اس کی وجہ ان کی بہادری ہے، اور مقصد یہ ہے کہ ایسے باپوں کے جتنے بیٹے ہو سکیں ہوں۔

گ :- بجا ہے۔

میں :- اور افسران متعلق خواہ مرد ہوں یا عورت۔ کیونکہ افسر تو مرد بھی ہو سکتے ہیں اور عورتیں بھی۔

گ :- جی۔

میں :- ہاں، تو افسران متعلق اچھے والدین کی اولاد کو باڑہ میں لیجائینگے اور انھیں آیاؤں کے سپرد کر دینگے، یہ آیائیں علیحدہ مکانات میں رہا کرینگی۔ کم درجہ لوگوں کی اولاد یا اچھوں کی وہ اولاد جو اتفاق سے بگڑ گئی ہو انھیں کسی مخفی نامعلوم مقام پر ڈالدیا جائیگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ اسی کے مستحق ہیں۔

گ :- جی ہاں، اگر نسل کو خالص رکھنا ہے تو محافظین کو یہی کرنا ہوگا۔

میں :- پھر یہی افسران بچوں کی پرورش کا انتظام کریں گے جب ماؤں کا دودھ بھر آئے گا تو انھیں باڑہ میں داخل کریں گے لیکن اس امر کا خاص خیال رکھا جائیگا کہ کوئی ماں اپنے بچہ کو نہ پہچان سکے اگر ضرورت ہوئی تو دودھ پلانے کے لیے اور دائیاں رکھ لی جائینگی۔ اس کا بھی خیال رکھا جائیگا کہ دودھ پلانیکا کام زیادہ دیر تک جاری نہ رہے، ماؤں کو رات میں وقت بے وقت اٹھنا اور دوسری پریشانیاں بھی نہ اٹھانا پڑیں گی، کیونکہ اس قسم کا سارا کام آیاؤں اور نوکروں کے سپرد کر دیا جائے گا۔

گ :- یعنی محافظین کے بیویوں کے جب بچہ ہوگا تو تو یہ خوب چین کیا کرینگی؟

میں :- کیوں نہیں ضرور کرینگی۔ خیر یہ تو ہوا، چلیئے اپنی تجویز کو ذرا اور آگے بڑھائیں۔ ہم یہ کہہ رہے تھے نا کہ والدین کی عمر کا زمانہ عنفوان شباب ہونا چاہیئے۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور اس زمانہ شباب کا تعین کیسے ہو؟ کیا عورت کا شباب بیس سال اور مرد کا تیس سال نہیں ہوتا؟

گ :- اور یہ زمانہ رہیگا کب تک؟

میں :- عورت بیس برس کی عمر سے ریاست کے لیے بچّہ پیدا کرنا شروع کر سکتی اور چالیس سال کی عمر تک اس کام کو جاری رکھ سکتی ہے۔ مرد اپنا کام پچیس سال کی عمر سے شروع کر سکتا ہے۔ یعنی اس وقت کے گذرنے کے بعد جب

نبض حیات کی رفتار سب سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور اسے پچپن سال کی عمر تک جاری رکھ سکتا ہے۔

گ :- بیشک، عورت اور مرد دونوں میں یہی زمانہ جسمانی اور دماغی قوت کے معراج کا زمانہ ہے۔

میں :- ان مقررہ حدود سے کم یا زیادہ عمر کا کوئی شخص اگر عام جشنہائے تزویج میں حصہ لے تو وہ سخت ناپاک اور بڑے کام کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اگر اس کا کوئی بچہ زندہ رہ گیا تو سمجھا جائیگا کہ یہ حمل اس قربانی اور عبادت کے زیر اثر قرار نہیں پایا تھا جو ہر جشن شادی کے موقع پر تمام پجاریوں، پجارنوں اور سارے شہر کی طرف سے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ آیندہ نسل اپنے والدین سے بہتر اور مفید تر ثابت ہو۔ بلکہ اس شخص کی اولاد ظلمت اور شہوت پرستی کا نتیجہ متصور ہوگی۔

گ :- درست۔

میں :- اور یہی قانون حدود مقررہ کے اندر عمر والوں پر بھی عائد ہوگا۔ اگر وہ عنفوان شباب میں بلا اجازت حکام کسی عورت سے تعلق پیدا کرلیں۔ کیونکہ پھر یہ ریاست کے لیے حرامی بچے پیدا کریں گے جن کی نہ تصدیق ہوگی نہ تقدیس۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور جب عمر کی مقررہ حدود سے یہ لوگ نکل جائیں تو پھر انھیں آزادی

ہونی چاہیئے کہ جس سے چاہیں ملیں جلیں اور تعلق رکھیں؛ البتہ یہ ضرور ہو کہ کوئی شخص اپنی بیٹی یا نواسی یا اپنی ماں نانی سے تعلق نہ پیدا کرلے۔ اسی طرح عورتوں کیلئے اپنے بیٹوں پوتوں یا باپ اور دادا سے تعلق ممنوع ہو۔ ان لوگوں کو پہلے سے بتاکید اس امر پر متنبہ کردینا چاہیے کہ اگر اس طرح کوئی حمل قائم ہوگیا تو بچہ کو پیدا نہ ہونے دیا جائے گا اور اگر یہ کسی طرح پیدا ہو ہی جائے تو والدین کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسی اولاد کی پرورش نہیں کی جاسکتی۔

گ:۔ یہ تجویز بھی معقول ہے۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ انھیں یہ معلوم کیسے ہوگا کہ کون باپ ہے اور کون بیٹی؟

میں:۔ ہاں، اس کا تو انھیں کبھی بھی علم نہ ہوگا۔ لیکن یہ طریقہ رکھیں گے کہ جشن تزویج کے دن سے ساتویں یا دسویں مہینہ جتنے لڑکے پیدا ہوں گے انھیں دولھا اپنا لڑکا اور جتنی لڑکیاں پیدا ہوں گی انھیں اپنی بیٹی کہیگا۔ یہ سب اسے باپ کہکر پکاریں گے، ان بچوں کے بچوں کو وہ پوتا پوتی سمجھیگا اور یہ اس مشن جماعت کے سارے افراد کو دادا دادی کہینگے۔ ماؤں اور باپوں کی خلوت کے وقت جن جن کا حمل ساتھ قرار پایا تھا وہ بھائی بہن مانے جائیں گے اور انئیں شادی ممنوع ہوگی لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بھائی بہنوں میں شادی کی یہ ممانعت بالکل قطعی ہے۔ اگر قرعہ اندازی اس کی موافقت کرے اور پیتھیا کے کاہن سے بھی اجازت ملجائے تو قانون بھی اس کی اجازت دیدیگا۔

گ :- بہت درست،

میں :- محافظین میں اشتراک ازواج اور خاندان کے متعلق تو یہ تجویز ہے۔ اب غالباً آپ یہ چاہیں گے کہ اسے جماعت کے دوسرے حصوں کے بھی مطابق ثابت کیا جائے اور یہ بھی ظاہر ہوسکے کہ اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں۔ کیوں؟ آپ یہی چاہتے ہیں نا؟

گ :- جی ہاں، یقیناً۔

میں :- کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ہم پہلے ایک مشترک معیار دریافت کریں، یعنی واضعان قانون کو قانون وضع کرنے اور ریاست کے نظام و ترتیب میں کیا مقصد خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ سب سے زیادہ بہتر صورت کیا ہے۔ یعنی کثرت خیر کس میں ہے اور سب سے بدتر کیا یعنی کثرت شر کس میں؟ یہ معیار دریافت ہولے تو دیکھیں کہ ہماری تجویز پر خیر کا اطلاق ہوسکتا ہے یا شر کا۔

گ :- ضرور۔

میں :- اچھا تو کیا نفاق اور انتشار سے بھی زیادہ بُری کوئی چیز ہے؟ یا جہاں وحدت مطلوب ہو وہاں کثرت؟ اور کیا وحدت کے بندھن سے بھی زیادہ اچھی کوئی چیز ہے؟

گ :- جی، ہرگز نہیں۔

میں :- اور وحدت اور ایکا وہیں ہوتا ہے جہاں لوگوں کا رنج و راحت،

آرام و تکلیف مشترک ہو۔ یعنی جہاں شہری خوشی یا رنج کے موقعوں پر سب کے سب یکساں خوش یا رنجیدہ ہوتے ہوں؟

گ:- بیشک۔

میں:- اور جہاں کوئی مشترک احساس نہیں بلکہ صرف شخصی حس ہو تو ریاست غیر منتظم اور منتشر ہوتی ہے، یعنی جب شہر میں ایک ہی واقعہ پر آدھی دنیا تو خوشیاں مناتی ہو اور دوسری آدھی غرق غم ہو۔

گ:- بیشک۔

میں:- اور یہ اختلافات عموماً ان لفظوں کے استعمال میں اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ چیز "میری ہے"، یا "میری نہیں"۔ "اس کی ہے" یا "اُسکی نہیں"۔

گ: جی، یہی وجہ ہے۔

میں:- تو کیا اس ریاست کا انتظام بہترین نہیں جس میں اشخاص کی زیادہ سے زیادہ تعداد اسی چیز پر "میری ہے" یا "میری نہیں"، کا یکساں استعمال کر سکے؟

گ:- درست۔

میں:- یا وہ ریاست جسکی حالت ایک فرد کی سی ہو۔ جس طرح جسم انسانی میں ایک انگلی مجروح ہو جاسے تو سارا کا سارا بدن (جسکا مرکز روح ہے اور جو اس کے زیر حکومت ایک ریاست کی حیثیت رکھتا ہے) اس تکلیف کو محسوس کرتا اور معاً وقت سے ہمدردی کرتا ہے، اور ہم کہتے ہیں کہ اس آدمی کی انگلی میں درد ہو رہا ہے۔ اسی طرح

اگر کسی اور حصہ میں درد کی وجہ سے تکلیف یا درد کی کمی کی وجہ سے آرام پہنچ رہا ہو، تو اُس کے لیے بھی یہی الفاظ استعمال کر سکتے ہیں۔

گ :۔ بالکل درست۔ میں آپ سے متفق ہوں کہ جس ریاست میں بہترین نظام ہوگا وہ آپ کے اس بیان کردہ احساس مشترک کے بہت قریب پہنچ چکی ہوگی۔

میں :۔ یعنی اگر کسی ایک شہری پر کوئی اچھی یا بُری بات گذرے تو ساری ریاست اسے اپنا معاملہ سمجھے گی، اس کے ساتھ خوش ہوگی اور اسی کے ساتھ رنجیدہ۔

گ :۔ جی ہاں، ایک عمدہ منتظم ریاست میں تو یہی صورت حال ہوگی۔

میں :۔ ہاں، تو میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت ہے کہ ہم اپنی ریاست کی طرف پھر رجوع کریں اور دیکھیں کہ اس کی جو شکل ہم نے تجویز کی ہے وہی ان بنیادی اُصولوں کے مطابق ہے یا کوئی دوسری۔

گ :۔ بہت خوب۔

میں :۔ ہر دوسری ریاست کی طرح ہماری ریاست میں بھی حاکم اور محکوم ہونگے؟

گ :۔ جی۔

میں :۔ یہ سب کے سب ایک دوسرے کو شہری کہا کریں گے؟

گ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ لیکن دوسری ریاستوں میں کیا حاکموں کو کوئی دوسرا لقب نہیں دیتے؟

گ :۔ عموماً آقا کہتے ہیں، لیکن جمہوری ریاستوں میں صرف حاکم کہکر پکارتے رہتے ہیں

میں :- اور اپنی ریاست میں حاکموں کو شہری کے علاوہ اور کیا کہتے ہیں؟

گ :- محافظ اور مددگار۔

میں :- اور حکام عوام الناس کو کیا کہتے ہیں؟

گ :- پالنے اور پرورش کرنیوالے۔

میں :- اور دوسری ریاستوں میں؟

گ :- غلام۔

میں :- دوسری ریاستوں میں حکام ایک دوسرے کو کیا کہتے ہیں؟

گ :- شریک حکومت۔

میں :- اور اپنی ریاست میں؟

گ :- شریک حفاظت۔

میں :- کیا تم کسی ایسی مثال سے واقف ہو کہ ایک ریاست میں کوئی حاکم اپنے ایک شریک کار کو تو دوست بتلائے اور دوسرے کو دوست نہ سمجھے۔

گ :- جی ہاں، ایسی مثالیں تو اکثر ملتی ہیں۔

میں :- دوست کے ساتھ تو وہ دلچسپی کا اظہار کرتا اور اس سے واقعی دلچسپی رکھتا بھی ہے لیکن دوسرے کو اجنبی جانتا ہے اور اس سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن تمہارے محافظین میں سے بھی کوئی کسی دوسرے محافظ کو اجنبی بتا سکتا یا سمجھ سکتا ہی؟

گ :- ہرگز نہیں۔ کیونکہ یہ تو جس سے ملیں گے اُسے اپنا بھائی یا بہن سمجھیں گے یا ماں یا باپ، یا بیٹا یا بیٹی یا پھر ان متعلقین میں سے کسی کی اولاد۔

میں :- بہت خوب لیکن میں آپ سے ذرا ایک دفعہ اور پوچھ لوں کہ یہ مشترک خاندان کیا بس نام ہی نام کا خاندان ہوگا یا اپنے اعمال سے یہ لوگ اس نام کو حقیقت بنا دیں گے۔ مثلاً "باپ" کے لفظ کے ساتھ ایک باپ کی سی نگرانی و تعلق خاطر اور دوسری طرف احکام قانون کے مطابق اسکی عزت اور اطاعت بھی لازم ہوگی یا نہیں؟ پھر کیا یہ نہ ہوگا کہ ان فرائض کو پس پشت ڈالنے والا ابداً غیر متقی سمجھا جائے اور خدا اور بندہ کسی کے ہاتھ سے اسے کوئی فیض نہ پہونچے۔ اور کیا بچوں کے کانوں میں اپنے نام نہاد والدین اور دوسرے اعزہ، کے متعلق اس قسم کی باتیں سب شہریوں کی زبانی پڑتی رہیں گی یا نہیں؟

گ :- بیشک وہ یہی سنیں گے" اور اس کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ یہ تو ایک مہمل سی بات ہوگی کہ یہ بس مُنہ سے تو اپنے قرابت خاندانی کے نام لیں لیکن ان کی اصلیت پر ذرا بھی عامل نہ ہوں۔

میں :- یعنی ہمارے شہر میں دوسرے شہروں کی بہ نسبت یکجہتی اور میل ملاپ کی گفتگو زیادہ کثرت سے سنائی دیگی۔ اور جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں جب کوئی

اچھے حال میں ہوگا یا بُرے حال میں تو سب کی زبان پر عام کلمہ یہ ہوگا کہ "میں خوش ہوں" یا "میں بُرے حال میں ہوں"

گ :- بیشک۔

میں :- تو پھر اسی طریقہ فکر و گفتار کے عین مطابق تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ان کی خوشی و غم، آرام اور تکلیف سب مشترک ہوں گے۔

گ :- جی ہاں، ایسا ہی ہوگا۔

میں :- جس چیز کو یہ "سب اپنا" کہینگے اس میں سب مشترک دلچسپی بھی لیں گے اور اس دلچسپی کی وجہ سے ان کی خوشیاں اور غم بھی مشترک ہوں گے۔

گ :- بیشک بمقابلہ دوسری ریاستوں کے بہت زیادہ۔

میں :- ریاست کے عام دستور اساسی کے علاوہ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہوگی کہ محافظین میں زن و فرزند مشترک ہوں گے۔

گ :- اور کیا یہی تو خاص وجہ ہوگی۔

میں :- ایک عمدہ منتظم ریاست کو جسم اور اعضائے سے مشابہ کرتے وقت ہمنے، اس وحدت احساس کو سب سے بڑی خوبی تسلیم کیا تھا۔

گ :- جی۔ تسلیم کیا تھا اور صحیح تسلیم کیا تھا۔

میں :- گویا ہمارے شہر میں عورتوں اور بچوں کا مشترک ہونا ریاست کے لیے سب سے بڑی خوبی کا باعث ہے۔

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ اور یہ بات اس دوسرے اصول سے بھی مطابقت کرتی ہے کہ محافظین کے پاس مکانات، اراضی، یا اور کسی قسم کی املاک نہ ہونی چاہیئے۔ ان کی تنخواہ میں غذا ہو جو انھیں دوسرے شہریوں سے ملے۔ ان کے کوئی خانگی اور ذاتی اخراجات نہ ہوں۔ تاکہ یہ حقیقی محافظ کی خصوصیات قائم رکھ سکیں۔

گ :۔ درست۔

میں :۔ جیسے میں نے عرض کیا اشتراک املاک اور اشتراک خاندان یہ دونوں باتیں انھیں حقیقی محافظ بنانے میں مد ہوں گی۔ یہ لوگ "اپنے" اور "پرائے" کے جھگڑوں میں شہر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کریں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ جس نے جو کچھ حاصل کیا اسے بس ایک الگ گھر میں گھسیٹے لیے جا رہا ہے۔ جہاں اس کے علاوہ بیوی بچے اور ذاتی سامان آرام و آسائش ہے، چنانچہ محض شخصی احساس رنج و خوشی بھی رکھتا ہے۔ بلکہ حتی الامکان سب کے سب مسرت و الم سے یکساں متاثر ہونگے، اور اعزا و اقربا کے متعلق چونکہ متحد الخیال ہوں گے لہذا خواہ مخواہ ایک ہی مقصد کی طرف ان سب کا رجحان بھی ہوگا۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ ان کے پاس چونکہ اپنے بدن کے سوا کوئی چیز نہ ہوگی جسے "یہ اپنا" کہہ سکیں لہذا مقدمہ و استغاثہ کا وجود ہی نہ ہوگا؟ اور روپیہ، اولاد اور دوسرے

تعلقات کے باعث جو جھگڑے ٹنٹے ہوتے ہیں ان سب سے یہ یک قلم مامون ہو جائینگے۔

گ:۔ ظاہر ہے۔

میں:۔ حملہ یا ہتک عزت کے مقدمات کا ہونا بھی زیادہ قرین قیاس نہیں کیونکہ یہ بات تو جائز اور مستحب سمجھی جائے گی کہ برابر والا برابر والے کا مقابلہ خود کرلے اور حفاظت جسم کو تو ہم لازمی قرار دیدینگے۔

گ:۔ یہ خوب ہوگا۔

میں:۔ ہاں، اور اس قانون میں ایک فائدہ اور ہے۔ وہ یہ کہ جہاں کسی کا کسی سے جھگڑا ہوا تو وہ وہیں اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرلیگا اور معاملہ زیادہ خطرناک حد تک طول نہ پکڑے گا۔

گ:۔ بیشک۔

میں:۔ مسن لوگوں کو کمسن آدمیوں پر حکومت کرنے اور انھیں سزا دینے کا فرض تفویض کیا جائے گا۔

گ:۔ ظاہر ہے۔

میں:۔ اور اس میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ بڑوں پر چھوٹے کبھی ہاتھ نہ اُٹھائیں گے، نہ انپر کوئی اور تشدد روا رکھیں گے، نہ کسی طرح ان کی سُبکی کریں گے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی حاکم انھیں اس کا حکم دے۔ چھوٹوں کو ان باتوں سے باز رکھنے کے لیئے دو قوی محافظ ہیں، شرم اور خوف۔ شرم تو

اس سے مانع ہو کہ انسان اپنے والدین پر ہاتھ اٹھائے؛ خوف یہ کہ اس بیٹے کی مدد دوسرے لوگ کریں گے جو اسکے بھائی، بیٹے یا باپ ہیں۔

گ :- سچ ہے۔

میں :- غرض یہ کہ یہ قوانین ہر طرح شہریوں میں باہمی صلح و امن قائم رکھنے میں مدد دیں گے۔

گ :- صلح و امن کی تو بیشک کچھ کمی نہ ہوگی۔

میں :- اور جب محافظین میں آپس میں کوئی جھگڑا نہ ہوگا تو پھر بقیہ شہری بھی ان کے خلاف یا خود آپس میں تفرقہ ہونے کا اندیشہ نہیں۔

گ :- بالکل نہیں۔

میں :- ان ذرا ذرا سی خفیف الحرکتیوں کا تو ذکر کرنا بھی خلاف شان سمجھتا ہوں جن سے یہ لوگ بچ جائیں گے۔ مثلاً غریب لوگ جو امیروں کی خوشامد کرتے ہیں؛ یا خاندان کی پرورش میں جو تکلیفیں لوگوں کو برداشت کرنی ہوتی ہیں یا گھر بلو ضروریات کے لیے جو روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس روپیہ کا قرض لینا، پھر ادا کرنے سے انکار کرنا؛ جیسے تیسے روپیہ حاصل کر کے عورتوں یا غلاموں کی تحویل میں دیدینا، اس قسم کی بہتیری برائیاں جو لوگوں کو پیش آتی ہیں اتنی معروف اور اس قدر ذلیل ہیں کہ قابل ذکر بھی نہیں۔

گ :- جی ہاں، ان برائیوں کے دیکھنے کے لیے تو آنکھیں بھی درکار نہیں۔

میں :۔ اچھا تو یہ لوگ ان ساری برائیوں سے بچ جائیں گے اور انکی زندگی فاتحان اولمپی کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ مبارک ہو جائیگی۔

گ :۔ یہ کیسے ؟

میں :۔ ہمارے شہریوں کو جو چیز نصیب ہے اس کا محض ایک جزو ملجانے پر لوگ فاتح اولمپی کو خوش قسمت سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے شہریوں نے جو فتح حاصل کی ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ شاندار ہے اور صرف عام سے ان کی زیادہ مکمل کفالت ہوتی ہے۔ کیونکہ انھیں جو فتح نصیب ہوئی ہے اس میں تو ساری ریاست کی نجات ہے اور ان کے اور اُن کی اولاد کے سر پر جو تاج رکھا گیا وہ اُنکی تمام زندگی کی ضروریات کا کفیل ہے۔ زندگی میں اپنے ملک کے ہاتھوں انھیں انعام ملتے ہیں اور مرنے کے بعد باعزاز تجہیز و تکفین۔

نام لینے سے کیا حاصل، تمہیں یاد ہوگا کہ اس سے پہلے مباحثہ میں ایک صاحب نے ہم پر الزام لگایا تھا کہ ہم محافظین کو نہایت بھوکے حالوں رکھ رہے ہیں اور جہاں یہ سب چیزوں پر قابض ہو سکتے تھے ہم نے انکے لیے کچھ نہ چھوڑا۔ اسکا جواب ہم نے یہ دیا تھا کہ اگر آگے چل کر کوئی موقع ملا تو اس سوال پر پھر غور کریں گے، اس وقت تو ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ محافظین کو حقیقی محافظ بنالیں اور ترتیب ریاست میں زیادہ سے زیادہ خوشحالی کو پیش نظر رکھیں، کسی خاص طبقہ یا گروہ کی مرفہ الحالی نہیں بلکہ ساری ریاست کی۔

گ :- جی ہاں، مجھے یاد ہے۔

میں :- اور اب آپ کیا کہتے ہیں؟ محافظین کی زندگی تو فاتحان اولمپی سے بھی بہتر نکلی؛ کیا اب بھی اس سے موچیوں یا دوسرے کاریگروں یا کسانوں کی زندگی کا مقابلہ کیا جائیگا؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اس کے ساتھ میں اس موقع پر پھر اس بات کو دہرا دوں جو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر ہمارا کوئی محافظ ایسی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ محافظ ہی باقی نہ رہے؛ یا اگر وہ اس محفوظ اور متناسب زندگی پر قانع نہیں جو ہمارے نزدیک بہترین زندگی ہے؛ بلکہ جنون شباب سے متاثر ہو کر مسرت اور خوشی کے کسی ایسے خیال کو اپنے سر میں جگہ دے کہ ساری کی ساری ریاست خود لے بیٹھوں؛ تو اسے بالآخر ہیسیاد کے فہم و حکمت کی داد دینی ہوگی کہ اس نے کسقدر سچ کہا تھا کہ "نصف کل سے زیادہ ہوتا ہے"!

گ :- یہ اگر مجھ سے مشورہ کرے تو میں تو اسے یہی رائے دوں کہ بھائی جب تمہیں ایسی زندگی نصیب ہے تو بہتر یہی ہے کہ جہاں ہو وہیں رہو۔

میں :- ہاں، تو آپ اتفاق کرتے ہیں کہ مرد عورت سب کا وہی مشترک طریقہ زندگی ہو جو ہم نے تجویز کیا ہے۔ یعنی مشترک تعلیم، مشترک اولاد، اور شہر میں ہوں یا جنگ پر، سارے شہریوں کی مشترک حفاظت؛ ساتھ ملکر پہرہ دیں ساتھ

ملکر سکار کریں (جیسے کتے کرتے ہیں) اور سب باتوں میں حتی الامکان عورتیں مردوں کا ساتھ دیں، کہ ان کے لیے یہی بہترین راہ ہی، اور اسپر عامل ہو کر وہ ذکور و اناث کے قدرتی تعلق کو توڑنے کے بجاے اسے قائم و محفوظ کریں گی۔

گ:۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔ لیکن ابھی یہ بات تو دریافت کرنی رہ ہی گئی کہ اور جانوروں کی طرح آدمیوں میں یہ اشتراک ممکن بھی ہوگا یا نہیں اور اگر ہوگا تو کسطرح؟

گ:۔ آپ نے پیش قدمی کی، ورنہ میں یہی سوال کرنیوالا تھا۔

میں:۔ مثلاً اس بات کے دریافت کرنے میں تو کوئی دشواری نہیں کہ یہ لوگ جنگ کس طرح کریں گے؟

گ:۔ کیسے؟

میں:۔ کیوں، یہ سب ملکر مہم پر جایا کریں گے۔ جو بچے کافی مضبوط ہیں انھیں اپنے ساتھ لیجائیں گے، تاکہ کاریگروں کے بچوں کی طرح یہ بچے بھی اپنی آنکھ سے اس کام کو دیکھ لیں جو بڑے ہو کر انھیں کرنا پڑیگا۔ اور یہی نہیں کہ یہ بچے صرف جنگ کا نظارہ کرلیں، بلکہ جنگ میں مدد بھی دینگے اور کار آمد ثابت ہونگے اور اپنے والدین کی خدمت کرینگے۔ تم نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا کہ کمہار کے بچے چاک کو ہاتھ لگانے سے بہت پہلے اپنے والدین کو کام کرتے دیکھتے اور انکی مدد کرتے ہیں،

گ:۔ جی، میں نے دیکھا ہی۔

میں :- تو کیا کمہار کو محافظین کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی تربیت و تعلیم
اپنے کام کے مشاہدہ اور مشق کے مواقع فراہم کرنیکا زیادہ خیال ہوگا؟

گ :- یہ تو خیال ہی مضحکہ خیز ہے۔

میں :- پھر ایک بات اور یہ ہے کہ والدین پر بھی ان کی موجودگی کا اثر ہوگا
اور جانوروں کی طرح انسان کے لیے بھی اپنے بچوں کی موجودگی اظہار شجاعت
کی بہت قوی محرک ہوتی ہے۔

گ :- یہ تو سچ ہے۔ لیکن اگر انھیں شکست ہوئی (اور جنگ تو آخر جنگ
ہے، اکثر ایسا ہوگا)، تو پھر خطرہ کس قدر بڑا ہے؟ والدین کے ساتھ بچے بھی ضائع
ہوجائینگے اور ریاست کو دوبارہ بننے کا کوئی موقع نہ رہیگا۔

میں :- ٹھیک ہے۔ لیکن کیا آپ انھیں کبھی کسی خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہتے؟

گ :- نہیں، میرا یہ مطلب تو نہیں۔

میں :- تو اگر کبھی نہ کبھی خطرہ برداشت ہی کرنا ہے تو پھر ایسے موقع پر کیوں
نہ ہو کہ اگر وہ تباہی سے بچ جائیں تو پھر اس خطرہ کو برداشت کرنے کی وجہ سے
انھیں کچھ حاصل بھی ہو؟

گ :- جی، یہ تو ٹھیک ہے۔

میں :- آئندہ سپاہی بننے والے آیا کمسنی کے زمانہ میں جنگ کا نظارہ
کریں یا نہ کریں، یہ ایک اہم معاملہ ہے جس کی خاطر کچھ نہ کچھ خطرہ جائز طور پر برداشت

کیا جا سکتا ہے۔

گ:۔ بیشک معاملہ ہے تو بہت اہم۔

میں:۔ لہٰذا ہمارا پہلا قدم تو یہ ہونا چاہیئے کہ بچوں کو جنگ کا نظارہ کرائیں لیکن ایسی تدابیر بھی کرنی چاہیئں کہ یہ خطرے سے محفوظ رہیں۔ پھر تو سب ٹھیک ہوگا

گ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ ان بچوں کے والدین کچھ اندھے تو ہونگے نہیں کہ جنگ کے خطرات سے واقف نہوں اور جہاں تک انسانی دوراندیشی کام دے سکتی ہے یہ بھی جان سکتے ہیں کہ کونسی مہم محفوظ ہے، کونسی خطرناک؟

گ:۔ ہاں یہ تو فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں:۔ تو پھر یہ بچوں کو محفوظ مہم میں لیجائیں گے اور پرخطر مہم میں احتیاط سے کام لیں گے۔

گ:۔ درست۔

میں:۔ اور ان بچوں کو تجربہ کار اور جنگ آزمودہ لوگوں کے تحت میں رکھیں گے اور انھیں کو انکا سردار اور معلم مقرر کریں گے۔

گ:۔ بہت ٹھیک۔

میں:۔ تاہم جنگ کے خطرات ہمیشہ پہلے سے معلوم نہیں ہو سکتے پھر بھی ہزار اتفاق ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- ایسے اتفاقات کے خلاف تو ان بچوں کے پر لگا دینے چاہئیں تاکہ ضرورت کے وقت اُڑ کر بچ نکلیں۔

گ :- کیسے؟ آپ کا کیا مطلب ہے!

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ شروع بچپن ہی سے انھیں گھوڑوں پر سوار کرنا چاہیئے جب سواری سیکھ جائیں تو انھیں گھوڑوں پر سوار کر کے جنگ دکھانے لیجانا چاہیئے۔ یہ خیال رہے کہ ان کے گھوڑے جوشیلے اور جنگی نہ ہوں بلکہ بہت سیدھے لیکن نہایت سبک رفتار۔ اس طرح یہ بچے اپنے آیندہ شغل زندگی کا خوب نظارہ کر سکیں گے اور اگر خطرہ ہوا تو بس اپنے معمر سرداروں کے پیچھے پیچھے بھاگ کر اپنی جان بچالیں گے۔

گ :- میری رائے میں آپ بالکل درست فرماتے ہیں۔

میں :- اسکے بعد دیکھنا یہ ہے کہ جنگ میں سپاہیوں کے باہمی تعلقات کیا ہوں گے، اور دشمن سے کیا؟ میں تو یہ تجویز کروں گا کہ جو سپاہی اپنی جگہ چھوڑ دے، یا ہتھیار ڈالدے، یا کسی اور بزدلانہ حرکت کا مرتکب ہو اسے کسانوں یا کاریگروں کے طبقہ میں اُتار دینا چاہیئے۔ کیوں آپکا کیا خیال ہے؟

گ :- ضرور۔

میں :- جو اپنے کو قید ہو جانے دے وہ دشمنوں کے نذر ہے۔ وہ انکا جائز شکار ہے۔

اس لیے وہ اس کے ساتھ جو چاہیں کریں۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ لیکن جس بہادر شخص نے جنگ میں امتیاز حاصل کیا ہو اُسکے ساتھ کیا کرنا چاہیئے؟ سب سے پہلے تو اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ہاتھ سے اُسکی عزت کرائی جائے۔ ان میں کا ہر ایک اس کے سر پر ایک تاج رکھے۔ کیوں ٹھیک ہی؟

گ :۔ جی ہاں، میں اسے پسند کرتا ہوں۔

میں :۔ پھر سب اس سے ملانے کو اپنا اپنا ہاتھ بڑھائیں۔

گ : میں اس سے بھی متفق ہوں۔

میں :۔ لیکن غالباً آپ میری اگلی تجویز سے اتفاق نہ کریں گے؟

گ :۔ وہ کیا ہی!

میں :۔ یہ کہ وہ ان سب کا بوسہ لے اور یہ سب اس کا بوسہ لیں۔

گ :۔ ضرور۔ بلکہ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھاؤنگا۔ کہ دوران مہم میں وہ جس کسی کا بوسہ لینا چاہے وہ اُسے بوسہ دینے سے انکار نہیں کرسکتا۔ تاکہ اگر فوج میں کوئی عاشق ہو (چاہے اُس کا معشوق کوئی لڑکا ہو یا لڑکی) تو وہ اس طرح اپنی شجاعت کا انعام حاصل کرنیکی کوشش کرے۔

میں :۔ بہت خوب۔ یہ بات تو پہلے ہی طے ہو چکی ہی کہ بہادر آدمی دوسروں سے زیادہ بیویاں کر سکیگا؛ اوروں کے مقابلہ میں اسے انتخاب میں حق تقدم بھی

حاصل ہوگا تاکہ یہ جتنے بچے ممکن ہیں پیدا کر سکے۔

گ:۔صاد ہی۔

میں:۔اس کے علاوہ ھومر کے ہاں بہادر جوانوں کی عزت افزائی کا ایک اور طریقہ ہی۔ ھومر نے اجاکس کا حال بیان کیا ہی کہ میدان کارزار میں ممتاز خدمات انجام دینے پر اُسے گاے کے گوشت کے لوتھڑے انعام میں ملتے یہ ایک شجاع شخص کے لیے جو عنفوان شباب میں ہو نہایت مناسب ہی یہ تحسین معلوم ہوتا ہی کہ اس سے یہی نہیں کہ اس کی عزت افزائی ہوتی ہی بلکہ یہ خود نہایت تقویت بخش چیز بھی ہی۔

گ:۔بیشک۔

میں:۔چنانچہ اس معاملہ میں ہم ھومر کی استادی قبول کرتے ہیں اور قربانیوں یا دوسرے اسی قسم کے موقعوں پر ہم بھی اپنے بہادر مردوں اور عورتوں کی عزت افزائی انکی شجاعت کی مناسبت سے گیتوں اور دوسرے مذکورۂ بالا طریقوں سے کیا کریں گے۔اسکے علاوہ یہ کہ انھیں اعزازی جگہ دینگے اور ان کے لیے عمدہ گوشت اور لبالب جام شراب فراہم کرینگے۔اور اسی عزت افزائی کے سلسلہ میں ان کی تعلیم بھی ہوتی جائیگی۔

گ:۔یہ بہت ہی خوب ہی۔

میں:۔اور جب کوئی بہادری کے ساتھ میدان کارزار میں جان دیگا تو

سب سے پہلے تو ہم نے نسل زریں کا رکن بتلائیں گے۔

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ یہی نہیں۔ بلکہ ہمارے پاس کیا ھیسیاد کی شہادت موجود نہیں کہ یہ لوگ مرنے کے بعد "زمین پر پاک اور مقدس فرشتوں کی طرح رہتے ہیں یعنی منبع خیر و مانع شر اور صفت گفتار رکھنے والے انسان کے محافظ"۔

گ :۔ ہاں ہاں، اور ہم اس کی شہادت کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔

میں :۔ اسی دیوتا سے ہمیں یہ سبق بھی لینا چاہیئے کہ ان الٰہی ہستیوں، اور مشاہیر کے مقبروں کی تعمیر کس طرح عمل میں آئے اور انکا امتیاز خصوصی کیا ہو۔ پھر دیوتا جو ہدایت کرے ہمیں اُسی کے مطابق عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

گ :۔ ضرور۔

میں :۔ ہم لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان کی عزت کرینگے اور مشاہیر کے مقبروں کیطرح ان کے مزاروں پر اپنا زانو خم کیا کریں گے۔ یہ عزت انہیں تک محدود نہ ہوگی بلکہ ہر وہ شخص اس اعزاز کا مستحق متصور ہوگا جو غیر معمولی طور پر اچھا اور نیک خیال کیا جاتا ہو خواہ وہ زیادتی عمر کیوجہ سے شکار اجل ہو یا اور کسی طرح۔

گ :۔ بہت ٹھیک۔

میں :۔ ہاں، اب دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے سپاہی دشمنوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرینگے؟

گ:۔ کس معاملہ میں؟

میں:۔ سب سے پہلے تو غلامی کے بارہ میں۔ کیا آپ کے نزدیک یونانیوں کے لیے یہ جائز ہی کہ وہ اور یونانی ریاستوں کو غلام بنائیں یا اگر ان میں ان کی حفاظت کی قوت ہو تو انھیں دوسروں کا غلام نہ بننے دیں۔ اس خطرہ کا خیال کر کے کہ کہیں ساری یونانی نسل بربر اقوام کے زیر عنان نہ آجائے کیا ان لوگوں میں یہ رسم نہ ہو کہ انھیں غلام بنانے سے درگذر کریں؟

گ:۔ میرے خیال میں درگذر کرنا بدرجہا بہتر ہی۔

میں:۔ یعنی یہ کسی یونانی کو اپنی غلامی میں نہ رکھیں۔ یہ خود اس قاعدہ کی پابندی کریں گے اور دوسرے یونانیوں کو بھی اسپر عامل ہونے کا مشورہ دیں گے۔

گ:۔ اس طرح یہ لوگ ایک دوسرے پر دست درازی نہ کریں گے اور بربر اقوام کے مقابلہ میں متحد رہیں گے۔

میں:۔ دوسری بات دریافت طلب مقتولوں کی بابت ہی کیا فاتح مقتولین کے اسلحہ کے علاوہ اور کچھ بھی لیں گے؟ کیا دشمن کو لوٹنے کا عمل نبرد آزمائی سے بچنے کا ایک حیلہ نہیں بنجاتا؟ بزدل لوگ لاشوں کے قریب چھپے رہتے ہیں اور بہانہ یہ کرتے ہیں کہ ہم بھی تو ایک فرض انجام دے رہے ہیں۔ آج سے پہلے کتنی ہی فوجیں اسی لوٹ مار کی محبت میں تباہ ہو چکی ہیں۔

گ:- بجا ہے۔

میں:- اور کیا لاش کو لوٹنے کھسوٹنے میں شقاوت اور ہوس کی بو نہیں آتی؟ مردہ جسم کو دشمن بنانا، حالانکہ اصلی دشمن تو اپنا اسباب جنگ چھوڑ کر اُڑ گیا ہے اس میں بھی ایک طرح کا کمینہ پن اور ایک قسم کی نسائیت معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو وہی کتے کی سی مثال ہوئی کہ جب اپنے حملہ آور تک نہیں پہنچ سکتا تو اُن پتھروں سے لڑتا ہے جو آ آ کر اُسے لگ رہے ہیں۔

گ:- جی ہاں، بالکل اسی کتے کی سی مثال ہے۔

میں:- لہٰذا ہمیں لاشوں کے لوٹنے سے باز رہنا اور اُن کے دفن کرنے میں کبھی حارج نہ ہونا چاہیئے۔

گ:- جی ہاں، اس سے تو یقیناً باز رہنا چاہیئے۔

میں:- یوں تو کبھی بھی دیوتاؤں کے مندروں پر اسلحہ کا نذرانہ نہ پیش کرنا چاہیئے اور اگر دوسرے یونانیوں سے اچھے تعلقات رکھنا منظور ہیں تو پھر یونانیوں کے اسلحہ کا تو ہرگز نہیں، اور سچ پوچھو تو اعزہ اور رشتہ داروں سے حاصل کیے ہوئے مال غنیمت کا نذرانہ تو ناپاک تصور کیا جا سکتا ہے۔ ہاں سوائے اس صورت کے کہ خود دیوتا نے اس کا حکم دیا ہو۔

گ:- بہت صحیح۔

میں:- اس کے بعد یونانی علاقوں کی تاخت اور مکانات کے جلانے کے

متعلق ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیئے ؟

گ :- آپ اپنی راے فرمایئے۔ میں اُسے سُننا چاہتا ہوں۔

مین :- میری راے میں تو دونوں ہی ممنوع ہونی چاہیئں میرے نزدیک صرف سالانہ پیداوار لینی چاہیئے اور بس۔ اس کی وجہ میں بتلاتا ہوں۔

گ :- فرمایئے۔

میں :- آپ جانتے ہیں کہ باہمی نفاق و فساد اور جنگ میں بس نام ہی کا فرق نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی ماہیت بھی مختلف ہی۔ ایک سے اندرونی اور خانگی کیفیت کا اظہار ہوتا ہی اور دوسرے سے بیرونی وخارجی کا۔ پہلی کیفیت کو فساد دوسری کو جنگ کہتے ہیں۔

گ :- جی، بالکل صحیح تفریق ہی۔

میں :- پھر کیا یہ بات بھی اسی طرح مسلم نہیں کہ یونانی نسل سب کی سب خون اور دوستی کے تعلق کیوجہ سے متحد ہی، اور بربر قوموں سے اجنبی اور جُدا۔

گ - جی۔

چنانچہ جب بربر اور یونانی برسرپیکار ہوں تو یہ ایک دوسرے کے دشمن کہلائینگے اور اس حالت کو جنگ سے تعبیر کیا جائیگا۔ لیکن اگر یونانی باہم لڑیں تو کہا جائے گا کہ یونان میں بدنظمی اور فساد برپا ہی۔ یہ لوگ دراصل دوست ہیں اور ان کی وقتی خصومت اور لڑائی ' فساد ' سے تعبیر کیجائیگی۔

گ :- میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں ۔

میں :- تو ذرا سوچو کہ اگر کسی شہر میں وہ کیفیت پیدا ہو جسے ہم نے فساد سے موسوم کیا ہی یعنی شہر میں دو فرقے ہو جائیں اور یہ دونوں لگیں ایک دوسرے کی اراضی کو تاخت و تاراج اور مکانوں کو سپرد آتش کرنے تو یہ پیکار کس قدر فتنہ خیز ہو جائیگی۔ ملک کا کوئی سچا محبت کرنیوالا کس طرح اپنے کو اپنی ماں (مادر وطن) اور دائی (پرورش کرنیوالا وطن) کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر آمادہ کر سکیگا۔ البتہ فاتح اگر مفتوح کو اس کی سالانہ فصل سے محروم کر دے تو اس میں پھر بھی کچھ معقولیت ہی لیکن تاہم ان کے دلوں میں صلح و امن ہی کا خیال ہوگا اور وہ ہرگز ہمیشہ برسر پیکار رہنے کا ارادہ نہ کریں گے ۔

گ :- جی ہاں، یہی بہتر رویہ ہی ۔

میں :- اور جس شہر کی آپ بنیاد ڈال رہے ہیں کیا وہ یونانی شہر نہ ہوگا؟

گ :- کیوں نہیں، ضرور۔

میں :- تو کیا اسکے شہری بہت اچھے اور مہذب لوگ نہ ہونگے؟

گ :- بیشک، بہت مہذب۔

میں :- کیا وہ یونان کے عاشق نہ ہونگے، اور اسے اپنا وطن نہ سمجھینگے؟ یا یونان کے مشترک مندروں اور عبادتگاہوں میں شریک نہ ہونگے؟

گ :- کیوں نہیں، ضرور ہوں گے ۔

میں :- ان میں جب کبھی کوئی باہمی اختلاف ہوگا تو یہ اسے محض ایک نفاق یا فساد خیال کرینگے؛ یعنی دوستوں کا ایک باہمی جھگڑا۔ اسے جنگ کے نام سے موسوم نہیں کرسکتے۔

گ :- اسے ہرگز جنگ نہیں کہہ سکتے۔

میں :- وہ ان لوگوں کی طرح جھگڑینگے جو روٹھتے ہیں لیکن پھر ایک دن منے کے لیے۔

گ :- بیشک۔

میں :- یہ باہم دوستانہ اصلاح کی کوشش کریں گے۔ اپنے مخالفوں کو نہ تباہ کریں گے نہ انھیں غلام بنائیں گے؛ ایک دوسرے کے مصلح ہونگے نہ کہ دشمن۔

گ :- بیشک۔

میں :- چونکہ خود بھی یونانی ہیں اس لیے یونان میں تاخت نہ کریں گے؛ نہ کبھی مکانوں کو آگ لگائیں گے۔ نہ یہ خیال کریں گے کہ کسی شہر کی ساری کی ساری آبادی؛ مرد، عورت، بچے، یکساں انکے دشمن ہیں وہ خوب جانتے ہیں جنگ کا جرم چند اشخاص تک محدود ہوتا ہے اور اکثریت دراصل ان کی دوست ہے۔ ان وجوہ سے یہ نہ تو ان کی زمینیں خراب کرینگے نہ ان کے مکان مسمار۔ انکی دشمنی بس اس وقت تک قائم رہیگی کہ معصوم مظلوموں کی اکثریت ان چند مجرموں کو اپنے جرم کی تلافی کرنے پر مجبور کردے۔

گ :- میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہمارے شہری اپنے یونانی دشمنوں سے یہ رویہ رکھیں گے اور بربروں سے وہ طریقہ جو آج کل آپس میں برتتے ہیں۔

میں :- اچھا تو ہم اپنے محافظین کے لیے یہ قانون بھی وضع کر دیں کہ وہ نہ تو یونانیوں کی آراضی پر تاخت کریں نہ ان کے مکان جلائیں۔

گ :- ٹھیک ہے۔ اور دوسرے قوانین موضوعہ کی طرح ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بہت اچھا قانون ہے۔ لیکن میں پھر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اسی طرح چلتے گئے تو اس دوسرے سوال کو آپ بالکل بھول جائیں گے جسے اس تحقیق کے شروع میں آپ نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔ یعنی آیا یہ صورت اور یہ نظام ممکن بھی ہے؛ اور ممکن ہے تو کس طرح اس لیے کہ آپ کی تجویز اگر قابل عمل ہو تو میں اس کے تسلیم کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں کہ اس سے ریاست کو طرح طرح کے فوائد ہونگے۔ بلکہ میں تو یہ اور اضافہ کرونگا جو آپ نے چھوڑ دیا ہے یعنی ہمارے شہری بہادر ترین جنگ آزما ہونگے اور کبھی اپنی جگہ سے نہ ٹلیں گے؛ اس لیے کہ ایک دوسرے سے واقف ہوں گے اور باہم باپ، بھائی یا بیٹا کہکر ایک دوسرے کو پکارینگے۔ اور اگر یہ بھی مانا جائے کہ عورتیں بھی ان فوجوں میں شامل ہونگی خواہ پیش پیش ہوں یا عقب میں؛ دشمن کے لیے برق عذاب کی حیثیت سے ہوں یا بوقت ضرورت مردوں کو مدد پہنچانے کے لیے تو تو میرا یقین ہے کہ یہ فوج ناقابل تسخیر ہوگی۔ اس کے علاوہ بہت سے خانگی فوائد بھی ہیں جن کا ذکر اس سلسلہ میں کیا جا سکتا ہے اور میں انھیں بے کم و کاست تسلیم کرتا ہوں

لیکن چونکہ میں ان تمام فوائد کو اور انکے علاوہ جتنے آپ اور فرمائیں ان سب کو اس شرط پر تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کی یہ ریاست عالم وجود میں بھی آجائے اسلئے اب ان فوائد کے متعلق زیادہ کہنے سننے کی تو ضرورت نہیں البتہ ہمیں اب ریاست کے وجود میں آنے کے امکان اور اُس کے وسائل و ذرایع کے سوال کیطرف توجہ کرنی چاہیئے۔

میں :- میں جہاں ذرا بھٹکا کہ آپ حملہ کر دیتے ہیں اور ذرا رحم نہیں کرتے! میں پہلی اور دوسری رو سے بشکل بچا اور آپ شاید نہیں جانتے کہ آپ نے تیسری رو مہیا کر دی۔ اور یہ تیسری رو سب سے قوی اور سب سے بڑی ہے جب آپ بھی اس تیسری موج کو دیکھ بھال لیں گے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری شکل کا زیادہ خیال کرینگے اور غالباً تسلیم کریں گے کہ ایسی غیر معمولی تجویز پیش کرنے سے پہلے میرا خوف اور میری جھجک فطری تھی اور جائز۔

گ :- آپ جتنی زیادہ اس قسم کی درخواستیں کرتے ہیں اسی قدر ہمارا عزم قوی ہوتا ہے کہ آپ سے اس ریاست کے امکان کے ذرایع دریافت کرکے چھوڑینگے۔ بس کہئیے بھی۔ جلدی کیجئے۔

میں :- میں پہلے تو آپ کو یہ یاد دلادوں کہ ہم یہاں پہنچے ہیں عدل اور ناانصافی کی تلاش میں!

گ :- جی، لیکن اس سے مطلب؟

میں :- میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر ان چیزوں کی ماہیت معلوم ہو چکی ہو تو کیا عادل انسان کو کسی معاملہ میں عدل مطلق کے جادہ سے انحراف نہ کرنا چاہیئے؟ یا ہم مطمئن ہو جائینگے اگر وہ قریب قریب عادل ہو اور صفت عدل کا وجود اسمیں اور انسانوں سے زیادہ پایا جاتا ہو؟

گ :- بس قریب قریب عادل ہونا کافی ہوگا۔

میں :- مگر یاد رہے کہ ہم عدل مطلق کی ماہیت اور عادل کامل کی خصوصیات دریافت کر رہے تھے، اور اسی طرح مطلق ناانصافی کی ماہیت اور کامل غیر منصف کی خصوصیتیں۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ہمارے سامنے ان چیزوں کا ایک تصور قائم ہو جائے۔ اور ان کی تلاش اس لیے تھی کہ اس معیار سے مقابلہ کر کے اور یہ دیکھکر کہ ہم انسے کسدرجہ مشابہ یا غیر مشابہ ہیں، ہم خود اپنی خوشحالی یا عدم خوشحالی کا اندازہ کر سکیں۔ کچھ یہ تھوڑی ہی ظاہر کرنا تھا کہ یہ تصورات واقعۃً موجود بھی ہو سکتے ہیں؟

گ :- درست۔

میں :- کیا ایک مصور اسوجہ سے بُرا مصور ہو جائیگا کہ کمال ہنرمندی سے ایک حسین شکل کے خط و خال تیار کرنے کے بعد وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ آیا ایسی کر کبھی موجود بھی تھی۔

گ :- نہیں کبھی نہیں۔

میں :- اچھا تو ہم بھی تو ایک کامل ریاست کا تصور قائم کر رہے تھے۔

گ :- جی،

میں :- تو کیا ہمارا نظریہ اس وجہ سے بُرا قرار پا جائیگا کہ ہم یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ کسی شہر یا ریاست کے اس طرح مرتب ہونیکا امکان بھی ہے۔

گ :- نہیں، ہرگز نہیں۔

میں :- بیشک حقیقت تو یہی ہے۔ لیکن اگر آپ کی درخواست پر میں یہ بتلانے کی کوشش کروں کہ کن حالتوں میں ایسی ریاست کے وجود کا امکان سب سے زیادہ ہے تو میں پہلے آپ سے تمام سابقہ مسلمات کے دوہرانے کی درخواست کروں گا۔

گ :- کونسے مسلمات؟

میں :- میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا زبان کبھی بھی تصورات کی پوری ترجمانی کر سکتی ہے۔ کیا الفاظ واقعات سے زیادہ اظہار نہیں کرتے اور آدمی جو چاہے سمجھے کیا لازمی طور پر وجود حقیقت سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ کہیئے آپکا کیا خیال ہے؟

گ :- میں آپ کا ہم خیال ہوں۔

میں :- تو پھر آپ اس امر پر مصر نہ ہوں کہ عالم وجود میں جو ریاست ہو میں اُسے من وعن اپنے تصور کے مطابق ثابت کروں۔ اگر بس اتنا ہی معلوم ہو جائے کہ ہماری تجویز کے لگ بھگ کسی شہر پر کس طرح حکومت ہو سکتی ہے تو غالباً آپ تسلیم کرلیں گے کہ آپ جس امکان کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ معلوم ہو گیا۔ بس اسی پر قناعت

کیجیے گا۔ مجھے تو یقین ہی کہ میں اسپر قائل ہو جاؤنگا۔ کیوں، کیا اپ نہ ہونگے؟

گ :- ہاں ہاں، میں بھی ہو جاؤنگا۔

میں :- اس کے بعد میں یہ بتلانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ریاستوں کی کونسی غلطی ان کی موجودہ بدنظمی کا باعث ہی۔ اور وہ کم سے کم اصلاح کونسی ہی جو ریاست کو بہتر شکل میں تبدیل کر سکتی ہے۔ ممکن ہو تو اصلاح بس ایک ہی چیز کی ہونی چاہیے، یا دو کی یا غرض تبدیلیاں جسقدر کم اور جسقدر خفیف ہوں بہتر ہی۔

گ :- بیشک۔

میں :- میرے خیال میں بس اگر ایک تبدیلی کر دی جاسے تو ریاست کی اصلاح ممکن ہی۔ ہرچند یہ تبدیلی نہ آسان ہی نہ خفیف، البتہ ممکن ضرور ہی۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- میں اب اس چیز سے دوچار ہوتا ہوں جسے میں نے سب سے بڑی موجے تعبیر کیا تھا۔ اب چاہیے یہ لہر مجھے طوفان تمسخر و تحقیر میں غرق ہی کیوں نہ کر دے، حقیقت کا اظہار تو بہرحال ضروری ہی۔ اچھا تو غور سے میری بات سُنو۔

گ :- ارشاد۔

میں :- شہروں کو بلکہ نوع انسانی کو اپنے مصائب سے اُسوقت تک نجات نصیب نہ ہوگی جب تک دنیا میں فلسفی بادشاہ نہ ہوں یا بادشاہوں اور شہزادوں میں فلسفہ کی روح اور فلسفہ کی قوت نہ آجاسے یعنی جب تک سیاسی عظمت

اور عرفان حقیقت دونوں یکجا ہو جائیں اور وہ عامیانہ طبائع جو ان میں سے صرف ایک کی اتباع کرتے اور دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں علیحدہ ہونے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ ایسا ہو جائے تو ہماری ریاست عالم وجود میں آسکتی ہے اور اسی وقت اس کے لیے امکان حیات بھی ہے۔

گلاکن : میرا تو یہ خیال ہے اور اگر یہ اس درجہ مبالغہ آمیز نہ معلوم ہوتا تو میں ابتک اس کا اظہار کر چکا ہوتا۔ لوگ اسکے بڑی مشکل سے قائل ہوں گے کہ کسی اور ریاست میں شخصی یا جماعتی خوشی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں۔

گ :- جناب سقراط ! یہ آپ کہہ کیا رہے ہیں ؟ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ یہ جو الفاظ آپنے ابھی ابھی فرمائے اُنپر تو اکثر لوگ اور بہت سے معزز اشخاص فوراً اپنی عبا قبا اتار جو ہتھیار ہات پڑے لے لیکر آپ پر نہ معلوم کس نیت سے ایسے دوڑ پڑیں گے کہ آپکو علم بھی نہ ہوگا کہ آپ ہیں کہاں۔ اور اگر آپ نے پہلے سے کوئی جواب تیار نہ کر لیا تو یہ اپنی ذکاوت سے بس آپ کے ٹکڑے ٹکڑے ہی تو کر ڈالینگے۔ اور . . . . اور بجا کرینگے۔

میں :- جی جی ۔ تم نے مجھے اس مصیبت میں ڈالا۔

گ :- اچھا تو کیا۔ لیکن خیر میں آپ کو اس سے نکالنے کی بھی ہر ممکن کوشش کرونگا۔ لیکن سوائے نیک ارادہ اور نیک مشورہ کے اور میرے پاس ہی ہی کیا ؟ البتہ شاید آپ کے سوالوں کا جواب اوروں سے بہتر دے سکوں تو دے سکوں آپنے سنا،

آپ کے مددگار کا تو یہ حال ہے، اب منکرین و مخالفین کو اپنے حق بجانب ہونیکا یقین دلائیے۔

میں :- آپ جب ایسی گرانبہا امداد ہم پہنچائیں تو مجھے بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارے بچنے کی بس ایک یہ صورت ہے کہ ہم پہلے ہی بتلا دیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ فلسفی بادشاہ ہوں، تو ہماری مراد کن لوگوں سے ہے۔ اس طرح ہم اپنی بریت کر سکیں گے۔ دنیا میں بعض طبائع آپ کو ایسی ملیں گی جنھیں فلسفہ کا مطالعہ کرنا اور ریاست کا سردار بننا چاہیئے اور بعض طبائع ایسی ہوں گی جو فلسفی بننے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئیں۔ ان کی غایت جو تقلید و اتباع ہے، اقتدا نہیں۔

گ :- ہاں، تو فلسفی کی تعریف کر دیجیئے۔

میں :- سُنیئے مجھے اُمید ہے کہ جیسے تیسے اس کی تسلی بخش توضیح کر دونگا۔

گ :- فرمائیے۔

میں :- آپ کو تو یاد ہوگا اس لیے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں کہ ایک عاشق کو (بشرطیکہ وہ اس نام کا واقعی مستحق ہو) اپنے محبوب کے کسی جزو سے اظہار محبت نہ کرنا چاہیئے بلکہ کُل سے۔

گ :- میں نہیں سمجھا۔ ذرا میرے حافظہ کی مدد فرمائیے۔

میں :- اور کوئی شخص بھی آسانی سے یہی آپ کا سا جواب دے سکتا تھا لیکن آپ جیسے طرحدار آدمی کو تو معلوم ہونا چاہیئے کہ تمام وہ لوگ جو عنفوان شباب میں

ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح کسی عاشق کے سینہ میں ایک کسک پیدا کرتے یا کسی جنسی کو تحریک دیتے ہیں اور عاشق انھیں اپنی محبت آمیز توجہ کا مستحق سمجھتا ہے حسینوں کے معاملہ میں لوگوں کا طرز عمل کیا یہ نہیں ہوتا کہ اگر معشوق کی ناک ذرا چپٹی ہو تو اُسکے دلفریب چہرہ کی تعریف ہو رہی ہے؛ کسی کی بہت لمبی ناک ہے تو اُسکے شاہانہ انداز کی تحسین ہے؛ جس میں یہ دونوں باتیں نہیں تو اس میں حسن تناسب کی مدح سرائی ہے۔ اگر رنگ ذرا سیاہ ہے تو یہ مردانگی کی علامت ہے؛ صاف رنگ والے دیوتاؤں کی اولاد ہیں؛ رہے ''زرد علی'' تو ان کے تو نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی عاشق کی تلاش اور تصنیف ہے جس کے لیے زردی اگر عارض شباب پر نمودار ہو تو وہ بھی ناگوار نہیں۔ غرض وہ کونسا بہانہ ہے جو لوگ اس غرض سے نہ بنائیں گے اور کونسی بات ہے جو اس لیے نہ ڈھونڈھ لیں گے کہ بہارستان شباب کا ایک پھول بھی ان کے ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

گ:۔ اگر دلیل کی خاطر آپ مجھے معاملات عشق و محبت میں سند بناتے ہیں تو خیر مجھے منظور ہے۔

میں:۔ پھر شراب کے دلدادوں کا کیا حال ہے؟ وہ بھی یہی کرتے ہیں کہ کسی قسم کی شراب ہو، اُسے پینے کے لیے ہر طرح کا بہانہ خوشی سے ڈھونڈھ لیں گے۔

گ:۔ بہت درست۔

میں:۔ یہی حال حریص اور حوصلہ مند لوگوں کا ہے۔ پوری فوج کی قیادت

نصیب نہیں ہوئی تو ایک قطار ہی کی سہی۔ اگر بڑے اور معزز لوگ ان کی عزت نہیں کرتے تو کم حیثیت اور ہیچ لوگوں سے خراج تحسین وصول کر کے خوش ہیں بس غرض یہ ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی عزت ضرور ہو۔

گ :- جی، بالکل یہی حال ہے۔

میں :- تو میں پھر ایک مرتبہ پوچھتا ہوں کہ جب کوئی شخص کسی نوع خوبی کا دلدادہ ہوتا ہے تو پوری نوع کی آرزو رکھتا ہے یا محض ایک جزو کی۔

گ :- کُل کی۔

میں :- چنانچہ ہم فلسفی کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ حکمت و عرفان کے کسی جزو کا عاشق نہیں ہوتا بلکہ کل کا۔

گ :- بیشک، کُل کا۔

میں :- جو علم کو ناپسند کرتا ہو خصوصاً کمسنی میں ہی کہ ابھی خیر و شر میں تمیز کی قوت نہیں ہوتی، تو ایسے آدمی کو ہم فلسفی یا محب علم نہیں قرار دے سکتے۔ جو غذا سے انکار کرے وہ بھوکا نہیں اس کی اشتہا بری ہے، اچھی نہیں۔

گ :- بالکل ٹھیک۔

میں :- اس کے برعکس جسے ہر قسم کے علم کا ذوق ہو اور جو ہر بات کو سیکھنے کا متمنی ہو اور کبھی اس سے سیری نہ ہوتا ہو تو ایسے شخص کو بجا طور پر فلسفی (حکیم) کہا جا سکتا ہے۔ کیوں، میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟

گ :۔ اگر آدمی محض تجسس سے حکیم بن جاتا ہے تو تو آپ کو عجیب و غریب ہستیاں اس لقب کی مستحق ملیں گی۔ مختلف نظارے اور تماشے دیکھنے والے سب کے سب کچھ سیکھنے سے خوش ہوتے ہیں، اس لیے یہ بھی شامل کیے جانے چاہئیں۔ موسیقی کے نوسیکھیے یوں تو فلسفیوں میں کچھ نظر آتے نہیں، اس لیے کہ اپنے بن پڑے تو کبھی فلسفیانہ بحث وتحقیق کے قریب بھٹکیں بھی نہیں۔ لیکن سارے دیانیسی تہواروں میں یہ حضرات ادھر ادھر ایسے دوڑے پھرتے ہیں گویا ہمہ تن گوش ہیں اور اپنے کانوں کو ہر ترانہ کے لیے وقف شنیدن کر چکے ہیں۔ پھر چاہے یہ محفل سماع شہر میں ہو یا گاؤں میں، اس کی کچھ پروا نہیں۔ یہ حضرات ہیں کہ موجود ہیں۔ اچھا تو کیا اس وجہ سے ہم انھیں، اور ان کے ہم مذاق دوسرے لوگوں کو نیز اور چھوٹے چھوٹے فن جاننے والوں کو فلسفی قرار دیں گے؟

میں :۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو محض نقل ہیں۔

گ :۔ اور اصل پھر کون ہیں؟

میں :۔ وہ جو نظارۂ حقیقت کے دلدادہ ہیں۔

گ :۔ بہت خوب، لیکن میں ذرا آپکا مفہوم سمجھنا چاہتا ہوں۔

میں :۔ کسی اور کے سامنے اس کی تشریح شاید کچھ مشکل ہوتی، لیکن میں جو کچھ کہنے والا ہوں اُسے تم تو غالباً ضرور تسلیم کر لو گے۔

گ :۔ وہ کیا؟

میں :- چونکہ حسن قبح کی ضد ہے اس لیے یہ دو جدا جدا چیزیں ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- اور چونکہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں اسیلئے انمیں سے ہر ایک ایک چیز ہوگی

گ :- یہ بھی صحیح ہے۔

میں :- اسی طرح عدل و ناانصافی، خیر و شر اور ہر دوسری تقسیم کے متعلق یہی بیان راست آتا ہے۔ علحدہ علحدہ تو ان میں سے ہر ایک ایک وحدت ہے لیکن اعمال اور اشیا میں انکے باہم جو مجموعے بنجاتے ہیں ان کی وجہ سے یہ مختلف صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں اور بہت سے معلوم ہوتے ہیں۔

گ :- بہت ٹھیک۔

میں :- یہی امتیاز میں تماشائی یا عملی محبان فنون اور ان لوگوں میں کرتا ہوں جنکا میں نے تذکرہ کیا تھا۔ بس یہی مؤخر الذکر لوگ حقیقی فلسفی کہلانے کے مستحق ہیں

گ :- آپ یہ تفریق کس طرح کرتے ہیں ؟

میں :- یہ عاشقان نغمہ اور دلدادگان جلوہ میرے خیال میں سچ پوچھو تو اچھی آواز، عمدہ الوان، اور خوبصورت شکلوں اور انسے جو مصنوعی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، اُن کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا دماغ حسن مطلق کے نظارہ یا اسکی محبت کے یکقلم ناقابل ہوتا ہے۔

گ :- بیشک۔

میں: وہ لوگ بہت کم ہیں جو اس کا نظارہ حاصل کر سکیں۔

گ:۔ بلاشبہ۔

میں:۔ میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ ایک آدمی ہو جو حسین اشیا کا حسن تو رکھتا ہے لیکن حسن مطلق کا اسے بالکل احساس نہیں، پھر اگر کوئی اسے اس حسن کی طرف لے جانا چاہے تو یہ اس کے پیچھے پیچھے چل بھی نہیں سکتا، تو آیا یہ آدمی بیدار ہے یا خواب میں؟ سوچو۔ کیا خواب دیکھنے والا، خفتہ ہو کہ بیدار، وہ نہیں ہوتا جو غیر مماثل اشیاء کو باہم مشابہ کرے اور اصل چیز کے بجائے اس کی نقل کو قبول کرے۔

گ:۔ بیشک ایسا شخص خواب میں ہے۔

میں:۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرے شخص کا حال دیکھیے جو حسن مطلق کے وجود کو پہچانتا اور اس کے تصور کو ان اشیاء سے ممیز کر سکتا ہے جو اس تصور میں شریک ہیں اور نہ تو ان اشیاء کو تصور کی جگہ رکھتا ہے، نہ تصور کو ان اشیاء کی جگہ؛ تو یہ شخص خواب میں ہے یا بیدار۔

گ:۔ بالکل بیدار۔

میں:۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو جانتا ہے اس کے ذہن میں علم ہے، اور جو محض قیاس سے کام کرتا ہے اس میں ظن و رائے۔

گ:۔ بیشک۔

میں:۔ لیکن فرض کرو کہ یہ مؤخر الذکر شخص ہم سے جھگڑے اور ہمارے

بیان کی تردید کرے تو ایسی حالت میں کیا یہ ممکن ہو کہ اسپر اس امر کا اظہار کیئے بغیر کہ اسکے حواس میں سخت بے ترتیبی اور خبط ہی ہم کوئی جداگانہ مسکن اس کے لیے تجویز کردیں یا کوئی اور بہتر مشورہ اسے دے سکیں۔

گ :- بیشک اس غریب کو کوئی اچھا مشورہ دینا چاہیئے۔

میں :- اچھا تو آؤ سوچیں کہ اس سے کیا کہا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ پہلے تو اسے یقین دلائیں کہ بھائی تمہیں اگر کسی چیز کا علم ہی تو ہم بہت خوش ہیں تمھیں مبارک۔ لیکن ہاں اس سے ایک سوال بھی پوچھنا چاہیئے یعنی جس شخص کو علم ہوتا ہے وہ کچھ جانتا ہی یا نہیں جانتا؟ آپ اس کی طرف سے جواب دیجیئے۔

گ :- میں جواب دیتا ہوں کہ وہ کچھ جانتا ہی۔

میں :- یہ کچھ چیز موجود ہی یا موجود نہیں؟

گ :- موجود ہی۔ کیونکہ جو ہی ہی نہیں اُس کا علم کس طرح ہوسکتا ہی؟

میں :- تو کیا اس مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنے کے بعد ہم کو یقین ہو کہ وجود مطلق کے متعلق تو علم ہو یا ہوسکتا ہی؛ لیکن جو چیز بالکل غیر موجود یا معدوم ہو وہ بالکل غیر معلوم بھی ہوگی؟

گ :- اس سے زیادہ یقینی اور کیا بات ہوسکتی ہو۔

میں :- بہت خوب! لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ ہو بھی اور نہ بھی ہو تو اسے خالص وجود اور مطلق عدم وجود کے درمیان جگہ دیجائیگی۔

گ :- ہاں، انکے بین بین۔

میں :- اور جس طرح علم مطابق تھا وجود سے اور جہل لازماً وابستہ تھا عدم وجود سے اسی طرح اس عدم و وجود کے درمیانی حالت کے لیے ایک کیفیت معلوم کرنی چاہیے جو علم اور جہل کے بین بین ہو، بشرطیکہ ایسی چیز کہیں ہو بھی۔

گ :- بیشک۔

میں :- کیا آپ ظن اور رائے کا وجود تسلیم کرتے ہیں؟

گ :- بلاشبہ۔

میں :- علم اور رائے ایک ہی چیز ہیں یا مختلف صلاحیتیں؟

گ :- مختلف صلاحیتیں۔

میں :- تو اس اختلاف صلاحیت کے مطابق علم اور رائے مختلف چیزوں سے بحث بھی کرتے ہونگے؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- علم تو موجود سے متعلق ہے اور موجود کو جانتا ہے۔ لیکن ہاں آگے چلنے سے پہلے میں ایک تقسیم اور کرونگا۔

گ :- کیسی تقسیم؟

میں :- پہلے تو میں سب صلاحیتوں کو ایک گروہ میں رکھتا ہوں۔ صلاحیتیں ہماری اور دیگر اشیا کی وہ قوتیں ہیں جنکے باعث ہمارا عمل وہ ہے جو کہ ہے۔ مثلاً

باصرہ اور سامعہ کو میں صلاحیتیں نہ کہونگا۔ میں جس گروہ کا ذکر کر رہا ہوں اس کی غالباً کافی توضیح ہو گئی ہوگی؟

گ:- جی ہاں، میں سمجھ گیا۔

میں:- تو اب میں ان کے متعلق اپنا خیال ظاہر کردں۔ ان کو چونکہ میں دیکھتا نہیں اس لیے رنگ، شکل وغیرہ کا اختلاف جو دوسری چیزوں میں باہم امتیاز کرا دیتا ہی وہ انپر عائد نہ ہوگا۔ میں جب صلاحیت کا ذکر کرتا ہوں تو اسکے حیطہ اثر اور اس کے نتیجہ کا خیال میرے ذہن میں ہوتا ہی۔ جن صلاحیتوں کے حیطہ اثر اور نتیجہ ایک ہوا نھیں میں ایک صلاحیت کہتا ہوں، جنکا حیطہ عمل اور نتیجہ مختلف ہوا نھیں مختلف صلاحیتیں۔ آپ بھی کیا اسی اصول پر گفتگو کریں گے؟

گ:- جی ہاں۔

میں:- کیا آپ براہ نوازش ایک سوال کا اور جواب دیں گے؟ علم کو کیا آپ صلاحیت مانتے ہیں! اور اسے کس گروہ میں جگہ دیتے ہیں؟

گ:- بیشک، علم صلاحیت ہی، اور سب سے زبردست صلاحیت۔

میں:- اور رائے و قیاس بھی ایک صلاحیت ہی؟

گ:- بیشک کیونکہ قیاس ہی وہ صلاحیت ہی جس سے ہم رائے قائم کرتے ہیں۔

میں:- اور ابھی تھوڑی دیر ہوئی آپ نے تسلیم کیا تھا کہ علم اور رائے ایک

چیز نہیں۔

گ :۔ ہاں، تو کیا ہوا؟ کوئی معقول شخص ایک ایسی چیز کو جو غلطی اور خطا سے مبرّیٰ ہو اس چیز سے کیوں کر ملا سکتا ہی جسمیں غلطی اور خطا ہوتی ہی۔

میں :۔ سبحان اللہ۔ آپ نے نہایت خوب جواب دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ ہم ان دونوں کے فرق سے بخوبی آشنا ہیں۔

گ :۔ جی۔

میں :۔ گویا علم اور قیاس کی جُدا جُدا قوتیں ہیں؛ ان کا میدان جدا ہی اور ان کا موضوع تحقیق جُدا۔

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ علم کا موضوع یا میدان تحقیق وجود ہی، اور علم ماہیت وجود کے جاننے کا نام۔

گ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ اور قیاس گویا ایک رائے رکھنے کو کہتے ہیں۔

گ :۔ جی۔

میں :۔ ہم جو قیاس کرتے ہیں کیا اسے جانتے بھی ہیں (اسکا علم بھی رکھتے ہیں)؟ کیا قیاس اور علم کا موضوع ایک ہی ہی؟

گ :۔ نہیں، اس کے تو خلاف پہلے ہی ثابت ہو چکا ہی۔ اختلاف صلاحیت

کے معنی اگر اختلاف حیطۂ اثر اور اختلاف موضوع ہیں اور اگر علم و قیاس مختلف صلاحیتیں ہیں تو پھر ان کا میدان تحقیق ایک نہیں ہو سکتا۔

میں :۔ اگر علم کا موضوع وجود ہی تو قیاس کا اور کچھ ہونا چاہیئے۔

گ :۔ جی ہاں، کچھ اور چاہیئے۔

میں :۔ اچھا، تو قیاس کا موضوع کیا غیر وجود ہی؟ مگر معدوم اور غیر موجود کے متعلق رائے کیسے قائم ہو سکتی ہی؟ ذرا سوچو۔ جب انسان رائے قائم کرتا ہی تو کسی چیز کے متعلق ہی تو قائم کرتا ہی یا ایسی رائے رکھنا بھی ممکن ہی جو کسی چیز کے متعلق نہو؟

گ :۔ یہ تو ناممکن ہی۔

میں :۔ جو شخص رائے رکھتا ہی وہ کسی چیز کی بابت رکھتا ہی۔

گ :۔ جی۔

میں :۔ اور معدوم و غیر موجود چیز نہیں ہوتی۔

گ :۔ درست۔

میں :۔ غیر موجود کا لازمی نصیب تو جہل تسلیم کیا گیا تھا اور وجود کا علم۔

گ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ تو گویا رائے موجود اور غیر موجود دونوں میں سے کسی سے تعلق نہیں رکھتی۔

گ :۔ جی ہاں، کسی سے نہیں۔

میں :۔ چنانچہ یہ نہ علم ہی، نہ جہل۔

گ :- یہ تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

میں :- لیکن ہمیں اسے کی تلاش کیا ان دونوں کے باہر اور اُلٹنے پرے کرنی چاہیئے یعنی علم سے زیادہ صفائی اور وضاحت میں یا جہل سے زیادہ تاریکی میں؟

گ :- دونوں میں سے کسی میں نہیں۔

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے خیال میں رائے علم سے کچھ تاریک اور جہل سے کچھ روشن ہوتی ہے۔

گ :- جی، اور یہ کیا کوئی خفیف اختلاف ہے؟

میں :- ہاں، اور رائے علم اور جہل کی حدود کے اندر اور ان کے بین بین ہی ہوتی ہے نا؟

گ :- جی ہاں،

میں :- گویا آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ قیاس رائے درمیانی چیز ہے۔

گ :- بلا شبہ۔

میں :- تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ ہم کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی چیز ایسی ہو کہ ایک ہی وقت میں ہو بھی اور نہ بھی ہو، تو وہ خالص وجود اور مطلق غیر موجود کے درمیان رکھی جائیگی اور اس کے مطابق صلاحیت نہ علم ہوگی نہ جہل بلکہ ان کے بین بین ایک کیفیت۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اس بیچ کے فصل میں ہمیں ایک چیز معلوم ہوئی ہی جسے ہم رائے و قیاس سے موسوم کرتے ہیں۔

گ :- جی ہاں،

میں :- اب جس کا پتہ لگانا ہو وہ وہ چیز ہی جو موجود اور غیر موجود دونوں کی ماہیت کی حامل ہو، اور جو نہ خالص موجود کہی جا سکے نہ محض غیر موجود۔ یہ نامعلوم لفظ جب معلوم ہو جائے گا تو یہی بجا طور پر صلاحیت رائے و قیاس کا موضوع قرار پائے گا۔ پھر سب موضوع اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق کر دیے جائیں گے، دونوں انتہائی موضوع انتہائی صلاحیتوں کے اور درمیانی موضوع درمیانی صلاحیت کے۔

گ :- درست۔

میں :- جب یہ طے ہو چکا تو میں اب ان حضرت سے ایک سوال کروں گا جنکی رائے میں حسن کا کوئی عین اور غیر متغیر تصور نہیں ہی۔ جن کے نزدیک حسن کثرت میں ہی، وہی، وہی آپ کے نظارہائے حسین کے دلدادہ جنھیں اس امر کا اظہار گوارا نہیں کہ حسن ایک وحدت ہی اور اسی طرح عدل وحدت ہی اور دوسری چیزیں بھی۔ میں ان حضرت کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ " جناب عالی۔ کیا آپ از راہ نوازش تمام حسین و جمیل چیزوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی بتلا سکتے ہیں جو بھونڈی اور بدشکل بھی نہ معلوم ہوتی ہو، یا کوئی انصاف و عدل کی

ایسی مثال جو غیر منصفانہ بھی نہ پائی جائے، یا کوئی ایسی مقدس چیز جو ناپاک بھی نہ ہو؟

گ :- نہیں، ہر حسین کسی نہ کسی پہلو سے ضرور بھونڈا اور بد شکل معلوم ہوگا، اور یہی حال دوسری چیزوں کا ہے۔

میں :- بہت سی چیزیں جو دوگنی ہیں کیا وہ آدھی بھی نہیں یعنی اگر کسی کی دوچند ہیں تو کسی کی نصف؟

گ :- جی۔

میں :- جن چیزوں کو ہم بھاری یا ہلکا، بڑا یا چھوٹا کہتے ہیں کیا یہی بالکل اُلٹے نام سے نہیں پکاری جاسکتیں، یعنی بھاری کو ہلکا، بڑے کو چھوٹا، کہ یہ سب اعتباری الفاظ ہیں۔

گ :- ہاں ہاں، دونوں نام عائد ہوسکتے ہیں۔

میں :- اور کیا ان بہت سی چیزوں کے متعلق جنھیں مخصوص ناموں سے پکارتے ہیں کبھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہیں اور کبھی یہ کہ نہیں؟

گ :- یہ چیزیں تو ان پہیلیوں کی سی حیثیت رکھتی ہیں جنھیں لوگ دعوتوں کے موقعوں پر پوچھا کرتے ہیں یا بچوں کے اُس معمہ کی سی جس میں وہی خواجہ سرا نے چمگادڑ کا نشانہ لیا تھا۔ اسی میں تو پوچھتے ہیں کہ اس نے چمگادڑ کو کاہے سے مارا اور چمگادڑ بیٹھا کاہے پر تھا۔ جن انفرادی چیزوں کا میں نے ذکر کیا

وہ بھی ایک معمہ ہیں اور دوہرے معنی رکھتی ہیں۔ آپ انھیں اپنے ذہن میں نہ تو موجود کی حیثیت سے قائم کر سکتے ہیں نہ غیر موجود کی طرح، نہ یہی ہی کہ دونوں ہوں یا پھر ایک بھی نہ ہوں۔

میں :- تو اب ان کے ساتھ آپ کرینگے کیا؟ کیا وجود و عدم وجود کے درمیانی جگہ سے کوئی اور بہتر جگہ ان کے لئے نکل سکتی ہی۔ یہ ظاہر ہی کہ یہ غیر موجود و معدوم سے زیادہ تاریکی اور عدم میں تو نہیں ہیں اور نہ موجود سے زیادہ روشنی اور وجود میں۔

گ :- یہ تو بالکل صحیح ہی۔

میں :- تو معلوم یہ ہوتا ہی کہ ہم نے یہ پتہ لگایا کہ عوام حسن اور دوسری چیزوں کے متعلق جو بہت سے خیالات و تصورات رکھتے ہیں وہ سب کے سب ایسی چیزوں کی بابتہ ہیں جو اس علاقہ میں ماری پھرتی ہیں جو خالص وجود اور بالکل غیر موجود کے درمیان واقع ہی۔

گ :- جی ہاں، یہی پتہ چلا۔

میں :- اور یہ ہم پہلے ہی طی کر چکے ہیں کہ اس قسم کی جس چیز کا بھی پتہ چلیگا وہ موضوع قیاس قرار پائیگی نہ کہ موضوع علم۔ یعنی یہ وہ درمیانی برزخ ہی جو درمیانی صلاحیت کے حصہ میں آتا ہی

گ :- بالکل بجا۔

میں :- تو پھر جو لوگ بہت سی حسین اور جمیل چیزیں تو دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی نہ تو

حُسنِ مطلق کا نظارہ انھیں نصیب ہی، نہ وہ کسی ایسے راہبر کا تتبع ہی کرنے میں جو اُس کی راہ بتلا سکے؛ یا وہ لوگ جو کثرت سے عادل تو دیکھتے ہیں لیکن عدلِ مطلق کو نہیں دیکھتے یا ان جیسے اور لوگ، ان سب کو قیاس رائے کا عامل کہا جا سکتا ہی علم کا نہیں۔

گ :- یقیناً۔

میں :- لیکن جو حقیقتِ مطلق ابدی و غیر متبدل کا نظارہ کرتے ہیں وہ تو حامل علم ہیں؛ یہ صرف رائے ہی رائے نہیں رکھتے۔

گ :- اس سے کیسے انکار ہو سکتا ہی۔

میں :- ایک گروہ تو موضوعِ علم سے محبت کرتا اور اُسے سینہ سے لگاتا ہے، دوسرا گروہ موضوعِ قیاس سے۔ یہ دوسرا گروہ انھیں لوگوں کا ہی جو سامعہ نواز ترانے سُنتے اور نظر فریب نظارے دیکھتے تھے لیکن حسنِ مطلق کا وجود انھیں گوارا نہ تھا۔

گ :- جی ہاں، مجھے یاد ہی۔

میں :- تو اگر انھیں بجائے شیفتگانِ معرفت کے محبانِ قیاس و رائے کہیں تو کیا کچھ بیجا ہوگا؟ اور کیا واقعی اس پر یہ ہم سے بہت ناراض ہو جائینگے؟

گ :- نہیں نہیں میں سمجھا دونگا کہ خفا نہ ہوں۔ امرِ حق پر کسی کو ناراض نہ ہونا چاہیئے۔

میں :- اسکے برعکس جو لوگ ہر شئے میں حقیقت کے دلدادہ ہیں انھیں محبانِ معرفت و حکمت کہا جائیگا نہ کہ شیدائیانِ قیاس و رائے۔

گ :- یقیناً۔

ریاست

باب ششم

فلسفہ حکومت

میں :- گلاکن ! اسقدر طول طویل دلیل و بحث کے بعد بالآخر سچے اور جھوٹے فلسفیوں کی حقیقت ظاہر ہوگئی۔

گ :- میں تو سمجھتا ہوں کہ بحث میں اختصار ممکن ہی نہ تھا۔

میں :- ہاں غالباً نہ تھا۔ لیکن اگر بحث اسی ایک موضوع تک محدود رہتی اور دوسرے سوالات منتظر تحقیق نہ ہوتے، جنپر غور اور نظر اس شخص کے لیے از بس ضروری ہی جو عدل اور نا انصافی کی زندگی میں وجہ امتیاز معلوم کرنا چاہتا ہی، تو میرا یقین ہی کہ ہم فلسفیوں کی ان دو اقسام کا بہتر نظارہ کر سکتے۔

گ :- تو اب اس کے بعد دوسرا مسئلہ کیا ہی

میں :- یقیناً وہی سوال جو ترتیب سے اسکے بعد پیدا ہوتا ہی۔ یعنی چونکہ فلسفی ہی حقیقت ابدی و غیر متبدل کو پا سکتے ہیں اور جو لوگ کثرت اور تغیر کے میدان میں دشت پیمائی کرتے ہیں وہ فلسفی نہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ ان میں سے کونسا گروہ

ہماری ریاست کا حکمراں ہو؟

گ :- اس سوال کا صحیح جواب کس طرح دیا جائے؟

میں :- یوں کہ ان میں سے جو گروہ بھی ہمارے قوانین اور تنسیقات کی بہتر حفاظت کر سکے بس اسی کو ہم اپنا محافظ بنائیں۔

گ :- بہت خوب۔

میں :- اسمیں بھی کلام نہیں کہ جس محافظ کو کوئی چیز قائم و سلامت رکھنی ہو اسکے آنکھیں ہونی چاہیئیں یہ نہیں کہ اندھا ہو۔

گ :- اس میں کیا کلام ہے۔

میں :- اور کیا وہ لوگ جو ہر چیز کے حقیقی وجود کے علم سے محروم ہیں جنکی روح میں کوئی صاف نمونہ موجود نہیں، جو اس قابل نہیں کہ مصور کی طرح حقیقت مطلق کو دیکھ سکیں اور پھر اس اصلیت کی طرف رجوع کریں اور دوسری دنیا کا کامل مشاہدہ کر کے اس عالم میں حسن و نیکی اور عدل کے متعلق قوانین نافذ کر سکیں (بشرطیکہ پہلے سے ان قوانین کا نفاذ نہ ہو چکا ہو) اور پھر ان کے ترتیب و نظام کو برقرار و محفوظ رکھ سکیں۔ جن لوگوں میں یہ کوئی بات موجود نہو کیا وہ اندھے نہیں؟

گ :- سچ ہے۔ وہ تقریباً اسی حال میں ہیں۔

میں :- پھر کیا یہ لوگ ایسی حالت میں ہمارے محافظ ہو سکتے ہیں کہ دوسر

ایسے لوگ موجود ہوں جو تجربہ میں ان کے ہم پلہ اور کسی خاص خوبی میں ان سے کم نہ ہونے کے علاوہ ہر چیز کی اصل حقیقت کا علم بھی رکھتے ہیں۔

گ:۔ کوئی وجہ نہیں کہ جن لوگوں میں یہ بہترین صفت موجود ہو انھیں مسترد کیا جائے۔ انھیں کو ہمیشہ تقدم حاصل ہونا چاہئے بشرطیکہ یہ کسی دوسری حیثیت سے کم نہ ہوں۔

میں:۔ اچھا تو اب یہ معلوم کریں کہ یہ لوگ اس خوبی کے ساتھ دوسرے محاسن کو کہاں تک یکجا کر سکتے ہیں؟

گ:۔ ضرور۔

میں:۔ جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں سب سے پہلے تو فلسفی کی ماہیت دریافت کرنی چاہیئے۔ اسکے متعلق پہلے ایک سمجھوتہ ہو جائے۔ جب یہ ہو گیا تو غالباً (اگر میں غلطی پر نہ ہوں) ہم یہ بھی تسلیم کرلیں گے کہ صفات کی یہ یکجائی ممکن ہے۔ اور صرف وہی لوگ حکام ریاست ہو سکتے ہیں جن میں یہ صفات متحد و یکجا ہوں۔

گ:۔ آپ کا کیا مطلب ہے

میں:۔ فرض کیجیے کہ فلسفیانہ دماغ ہمیشہ ایسے علم سے انس رکھیں گے جو انھیں اشیار کی اس ازلی ماہیت سے آگاہ کرے جو کون و فساد سے متغیر نہو

گ:۔ ٹھیک ہے۔

میں:۔ یہ بھی فرض کیجئے کہ وہ کُل کے کُل وجود حقیقی سے محبت کرتے ہیں۔

اور کوئی حصہ بڑا ہو یا چھوٹا کم قابل عزت ہو یا زیادہ، وہ اُسے ترک کرنے کے لیے راضی نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے عاشق اور حریص انسان کے متعلق کہہ چکے ہیں۔

گ :- درست۔

میں :- اور اگر ان لوگوں کی یہی حالت ہے جو ہم نے بیان کی تو کیا ان میں ایک اور صفت کا ہونا ضروری نہیں؟

گ :- وہ کیا صفت؟

میں :- صداقت۔ یہ لوگ کبھی اپنے ذہن میں ارادۃً دروغ و کذب کو جگہ نہ دینگے۔ دروغ سے تو یہ سخت نفور رہوں گے اور صداقت کے دلدادہ۔

گ :- جی ہاں، انکے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

میں :- کیا جا سکتا ہے، نہیں بلکہ کہئے کہ کیا جانا چاہیئے، کیونکہ جس طبیعت میں کسی چیز کی محبت ہے وہ اپنے محبوب کے متعلقات اور ملتی جلتی چیزوں سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گ :- بجا۔

میں :- کیا کوئی اور چیز علم و حکمت سے اس درجہ ملتی جلتی ہے جتنی کہ صداقت؟

گ :- اور کون چیز ہو سکتی ہے؟

میں :- کیا ایک ہی طبیعت علم و حکمت کی عاشق بھی ہو سکتی ہے اور دروغ و کذب کی بھی؟

گ :- کبھی نہیں۔

میں :- سچے محب علم کو تو اوائل عمر ہی سے حتی الامکان تمام حق و صداقت کی آرزو ہونی چاہیئے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اس کے علاوہ ہم تجربہ سے جانتے ہیں کہ کسی شخص کی خواہشات ایک طرف قوی ہوتی ہیں تو دوسری جانب کمزور ہو جاتی ہیں اس کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس کا پانی ایک طرف نالی سے نکال لیا گیا ہو۔

گ :- بیشک۔

میں :- چنانچہ جس شخص کی تمام خواہشات بس جملہ انواع علم کی طرف منعطف ہوں وہ تو لذات روحانی میں محو ہو جائے گا اور لذات جسمانی مشکل سے محسوس کریگا۔ لیکن میرا مطلب حقیقی فلسفی سے ہے یونہی کسی ایسے ویسے سے نہیں۔

گ :- یہ تو یقینی امر ہے۔

میں :- ایسا آدمی یقیناً معتدل مزاج اور باعفت ہوگا اور لالچی کی ضد کیونکہ اس کی طبیعت میں ان محرکات کی جگہ ہی نہیں جو دوسروں کو پانے اور صرف کرنے کا آرزومند بناتے ہیں۔

گ :- درست۔

میں :- اسکے علاوہ فلسفیانہ طبیعت کا ایک اور معیار بھی قابل توجہ ہے۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- یعنی اس میں دناءت اور بے مروتی کے لیے کوئی مخفی جگہ نہ ہو۔ جو طبیعت الٰہی اور انسانی اشیاء کی کلیت کی آرزو رکھتی ہو اس کے لیے کم ظرفی اور کمینہ پن سے زیادہ کوئی چیز مخالف نہیں ہو سکتی۔

گ :- بالکل بجا۔

میں :- تو جس شخص میں شوکت و علو ذہنی ہو، اور جو کل زمانہ اور کل وجود کا ناظر ہو، وہ انسانی زندگی کو بہت اہمیت کیسے دے سکتا ہے۔

گ :- جی ہاں، نہیں دے سکتا۔

میں :- اور کیا ایسا آدمی موت کو خطرناک متصور کر سکتا ہے؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اور کیا یہ شخص جس کی طبیعت کی ترکیب نہایت ہموار ہوئی ہے، جو نہ لالچی ہے نہ کم ظرف، شیخی خور ہے نہ بزدل، میں پوچھتا ہوں کیا یہ شخص کبھی اپنے معاملات میں غیر منصف اور متشدد ہو سکتا ہے؟

گ :- ناممکن۔

میں :- تو پھر تم آسانی سے دیکھ سکتے ہو کہ آیا ایک شخص منصف مزاج اور شریف ہے یا اکھڑ اور وحشی۔ یہ وہ علامات ہیں جو کمسنی ہی میں فلسفیانہ اور غیر فلسفیانہ طبائع کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیتی ہیں۔

گ :- درست۔

میں :- ایک اور بات بھی ہے جس پر نظر کر لینی چاہیئے۔

گ :- وہ کیا۔

میں :- وہ یہ کہ آیا سیکھنے تحصیل علم سے اسے کچھ لذت اور حظ حاصل ہوتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ کوئی آدمی ایسی چیز سے محبت نہیں کرتا جو اُسے کرب والم پہنچاتی ہو یا جس میں بہت محنت کے بعد وہ تھوڑی سی ترقی کرتا ہو۔

گ :- یقیناً نہیں۔

میں :- یا اگر وہ بھول جاتا ہے اور جو کچھ سیکھتا ہے اُسے محفوظ نہیں رکھ سکتا تو بس یہ ظرف خالی کا خالی رہیگا۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اس سعی لاحاصل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بالآخر خود اپنی ذات اور اپنے بے فائدہ شغل دونوں سے نفرت کرنے لگیگا۔

گ :- جی۔

میں :- چنانچہ جس روح میں نسیان ہو وہ حقیقی فلسفیانہ طبائع میں شمار نہیں کیجا سکتی، ہمیں اس بات پر اصرار کرنا چاہیئے کہ فلسفیوں کا حافظہ اچھا ہو

گ :- بیشک۔

میں :- تم نے پھر دیکھا کہ ناہموار اور بھدی طبیعت کا رُجحان عدم تناسب

کی طرف ہے۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- اور تم صداقت کو تناسب سے متعلق سمجھتے ہو یا عدم تناسب سے؟

گ :- تناسب سے۔

میں :- تو علاوہ دیگر صفات کے ہمیں ایسے دماغ کی تلاش کرنی چاہیئے جو اپنے اندر فطرتاً حسن تناسب و شرافت رکھتا ہو اور خود بخود تمام اشیاء کے وجود حقیقی کی طرف حرکت کرے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- کیا یہ تمام صفات جنھیں ہم ایک ایک کرکے گنا رہے ہیں یکجا نہیں ہوتیں اور ایسی روح کے لیے جو وجود میں بدرجہ اتم و اکمل شرکت کرے یہ سب گویا ایک طرح لازمی نہیں۔

گ :- قطعاً لازمی ہیں۔

میں :- تو اس علم پر کون حرف رکھ سکتا ہے جس کا اکتساب وہ شخص کرے جو ذکی الفہم ہو اور اچھا حافظہ رکھتا ہو شریف ہو اور شفیق اور صداقت انصاف جرأت و اعتدال کو دوست رکھتا ہو کہ یہ اس کے مجانس ہیں۔

گ :- اس علم میں تو رشک کا دیوتا تک کوئی برائی نہیں نکال سکتا۔

میں :- چنانچہ ایسوں کو اور صرف ایسوں کو ہم اپنی ریاست سپرد کرینگے

جب عمر اور تعلیم سے ان کی تکمیل ہو جائے۔ یہاں ایڈیمینٹس نے بات کاٹی اور کہنے لگے "جناب سقراط! آپ کے ان بیانات کا تو کوئی جواب نہیں دے سکتا لیکن جب آپ اس طرح گفتگو کرتے ہیں تو آپ کے سامعین کے ذہن میں ایک عجیب احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دلیل کے ہر قدم پر وہ حقیقت سے تھوڑا سا ہٹ جاتے ہیں اور یہ اس لیے کہ انھیں سوالات پوچھنے اور ان کا جواب دینے میں کافی مہارت نہیں۔ یہ تھوڑا تھوڑا مل کر بہت ہو جاتا ہے اور اختتام بحث پر معلوم ہوتا ہے کہ انھیں سخت شکست ہوئی۔ اور بظاہر ان کے تمام سابقہ خیالات بالکل الٹ جاتے ہیں جس طرح شطرنج میں ایک ماہر کھلاڑی اپنے غیر ماہر حریف کے تمام گھر بند کر دیتا ہے اور وہ کوئی چال نہیں چل سکتا اسی طرح یہ بیچارے محسوس کرتے ہیں کہ بالآخر گھر گئے۔ چونکہ اس نئے کھیل میں جس کے مہرے الفاظ ہیں ان کے پاس کوئی چال باقی نہیں رہی لیکن باوجود اسکے در اصل وہی حق پر ہیں۔ اسوقت ہمارے سامنے جو ہو رہا ہے اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا۔ کیونکہ ہم میں سے ہر ایک یہ کہہ سکتا ہے کہ باوجودیکہ وہ دلیل کی ہر منزل پر الفاظ سے آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاہم وہ اثبات کو بطور واقعہ کے دیکھتا ہے کہ فلسفے کے وہ دلدادہ جو اس کا مطالعہ صرف جوانی ہی میں بطور جزو تعلیم کے نہیں بلکہ اپنی آخری عمر کے شغل کے طور پر بھی جاری رکھتے ہیں، ان میں سے اکثر اگر مطلق بدمعاش نہیں تو کچھ عجیب

مسخ سے ضرور رہو جاتے ہیں۔ اور ان میں کے بہترین لوگ اسی مطالعہ کے باعث جس کی آپ استقدر تعریف کر رہے ہیں دنیا کے لیے بیکار ہو جاتے ہیں۔

میں:- اچھا تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کیا وہ آپکے خیال میں غلط کہتے ہیں؟

ایڈ:- میں نہیں کہہ سکتا، البتہ میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

میں:- تو لیجیے میرا جواب سنیئے۔ میری رائے ہی کہ یہ لوگ بالکل سچ کہتے ہیں۔

ایڈ:- جب ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ لوگ شہر کے لیے مفید نہیں تو پھر آپ یہ کس طرح فرماتے ہیں کہ شہر اسوقت تک برائی سے نہ باز رہیں گے جب تک فلسفی ان میں حکومت نہ کریں۔

میں:- آپ نے ایسا سوال کیا ہی جسکا جواب صرف ایک تمثیل سے دیا جاسکتا ہی۔

ایڈ:- جی ہاں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس طریق کلام کے بالکل عادی نہیں!

میں:- ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے اس مشکل بحث میں ڈال کر آپ نہایت محظوظ ہیں۔ لیکن اب میری تمثیل سُنیئے، اس کے بعد میری تنگی تخیل سے آپ اور بھی محظوظ ہوں گے۔ کیونکہ بہترین آدمیوں کے ساتھ ان کی ریاستوں میں جس طرح سلوک ہوتا ہی وہ اس درجہ رنج دہ ہی کہ دنیا میں کوئی اور چیز اسکے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی اور اس لیے اگر میں ان کی طرف سے وکالت

کروں تو مجھے افسانہ کا سہارا لینا ہوگا اور بہت سی چیزیں ملا کر ایک شکل کھڑی کرنی ہوگی جیسے بکروں اور بارہ سنگھوں کی خیالی ترکیب تصویروں میں ملتی ہے اچھا تو ایک بحری بیڑے یا ایک جہاز کا تصور کیجیے جس کا کپتان دوسرے ملاحوں سے مضبوط اور زیادہ قدآور ہے لیکن ذرا اونچا سنتا ہے، اس کی بصارت بھی ذرا کمزور ہے اور فن جہازرانی میں بھی اس کا علم دوسروں سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ملاح ناخدائی کے بارہ میں ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ ہر شخص کی رائے ہے کہ اسے ناخدائی کا حق ہے اگرچہ اسنے کبھی جہازرانی کا فن نہیں سیکھا اور یہ نہیں بتا سکتا کہ کب اور کس نے اسے یہ فن سکھایا بلکہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے یعنی دعوی کرتا ہے کہ یہ فن سکھایا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی شخص اسکے مخالف کچھ کہے تو یہ لوگ اسے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تیار ہیں۔ یہ سب کے سب کپتان کے گرد جمع ہوتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ سکان انکے سپرد کر دیا جائے اور اگر کبھی ایسا ہو کہ ان کی بات نہ مانی جائے اور دوسروں کو ان پر ترجیح دیجائے تو یہ ان دوسروں کو مار کر جہاز سے پھینک دیتے، اور پہلے شریف کپتان کے حواس کو شراب یا کسی منشی دوا سے محبوس کر کے یہ لوگ علم بغاوت بلند کرتے ہیں اور جہاز پر قبضہ کر کے ذخائر کو خوب اللے تللے سے اڑاتے ہیں۔ اور اس طرح کھاتے اڑاتے اپنے سفر کو بس اس طرح جاری رکھتے ہیں جیسی کہ ایسے لوگوں سے توقع ہو سکتی ہے۔
جوان کا شریک ہے اور چالاکی سے ان کی اس سازش میں مدد دیتا ہے، کہ یہ جبر یا ترغیب سے

جہاز کو کپتان کے ہات سے نکال کر اپنے قابو میں لے آئیں" اسے یہ ملاح، ناخدا، قابل جہاز راں کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو بُرا بھلا کہتے اور بیکار محض بتلاتے ہیں۔ لیکن ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ حقیقی ناخدا کیلیے (اگر وہ دراصل جہاز پر حکومت کے قابل ہونا چاہیے) ضروری ہے کہ موسم، وقت آسمان کی کیفیت، ستاروں، ہواؤں اور اپنے فن کے دیگر متعلقات کی طرف توجہ کرے، اور خواہ دوسرے لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں اسی کو جہاز کا ناخدا ہونا چاہیے اور وہی ہوگا۔ الغرض اختیار اور فن ناخدائی کا یہ اتحاد کبھی ان لوگوں کے خیالات میں اچھی طرح داخل نہیں ہوا۔ اب تم ہی سوچو کہ ایک ایسے جہاز میں جو بغاوت کی حالت میں ہے، باغی ملاح سچے ناخدا کو کس نظر سے دیکھیں گے۔ کیا یہ سب اسے خواہ مخواہ بکواس کرنے والا، خیالی پلاؤ پکانے والا اور بیکار محض نہ کہیں گے؟

ایڈ:۔ بیشک۔

میں:۔ غالباً اب آپ کو اس تشبیہ کی مزید تشریح کی ضرورت نہ ہوگی کہ یہ ریاست اور سچے "فلسفی کا تعلق بیان کرتی ہے، آپ نے شاید اسے ابھی سے سمجھ لیا ہے۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اچھا تو آپ اس تمثیل کو ان حضرات کے پاس لیجائیے جو اس بات پر متعجب تھے کہ شہروں میں فلسفیوں کی کوئی عزت نہیں۔ انھیں یہ اچھی طرح سمجھا دیجیے اور باور کرانے کی کوشش کیجیے کہ ان لوگوں کا شہروں میں معزز ہونا زیادہ

غیر معمولی اور تعجب خیز ہوتا۔

ایڈ:۔ میں ضرور ایسا کرونگا۔

میں:۔ اسنے کہیے کہ فلسفہ کے دلدادوں کو باقی دنیا کے لیے بیکار سمجھنے میں وہ صحیح ہیں لیکن نہیں آپ یہ بھی بتلا دیجئے کہ ان کی بیکاری کو اُن لوگوں کی غلطی سے منسوب کرنا چاہیے جو اُنسے فائدہ نہیں اٹھاتے نہ کہ خود ان کی ذات سے: ناخدا کو یہ تھوڑی ہی چاہیئے کہ ملاحوں سے بعجز التجا کرے کہ وہ اس کے احکام مانیں۔ یہ نظام فطرت نہیں۔ نہ یہ ہو سکتا ہی کہ "عقلاء دولتمندوں کے در پر جائیں"۔ اس مقولہ کے چالاک مصنف نے ایک کذب کا اظہار کیا ہی۔ بلکہ حقیقت یہ ہی کہ جب آدمی بیمار ہوتا ہی تو خواہ غریب ہو خواہ امیر اسے طبیب کے پاس جانا ہوتا ہی، اسی طرح جو اپنے اوپر حکومت کرانا چاہتا ہی اُسے ایسے شخص کے پاس جانا ہوگا جو حکومت کرنے کے قابل ہی۔ جس حاکم میں کچھ بھی خوبی ہی اسے ہرگز اپنی رعایا سے التجا نہ کرنی چاہیئے کہ میرے محکوم بنو، اگرچہ نوع انسانی کے موجودہ حکمراں ذرا دوسری قسم کے ہیں۔ ان کی مثال تو باغی ملاحوں کی سی ہی اور سچے ناخدا کی مثال ان کی سی جنھیں یہ باغی بیکار محض اور خیالی پلاؤ پکانے والا کہتے ہیں۔

ایڈ:۔ بالکل سچ ہی۔

میں:۔ اس قسم کے لوگوں میں اور مذکورہ وجوہ سے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ گروہ مخالف فلسفہ کی، کہ اشرف ترین مشاغل ہی، کچھ زیادہ عزت

کرے۔ اور یہ نہیں کہ اس علم کو اپنے مخالفوں سے ہی شدید ترین اور پائدار نقصان پہنچتا ہی بلکہ خود اپنے نام نہاد متبعین سے، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق آپ کے فرضی مستغیث نے کہا تھا کہ ان میں سے اکثر، ہر خود غلط بدمعاش اور اُن کے بہترین بیکار محض ہوتے ہیں۔ اور اس رائے سے میں نے اتفاق کیا تھا

ایڈ:۔ جی

میں:۔ ان میں سے اچھوں کے بیکار ہونے کی وجہ تو ظاہر ہو گئی۔

ایڈ:۔ درست۔

میں:۔ اب کیا ہم یہ بتلائیں کہ اس گروہ میں اکثریت کی تخریب بھی ناگزیر ہو اور گذشتہ بالا صورت کی طرح یہ بھی فلسفہ کی فرد جرائم میں نہیں شامل ہو سکتا ہی؟

ایڈ:۔ ضرور فرمائیے۔

میں:۔ اچھا، تو باری باری سوال و جواب کریں، اور سب سے پہلے نرم اور شریف طبیعت کے بیان کی طرف ذرا پھر رجوع کریں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حق اس کا رہنما تھا، جس کی اتباع وہ ہمیشہ اور ہر چیز میں کرتا ہی؛ اگر یہ نہیں تو وہ کذاب ہی اور حقیقی فلسفہ میں اس کا نہ کوئی دخل ہی نہ کوئی حصہ۔

ایڈ:۔ جی ہاں، یہ بات تو ہو چکی ہی۔

میں:۔ دوسری صفات کا تو ذکر ہی کیا، کیا فلسفی کا جو موجودہ تخیل ہی اس سے خود یہی صفت بالکل بعید ہی۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- اور کیا ہم اس کی وکالت میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ علم کا سچا عاشق ہمیشہ وجود حقیقی کی تلاش میں کوشاں ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ یہ اس کی فطرت ہی ہے۔ افراد کی اس کثرت میں جو صرف ظاہری ہو اسے چین نہ پڑے گا، بلکہ اپنی آرزو کی تیز دھار کو کند کیے بغیر اور اپنی خواہش کی قوت میں کمی کیے بن وہ برابر بڑھتا چلیگا حتیٰ کہ اپنی روح کی مماثل اور ہمدردانہ قوت سے ہر اصلیت کی حقیقی ماہیت کا علم حاصل کر لے، اور اس قوت کے ذریعہ وجود حقیقی سے قرب و اختلاط پیدا کرے اور بالآخر اس میں مل جائے جب اس طرح ذہن اور صداقت پیدا ہو جائیں تو اسے علم حاصل ہوگا اور اب یہ صحیح معنوں میں زندگی گذارے گا اور نشو و نما پائیگا۔ کیوں اس وقت جا کر اسکی تکلیف وہ محنت ختم ہوگی، اس سے پہلے نہیں۔

ایڈ :- اس توضیح سے صحیح تر اس کا کوئی بیان نہیں ہو سکتا۔

میں :- اور کیا جھوٹ کی محبت فلسفی کی طبیعت کا جزو ہوگی؟ کیا وہ جھوٹ سے مطلقاً نفرت نہ کریگا؟

ایڈ :- ضرور کریگا۔

میں :- اور جب صداقت رہنما اور سردار ہو تو جس گروہ کی یہ قائد ہے اس میں ہم کسی برائی کا شبہ نہیں کر سکتے؟

ایڈ :- ناممکن۔

میں :- عدل اور صحت ذہنی ان کے ہمراہ ہونگے اور عفت و اعتدال بھی پیچھے

ایڈ :- درست۔

میں :- اب غالباً اسکی ضرورت نہیں کہ میں پھر فلسفی کے تمام محاسن کو سامنے لاؤں، آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ جرأت، فراخدلی، ذکاوت، حافظہ، اس کے فطری صفات ہونگے۔ اسپر آپ نے اعتراض کیا تھا کہ اگرچہ میرے اس قول سے انکار ممکن نہیں، تاہم اگر الفاظ کو چھوڑکر واقعات پر نظر کی جائے تو جن لوگوں کا یوں ذکر ہو رہا تھا ان میں سے بعض بین طور پر بیکار اور اکثر مطلقاً بدمعاش ہیں۔ اسپر ہمنے ان الزامات کے وجوہ دریافت کیے، اور اب اس سوال پر پہونچے تھے کہ یہ اکثریت کیوں خراب ہی اور اس سوال نے ضرورتاً ہمیں سچے فلسفی کی تعریف اور تحقیق کیطرف رجوع کرایا۔

ایڈ :- بالکل بجا۔

میں :- اب اس کے بعد ہمیں فلسفیانہ طبائع کی تخریب پر غور کرنا ہی کہ اتنے بہت سے کیوں خراب ہو جاتے ہیں اور کیوں اتنے کم بگڑنے سے بچتے ہیں۔ میں انکا ذکر کر رہا ہوں جنھیں بیکار کہا گیا ہی شریر نہیں۔ جب ہم انسے نبٹ چکیں گے تو پھر فلسفہ کے نقالوں کا ذکر کریں گے، کہ کیس قسم کے لوگ ہیں جو اس پیشہ کے متمنی ہیں جو انسے بالاتر ہی اور جس کے وہ اہل نہیں، اور جو اپنے گوناگوں تناقض و تضاد نفسی سے فلسفہ اور تمام فلسفیوں پر وہ عالمگیر ملامت عائد کراتے ہیں جو ہماری گفتگو کا موضوع ہی۔

ایڈ :- یہ خرابیاں کیا ہیں؟

میں :- دیکھیے میں اس کی توضیح کی کوشش کرتا ہوں معلوم نہیں بن پڑے یا نہیں۔ کیوں۔ اس بات کو تو ہر شخص تسلیم کریگا کہ ایک ایسی طبیعت جس میں وہ تمام صفات بدرجہ کمال موجود ہوں جو ہم فلسفی میں طلب کرتے ہیں انسانوں میں ایک کمیاب پودے کیطرح شاذ و نادر ہی دکھائی دیتی ہے۔

ایڈ :- بیشک۔ یہ تو بہت کمیاب ہے۔

میں :- اور کتنے بے گنتی اور زبردست اسباب ہیں جو ان کمیاب طبائع کو بھی برباد کر دیتے ہیں؟

ایڈ :- کون اسباب؟

میں :- سب سے پہلے خود ان کے محاسن ہیں، یعنی انکی جرأت، ان کی عفت و اعتدال پسندی، وغیرہ کہ ان میں سے ہر ایک قابل قدر صفت ہے اور یہ ایک عجیب معاملہ ہے) اس روح کو جو ان کی حامل ہے تباہ اور فلسفہ سے منافر کرتی ہے۔

ایڈ :- یہ تو طرفہ ماجرا ہے!

میں :- پھر ان کے بعد زندگی کی معمولی خوبیاں ہیں مثلاً حُسن، دولت، قوت، مرتبہ ریاست میں اعلیٰ تعلقات۔ آپ ان چیزوں کو سمجھتے ہوں گے تو یہ سب بھی مخرب اور موجب اثر رکھتی ہیں۔

ایڈ :- میں سمجھا۔ لیکن میں ذرا ٹھیک ٹھیک معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا اُن کے متعلق کیا مطلب ہے۔

میں :- ذرا صحیح طریقہ سے پوری حقیقت پر عبور کرنے کی کوشش کرو تو پھر ان سابقہ ملاحظات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی اور پھر یہ تمھیں عجیب بھی نہ معلوم ہونگے۔

ایڈ :- لیکن میں آخر یہ کیسے کروں ؟

میں :- کیوں ! اس میں کیا ہے ؟ ہم سب جانتے ہیں کہ تمام جراثیم یا بیج خواہ نباتی ہوں خواہ حیوانی جب انھیں صحیح غذا، یا آب وہوا، یا زمین نہیں ملتی تو اسوقت یہ جسقدر قوی ہوتے ہیں اُسیقدر اپنے ماحول کی ناموافقیت سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو چیزیں اچھی نہیں ہیں انکے مقابلہ میں بُرائی اُن کی زیادہ دشمن ہے جو اچھی ہیں۔

ایڈ :- بہت صحیح۔

میں :- یہ فرض کرنے کی وجہ ہیں کہ ناموافق حالات میں بہترین طبائع کو بہ نسبت ادنیٰ طبائع کے زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ تضاد زیادہ ہے۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- اور ایڈیمینٹس ! کیا ہم اسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر تعلیم خراب ہو تو بہترین دماغ ہی بدرجہ اتم خراب ہوجاتے ہیں۔ اور کیا خالص شر کے جذبہ

اور بڑے بڑے جرائم کا سرچشمہ وہ نشو یافتہ طبائع نہیں ہوتیں جنھیں تعلیم نے برباد کر دیا ہو نہ کہ کم درجہ اور ادنیٰ طبائع۔ برخلاف اس کے کمزور طبائع میں نہ کسی بڑی اچھائی کی صلاحیت ہوتی ہو نہ کسی بڑی بُرائی کی۔

ایڈ :- ہاں، میرا خیال ہو کہ آپ بجا فرماتے ہیں۔

میں :- اور ہمارے فلسفی کی مثال بھی بس ایسی ہی ہو۔ وہ ایک پودے کی طرح ہو کہ اگر اس کی صحیح پرورش ہو تو وہ ضرور بڑھے اور اس میں تمام خوبیاں پیدا ہوں، لیکن اگر ناموافق زمین میں اس کا بیج بویا اور اسی میں اُسے نصب کیا جائے تو سب جھاڑیوں سے زیادہ مضرت رساں ثابت ہوتا ہو۔ الّا یہ کوئی الٰہی طاقت اُسے محفوظ و برقرار رکھے۔ جیسا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں، کیا آپکا بھی واقعی یہ خیال ہو کہ گروہ سافسطائی ہمارے نوجوانوں کی تخریب کا باعث ہے یا فنون کے خانگی اساتذہ کا اس میں معتدبہ اور قابل ذکر حصہ ہو؟ کیا سب سے بڑا گروہ سافسطائیہ خود وہ عام جمہور نہیں جو یہ کہتے ہیں؟ کیا یہی نہیں جو ہر جوان اور بڈھے، مرد اور عورت کو یکساں پوری طور پر تعلیم دیتے اور حسب دلخواہ انکی تربیت کرتے ہیں۔

ایڈ :- اور یہ سب کچھ آخر کب؟

میں :- جب یہ باہم ملتے ہیں، یا مجلس میں ساری دنیا جمع ہوتی ہو یا عدالتوں تماشاگاہوں لشکروں اور دوسری عام ملاقات کی جگہوں پر ہجوم ہوتا ہو سب کے سب

شور و غوغا مچاتے ہیں کسی چیز کی جو وہاں کہی یا کی جا رہی ہو تعریف کرتے اور کسی کی مذمت کرتے ہیں، اور لطف یہ کہ چیخ چلا کر اور تالیاں بجا بجا کر دونوں مساوی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ خود جلسہ گاہ اور قریبی پہاڑیوں سے ان کی بازگشت ان کی تحسین یا مذمت کی صداؤں کو دوچند کر دیتی ہے۔ تو جب یہ سب کچھ ہوتا ہو تو تم ہی بتلاؤ کیا ایک جوان آدمی کا دل اس کے پہلو میں اچھلنے نہ لگیگا۔ کیا کوئی خانگی تربیت اسے رلے عامہ کے اس امنڈتے ہوئے سیلاب کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے کے قابل بنا سکتی ہے؟ یا وہ اس کی رو میں بہ جائیگا؟ عام جمہور کے ذہن میں خیر و شر کا جو تخیل ہے کیا وہی اس کے دماغ میں بھی نہوگا جو وہ کرتے ہیں یہ کریگا، اور جیسے وہ ہیں ویسا ہی یہ بنے گا۔

ایڈ:- ہاں، جناب سقراط، ضرورت اسے مجبور کریگی۔

میں:- اور یہی نہیں۔ ابھی تو ایک اس سے بڑی ضرورت باقی ہے جسکا ذکر میں نے نہیں کیا۔

ایڈ:- وہ کیا؟

میں:- استبداد، ضبطی، یا موت کی نرم طاقت۔ کہ جب باتوں سے کام نہیں چلتا (جیسا کہ آپ جانتے ہیں) سافسطائیوں اور معلموں کا یہ طبقہ جس کا نام جمہور ہے اس قوت کا استعمال کرتا ہے۔

ایڈ:- بیشک۔ کرتے ہیں اور نہایت تندہی سے کرتے ہیں۔

میں :- بھلا اس غیر مساوی مقابلہ میں کسی دوسرے سافسطائی یا نج کے شخص کی رائے کا غالب آنا کیسے ممکن ہے۔

ایڈ :- جی، کوئی صورت نہیں۔

میں :- سچ پوچھو تو اس کی کوشش کرنا ہی بڑی حماقت ہے۔ رائے عامہ سے اخلاقی محاسن کی تعلیم پاکر جو نمونہ پیدا ہوتا ہے اس سے مختلف نمونہ اخلاق نہ ہے، نہ کبھی ہوا ہے، نہ آیندہ ایسا ہونا قرین قیاس ہے۔ خیال رہے کہ یہ صرف انسانی خوبیوں کا ذکر ہے، جو فوق الانسان ہے وہ اس میں شامل نہیں۔ کیونکہ میں آپ کو اس امر سے بیخبر نہیں رکھنا چاہتا کہ حکومتوں کی موجودہ حالت بد میں جو کچھ بچ جاتا اور خیر میں منتج ہوتا ہے، سچ یہ ہے کہ خدا کی قوت سے محفوظ رہتا ہے۔

ایڈ :- میں اسے کُلیّۃً قبول کرتا ہوں۔

میں :- تو پھر میں ایک مزید امر میں بھی آپ کے قبول کا ملتجی ہوں۔

ایڈ :- آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں ؟

میں :- یہ کہ تمام وہ کرایہ کے ٹٹو جنھیں عوام سافسطائی کہتے ہیں اور وہ جنہیں ان کا مدمقابل خیال کیا جاتا ہے سب کے سب دراصل عوام کی رائے ہی کی تعلیم دیتے ہیں، یعنی اپنی مجلسوں کی رائے کی۔ بس یہی ان کی حکمت ہے یہی انکا عرفان ہے میں ان کی مثال اس شخص سے دے سکتا ہوں جو ایک بہت بڑے مضبوط جانور کو کھلاتا اور اس کے مزاج اور خواہشات کا مطالعہ کرتا ہے۔ یہ شخص رفتہ رفتہ معلوم

بریگا کہ اس جانور کے پاس کس طرح جائے اور اس سے کیسا برتاؤ کرے کونسے وقت اور کن وجوہ سے یہ خطرناک ہو جاتا ہے اور کن سے اسکے برعکس، اسکی مختلف آوازوں کا کیا مفہوم ہے، دوسرا شخص کیسی آوازیں نکالنے تو یہ ٹھنڈا پڑتا ہے یا برافروختہ ہو جاتا ہے؛ فرض کیجیے اس طرح متواتر نگہداشت سے یہ شخص ان باتوں میں کامل ہو گیا تو لگا اپنے اس علم کو حکمت کہنے اس سے ایک نظام یا فن مرتب کرنے اور اس فن کی تعلیم دینے۔ حالانکہ جن اصول یا جذبات کا یہ ذکر کرتا ہے اس کے ذہن میں ان کے مفہوم کا بھی کوئی حقیقی تصور نہیں۔ لیکن وہ بلا تامل اس بڑے جانور کے مزاج اور مذاق کی ہمنوائی میں ایک چیز کو قابل عزت اور دوسری کو ناقابل عزت، اسے اچھا اسے برا، کسی کو مبنی بر عدل اور کسی کو غیر عادلانہ بتلاتا ہے جن چیزوں سے یہ جانور خوش ہو یہ انہیں خیر اور جنھیں یہ ناپسند کرے ان کو شر کہتا ہے۔ اور اس بارہ میں سوائے اسکے کوئی وجہ نہیں بتلاتا کہ عدل و شرافت وہ ہے جو ضروری ہو۔ درانحالیکہ اس نے کبھی نہ انکا مشاہدہ کیا، نہ اس میں یہ صلاحیت ہے، کہ دوسروں کو ان چیزوں کی ماہیت یا انکا وسیع باہمی فرق سمجھا سکے۔ واللہ ایسا شخص کیسا نادر معلم ہوگا!۔

ایڈ:۔ سچ ہے، نہایت نادر!

میں:۔ اور اس آدمی سے جس کا ہم نے ذکر کیا وہ شخص کس طرح مختلف ہے جو سمجھتا ہے کہ حکمت رنگ برنگ کے الوان، انبوہ کے مزاج اور مذاق کی پہچان کا

نام ہی، خواہ مصوری میں ہو، موسیقی میں ہو یا بالآخر سیاست میں۔ کیونکہ جہاں آدمی نے عوام (اکثریت) سے رشتہ باندھا، اور ان کے سامنے اپنی نظم، یا کوئی لطیف کام، یا ریاست کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور انھیں اپنا حَکَم بنایا (حالانکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور نہیں) تو پھر ڈایو میڈی کی سی ضرورت اسے ایسی چیزیں بنانے پر مجبور کرے گی جس کی یہ لوگ تعریف کریں۔ تاہم، اچھے، اور قابل عزت کے متعلق اپنے خیالات کی تصدیق میں یہ لوگ جو وجوہ پیش کرتے ہیں وہ بالکل مہمل اور مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی کوئی وجہ سنی ہی جس پر یہ صادق نہ آتا ہو؟

ایڈ:۔ نہیں۔ اور نہ کبھی سننے کا احتمال ہی۔

میں:۔ میں جو کچھ گزارش کر رہا ہوں آپ اسکی صداقت تسلیم کرتے ہیں نا؟ تو اب میں آپ سے اس امر پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں کہ کیا دنیا کبھی بھی حسن مطلق کے یقین پر آسکتی ہی بجائے اسکے کہ بہت سی حسین چیزوں پر یقین کرے یا اسی طرح ہر نوع میں بجائے اس نوع کی بہت سی چیزوں کے اسکے عین مطلق پر۔

ایڈ:۔ ہرگز نہیں۔

میں:۔ تو دنیا کے فلسفی ہونے کا گویا کوئی امکان نہیں؟

ایڈ:۔ ناممکن۔

میں:۔ لہذا لازم ہی کہ فلسفیوں پر ہمیشہ دنیا کی لعنت رہے۔

ایڈ :- لازمی -

میں :- اور لوگوں کی لعنت بھی جو انبوہ سے ساز باز رکھتے اور اُسے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں -

ایڈ :- ظاہر ہے -

میں :- اچھا، تو پھر کوئی طریقہ تمھیں ایسا نظر آتا ہے کہ فلسفی آخر تک اپنے کام میں قائم رہ سکے؟ اور ہم اس کے متعلق جو کچھ کہہ رہے تھے وہ یاد ہے یعنی ذہین، چستی، حافظہ، جرأت، اور فراخدلی ہو۔ انھیں ہم سچے فلسفی کے صفات تسلیم کر چکے ہیں -

ایڈ :- جی ہاں -

میں :- تو کیا ایسا شخص اوائل طفولیت سے ہی ہر چیز میں سب سے آگے نہ ہوگا، خصوصاً اگر اس کے جسمانی قویٰ بھی دماغی کی طرح ہوں؟

ایڈ :- یقیناً -

میں :- جوں جوں اس کی عمر بڑھیگی اس کے دوست اور دوسرے ہم شہری اسے اپنے اغراض کے لیے استعمال کرنے چاہیں گے؟

ایڈ :- اس میں کیا کلام ہے -

میں :- یہ اس کے پیروں پڑ پڑ کر اس سے درخواستیں کریں گے، اسکی عزت اور خوشامد ہوگی، کیونکہ یہ لوگ اسوقت اس قوت کو اپنے ہات میں لینا چاہتے ہیں،

جوایک دن اسکے قبضہ میں ہوگی۔

ایڈ :- جی اکثر ایسا ہوتا ہی۔

میں :- پھر اگر یہ چوڑا چکلا جوان کسی بڑے مالدار شہر کا باشندہ ہی تو بایں حالات اس سے کیا سرزد ہونیکا احتمال ہوگا؟ کیا اس کا دماغ بیشمار حوصلوں سے پُر نہ ہوجائیگا اور وہ اپنے خیال میں اپنے کو باشندگان ھیلاس اور اقوام بربر سب کے معاملات کے انتظام کا اہل تصور نہ کریگا۔ اور جب اس کے سر میں یہ سودا سمایا ہے تو کیا متمردانہ شان وشوکت اور بے معنی غرور میں وہ دل کھولکر اپنے کو بڑہاسے چڑھائیگا نہیں۔

ایڈ :- ضرور ایسا کریگا۔

میں :- اچھا تو جب اس کی دماغی کیفیت کا یہ حال ہی۔ اسکے پاس آہستہ سے کوئی شخص آئے اور کہے کہ تم بیوقوف ہو، سمجھ حاصل کرنے کی کوشش کرو اور یہ سمجھ بلا غلامی کیے نہیں، تو تم کیا خیال کرتے ہو کہ ان مخالف حالات میں کیا وہ بآسانی اس شخص کی بات سُننے پر آمادہ ہوجائیگا۔

ایڈ :- توبہ کیجیے۔

میں :- اور اگر کسی کی آنکھیں اپنی ذاتی خوبی یا فطری معقول پسندی کی وجہ سے کچھ کھُلیں بھی، اس میں انکسار پیدا ہوا در فلسفہ اسے اپنا شیدائی بنالے تو ایسے شخص کے دوستوں کا کیا رویہ ہوگا، جب یہ لوگ سوچینگے کہ اس کے ساتھ

جو فوائد متوقع تھے وہ سب کے سب ہاتھ سے جاتے ہیں؟ کیا یہ لوگ ایسے اپنی فطرت کے احسن جزو کی اتباع سے روکنے، اور اسکے معلم کو بے بس بنانے میں قولاً و فعلاً سب کچھ نہ کر ڈالیں گے اور اس غرض کے لیے پوشیدہ سازشیں علانیہ سزائیں سب کچھ استعمال کرینگے؟

ایڈ:- اس میں بھلا کیا شبہ ہے۔

میں:- تو پھر جس شخص کے حالات ماحول ایسے ہوں وہ کیسے فلسفی بن سکتا ہے؟

ایڈ:- ناممکن ہے۔

میں:- پھر کیا ہم اپنے اس قول میں صحیح نہ تھے کہ اگر تعلیم خراب ہو تو نہ صرف دولت اور اسکے متعلقات یا اور نام نہاد متاع زندگی بلکہ خود وہ صفات جو انسان کو فلسفی بناتی ہیں اسے فلسفہ سے منحرف کرنیکا باعث ہونگی؟

ایڈ:- ہم لوگ بالکل ٹھیک تھے۔

میں:- عزیز محترم۔ افضل ترین مشاغل کے لیے جن طبائع میں بہترین مناسبت ہے انکی تباہی و ناکامی اس طرح عمل میں آتی ہے۔ یہ وہ طبائع ہیں جو ہمارے خیال میں ہر زمانہ میں کمیاب ہوتی ہیں، یہی وہ طبقہ ہے جس میں سے وہ لوگ نکلتے ہیں جو ریاست اور افراد دونوں کے لیے بڑی سے بڑی برائیوں کے بانی ہوتے ہیں اور اور پھر رَو انھیں دوسری طرف لے جائے تو بڑی سے بڑی بھلائیوں کے بھی۔ لیکن کسی چھوٹے آدمی نے تو فرد کے لیے یا ریاست کے لیے کبھی کوئی بڑا کام نہیں کیا۔

ایڈ :- بالکل سچ ہی۔

میں :- چنانچہ یوں عروس فلسفہ بغیر ذمراسم شادی کی تکمیل کے تنہا بے یار و مددگار رہجاتی ہی، جو اُسکے اپنے تھے انھوں نے ایکسا ایک کرکے اسکا ساتھ چھوڑدیا، اور جب یہ لوگ ایسی باطل زندگی گذارنے لگے جو ان کی شان کے شایان نہیں اور جب دوسرے نا اہلوں نے دیکھا کہ اب اسکا کوئی عزیز قریب نہیں رہا جو اس کی حفاظت کرے تو یہ اس کے گھر میں گھس پڑے اور اس کی آبروریزی کی اور بیہودہ ملامتیں عائد کرائیں جن کا بقول آپ کے مخالفین فلسفہ اظہار کرتے ہیں، یعنی یہ کہ فلسفہ کے بعض دلدادہ تو بیکار محض ہوتے ہیں اور اکثر شدید ترین تعذیر کے مستحق۔

ایڈ :- جی ہاں، بیشک لوگ یہی کہتے ہیں۔

میں :- ہاں تو جب تم اس حقیر مخلوق کا خیال کرو تو اسکے علاوہ اور توقع ہی کیا ہوسکتی ہی۔ یہ اس میدان کو اپنے لیے کھلا پاکر (اور میدان بھی کیسا، اچھے اچھے ناموں اور نمائشی خطابوں سے پُر) ان قیدیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں جو محبس سے کسی امن کی جگہ میں بچکر جارہے ہوں؛ یہ اپنے پیشوں کو ترک کرکے بس فلسفہ میں کو دپڑتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ایسا کرنے والے غالباً وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی اپنی بدنصیب حرفت میں سب سے ہوشیار تھے۔ کیونکہ فلسفہ لاکھ اپنی موجودہ حالت بد میں ہو پھر بھی اسکے ساتھ اتنی شان اور اتنا وقار باقی ہی کہ کسی دوسرے

فن کو نصیب نہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے بہت سے وہ لوگ اس کی طرف کھنچے ہیں جن کی طبائع ناقص اور جن کی ارواح کم ظرفی اور کمینہ پن سے اسیطح مجروح و بدنما ہوگئی ہیں جیسے انکا جسم ان کے پیشہ اور حرفہ سے۔ کیا یہ صورت حال ناگزیر نہیں؟

ایڈ:۔ ہاں۔

میں:۔ کیا ان کی مثال بالکل اس چھوٹے حقیر کی سی نہیں جس نے ابھی قید سے نکل کر خوش بختی کا منہ دیکھا ہو، اور اب نہا دھو، نئے کپڑے پہن بن سنور کر دولھا بنا ہو اور اپنے آقا کی لڑکی سے جو نادار اور بے یار و مددگار رہ گئی ہے شادی کرنے جا رہا ہو۔

ایڈ:۔ نہایت ہی صحیح تمثیل ہو۔

میں:۔ تو پھر ایسی شادیوں کا نتیجہ کیسے بچے ہونگے؟ کیا یہ رذیل اور نغیل نہ ہوں گے۔

ایڈ:۔ اس میں کیا کلام ہو؟

میں:۔ اسی طرح جب ناقابل تربیت لوگ فلسفہ کی طرف بڑھتے، اور اس سے اپنا رشتہ کرتے ہیں جو مرتبہ میں اپنے بالاتر ہو تو اس سے کس قسم کے خیالات اور آرا کے پیدا ہونے کا احتمال ہو؟ کیا یہ محض سافسطائی مغالطے نہ ہونگے جو بس سامعہ فریب ہوں لیکن ان میں نہ کوئی اصلیت ہو نہ حقیقی حکمت سے قرب، نہ اسکے شایان شان۔

ایڈ:- بلاشبہ۔

میں:- ایڈیمنٹس! اس طرح چھٹ چھٹا کر فلسفہ کے سچے پیرو بس تھوڑے ہی سے باقی رہ جائیں گے۔ مثلاً شاید کوئی شریف اور تعلیم یافتہ شخص جلاوطنی کے باعث اس کی خدمت میں ہو اور مخرب اثرات کی عدم موجودگی کے سبب سے اب تک اس کا شیدائی رہا ہو، یا کوئی اعلیٰ اور بلند پایہ روح کسی چھوٹے ذلیل سے شہر میں پیدا ہو جائے اور اس کی سیاست کو نظر حقارت سے دیکھ کر اس سے چشم پوشی کرے اور کچھ ایسے باکمال لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو فنون کو چھوڑ کر (جن کی جائز طور پر یہ تحقیر کرتے ہیں) فلسفہ کی طرف آئے ہوں؛ یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بعض کو ہمارے دوست تھیاگیس کی لگام روکے؛ کیونکہ تھیاگیس کی زندگی میں تمام چیزوں نے گویا اسے فلسفہ سے منحرف کرنے کی ایک سازش کی تھی لیکن بس بیماری نے اسے ہمیشہ سیاست سے الگ رکھا۔ رہا خود میرا ایسا معاملہ یعنے دلیل باطن، تو اس کا ذکر بھی چنداں ضروری نہیں، کیونکہ ایسا منذر اگر کسی کو عطا کیا بھی گیا ہو تو بہت شاذ۔ ہاں تو جو لوگ (حقیقی فلسفیوں کے) اس چھوٹے سے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے اس کا مزہ چکھا ہے اور اس کی شیرینی اور برکت سے واقف ہیں؛ انھوں نے انبوہ کے جنون کو بھی خوب دیکھا ہے، یہ لوگ جانتے ہیں کہ سیاسین میں کوئی بھی ایماندار نہیں۔ نہ کوئی عدل و انصاف کا ایسا حامی ہے کہ اسکے ساتھ معرکہ آرا ہو کر یہ اپنی نجات حاصل کر سکیں، اس گروہ کے

افراد کی مثال اس انسان کی سی ہی جو جنگلی درندوں میں جا پڑا ہو، نہ تو یہ اپنے ساتھیوں کی شرارت کا شریک ہو سکتا ہی نہ تن تنہا ان کی خونخوار طبائع کا دفاع اس سے ممکن ہی، اس لیے جب یہ دیکھتا ہی کہ میں نہ ریاست کے لیے مفید ہو سکتا ہوں نہ اپنے دوستوں کے لیے اور جب سوچتا ہی کہ گویا اپنی ذات یا دوسروں کو کچھ فیض پہنچائے بغیر لے بس اپنی زندگی ضائع کرتی ہی تو یہ غریب دم سادھ کر چپ رہتا اور اپنی راہ جاتا ہی۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہی جو گرد و غبار کے اس طوفان میں جو آندھی کے ساتھ اُٹھتا ہی کسی دیوار کی پناہ لیکر الگ ہٹ جائے یہ جب بقیہ نوع انسانی کو شر سے پُر پاتا ہی تو اسی پر قانع ہو جاتا ہی کہ خود تو اپنی زندگی جوں توں شر و باطل سے پاک رہ کر گذار سکے اور روشن امیدوں کے ساتھ بامن و آشتی یہاں سے رخصت ہو جائے۔

ایڈ :۔ ہاں، رخصت ہونے سے پہلے اسنے تو بڑا کام انجام دیدیا۔

میں :۔ بیشک بڑا کام، لیکن جب تک یہ اپنے مناسب حال ریاست نہ پالے سب سے بڑا کام نہیں۔ کیونکہ مناسب حال ریاست میں اس کی نشو و نما زیادہ وسیع ہوگی اور یہ اپنی اور اپنے ملک دونوں کی نجات کا باعث ہوگا۔

اچھا تو اب فلسفہ کی بدنامی کے اسباب کی کافی تشریح ہو چکی ہی، فلسفہ کے خلاف جو الزام ہیں ان کی بے انصافی بھی ظاہر ہوگئی، کیا آپ کو اور کچھ فرمانا ہی؟

ایڈ :۔ اس مسئلہ پر تو اب کچھ نہیں کہنا، البتہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے میں موجودہ حکومتوں میں سے کون فلسفہ کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہے؟

میں :۔ کوئی بھی نہیں۔ اور بس یہی الزام تو میں ان سب پر لگاتا ہوں کہ ان میں سے ایک بھی فلسفیانہ طبیعت کے شایاں نہیں اور اس لیے یہ طبیعت معوج اور منحرف ہو جاتی ہے۔ جس طرح پردیسی بیج ایک خارجی زمین میں اپنی فطرت صحیحہ کے مطابق نہیں اُگتا بلکہ اس نئی مٹی میں اس کے مغلوب ہو کر فنا ہو جانیکا احتمال ہوتا ہے، اسی طرح فلسفہ کی یہ نشوونما بجائے قائم رہنے کے بگڑ کر ایک نیا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ لیکن اگر فلسفہ کو کبھی ریاست میں وہ کمال ملجائے جس سے کہ وہ خود عبارت ہے تو اسوقت پتہ چلے کہ یہ اپنی صداقت میں الٰہی ہے اور تمام دوسری چیزیں خواہ انسانی طبائع ہوں یا نظامات و تنسیقات سب کی سب انسانی ہیں؛ اور میں جانتا ہوں کہ آپ اب یہ سوال کرنیوالے ہیں کہ ایسی ریاست کیا ہے؟

ایڈ :۔ نہیں نہیں۔ آپ نے غلطی کی۔ میں ایک اور سوال پوچھنے والا تھا۔ وہ یہ کہ آیا وہ ریاست وہی ہے جسکے بانی و مخترع ہم ہیں یا کوئی اور؟

میں :۔ ہاں ہاں، اکثر اعتبارات سے ہماری ہی ریاست ہے۔ تمہیں یاد ہوگا میں نے پہلے کہا تھا کہ جس ریاست میں دستور اساسی کا وہی تخیل ہو جس نے بحیثیت واضعین قانون آئین بناتے وقت تمہاری رہنمائی ہوئی تھی تو ایسی ریاست میں

ہمیشہ کسی زندہ سیادۃ کی ضرورت ہوگی۔

ایڈ:۔ یہ تو کہا گیا تھا۔

میں:۔ ہاں، لیکن قابل اطمینان طریقہ سے نہیں کہا گیا تھا۔ تم نے بیچ میں اعتراضات کرکے سب کو ڈرا دیا تھا، اور ان اعتراضات سے یقینی طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ بحث طویل اور دشوار ہوگی اور اب بھی جو کچھ باقی ہے وہ سہل کی ضد ہے۔

ایڈ:۔ کیوں، اور اب باقی کیا ہی؟

میں:۔ یہ سوال کہ فلسفہ کے مطالعہ کو کس طرح منظم کیا جائے کہ ریاست کی تباہی کا باعث نہو۔ تم جانتے ہی ہو کہ تمام بڑی کوششوں میں کچھ خطرہ ضرور ہوتا ہی، عام قول ہی جو "کٹھن سو اچھا"

ایڈ:۔ پھر بھی اچھا ہی یہ نکتہ صاف ہی ہوجائے۔ تو پھر تحقیق پوری ہوگی۔

میں:۔ میں اگر رکا تو خواہش اور ارادہ کی کمی کی وجہ سے نہیں، قوت اور قدرت کی کمی کی وجہ سے رکوں گا۔ میرا جوش آپ خود دیکھ سکتے ہیں اور میں جو کچھ اب کہنے والا ہوں اس میں براہ مہربانی ذرا دیکھیئے گا کہ میں کس جرأت کے ساتھ بے پس وپیش اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ ریاستوں کو فلسفہ کا حصول اسطرح ہرگز نہ چاہیئے جس طرح وہ آج کل کرتی ہیں، بلکہ اس سے بالکل مختلف طریقہ سے

ایڈ:۔ یعنی کس طرح؟

میں:۔ آج کل فلسفہ کے متعلمین بالکل نوجوان ہوتے ہیں ابھی بچپن سے

بہ مشکل گزر چکتے ہیں کہ اس کی ابتدا ہو جاتی ہے، روپیہ کمانے اور امور خانہ داری سے جو وقت بچتا ہے صرف وہ ان مشاغل میں صرف کرتے ہیں اور ان میں سے وہ تک جن کی بڑی شہرت ہوتی ہے کہ ان میں فلسفیانہ جذبہ بہت ہے، جہاں مضمون کی بڑی دشواری یعنی منطق پر نظر پڑی کہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ آیندہ عمر میں اگر کہیں کسی دوسرے نے بلا لیا تو جا کر ایک آدھ تقریر سن آتے ہیں اور پھر اس کا بڑا چرچا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ خود فلسفہ کو اپنا اصلی اور صحیح شغل نہیں سمجھتے۔ بالآخر بڈھے ہو کر اکثر صورتوں میں یہ ھیرا کلائی ٹس کے آفتاب سے بھی زیادہ صحیح معنوں میں بجھ جاتے ہیں، کیونکہ وہ تو پھر روشن بھی ہوتا ہے، یہ پھر کبھی روشن نہیں ہوتے۔

اڈ :۔ لیکن خیر اور کیا طریقہ ہونا چاہیئے؟

میں :۔ اسکا بالکل الٹا۔ بچپن اور جوانی میں ان کا مطالعہ اور فلسفہ جو کچھ سیکھیں وہ انکے عمر کے مناسب ہونا چاہیئے۔ اس زمانہ میں جب وہ بڑھ کر پورے آدمی بن رہے ہیں ان کے جسموں کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیئے تاکہ انھیں فلسفہ کی خدمت میں لگا سکیں۔ جوں جوں عمر بڑھے اور ذہن پختہ ہونا شروع ہو تو توں یہ روح کی پرورش کو بڑھائیں لیکن جب ان کی طاقت جواب دیدے اور یہ مدنی یا فوجی خدمت کے لائق نہ رہیں تو انھیں اپنی مرضی کے مطابق رہنے سہنے دیا جائے اور ان سے کوئی مشقت نہ کرائی جائے۔ کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ یہ یہاں خوش رہیں اور آئندہ زندگی میں بھی ایسی ہی خوشی پا کر اس زندگی کے سر پر

باج رکھیں۔

ایڈ:۔ جناب سقراط! میں تو اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ اس رائے میں کس درجہ خلوص رکھتے ہیں۔ مجھے تو یقین ہی، لیکن اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کے سامعین میں سے اکثر آپ کی مخالفت میں غالباً اس سے بھی زیادہ خلوص رکھتے ہیں اور یہ شاید کبھی قائل نہوں، ان میں سب سے بڑھکر تھریسی میکس۔

میں:۔ تھریسی میکس اور مجھ میں کیوں خواہ مخواہ پھر جھگڑا کرتے ہو، ابھی تو ملاپ ہوا ہی اگرچہ سچ پوچھو تو دشمنی ہی کب تھی۔ البتہ میں تو اپنے بس بھر کوشش کیے ہی جاؤں گا حتی کہ یا تو تھریسی میکس اور دیگر اشخاص کو قائل کرلوں یا کوئی ایسی بات کروں جو اُس دن انکے کام آئے جبکہ وہ دوبارہ زندہ ہونگے اور اسی قسم کی گفتگو ایک دوسرے عالم وجود میں ہوگی۔

ایڈ:۔ آپ اس وقت کی باتیں کر رہے ہیں جو بہت قریب نہیں!

میں:۔ بلکہ ایسے زمانہ کی جو ازل کے مقابلہ میں بمنزلہ عدم کے ہے۔ تاہم مجھے حیرت نہیں کہ اکثر لوگ یقین کرنے سے انکار کرتے ہیں، کیونکہ ہم جس چیز کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں اسے انھوں نے کبھی حاصل ہوتے نہیں دیکھا۔ انھوں نے بس فلسفہ کی ایک رسمی نقل دیکھی ہی جو الفاظ کے محض ایک مصنوعی مجموعہ پر مشتمل ہی جن میں ہماری گفتگو کی سی فطری وحدت بھی نہیں۔ لیکن ایسا وجود انسانی جو اپنے قول و فعل کے اعتبار سے کامل طور پر ایسے سانچے میں ڈھل چکا ہو کہ اُس میں بقدر

امکان خیر کی مناسبت اور مماثلت پیدا ہو جائے اور پھر یہ شخص ایک ایسے شہر پر حکمراں ہو جو خود بھی اسی سانچہ کا اثر رکھتا ہو؟ ایسا انسان انھوں نے کبھی نہیں دیکھا نہ ایک نہ بہت۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ انھوں نے کبھی دیکھا ہی؟

ایڈ:۔ واقعاً نہیں دیکھا۔

میں:۔ اور محبت من، یہی نہیں بلکہ ان لوگوں نے اگر کبھی آزاد اور شریفانہ اظہار جذبات کو سنا بھی ہوگا تو بس یونہی شاذونادر۔ میرا مطلب ایسے خیالات سے ہے جو انسان کے منھ سے اس وقت نکلتے ہیں جب وہ خلوص کے ساتھ اپنی تمام امکانی قوت سے علم کی خاطر حق و صداقت کے متلاشی ہوتے ہیں اور ان مبالغہ آمیز موشگافیوں کی طرف سے سرد مہری اور بے اعتنائی برتتے ہیں جن کا حاصل مناقشہ اور قیاس ہی خواہ یہ موشگافیاں قانونی عدالتوں میں ہوں یا معاشرت اجتماعی میں۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔ جن الفاظ کا آپ ذکر کر رہے ہیں ان سے یہ لوگ بالکل ناآشنا ہیں۔

میں:۔ اور یہی بات تھی جو ہم نے پہلے سے دیکھ لی تھی اور یہی وجہ تھی کہ صداقت نے ہمیں بلا خوف و تردد اس امر کے تسلیم کرنے پر مجبور کیا کہ شہر، حکومتیں، یا افراد ان میں سے کوئی اس وقت تک کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ فلسفیوں کا وہ چھوٹا سا گروہ جسے ہم نے بیکار کہا ہی لیکن جس کی تخریب نہیں ہوئی اسے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے ریاست کی خبرگیری پر من اللہ مامور نہ کیا جائے۔ اور اسی طرح

ریاست پر ان کی اطاعت لازم کردی جائے یا پھر یہ ہو کہ بادشاہوں یا دشاہو
اور شہزادوں کی اولاد کے دل میں خدا کی طرف سے فلسفہ حقیقی کی سچی محبت پیدا
کردی جائے، میں یہ کہنے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ ان دو صورتوں میں سے کوئی
ایک یا ہر دو ناممکن ہیں، اگر ایسا ہوتا تو لوگ بیشک ہمیں تخیلی یا دو حرف کہہ کر
ہماری ہنسی اڑا سکتے تھے۔ کیوں میں صحیح کہتا ہوں نا؟

ایڈ:۔ بالکل درست۔

میں :۔ تو اگر ماضی کی بے گنتی جگھوں میں یا خود اس وقت کسی ایسے ملک
میں جو ہم سے دور اور ہمارے علم کے باہر ہے کبھی کسی کامل فلسفی کو ایک علی طاقت
نے حکومت کی باگ ہاتھ میں لینے پر مجبور کیا ہو یا کبھی آیندہ اس طرح مجبور کرے گی
تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں (اور ایسا دعوی کہ اگر غلط ہو تو ہماری سزا موت)
کہ یہی ہمارا دستور اساسی وہاں رائج رہا ہوگا یا رائج ہے۔ اور جہاں کہیں فلسفہ کی دیوی
ملکہ ہوگی وہاں یہی رائج ہوگا۔ اس میں کوئی بات محال نہیں، ہاں مشکل ہے، سو اس کا
ہمیں خود اقرار ہے۔

ایڈ:۔ میری رائے آپ سے متفق ہے۔

میں:۔ کیا تمہارا مطلب ہے کہ عوام کا یہ خیال نہیں۔

ایڈ:۔ ہاں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں ہے۔

میں:۔ اے میرے دوست عوام پر حملہ نہ کرو، یہ اپنی رائے تبدیل کر دیں گے

بشرطیکہ سر چڑھ کر جارحانہ طریقہ سے نہیں بلکہ نرمی سے انہیں تسکین دینے اور زیادتی تعلیم سے ان کی نفرت کو دور کرنے کے لیے تم انھیں اپنے اصلی فلسفی دکھاؤ اور ان کے سامنے ان فلسفیوں کے خصائص و اشغال کو اسی طرح بیان کرو جس طرح ابھی ابھی بیان کیا جا رہا تھا تو جمہور انا س دیکھ لینگے کہ تم جس کا ذکر کر رہے ہو وہ ایسا نہیں جیسا کہ یہ سمجھتے تھے۔ جب وہ اسے اس نئی روشنی میں دیکھیں گے تو یقیناً اس کے متعلق اپنے خیالات کو بدل دینگے اور بالکل جدا گانہ طریقہ سے تمہارے عالی اس کے سوال کا جواب دیں گے۔ اپنے محبت کرنیوالے سے کون دشمنی کریگا، جو خود نرم دل اور حسد سے پاک ہو وہ ایسے آدمی سے کیوں رشک کریگا جس میں خود رشک نہیں۔ نہیں۔ میں آپ جواب دیتا ہوں کہ ممکن ہے اکے دُکے میں یہ سنگ طبعی پائی جائے لیکن نوع انسانی کی اکثریت میں تو یہ کبھی نہ ملیگی۔

ایڈ:۔ میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔ اور کیا تم بھی میری طرح یہ نہیں سمجھتے کہ عوام میں فلسفہ کے خلاف جو شدید احساس پایا جاتا ہے اس کی ابتدا ہوتی ہے درصل ان نام نہاد فلسفیوں سے جو ناخواندہ آگو دتے ہیں اور ہمیشہ ان لوگوں کو برا بھلا کہتے اور ان پر نکتہ چینی اور عیب جوئی کرتے اور اشیاء کے بجائے اشخاص کو اپنا موضوع گفتگو بناتے ہیں؟ اور فلسفی کے شان کے منافی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

ایڈ:۔ یہ از حد ناز یبا ہے۔

میں :- کیونکہ ایڈی مینٹس، جس کی لو وجود حقیقی سے لگی ہوئی ہے یقیناً دنیاوی معاملات پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ہوتی، نہ اسے اس کی مہلت کہ کینہ اور بغض سے پُر انسانوں سے مجادلہ کرتا پھرے۔ اس کی نگاہ جمی ہوئی ہے ٹھوس اور دائم چیزوں پر جنھیں وہ دیکھتا ہے کہ نہ یہ ایک دوسرے کو ضرر پہنچاتی ہیں، نہ انھیں کوئی ضرر پہنچتا ہے، اور سب کی سب عقل کے مطابق ایک نظام سے متحرک ہیں۔ وہ انکی نقل کرتا ہے اور جہاں تک اس سے بن پڑتا ہے اپنے مطابقت کرنا چاہتا ہے۔ اور انسان بھلا اس کی نقالی کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے جس سے اسے معتقدانہ لگاؤ اور ربط ضبط ہو۔

ایڈ :- ناممکن۔

میں :- اور اس طرح نظام الٰہی سے ربط ضبط رکھنے والا فلسفی خود بھی جہاں تک فطرت انسانی اجازت دیتی ہے، منظم اور الٰہی ہو جاتا ہے۔ البتہ اور ہر چیز کی طرح اسے اس میں بھی تھوڑی سی کمی ضرور ہوگی۔

ایڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- اور اگر اس پر یہ کام لازم کر دیا جائے کہ نہ صرف اپنی بلکہ عام فطرت انسانی کی تشکیل خواہ ریاست میں ہو یا افراد میں اس کے مطابق کرے جو وہ کہیں اور دیکھ رہا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ عدل، عفت و اعتدال اور دیگر محاسن شہری کا ایک غیر ہنرمند کاریگر ثابت ہوگا۔

ایڈ:۔ سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن غیر ہنرمند نہیں۔

میں:۔ اور اگر دنیا دیکھ لے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے تو کیا وہ فلسفہ سے ناراض رہ سکتی ہے۔ اور کیا لوگ ہمارے اس کہنے پر یقین نہ کرینگے کہ وہ ریاست کبھی خوش نہیں رہ سکتی جس کا نقشہ ایسے صنّاعوں نے نہ بنایا ہو جو آسمانی نمونہ کی نقل کرتے ہیں؟

ایڈ:۔ سمجھنے کے بعد تو پھر نہ ناراض رہیں گے۔ لیکن جس نقشہ کا آپ ذکر کرتے ہیں وہ یہ کس طرح کھینچیں گے؟

میں:۔ یہ ریاست اور آدمیوں کے اطوار سے ابتدا کرینگے اور جیسے تختی سے تصویر مٹا دیتے ہیں یہ سب مٹا کر صاف سطح چھوڑ دینگے۔ یہ کچھ سہل کام نہیں لیکن سہل ہو یا نہ ہو ان میں اور دوسرے واضعان قوانین میں بس یہی فرق ہوگا کہ اس وقت تک فرد یا ریاست سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے نہ کوئی قوانین بنائینگے جب تک یا تو انھیں ایسی صاف سطح نہ ملے یا یہ خود اسے صاف نہ کرلیں۔

ایڈ:۔ بہت ٹھیک کریں گے۔

میں:۔ جب یہ ہو جائیگا تو پھر یہ دستور اساسی کا خاکہ بنانا شروع کرینگے۔

ایڈ:۔ بلاشبہ۔

میں:۔ اور اس خاکہ کو پُر کرتے وقت میرے تخیل کے مطابق یہ اکثر اوپر تلے نظر ڈالیں گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ پہلے تو عدل مطلق، اور حسن اعتدال

مطلق کو دیکھیں گے اور پھر ان کی انسانی نقل کو، اور مختلف عناصر حیات کو شکل انسانی میں ملا کر داخل کریں گے اور اسکا تخیل وہ اس دوسری شکل سے قائم کرینگے کہ جو جب انسانوں میں موجود ہوتی ہے تو ھومر اسے شکل و تمثال خداوندی کہتا ہے۔

ایڈ :- بہت درست۔

میں :- یہ ایک شکل کو مٹائیں گے اور دوسری کو اس کی جگہ ثبت کریں گے یہاں تک کہ اطوار انسانی کو حتی الامکان اطوار الٰہی کے مطابق بنا دیں۔

ایڈ :- بیشک، اور کسی طرح یہ اس سے حسین تر تصویر نہیں بنا سکتے۔

میں :- ہاں تو جن لوگوں کے متعلق تم نے کہا تھا کہ ہم پر غرّا کر جھپٹیں گے شاید اب ہم انہیں سمجھانے لگے ہیں کہ ریاست کے دستور اساسی کا نقش کھینچنے والا مصور ایسا ہی جس کی ہم تعریف کر رہے تھے اور جس کے ہاتھ میں عنان حکومت دیدینے پر وہ اس درجہ برافروختہ تھے۔ کیا یہ لوگ ہماری ابھی ابھی کی باتیں سُنکر ذرا ذرا خاموش نہیں ہونے لگے؟

ایڈ :- اگر ان میں ذرا بھی عقل ہے تو ضرور خاموش ہو جائیں گے۔

میں :- اب آخر اعتراض کی کون وجہ باقی رہی؟ کیا یہ لوگ اس میں شبہ کرینگے کہ فلسفی حق و صداقت اور وجود مطلق کا عاشق ہے؟

ایڈ :- ایسے بے عقلے تو کیا ہونگے!

میں :- یا اس میں شبہ کرینگے کہ اس کی فطرت جیسی کہ ہم نے اس کا خاکہ کھینچا ہے خیر اعلے

سے مطابق ہو گی!

ایڈ :- نہ اس میں شبہ کر سکتے ہیں۔

میں :- تو کیا یہ لوگ پھر یہ کہیں گے کہ ایسی فطرت موافق و مساعد حالات میں بھی کامل اچھی اور عقلمند نہیں ہو سکتی (بشرطیکہ کامل خیر و حکمت کبھی کسی کو حاصل ہوئی ہو) یا کہیں یہ لوگ انھیں ترجیح نہ دیں جنھیں ہم نے مسترد کر دیا ہے!

ایڈ :- نہیں، ہرگز نہیں۔

میں :- پھر کیا یہ ہمارے اس کہنے پر اب بھی خفا ہونگے کہ جب تک فلسفیوں کے ہاتھ میں حکومت نہ ہو ریاستوں اور افراد کو شر سے چین نہ نصیب ہوگا اور نہ ہماری یہ خیالی ریاست کبھی عالم وجود میں آ سکے گی؟ —

ایڈ :- میں سمجھتا ہوں کہ یہ لوگ اب کم ناراض ہونگے۔

میں :- کیا ہم یہ نہیں فرض کر سکتے کہ اب یہ نہ صرف کم ناراض ہونگے بلکہ بالکل نرم ہوں گے، اب انکا خیال پلٹ گیا ہوگا اور اور کچھ نہیں تو شرما شرمی ہی یہ صلح کرنے سے انکار نہ کرینگے۔

ایڈ :- ضرور فرض کر سکتے ہیں۔

میں :- تو پھر فرض کرو کہ یہ باہمی مفاہمت ہو گئی۔ اب کیا کوئی شخص ہماری دوسری صورت سے انکار کریگا کہ بادشاہوں اور شہزادوں کی ایسی اولاد ہو سکتی ہے جو بالطبع فلسفی ہو۔

ایڈ :۔ یقیناً، کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

میں :۔ اور کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ عالم وجود میں آنے کے بعد ان کی تخریب دنیا ہی لازمی ہے، اس سے تو ہمیں بھی انکار نہیں کہ ان کا بچانا بہت دشوار ہی۔ لیکن یہ بھلا کون کہہ سکتا ہی کہ قرنہا قرن میں نہیں سے ایک فرد واحد بھی نہ بچ سکے گا؟

ایڈ :۔ بیشک کون کہہ سکتا ہی۔

میں :۔ لیکن ایک کافی ہی۔ بس ایک آدمی چاہیے کہ ایک شہر اسکے ارادکا تابع ہو، اور یہ اکیلا اس بہترین نظام حکومت کو عالم وجود میں لا سکتا ہی جس کے متعلق دنیا اس قدر مشتبہ اور متشکک ہی۔

ایڈ :۔ ہاں۔ ایک کافی ہی۔

میں :۔ حاکم ان قواعد و قوانین کو نافذ کریگا جو ہم بیان کر رہے ہیں اور رعایا غالباً ان کی اطاعت پر آمادہ ہو گی۔

ایڈ :۔ یقیناً۔

میں :۔ اور یہ بات نہ محال ہی نہ معجزہ کہ جسے ہم پسند کرتے ہیں اُسے دوسرے بھی پسند کریں۔

ایڈ :۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں ہی۔

میں :۔ اپنی ساری پچھلی گفتگو میں ہم نے کافی طور پر ظاہر کر دیا ہی کہ اگر یہ سب کچھ ممکن ہو تو یقیناً بہترین نتائج رونما ہوں گے۔

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- اور اب ہم صرف یہ نہیں کہتے کہ اگر ہمارے قوانین نافذ ہو سکتے تو بہترین نتائج کا باعث ہوتے۔ بلکہ اب ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ انکا نفاذ اگرچہ مشکل سہی لیکن ناممکن نہیں ہے۔

ایڈ :- بہت خوب۔

میں :- خیر یہ ہزار کاوش و دشواری ہم ایک مضمون کے ختم پر تو پہونچے لیکن ابھی اس سے زیادہ بحث کے لیے باقی ہے یعنی اس نظام اساسی کے محافظین کس طرح، کن اشغال اور کن چیزوں کے مطالعے سے پیدا ہونگے، اور یہ ان مختلف علوم کی تحصیل پر کس کس عمر میں مشغول ہوں۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- میں نے عورتوں پر قبضہ، بچوں کی پیدائش اور حکام کے تقرر کے تکلیف دہ معاملات اس لیے حذف کر دیے تھے کہ میں جانتا تھا کہ کامل ریاست پر لوگ رشک و رقابت سے نظر ڈالیں گے اور اس کا حصول دشوار ہوگا، لیکن یہ چالاکی میرے زیادہ کام نہ آئی اور مجھے پھر بھی ان پر بحث کرنی ہی پڑی۔ اب عورتوں اور بچوں کا معاملہ تو طے ہوا لیکن دوسرا مسئلہ یعنی حکام کے سوال کی بالکل شروع سے تحقیق ہونی چاہیئے تمہیں یاد ہوگا ہم کہہ رہے تھے کہ یہ اپنے ملک کے عاشق ہوں، مسرت والم، حظ و کرب کے امتحان سے انکی آزمائش ہو چکی ہو، صعوبتوں میں خطرہ میں

یا کسی اور اہم اور کٹھن موقع پر یہ اپنے جذبہ حُبِ وطن کو کھو نہ بیٹھیں جو ان آزمائشوں میں ناکام ہوں اسے مسترد کر دیا جائے، لیکن جو ہمیشہ خالص نکلے جیسے سُنار کی بھٹی سے تپا ہوا سونا نکلتا ہے تو وہ حاکم بنا یا جائے اور زندگی میں اور بعد موت اعزاز و انعام کا مورد ہو۔ ہم اس قسم کی باتیں کر رہے تھے کہ دلیل نے ایک طرف کو مڑ کر اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لی وہ چاہتی تھی کہ جو مسئلہ اب چھڑ گیا ہے اُسمیں مخل نہ ہو۔

ایڈ :۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

میں :۔ ہاں میرے دوست میں اُسوقت صاف صاف الفاظ کہنے سے جھجکتا تھا۔ لیکن اب میں صاف کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کامل محافظ کے لیے لازم ہے کہ وہ فلسفی ہو۔

ایڈ :۔ ہاں اب یہ دعویٰ کر دینا چاہیئے۔

میں :۔ اور یہ نہ سمجھو کہ یہ فلسفی بہت سے ہونگے، کیونکہ ہم نے جن صفات کو لازمی قرار دیا ہے وہ بہت شاذ یکجا ہوتی ہیں۔ وہ اکثر ٹکڑے ٹکڑے اور پارہ پارہ ملتی ہیں۔

ایڈ :۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :۔ تم واقف ہو کہ ذکاوت، حافظہ، ہوشمندی، فہم، چالاکی اور دوسری ایسی ہی صفات اکثر یکجا نہیں ملتیں اور جن لوگوں میں یہ ہوتی ہیں اور وہ ساتھ ساتھ فراخ دل اور عالی حوصلہ بھی ہوں تو فطرت کی طرف سے انکی کچھ ایسی ساخت ہوتی ہے

کہ وہ منتظم، پر امن وسکون اور ایک مستقل وضع کی زندگی نہیں گذار سکتے۔ انکے ہیجانات انھیں جدھر چاہتے ہیں لیجاتے ہیں اور ان کی تمام ٹھوس اصلیت اپنے نکلجاتی ہے۔

ایڈ :- بہت درست۔

میں :- برخلاف اسکے وہ مستقل طبائع ہیں جنپر زیادہ اعتماد کیا جاسکتا ہے جو جنگ میں اٹل اور خوف سے بالکل غیر متاثر ہوتی ہیں، تو یہ غریب جب کچھ سیکھنے سمجھنے کا معاملہ ہوتا ہے تب بھی ایسی ہی غیر متحرک اور منجمد ثابت ہوتی ہیں یہ ہمیشہ ایک ساکن کیفیت میں رہتی ہیں، اور جہاں کچھ ذہنی محنت کا معاملہ آیا ہمیشہ ہوتا ہے کہ یہ جمائیاں لیکر سو جائینگے۔

ایڈ :- بالکل بجا۔

میں :- لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ جن لوگوں کو اعلیٰ تعلیم دی ہے اور جو کسی عہدہ یا منصب پر قابض ہونیوالے ہیں ان کے لیے یہ دونوں صفات لازمی ہیں۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- تو کیا یہ نہایت کمیاب طبقہ ہوگا؟

ایڈ :- ہاں، یقیناً۔

میں :- تو اس کے اُمیدوار کا امتحان صرف ان مسرتوں، مشقتوں، اور خطرات سے نہ ہوگا جنکا ہم ذکر کر چکے ہیں، بلکہ ایک اور قسم کی آزمایش بھی ہے جس کا بیان ابھی رہ گیا تھا یعنی مختلف قسم کے علوم میں اسکی مشق کرانی چاہیئے تاکہ معلوم

ہو سکے کہ آیا اس کی روح افضل ترین علوم کا تحمل کر سکے گی یا نہیں؟

ایڈ:- ہاں۔ یہ تو بالکل ٹھیک ہے کہ آپ اس کی آزمائش کریں لیکن افضل ترین علم سے آپ کا مقصود کیا ہے؟

میں:- تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے روح کے تین حصے کیے تھے، اور عدل، عفت واعتدال، جرأت اور عقل کی جداگانہ ماہیتوں میں تمیز کی تھی۔

ایڈ:- خوب، اگر میں اسی کو بھول جاؤں تو پھر آگے گفتگو سننے کا مستحق ہی نہیں۔

میں:- اور ان پر بحث کرنے سے قبل جو تمہیدی الفاظ کہے گئے تھے وہ تمہیں یاد ہیں؟

ایڈ:- آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟

میں:- اگر میں غلطی نہ کرتا ہوں تو غالباً ہم نے کہا تھا کہ جو شخص انہیں انکے کامل حسن میں دیکھنا چاہتا ہے اُسے ذرا طویل و پر پیچ رستہ اختیار کرنا ہوگا کہ اسکے طے ہونے پر یہ ظاہر ہوں گی۔ لیکن ہم ان کی ایک عامیانہ توضیح بھی اضافہ کر سکتے ہیں جس کی سطح گذشتہ بحث کی سی ہو۔ اس پر تم نے جواب دیا کہ بس یہی توضیح تمہارے لیے کافی ہوگی۔ چنانچہ تحقیق اس انداز سے جاری ہوئی جو میرے خیال کے مطابق نہایت غیر صحیح طریقہ ہے۔ رہا یہ کہ تم بھی اس سے مطمئن ہوئے یا نہیں سو یہ تمہارے بتانے کی بات ہے۔

ایڈ:- جی، میرا اور نیز دیگر احباب کا خیال ہے کہ آپ نے ہمیں صداقت کا

ایک معقول معیار فراہم کر دیا۔

میں :- لیکن، میرے دوست! ان چیزوں کا ہر وہ معیار جو کامل صداقت سے ذرا سی قدر بھی کم ہو وہ معقول معیار نہیں۔ کوئی ناقص چیز کسی دوسری چیز کا معیار نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ لوگ عموماً قانع ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مزید تلاش کی ضرورت نہیں

ایڈ :- جب لوگ کاہل ہوں تو یہ صورت کچھ غیر معمولی نہیں۔

میں :- ہاں، اور ریاست اور آئین کے محافظ کے لئے اس سے بڑا کوئی اور عیب نہیں ہو سکتا۔

ایڈ :- درست۔

میں :- تو پھر محافظ سے یہ طویل راہ اختیار کرانی چاہیئے اور اسے علم اور ورزش دونوں میں محنت کرنی چاہیئے ورنہ وہ کبھی اس افضل ترین علم کو نہ حاصل کر سکیگا جو جیسا کہ ہم ابھی کہہ رہے تھے، اس کا اصلی مقصد ہے۔

ایڈ :- کیا؟ کیا کوئی علم اس سے بھی اعلیٰ اور افضل ہے۔ یعنی عدل اور دیگر محاسن سے بھی اعلیٰ۔

میں :- ہاں، ہے۔ اور خود ان مذکورہ محاسن کا بھی ہمیں محض خاکہ نہ دیکھنا چاہیئے جیسا کہ ہم فی الحال کر رہے ہیں۔ ہمیں بہترین مکمل تصویر سے کم پر مطمئن ہی نہ ہونا چاہیئے۔ جب چھوٹی چھوٹی چیزوں کو انتہائی محنت کے ساتھ تفصیلی طور پر بنایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے پورے حسن اور کامل وضاحت سے ظاہر ہو سکیں تو کیسی تمسخر انگیز بات ہے

کہ ہم اعلیٰ ترین حقائق کو صحت کامل حاصل کرنے کے قابل نہ سمجھیں۔

ایڈ:۔ نہایت اعلیٰ خیال ہے۔ لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اس سوال سے باز آجائینگے کہ آخر یہ افضل ترین علم کیا ہے؟

میں:۔ نہیں نہیں، تمہارا جی چاہے تو پوچھو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بارہا اسکا جواب سُن چکے ہو، اور یا تو تم مجھے سمجھتے نہیں اور یا غالباً تم محض شرارت پر آمادہ ہو تمہیں اکثر بتایا گیا ہے کہ خیر کا تصور (عین) اعلیٰ ترین علم ہے۔ اور تمام دوسری چیزیں اسی کو استعمال کرکے مفید اور کارآمد بنتی ہیں۔ تم اس سے تو مشکل ہی ناواقف ہوگے کہ میں اب اسی کے متعلق گفتگو کرنے والا تھا، اور تم نے مجھے اکثر کہتے سُنا ہوگا کہ ہم اسکے متعلق سب سے کم جانتے ہیں۔ اور اس کے بغیر ہر دوسرا علم اور ہر قسم کی متاع ہمارے لئے بیسود ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمام دوسری چیزوں پر قبضہ ہمارے لیے کوئی بھی قیمت رکھتا ہے، اگر ہمارے قبضہ میں خیر نہ ہو۔ یا تمام دوسری چیزوں کا علم ہمارے لیے کوئی قدر رکھ سکتا ہے اگر ہمیں حسن و خیر کا علم نہ ہو۔

ایڈ:۔ یقیناً نہیں۔

میں:۔ تم اس سے بھی آگاہ ہو کہ اکثر لوگ مسرت وحظ کو خیر کہتے ہیں لیکن انسے لطیف تر عقلیں اسے علم سے تعبیر کرتی ہیں۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ مؤخر الذکر لوگ یہ واضح نہیں کرسکے کہ انکا

علم سے کیا مفہوم ہے اور بالآخر مجبور ہو کر اسے خیر کا علم کہدیتے ہیں۔

ایڈ :۔ کیا خوب، کیسی تمسخر خیز بات ہے!

میں :۔ جی ہاں۔ پہلے تو یہ لوگ ہم پر ملامت کرتے ہیں کہ خیر سے ناواقف ہو اور پھر فرض کر لیتے ہیں کہ ہمیں اس کا علم ہے۔ کیونکہ خیر کی تعریف یہ لوگ کرتے ہیں "علم خیر" گویا جب انھوں نے لفظ خیر استعمال کیا تو ہم اس کے معنی سمجھتے ہی تھے۔ نہایت مضحکہ انگیز بات ہے۔

ایڈ :۔ بالکل بجا۔

میں :۔ اسی طرح جو مسرت و حظ کو خیر کہتے ہیں وہ بھی برابر کی ہی پریشانی میں مبتلا ہیں کیونکہ انھیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جہاں اچھی مسرتیں ہیں وہاں بُری مسرتیں بھی ہیں۔

ایڈ :۔ یقیناً

میں :۔ اس طرح گویا انھیں تسلیم کرنا ہوتا ہے کہ اچھا اور بُرا ایک ہی ہے۔

ایڈ :۔ بجا۔

میں :۔ جن لاتعداد مشکلات میں یہ مسئلہ آلودہ ہے انہیں کیا شبہہ ہو سکتا ہے؟

ایڈ :۔ کوئی شبہہ نہیں۔

میں :۔ پھر کیا ہم بہت سے لوگوں کو اسپر آمادہ نہیں پاتے کہ اصلیت و حقیقت کے بغیر وہ کریں یا رکھیں یا معلوم ہوں جو بظاہر مبنی بر انصاف و عدل و قابل عزت ہو۔

لیکن خیر کے محض ظاہر سے کوئی مطمئن نہیں ہوتا۔ تلاش تو حقیقت کی ہی اور خیر کے معاملہ میں ہر ایک محض ظاہر صورت کو ذلیل سمجھتا ہی۔

ایڈ :- بالکل بجا۔

میں :- اس چیز سے جس کی تلاش ہر انسانی روح کو ہی اور جسے وہ اپنے تمام اعمال کا مقصد بناتی ہی، کیونکہ اسے پہلے سے یہ خیال ہی کہ ایسا مقصد ہونا چاہئے لیکن پھر متامل ہی کہ نہ اس کی ماہیت کا علم رکھتی ہی نہ اس کے متعلق وہ یقین جو دوسری چیزوں کے متعلق ہی اور اس طرح دوسری چیزوں میں جو کچھ خوبی ہی اسے ضائع کر دیا ہی کیا اس عظیم الشان اصول کے متعلق ہماری ریاست کا بہترین انسان جسکے سپرد سب کچھ ہی، جہالت کی تاریکی میں ہوگا؟

ایڈ :- ہرگز نہیں۔

میں :- میرا یقین ہی کہ جو شخص نہیں جانتا کہ حسن و عدل ساتھ ہی ساتھ خیر بھی کس طرح ہوتے ہیں، وہ حسن و عدل کا کچھ یونہی سا محافظ ہوگا۔ اور میں تو شبہ رکھتا ہوں کہ جو شخص خیر سے ناواقف ہی وہ ان کا علم بھی نہیں رکھ سکتا۔

ایڈ :- نہایت بجا شبہ ہی۔

میں :- اور اگر ہمیں ایسا محافظ ملجائے جسے یہ علم ہو تو پھر تو ہماری ریاست میں کامل نظم ہوگا۔

ایڈ :- بلا شبہ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے یہ بتلائیں کہ آپ خود خیر کے

اس اصل اعلےٰ کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں ؟ آیا یہ علم ہی یا مسرت و حظ یا ان دونوں سے جداگانہ کوئی شئے

میں :- ہاں ہاں، میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ تم جیسا باریک بیں اور چھان بین کرنے والا ان معاملات پر محض دوسرے لوگوں کے خیالات سُننے پر قانع نہ ہوگا۔

ایڈ :- جناب سقراط! یہ سچ ہی لیکن میں یہ ضرور عرض کرونگا کہ آپ جیسے شخص کو جسنے اپنی ساری زندگی فلسفہ کے مطالعہ میں صرف کی ہو اس پر کبھی قانع نہ ہونا چاہیئے کہ بس دوسروں کی رائیں دہرائے اور خود اپنی رائے کبھی نہ بتلائے۔

میں :- درست، لیکن کیا کسی شخص کو اس معاملہ پر کوئی قطعی رائے دینے کا حق ہے جسے جانتا نہ ہو؟

ایڈ :- نہیں، اسے اپنا خیال قطعی یقین کے ساتھ نہ پیش کرنا چاہیئے۔ اس کا اسے بیشک حق نہیں لیکن وہ یہ کہہ سکتا ہی کہ اس معاملہ پر اس کا کیا خیال ہی یعنی محض بطور رائے کے۔

میں :- کیا تم نہیں جانتے کہ محض آراء تمام کی تمام بُری ہوتی ہیں اور انہیں سے بہترین بھی کور ہیں تم اس سے تو انکار نہ کروگے کہ جن لوگوں کے ذہن میں بلا سمجھے کوئی صحیح خیال ہو انکی مثال اندھوں کی سی ہی جو سڑک پر اپنا راستہ محسوس کر لیتے ہیں۔

ایڈ :- بالکل صحیح۔

میں :- پھر کیا تم اسے دیکھنے کی خواہش رکھتے ہو جو کور ہی اور مسخ و ذلیل جبکہ دوسرے تمھیں حسن و تجلی بتانے پر طیار ہیں۔

گلاکن :- پھر بھی جناب سقراط میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ عین اسوقت کہ ہم منزل مقصود پر پہنچ رہے ہیں اپنا منھ نہ موڑیئے۔ اگر آپ خیر کی بھی ایسی ہی توضیح کر دیں جیسی کہ آپ نے عدل و عفت اور دیگر محاسن کی کی ہی تو ہم مطمئن ہو جائیں گے۔

میں :- ہاں۔ میرے دوست مجھے بھی کم از کم اتنا ہی اطمینان حاصل ہوگا! لیکن مجھے ڈر ہی کہ میں ناکام رہوں گا۔ اور میرا بیجا جوش میری ہنسی اڑوائیگا نہیں نہیں۔ میرے مہربانو، ہم اس وقت نہ پوچھیں کہ خیر کی اصل ماہیت کیا ہی کیونکہ اس مقام پر پہونچنے کے لیے جو اسوقت میرے خیال میں ہی ایسی سعی درکار ہی جو میری طاقت سے باہر ہوگی۔ البتہ میں خیر کے ایک بچہ کا ذکر کرسکتا ہوں جو سب سے زیادہ اس سے مشابہ ہی، بشرطیکہ مجھے یہ یقین ہو جائے کہ آپ لوگ سے سننا چاہتے ہیں۔ ورنہ یہ بھی نہیں۔

گلاکن :- ہاں ہاں ضرور۔ بچہ کا ذکر کیجئے۔ اور باپ کا بیان آپ پر گویا واجب الادا رہے گا۔

میں :- سچ پوچھو تو میں تو خود چاہتا ہوں کہ میں صرف اولاد ہی کا نہیں بلکہ والد کا حساب بھی چکا سکتا اور تم اُسے بھی وصول کر لیتے۔ لیکن خیر فی الحال اسی کو

بطور سود کے لو اور خیال رکھو کہ میں کہیں غلط حساب تو نہیں دیتا۔ اگرچہ سچ پوچھو تو میرے دل میں تمھیں دھوکہ دینے کا ذرا بھی قصد نہیں ہے۔

گلاکن :۔ بہت اچھا، آپ آگے چلیے، ہم حتی الوسع پوری احتیاط برتیں گے۔

میں :۔ ہاں، لیکن پہلے میں آپ لوگوں سے ایک سمجھوتہ کر لوں، اور آپ کو ایک بات پھر یاد دلا دوں جو اثنائے بحث میں اور نیز دوسرے موقعوں پر میں بیان کر چکا ہوں۔

گلاکن :۔ وہ کیا؟

میں :۔ وہی پرانا قصّہ، کہ ایک حسن کثرت ہوتا ہے اور خیر کثرت اور اسی طرح اور دوسری چیزوں کے متعلق جنکا تذکرہ اور تعریف ہم کرتے ہیں۔ ان سب پر لفظ کثرت کا اطلاق ہوتا ہے۔

گلاکن :۔ درست۔

میں :۔ اور ایک ہوتا ہے حسن مطلق اور خیر مطلق، نیز جن دوسری چیزوں پر لفظ 'کثرت' عائد ہوتا ہے ان کا بھی ایک 'مطلق' ہے، کیونکہ یہ سب ایک ' احد عین' کے تحت لائے جا سکتے ہیں جو ہر ایک کا اصل وجوہر کہلاتا ہے۔

گلاکن :۔ بہت صحیح۔

میں :۔ 'کثرت' دیکھی جاتی ہے، جانی نہیں جاتی، اور اعیان جانے جاتے ہیں دیکھے نہیں جاتے۔

گ :- بجا۔

میں :- مرئی چیزوں کو ہم کاہے سے دیکھتے ہیں؟

گ :- باصرہ سے۔

میں :- اور سامعہ سے سُنتے، اور دیگر حواس سے دوسرے موارد حس کا احساس کرتے ہیں۔

گ :- درست۔

میں :- لیکن تم نے کبھی اس طرف توجہ کی ہے کہ باصرہ ہنرمندی کا سب سے قیمتی اور پیچیدہ کام ہے جو صناع حواس نے انجام دیا ہے؟

گ :- نہیں میں نے کبھی ادھر دھیان نہیں کیا۔

میں :- تو ذرا غور کرو۔ کیا کان یا آواز کو اس لیے کہ وہ سن سکے یا یہ سنا جا سکے کسی تیسری یا اضافی چیز کی ضرورت ہے؟

گ :- کسی چیز کی نہیں۔

میں :- دراصل نہیں۔ اور یہی حال اگر سب کا نہیں تو اکثر حواس کا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں کسی حس کو یہ اضافی چیز درکار ہے؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- لیکن کسی دوسری شے کے اضافہ کے بغیر نہ دیکھنا ممکن ہے نہ دیکھا جانا۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- ایسے کہ باوجودیکہ آنکھوں میں باصرہ موجود ہو، اور آنکھوں والا دیکھنا بھی چاہتا ہو، رنگ بھی موجود ہو، لیکن جب تک اس غرض کے لیے ایک اور تیسری چیز موجود نہ ہو اُس وقت تک آنکھوں والا کچھ نہ دیکھ سکیگا اور رنگ غیر مرئی رہینگے

گ :- آپ کس چیز کا ذکر کر رہے ہیں ؟

میں :- اسکا جسے تم روشنی کہتے ہو۔

گ :- ہاں، درست۔

میں :- شریف ہے وہ رشتہ جو باصرہ کو مرئی چیزوں سے جوڑتا ہے اور دوسرے رشتوں سے بوجہ اپنے کثیر اختلافِ ماہیت کتنا مہتم بالشان۔ کیونکہ یہ رشتہ روشنی ہے اور روشنی کوئی ذلیل شئے نہیں۔

گ :- ذلیل کی بالکل ضد۔

میں :- اور تمہارے خیال میں آسمانی دیوتاؤں میں اس عنصر کا مالک کون ہے ؟ وہ روشنی کس کی ہے جو آنکھ کو پوری طرح دیکھنے اور مشہود کو ظاہر ہونے دیتی ہے۔

گ :- آپ کا مطلب آفتاب سے ہے۔ آپ کا نیز تمام نوع انسانی کا یہی خیال ہے

میں :- روشنی سے اس دیوتا کا تعلق کیا اس طرح بیان نہیں ہو سکتا ؟

گ :- کس طرح ؟

میں :- نہ تو آنکھ آفتاب ہے اور نہ باصرہ جو آنکھ میں رہتی ہے۔

گ :- نہیں۔

میں :- تاہم تمام اعضائے حِسّیہ میں آنکھ ہی سب سے زیادہ سورج کی طرح ہی۔

گ :- سب سے زیادہ۔

میں :- اور آنکھ میں جو قوت ہی وہ گویا آفتاب سے ایک طرح کا تموج و انصباب ہی۔

گ :- بالکل۔

میں :- تو گویا آفتاب باصرہ نہیں باصرہ کا باعث اور منبع ہی جسے باصرہ جانتی اور مانتی ہی۔

گ :- درست۔

میں :- اسی کو میں خیر کا بچہ کہتا ہوں جسے خیر نے اپنے مشابہ پیدا کیا تاکہ عالم مرئی میں اس کا تعلق باصرہ اور اشیاء مشہودہ سے وہی ہو جو تعلق عالم ذہنی میں خیر کو ذہن اور اشیاء ذہنیہ سے ہی۔

گ :- کیا آپ براہ نوازش اسے ذرا اور صاف کریںگے؟

میں :- کیوں، تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ اگر ایک شخص اپنی آنکھیں ایسی چیزوں کی طرف سے پھیرے جن پر اون کی روشنی نہ پڑ رہی ہو بلکہ صرف چاند تاروں کی تو اسکی آنکھیں دھندلا دھندلا دیکھیں گی اور تقریباً کور ہوں گی، ان میں بصارت کی صفائی نہ ہوگی۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- لیکن جب انھیں ایسی چیزوں کی طرف پھیرا جائے جن پر آفتاب چمک

رہا ہو تو پھر ان میں بصارت ہو گی اور وہ صاف صاف دیکھ سکیں گے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- تو روح کی مثال بھی آنکھ کی سی ہے جب وہ ادھر دیکھتی ہے جہاں حقیقت وجودِ مطلق اپنی روشنی ڈال رہے ہیں تو وہ دیکھتی ہے اور سمجھتی ہے اور اپنے فہم سے طلعت پذیر ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کا رخ کون و فساد کے جھٹپٹے کی طرف ہوتا ہے تو پھر یہ محض ظن درائے رکھتی ہے اور پھرتی ہے ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتی، کبھی ایک رائے رکھتی ہے کبھی دوسری اور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی فہم نہیں

گ :- بالکل یہی حالت ہوتی ہے۔

میں :- ہاں تو یہ چیز جو معلوم کو صداقت اور عالم کو قوت علم عطا کرتی ہے یہ ہے وہ چیز جسے میں چاہتا ہوں کہ تم عین خیر کہو۔ یہی تمام حکمت کی علت ہے اور تمام صداقت کی بھی، جہاں تک صداقت علم کا موضوع بن سکتی ہے۔ اور یوں اگرچہ صداقت علم دونوں حسین و جمیل ہیں، لیکن تم حق بجانب ہو گے اگر اس چیز کو ان دونوں سے حسین و جمیل تر سمجھو، جس طرح گذشتہ بالا مثال میں روشنی اور باصرہ کو بجا طور پر آفتاب سے مشابہ کہہ سکتے تھے، لیکن پھر بھی یہ آفتاب نہ تھیں، اسی طرح اس دوسرے حلقہ میں حکمت و صداقت کو بھی خیر سے مشابہ مان سکتے ہیں لیکن خود خیر نہیں خیر کا تخت اعزاز اس سے بھی بلند تر ہے۔

گ :- وہ چیز حسن و جمال کا کیسا حیرت کدہ ہو گی جو حکمت و صداقت کی موجد ہے

پھر حسن میں اپنے بڑھکر۔کیونکہ آپ کا یہ تو مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ مسرت خدا خیر ہے؟۔

میں :۔ نعوذ باللہ۔ لیکن کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں کہ اس تصویر پر ایک اور نقطہ سے پھر نظر ڈالیں۔

گ :۔ وہ کونسا نقطۂ نظر ہے؟

میں :۔ آپ یہ تو کہیں گے نا کہ آفتاب نہ صرف تمام مرئی چیزوں کے نظارہ ہی کا باعث ہے بلکہ تخلیق اور نشو و نمو کا بھی اگرچہ وہ خود (تخلیق) نہیں۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ علی ہذا القیاس خیر کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمام معلوم چیز دیگر علم ہی کا نہیں بلکہ اُن کے وجود و صلیت کا بھی باعث ہے۔ لیکن باوجود اسکے خیر خود یہ صلیت نہیں بلکہ اپنی شان و قوت میں اس صلیت سے کہیں افضل ہے۔

گ :۔ (ایک تمسخر آمیز قہقہے سے) آسمان کی روشنی کی قسم! کیسی حیرت انگیز باتیں ہیں!

میں :۔ ہاں ہاں۔ اور اگر کچھ مبالغہ ہے تو اس کا الزام تمہارے ذمہ ہے کہ تم نے مجھے اپنے تخیلات بیان کرنے پر مجبور کیا۔

گ :۔ خدارا، ابھی بیان کیے جائیے۔ کم از کم اگر اس آفتاب والی تمثیل کے متعلق کچھ کہنا باقی ہو تو اسے تو ضرور سنائیے۔

میں :۔ ہاں۔ ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔

گ :- تو پھر سر مو بھی حذف نہ کیجئے۔

میں :- میں اپنی سی کوشش کرونگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بہت کچھ حذف کرنا ہوگا۔

گ :- مجھے توقع ہے کہ ایسا نہ ہوگا۔

میں :- تو پھر تصوّر کرو کہ دو حکمراں طاقتیں ہیں ایک ذہنی دنیا پر مسلط ہے ایک عالم مرئی پر۔ میں آسمان اس لیے نہیں کہتا کہ مبادا تم سمجھو کہ میں محض نام سے کھیل رہا ہوں کیا میں سمجھ لوں کہ ذہنی اور مرئی کی یہ تفریق تمہارے ذہن میں اچھی طرح آگئی؟

گ :- جی ہاں۔ آگئی۔

میں :- اچھا اب ایک خط لو جو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان دو حصوں کو پھر اسی نسبت سے تقسیم کرو۔ اور فرض کرو کہ اصلی دو تقسیمیں مرادف ہیں ایک عالم مرئی اور دوسری عالم ذہنی کے، پھر ان مزید تقسیموں کا انکی وضاحت اور عدم وضاحت کے اعتبار سے مقابلہ کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ عالم مرئی میں پہلا جز تصاویر پر مشتمل ہے۔ اور تصاویر سے میری مراد ہے اول تو سایہ سے اور دوسرے اُن عکسوں سے جو پانی یا منجمد مسطح اور چکنی یا ایسی ہی اور چیزوں میں پڑتے ہیں۔ آپ سمجھ گئے؟

گ :- جی ہاں، سمجھ گیا۔

میں :- اب دوسرے جزو کا تصور کرو جسکی محض مشابہت تھی۔ اسمیں وہ جانور شامل ہیں جو ہم دیکھتے ہیں اور ہر وہ چیز جو قدرتاً پیدا ہوتی ہو یا بنائی جاتی ہو۔

گ :- بہت خوب۔

میں :- کیا تم تسلیم نہ کروگے کہ اس تقسیم کے ہر دو اجزا میں صداقت کے مختلف مدارج ہیں اور نقل کو اصل سے وہی نسبت ہو جو حلقۂ آرا کو حلقۂ علم سے۔

گ :- بلا شبہ۔

میں :- اسکے بعد دیکھئے کہ اشیاء ذہنیہ کا حلقہ کس طرح منقسم ہونا چاہیئے؟۔

گ :- ہاں، کس طرح؟۔

میں :- اس طرح، اسکی دو مزید تقسیمیں ہیں۔ انمیں سے اسفل میں روح ان اشکال کا جو سابقہ تقسیم سے آتی ہیں بطور تصاویر استعمال کرتی ہو۔ تحقیق صرف فرضی ہو سکتی ہو، اور بجائے اسکے کسی اصول کیطرف اوپر چلے یہ دوسرے سرے کیطرف اترتی ہو۔ قسم اعلیٰ میں روح مفروضہ سے گذر کر ایک اصول کی طرف جاتی ہو جو مفروضہ سے بالاتر ہو پہلے کی طرح صور کا استعمال نہیں کرتی بلکہ خود اعیان میں سے اور اعیان ہی کے ذریعہ آگے بڑھتی ہو۔

گ :- میں آپ کا مفہوم پوری طرح نہیں سمجھا۔

میں :- تو میں پھر کوشش کروں گا۔ میں اگر کچھ تمہیدی ابتدائی باتیں پہلے کہدوں تو تم بہتر سمجھوگے۔ تم جانتے ہو کہ ہندسہ حساب اور دوسرے اسی قسم کے علوم کے طلباء اپنے علوم کی مختلف شاخوں میں طاق و جفت بعض اشکال تین

قسم کے زاویہ اور اسی قسم کی چیزیں فرض کر لیتے ہیں۔ یہ انکے مفروضات ہیں جنکے متعلق سمجھا جاتا ہی کہ وہ خود اور ہر دوسرا شخص انھیں جانتا ہی۔ اسلیے ان کی تشریح کی تکلیف یہ نہ خود اپنے لیے گوارا کرتے ہیں نہ دوسروں کے لیے۔ لیکن شروع انھیں سے کرتے ہیں اور آگے چلے جاتے ہیں یہانتک کہ بالآخر درجہ بدرجہ یہ اپنے نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔

گ :- جی ہاں، میں اس سے واقف ہوں۔

میں :- اور کیا تم یہ بھی نہیں جانتے کہ اگرچہ یہ لوگ مرئی اشکال کا استعمال کرتے اور انھیں کے متعلق دلیلیں دیتے ہیں لیکن درا‌صل ان کے ذہن میں ان شکلوں کا خیال نہیں بلکہ ان ارتسامات کا ہی جنسے یہ مشابہ ہیں۔ ان شکلوں کا نہیں جو یہ کھینچتے ہیں بلکہ مربع مطلق اور قطر مطلق کا اور علیٰ ہذا القیاس۔ جو شکلیں یہ کھینچتے یا بناتے ہیں اور جنکا خود بھی پانی میں سایہ اور عکس پڑتا ہی انھیں یہ لوگ تصویروں میں تبدیل کر لیتے ہیں لیکن درا‌صل متلاشی ہوتے ہیں۔ یہ اس چیز کو فی نفسہ دیکھنے کے اور اسے صرف چشم ذہن سے دیکھا جا سکتا ہی۔

گ :- سچ ہے۔

میں :- اسی قسم کو میں نے قابل فہم کہا تھا۔ اگرچہ اس کی جستجو میں روح کو مفروضات کا استعمال مجبوراً کرنا پڑتا ہی، وہ کسی اصول اولیہ کیطرف صعود نہیں کرتی کیونکہ وہ عالم مفروضات سے بلند ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی۔ ہاں، ان چیزوں کو بطور صور استعمال کرتی ہی جن کے سایے خود اپنی جگہ تشبیہیں ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں اپنے سایہ اور عکس کے

مقابلہ میں زیادہ وضاحت اور لہٰذا زیادہ قدر رکھتی ہیں۔

گ :۔ میں سمجھتا ہوں۔ آپ ہندسہ اور دیگر متعلق فنون کا ذکر کر رہے ہیں

میں :۔ اور جب میں قابل فہم کی دوسری تقسیم کا ذکر کرونگا تو تم سمجھو گے کہ میں اس دوسری نوع علم کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جو عقل خود منطق کی قوت سے حاصل کرتی ہے۔ اور مفروضات کو بطور اصول اولیہ نہیں بلکہ محض بطور مفروضات استعمال کرتی ہے یعنی بالفاظ دیگر ایک ایسی دنیا میں جو مفروضات سے بالاتر ہے بطور منزل ونشان کے تاکہ اپنے پرے کل کے اصول اول تک پرواز کر سکے اور پھر کبھی اس کے سہارے سے اور کبھی اس کے سہارے سے جو اس پر منحصر ہے درجہ بدرجہ و منزل بہ منزل یہ پھر کسی محسوس شے کی مدد کے بغیر اترتی ہے، اعیان سے اعیان میں ہوتے ہوئے پھر اعیان پر ہی آکر ختم کرتی ہے۔

گ :۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ بالکل تو نہیں کیونکہ آپ ایک ایسا کام بیان کر رہے ہیں جو حقیقتاً محیر العقول معلوم ہوتا ہے۔ تاہم میں یہ سمجھا کہ آپ کی رائے میں وہ علم و وجود جو علم منطق کا موضوع ہیں ان فنون کے تصورات سے واضح تر ہوتے ہیں جو محض مفروضات پر اپنی بنیاد رکھتے ہیں۔ انھیں بھی عقل ہی دیکھتی ہے حواس نہیں، تاہم چونکہ یہ ابتدا کرتے ہیں مفروضات سے اور کسی اصول تک صعود کرتے نہیں اس لیے ان کے دیکھنے والے آپ کے نزدیک ان پر عقل اعلیٰ کا استعمال نہیں کرتے۔ اگرچہ جب ان کے ساتھ ایک اصول اولیہ کا اضافہ کر دیا جائے

تو یہ عقل اعلیٰ کے لیے معروف ہو جاتے ہیں اور جو عادت ہندسہ اور متعلق علوم سے وابستہ ہو اسے غالباً آپ فہم کہیں گے نہ کہ عقل اور گویا یہ رائے اور عقل کے بین بین ہوگی۔

میں :۔ تم میرا مفہوم بالکل سمجھ گئے۔ اب ضرورت ہے کہ ان چار تقسیموں کے مطابق روح میں چار صلاحیتیں یا قوتیں ہوں۔ اعلیٰ ترین کی مرادف عقل، دوسری کا فہم، تیسری کا عقیدہ اور آخری کے مرادف سایوں کا ادراک۔ اور ان کا ایک پیمانہ ہونا چاہیئے۔ آؤ ہم یہ فرض کر لیں کہ مختلف صلاحیتوں میں اسی درجہ کی وضاحت ہوتی ہے جتنی کہ ان کے موضوع میں صداقت ہو۔

گ :۔ میں سمجھ گیا۔ اور میں اس سے اتفاق کرتا اور آپ کی ترتیب کو تسلیم کرتا ہوں۔

ساتویں کتاب

میں :۔ اچھا اب میں آپ کو ایک تمثیل دیکر بتلاؤں کہ ہماری طبائع کس حد تک روشن ہیں اور کہاں تک غیر روشن :۔ دیکھو! انسانوں کو ایک زمین دوز غار میں رہتا ہوا خیال کرو۔ جس کا منہ روشنی کی طرف ہے اور روشنی غار کے ایک سرے سے دوسرے تک پہونچتی ہے۔ یہ لوگ اس میں بچپن سے ہیں، ان کے پیر اور گردنیں زنجیروں سے جکڑی ہیں تاکہ یہ ہل جھل نہ سکیں اور چونکہ زنجیروں کی وجہ سے نہیں پھیر سکتے اس لئے یہ صرف اپنے سامنے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے اوپر پشت کی طرف کچھ فاصلہ پر ایک آگ دہک رہی ہے اس آگ اور ان زندانیوں کے درمیان ایک مرتفع راستہ ہے، اور اگر تم ذرا دھیان سے دیکھو تو اس راستہ کے برابر ایک نیچی سی دیوار بنی ہوئی دکھائی دیگی جس طرح بازی گر اپنے سامنے ایک پردہ سا بنا لیتے ہیں اور اس کے

اوپر کٹھ پتلیاں دکھلاتے ہیں۔

گلاکن :۔جی، میں نے دیکھا۔

میں :۔ اور تم اس دیوار پر یہ بھی دیکھتے ہو کہ لوگ ادھر سے ادھر گذر رہے ہیں، ان کے ہاتھوں میں طرح طرح کے برتن، مجسمے، اور جانوروں کی شکلیں ہیں، بعض لکڑی کے بعض پتھر کے اور دوسری مختلف چیزوں کے۔ ان لوگوں میں سے بعض باتیں کر رہے ہیں اور بعض خاموش ہیں۔

گلاکن :۔ آپنے تو مجھے عجیب تصویر دکھائی اور یہ قیدی بھی عجیب ہیں۔

میں :۔ ہمیں جیسے ہیں۔ اور یہ بس خود اپنا یا ایک دوسرے کا سایہ دیکھتے ہیں جو آگ سے غار کی مقابل دیوار پر پڑتا ہے۔

گلاکن :۔ سچ ہے۔ جب انہیں سر ہی ہلانے کی اجازت نہیں تو پھر یہ سوائے سایہ کے اور کچھ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

میں :۔ اور ہاتھوں میں جو دوسری چیزیں ہیں ان کا بھی بس اسی طرح سایہ ہی دیکھیں گے۔

گ :۔ جی ہاں۔

میں۔ اور اگر یہ ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں تو کیا یہ نہ سمجھیں گے کہ یہ ان چیزوں کے نام لے رہے ہیں جو واقعتاً ان کے

زدبرو ہیں؟

گ۔ بالکل درست۔

میں۔ اب یہ اور فرض کرو کہ اس زنداں میں دوسری جانب سے ایک آواز بازگشت آتی۔ تو اگر کوئی باہر کا گذرنے والا کچھ کہتا تو کیا یہ یقیناً یہ نہ خیال کرتے کہ یہ آواز اس کے متحرک سایہ سے آرہی ہے۔

گ۔ بلاشبہ۔

میں۔ ان لوگوں کے لئے صداقت بس حرفاً حرفاً ان صور کے سایہ سے عبارت ہوگی۔

گ۔ یقینی بات ہے۔

میں۔ اچھا اب ذرا یہ دیکھو کہ اگر ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے اور ان کی یہ غلط فہمی رفع ہو جائے تو اس کا فطری نتیجہ کیا ہوگا۔ ان میں سے کسی کو آزاد کر کے جب ایک دم کھڑے ہو کر گردن پھیرنے، ذرا چلنے اور روشنی کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا جائے گا تو پہلے پہل تو اسے نہایت شدید کرب محسوس ہوگا۔ روشنی کی چمک اسے اذیت پہونچائیگی اور وہ ان حقایق کو دیکھنے کے قابل نہ ہوگا جن کا اپنی سابقہ حالت میں وہ سایہ دیکھتا تھا۔ اب تصور کرو کہ کوئی شخص اس سے کہتا ہے کہ اس نے پہلے جو کچھ دیکھا سب خیالی دھوکہ تھا۔ البتہ اب کہ وہ وجود اصلی

سے قریب تر ہو رہا ہے اور اس کی آنکھیں زیادہ حقیقی وجود کی طرف مڑی ہیں، اس کا نظارہ پہلے سے واضح تر ہے۔ تو وہ اس کا کیا جواب دیگا؟۔ پھر فرض کرو کہ جیسے جیسے مختلف چیزیں اس کے سامنے سے گذرتی ہیں اس کا معلم اس سے ان کے نام لوانا چاہے تو کیا یہ مبہوط نہ ہو جائیگا۔ کیا یہ غریب یہ نہ سمجھے گا کہ جو سایے یہ پہلے دیکھتا تھا وہ ان چیزوں سے زیادہ حقیقی تھے جو اب اسے دکھائی جا رہی ہیں۔

گ۔ جی ہاں، کہیں زیادہ حقیقی جانے گا۔

میں۔ اور اگر اسے مجبور کیا جائے کہ بالکل سیدھے روشنی کی طرف دیکھے تو اس کی آنکھوں میں کیسی تکلیف ہوگی اور کیا یہ ان چیزوں کیطرف منہ موڑ کر پناہ نہ لینا چاہیگا جنہیں یہ دیکھ سکتا ہے اور جو اسکے خیال میں درحقیقت ان چیزوں سے واضح تر ہیں جو اسے دکھائی جا رہی ہیں۔

گ۔ درست۔

میں۔ اور آگے فرض کرو کہ اسے ایک دشوار گذار سیدھی چڑھائی پر بادل ناخواستہ گھسیٹ لے گئے اور اسوقت تک اسے خوب مضبوط پکڑے رہے کہ یہ خود آفتاب کے حضور میں مجبوراً پیش ہو گیا تو کیا اس کا درد محسوس کرنا اور اس پر چڑچڑانا قرین قیاس نہیں! یہ جب روشنی کی طرف بڑھیگا تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور جنہیں ہم حقایق کہہ رہے ہیں

یہ ان میں کسی کو نہ دیکھ سکے گا۔

گ۔ ہاں یکایک کیسے دیکھ سکے گا!

میں۔ یہ اس عالم بالا کے نظارے کا ہوتے ہوتے ہی عادی ہوگا پہلے تو یہ سایہ کو سب سے اچھی طرح دیکھ سکے گا۔ پھر پانی میں آدمیوں اور دوسری چیزوں کے عکس کو اور پھر کہیں خود اصلی چیزوں کو۔ اب یہ چاند اور تاروں اور روشن آسمان کی روشنی کی طرف نظر کرے گا۔ دن میں سورج اور اس کی روشنی کے بہ نسبت یہ رات میں آسمان اور تاروں کو بہتر دیکھ سکے گا۔

گ۔ یقیناً۔

میں۔ سب سے آخر میں یہ آفتاب کو دیکھ سکے گا۔ نہ صرف پانی میں اس کے عکس کو یا کسی اور جگہ بلکہ خود اس کی اپنی مخصوص جگہ پر اور یہ اب آفتاب کا کما ہی نظارہ کریگا۔

گ۔ یقیناً

میں۔ اب یہ لگیگا یوں دلیل کرنے کہ یہی آفتاب موسم اور سال کا باعث ہے، یہی تمام ان چیزوں کا محافظ ہے۔ جو عالم مرئی میں ہے اور ایک معنی کر یہی ان تمام اشیاء کی علت ہے جنہیں یہ اور اسکے ساتھی دیکھنے کے عادی ہیں

گ۔ جی ہاں۔ صاف ہے، پہلے یہ آفتاب کو دیکھیگا۔ اور پھر اس کے

مفہوم غلط نہیں سمجھا۔ یہ میرا عقیدہ ہے جو تمہاری خواہش پر میں نے ظاہر کردیا صحیح یا غلط خدا جانتا ہے لیکن سچ ہو یا جھوٹ میری رائے یہ ہے کہ علم کی دنیا میں خیر کا تصور سب سے آخر میں آتا ہے اور پھر بھی بڑی کوشش سے دکھائی دیتا ہے۔ ہاں جب دکھائی دیجاتا ہے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حسین اور صحیح چیزوں کا باعث، اور اس عالم مرئی میں سلطان نور دونوں کا پروردگار اور عالم ذہنی میں عقل و صداقت کا بلا واسطہ منبع، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ جو کوئی شخصی یا اجتماعی زندگی میں عقل کے مطابق عامل ہونا چاہے اسے اپنی نگاہ اسی پر قایم رکھنی چاہئے۔

گ۔ جہاں تک میں آپ کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں میں آپ سے متفق ہوں

س۔ نیز تمہیں اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے کہ جو لوگ اس مسعود منظر کو حاصل کر لیتے ہیں وہ معاملات انسانی کی پستی پر نہیں اترنا چاہتے انکی روحیں تو عالم بالا کی طرف بعجلت راہ پیما ہیں اور وہیں قیام کرنا چاہتی ہیں۔ اور اگر ہماری تمثیل قابل اعتماد ہے تو انکی یہ خواہش بالکل قدرتی ہے۔

گ۔ جی۔ بالکل قدرتی۔

س۔ اور کیا اس میں کوئی حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص جو افکار الٰہی سے گذر کر انسان کی حالت سیئہ پر اتر آتا ہے۔ اس سے یہاں نہایت مضحک اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً ابھی کہ اس کی آنکھیں جھپکا رہی ہیں اور وہ

ابھی اپنے ماحول کی تاریکی کا عادی نہیں ہوا ہے اسے قانونی عدالتوں میں مقدمہ بازی کرنا یا اور کہیں عدل کے شکل ظاہری یا خود اس شکل کے سایہ کے متعلق لڑنا پڑے اور وہ ان لوگوں کے تصور کی مطابقت کرنا چاہے جنہوں نے کبھی عدل مطلق کی شکل ہی نہیں دیکھی۔

گ:۔ اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔

س:۔ ہر شخص جس میں معمولی سمجھ ہو جانتا ہے گا کہ آنکھ کی حیرت اور پریشانی دو قسم کی اور دو وجوہ سے ہوتی ہے۔ یعنی یا تو روشنی میں سے نکلنے سے یا روشنی میں داخل ہونے سے۔ اور یہ حقیقت بصیرت ذہنی پر بھی ویسے ہی عاید ہوتی ہے جیسے جسمانی پر۔ جو شخص اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے وہ جب کسی کو دیکھے گا کہ اس کی نظر کمزور اور پراگندہ ہے تو اس پر فوراً ہنس نہ دیگا بلکہ وہ یہ دریافت کریگا کہ آیا اس انسان کی روح روشن تر زندگی سے نکل کر تاریکی میں آئی ہے جس کی وہ عادی نہیں یا تاریکی سے روز روشن کی طرف رخ کرنے پر فراوانی نور نے اسے خیرہ کر دیا ہے۔ ایک کی حالت پر اسے خوشی ہوگی اور دوسرے پر افسوس۔ اور اسے اگر ہنسنا ہی ہے تو اس روح پر اس کی ہنسی زیادہ قرین عقل ہوگی جو تاریکی سے روشنی میں آئی ہے بہ نسبت اس کے جو نور کی بلندی سے قعر تاریکی میں واپس آئی ہے۔

گ:۔ جی یہ بالکل بجا تفریق ہے۔

میں:۔لیکن اگر میرا خیال درست ہو تو پھر بعض ان فاضل معلمین کا یہ خیال غلط ہونا چاہیے کہ جیسے کوئی کور آنکھ میں روشنی داخل کرے یہ روح میں وہ علم ٹھونس سکتے ہیں جو اس میں پہلے سے موجود نہ تھا۔

گ:۔ہاں۔یہ کہتے تو بیشک ہیں۔

میں:۔حالانکہ ہماری دلیل یہ بتلاتی ہو کہ سیکھنے کی قوت اور صلاحیت روح میں پہلے سے موجود ہوتی ہو اور جس طرح آنکھ تاریکی سے روشنی کی طرف بلا پورے جسم کے مڑے ہوئے اپنا رخ نہیں کر سکتی اسی طرح انسان کا آلۂ علم بھی کل روح کی حرکت سے ہی شہود سے وجود کی طرف پھر سکتا اور رفتہ رفتہ وجود، اور وجود میں روشن ترین اور بہترین وجود یعنی بالفاظ دیگر خیر کے نظارہ کی تاب لا سکتا ہے۔

گ:۔بہت درست۔

میں:۔اور کیا کوئی ایسا فن نہ ہونا چاہئے جو اس تبدیلی کو سہل تر اور زود تر طریقہ سے عمل میں لے آئے اس فن کے لئے یہ کام نہیں کہ یہ قوت بصر پیدا کرے کیونکہ یہ تو پہلے سے موجود ہی ہو البتہ اس کا رخ غلط سمت میں ہے اور وہ صداقت سے بعید تر جانب دیکھ رہی ہے۔

گ:۔جی ہاں ایسے فن کا وجود فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں:۔اور ہرچند دیگر محاسن روح صفات جسمانی سے ملتے جلتے ہیں کہ

اگر اصلاً فطرت میں مضمر بھی نہ ہوں تو بعد کو عادت اور مشق سے پیدا کیے جا سکتے ہیں
دانش و عرفان کی خوبی ہر دوسری چیز سے زیادہ اپنے اندر ایک الٰہی عنصر رکھتی ہے جو ہمیشہ باقی رہتا ہے اور جو اس تبدیلی سے مفید اور سود مند ہو جاتا ورنہ بحالت دیگر بیکار اور ضرر رساں رہتا ہے کیا تم نے کبھی کسی چالاک بدمعاش کی تیز آنکھوں میں کوتہ بین ذہانت کی چمک نہیں دیکھی۔ وہ کیسا متجسس ہوتا ہے اور اس کی چھوٹی روح کس صفائی سے اپنے مقصد کی راہ دیکھ لیتی ہے، وہ اندھا نہیں اندھے کی تو ضد ہے۔ ہاں اس کی تیز قوت نظر شر کی خدمت میں لگی ہوتی ہے۔ اور جتنا چالاک ہے اسی نسبت سے شریر ہے۔

گ:۔ بہت درست۔

میں:۔ لیکن اگر نو عمری ہی میں ان طبائع کی قطع و برید ہو جاتی اور انھیں اکل و شرب جیسی لذات شہوانی سے علیحدہ کر لیا جاتا جو پیدا ہونے کے ساتھ ہی ان کی گردن میں سیسہ کے بوجھ کی طرح باندھ دی گئیں اور جو انہیں ہمیشہ اسفل کی طرف کھینچتی اور ان کی نظر کو نیچے کی چیزوں کی طرف پھیرتی ہیں ہاں تو اگر ان موانع سے آزاد کر کے ان کا رخ مخالف سمت میں کر دیا جاتا تو ان کی یہی صلاحیت صداقت کو بھی اسی تیزی سے دیکھتی جس طرح اب ان چیزوں کو دیکھتی ہے جن کی طرف ان کا رخ ہے۔

گ:۔ بہت ممکن ہے۔

میں :۔ ہاں اور ایک بات اور بھی اغلب ہے، بلکہ یوں کہئے کہ گفتگوئے ماسبق سے لازمًا مستخرج ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ نہ تو غیر تعلیم یافتہ اور صداقت سے بے خبر ہماری ریاست کے قابل وزیر ہو سکتے ہیں اور نہ وہ جو اپنی تعلیم کو ختم ہی نہیں کرتے اول الذکر تو اسلئے نہیں کہ یہ اپنے فرض کا کوئی مقصد وحید نہیں رکھتے جو ان کے تمام اعمال شخصی و اجتماعی کا دستور ہو اور موخر الذکر اس وجہ سے نہیں کہ یہ سوائے جبر کے اور کسی طرح کام ہی نہ کریں گے اور یہ خیال کرتے رہیں گے کہ وہ ابھی سے متبرکین کے علیحدہ جزیرہ میں مقیم ہیں۔

گ :۔ بہت صحیح۔

میں :۔ چنانچہ ہمارا کام رکہ ہم اس ریاست کے بانی ہیں) یہ ہے کہ بہترین دماغوں کو اس علم کے حصول پر مجبور کریں جسے ہمنے ابھی ابھی اعلیٰ ترین علم ظاہر کیا ہے، یہ اپنی چڑھائی اور پرواز یہانتک جاری رکھیں کہ خیر تک پہونچ جائیں۔ لیکن جب اس بلندی پر چڑھ جائیں اور کافی دیکھ چکیں تو ہم انہیں وہ نہ کرنے دیں جو یہ آج کل کرتے ہیں۔

گ :۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :۔ یعنی یہ لوگ اسی عالم بالا میں رہ جاتے ہیں، اس کی اجازت نہ ہونی چاہئے۔ انہیں پھر غار کے قیدیوں میں اتارنا چاہئے اور انہیں پھر ان کی مشقتوں اور ان کے انعاموں میں حصہ لینا چاہئے خواہ یہ لینے کے

قابل ہوں یا نہوں۔

گ:۔ مگر کیا یہ بے انصافی نہیں؟ جب یہ بہتر زندگی گذار سکتے ہیں تو کیا ہمیں انکو ایک بدتر زندگی دینا چاہیئے؟

میں:۔ میرے دوست۔ تم پھر واضع قانون کا مقصد بھول گئے ہیں کا مقصد ریاست میں کسی ایک طبقہ کو دوسروں سے زیادہ خوشحال بنانا نہ تھا۔ اسے خوشحالی درکار تھی ساری ریاست کی۔ اس نے شہریوں کو ترغیب اور ضرورت کے زور سے یکجا رکھا، انہیں ریاست کا محسن اور اس طرح گویا ایک دوسرے کا محسن بنایا اور اس غرض سے انہیں پیدا کیا، اس لئے نہیں کہ اپنے کو خوش کریں بلکہ ریاست کے بندھن باندھنے کا آلہ ہوں۔

گ:۔ درست ہے میں بھول گیا تھا۔

میں:۔ گلاکن، ادھر دیکھو۔ ہم اگر اپنے فلسفیوں کو دوسروں کی نگرانی اور پرورش پر مجبور کریں تو اس میں کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔ ہم انہیں سمجھا دیں گے کہ دوسری ریاستوں میں ان کے طبقہ کے لوگ مساعی سیاسیہ میں حصہ لینے پر مجبور نہیں ہوتے۔ اور یہ بات معقول بھی ہے کیونکہ یہ لوگ خود من مانی مرضی سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ ریاست تو ان کے نہ ہونے کو شاید زیادہ پسند کرتی چونکہ یہ اپنی تعلیم آپ کرتے ہیں اس لئے ان سے یہ توقع نہیں کیجا سکتی کہ اس تعلیم کے لئے اظہار تشکر و احسانمندی کریں جو انہیں کبھی ملی ہی نہیں لیکن

تمہیں ہمنے دنیا میں اس چھتے کے حکمران بننے کے لئے پیدا کیا ہی یعنی خود اپنے بادشاہ ہونے کے لئے اور نیز اور شہریوں کے۔ ان سے کہیں بہتر اور کامل تر تعلیم ہمنے تمہیں دی ہی اور تم انسے زیادہ اس دوگونہ فرض میں حصہ لینے کے لایق ہو۔ اس لئے تم میں سے ہرایک کو چاہئے کہ جب اس کی باری آئے تو وہ عام زمین دوز مسکن میں نیچے جائے اور تاریکی میں دیکھنے کی عادت ڈالے۔ جب تم یہ عادت ڈال لوگے تو تم ساکنان غار سے دس ہزار گنا بہتر دیکھ سکوگے۔ تم جانوگے کہ یہ مختلف صورتیں کیا ہیں اور کاہیکی نمایندگی کرتی ہیں کیونکہ تم نے حسن، عدل اور خیر کو انکی سچی صورت میں دیکھا ہی۔ اس طرح ہماری ریاست، جو تمہاری ریاست بھی ہی، ایک حقیقت ہوگی نہ کہ محض ایک خواب، اور اس کا انتظام ان دوسری ریاستوں سے بالکل جداگانہ انداز پر ہوگا جن میں انسان محض سایوں کے متعلق ایک دوسرے سے لڑتے اور طاقت واقتدار کی کشمکش میں جو ان کی نظر میں ایک خیر عظیم ہی اپنے کو منتشر اور پراگندہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ سچ یہ ہی کہ جس ریاست کے حکام حکومت سے سب سے زیادہ بچنا چاہیں اسی پر سب سے عمدہ اور خاموشی کے ساتھ حکومت ہوتی ہی اور جس میں حکام حکومت کرنے کے سب سے زیادہ مشتاق ہوتے ہیں اسی کی حکومت بدترین ہوتی ہی۔

گ:۔ بالکل بجا۔

میں :- تو کیا ہمارے شاگرد یہ سننے کے بعد بھی اپنی باری پر بار الفض حکومت میں حصہ لینے سے انکار کریں گے درآنحالیکہ انہیں اس امر کی اجازت ہے کہ اپنے وقت کا بڑا حصہ باہم آسمانی نور میں گذاریں۔

گ :- ناممکن ہے۔ یہ منصف لوگ ہیں اور ان پر جو احکام عاید کر رہے ہیں وہ مبنی بر انصاف ہیں۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ لوگ اپنے عہدہ کو اس طرح نہ لیں گے جیسے ہمارے موجودہ حکام بلکہ اسے ایک ناگزیر ضرورت سمجھیں گے۔

میں :- ہاں میرے دوست یہی تو اصل نکتہ ہے۔ تمہیں اپنے آئندہ حکام کے لیے محض ایک حاکم سے مختلف اور بہتر زندگی فراہم کرنی چاہیئے اور بس پھر تمہاری ریاست میں عمدہ نظام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ صرف اس ریاست میں جو یہ زندگی پیش کرتی ہے صحیح معنوں میں دولتمند لوگ حکومت کرینگے، وہ نہیں جو سیم و زر رکھتے ہیں بلکہ وہ جو خوبی و عرفان کی دولت سے مالا مال ہیں کہ یہی زندگی کی سچی نعمتیں ہیں۔ برخلاف اسکے اگر یہ لوگ امور عامہ کے انتظام میں مفلس اور اپنے خانگی فوائد کے لیے بھوکے مشغول ہوئے اور لہذا سمجھتے رہے کہ انھیں خود اصلی خوبی جھپٹ لینی چاہیئے تو پھر نظم ہرگز باقی نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنے عہدہ اور منصب کے متعلق لڑتے رہیں گے اور جو خانگی و شہری قضیئے اس سے پیدا ہونگے وہ خود ان حکام کو نیز ساری ریاست کو تباہ و برباد کر دیں گے۔

گ :- بالکل صحیح۔

میں :- اور وہ واحد زندگی جو سیاسی حوصلہ مندی اور ہوس کو بہ نظر حقارت دیکھتی ہو وہ

فلسفیانہ زندگی ہے، کیا تم کوئی اور ایسی زندگی جانتے ہو؟

گ:۔ واقعاً میں نہیں جانتا۔

میں:۔ اور حکومت کرنیوالوں کو اس شغل حکومت سے محبت نہ ہونی چاہیئے، کیونکہ اگر یہ اسکے عاشق ہوئے تو دوسرے رقیب عشاق بھی ہوں گے اور یہ پھر آپس میں لڑیں گے۔

گ:۔ بلاشبہ۔

میں:۔ تو پھر وہ کون لوگ ہیں جنہیں ہم محافظ بننے پر مجبور کریں؟ یقیناً یہ وہی لوگ ہوں گے جو امور مملکت میں سب سے عقلمند اور انتظام ریاست میں بہترین ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ دوسرے اعزاز بھی رکھتے ہوں اور ایک دوسری زندگی جو سیاسی زندگی سے بہتر ہو۔

گ:۔ بس یہی لوگ ہیں، اور میں انہیں کو منتخب کرونگا۔

میں:۔ اب کیا اس مسئلہ پر غور کریں کہ ایسے محافظ آخر پیدا کیسے ہونگے اور انہیں تاریکی سے روشنی میں کیسے لایا جائیگا جیسے بیان کیا جاتا ہے کہ بعض لوگ عالم اسفل سے دیوتاؤں کے پاس تک جا پہونچے ہیں۔

گ:۔ ضرور۔

میں:۔ یہ طریقہ، یہ عمل ایک محار کے گھونگے کا چت یا پٹ پلٹ جانا نہیں بلکہ ایک روح کا رخ بدلنا ہے جو ایک ایسے دن سے جو راست سے بمشکل بہتر تھا اب وجود کے اصلی روز روشن میں آ رہی ہے یعنی اسفل سے اعلی کیطرف

پرواز کر رہی ہو اور یہی ہمارے دعوی کے مطابق سچا فلسفہ ہے۔

گ:۔ بجا ہے

میں:۔ اور کیا اب ہم یہ دریافت نہ کریں کہ ایسا تغیر پیدا کرنے کی طاقت کس علم میں ہے۔

گ:۔ یقیناً۔

میں:۔ وہ کس قسم کا علم ہے جو روح کو شہود سے وجود حقیقی کی طرف کھینچیگا؟ اور ابھی ابھی ایک اور بات کا خیال آیا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہمارے نوجوان جنگی پہلوان بھی ہونے چاہئیں۔

گ:۔ جی ہاں۔ یہ تو کہا جا چکا ہے۔

میں:۔ تو اس نئے قسم کے علم میں ایک اور اضافی صفت بھی ہونی چاہئیے؟

گ:۔ یہ کون صفت؟

میں:۔ جنگ میں مفید اور کار آمد ہونا۔

گ:۔ ہاں۔ اگر ممکن ہو۔

میں:۔ ہماری سابقہ تجویز تعلیم میں دو حصے تھے نا؟

گ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ ایک ورزش تھی جو جسمانی نشو و انحطاط کی نگراں تھی لہذا اسے تخلیق و تخریب سے متعلق سمجھنا چاہیے؟

گ :- بجا۔

میں :- تو پھر یہ تو وہ علم نہیں ہی جس کے اکتشاف کے ہم متلاشی ہیں؟

گ :- نہیں

میں :- لیکن موسیقی کے متعلق کیا کہتے ہو کہ یہ بھی ایک حد تک ہماری سابقہ تجویز میں شامل تھی ؟

گ :- آپ کو یاد ہو گا کہ موسیقی ورزش کا مقابل حصہ تھی اور عادت کے اثر سے محافظین کی تربیت کرتی تھی، یعنی اپنے تناسب سے انھیں تناسب اور اپنے وزن سے انہیں توازن۔ لیکن یہ ان کے لیے حکمت فراہم نہیں کرتی تھی، اور اس کے الفاظ میں خواہ یہ محض فسانہ ہوں یا ممکن ہی سچ ہوں تناسب و توازن کے عناصر شامل ہوتے تھے۔ لیکن موسیقی میں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو اس خیر، کی طرف راجع ہو جس کی اب آپکو تلاش ہی۔

میں :- تمھاری یادداشت بہت صحیح ہی۔ موسیقی میں بیشک اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی۔ لیکن عزیزم گلاکن! آخر یہ مطلوب صفت علم کی کس شاخ میں ہو سکتی ہی؛ ہم نے تمام مفید فنوں کو تو ذلیل ہی قرار دیدیا۔

گ :- بیشک۔ اگر ورزش اور موسیقی کو نکالدیجئے اور پھر فنون کو بھی خارج کر دیجئے، تو باقی کیا رہ جاتا ہی؟

میں :- ہاں، ممکن ہی ہمارے مخصوص مضامین میں کچھ باقی نہ رہے؛ اور

پھر ہمیں کوئی ایسی چیز یعنی ہو جو کسی خاص چیز پر نہیں بلکہ عالمگیر طور پر عاید ہوتی ہو۔

گ:۔ ایسی کونسی چیز ہو سکتی ہے۔

میں:۔ یہ وہ چیز ہوگی جسے تمام علوم، فنون اور عقول مشترک طور پر استعمال کرتی ہیں اور جو ہر شخص کو مبادی تعلیم میں سیکھنا پڑتی ہے۔

گ:۔ وہ کیا؟

میں:۔ یہ چھوٹی سی بات یعنی ایک، دو، تین میں تمیز کرنا یعنی مختصراً گنتی اور حساب۔ کیا تمام علوم اور فنون لازماً انہیں استعمال نہیں کرتے۔

گ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ فن جنگ بھی استعمال کرتا ہے؟

گ:۔ یقیناً۔

میں:۔ پالامیدیس ہمیشہ جب بھی وہ المناک ناٹک میں رونما ہوتا ہے تو اگامنان کو سپہ سالاری کے لئے کس درجہ مضحکہ خیز طور پر ناقابل ثابت کرتا ہے۔ کیا تم نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ وہ کس طرح اعلان کرتا ہے کہ عدد اس نے ایجاد کئے جہازوں کو گنا اور لڑائی میں فوج کو صف بستہ کیا؛ جس سے یہ مفہوم ہے کہ اس سے پہلے کبھی انہیں گنا نہ گیا تھا اگامنان کے متعلق سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے پاؤں تک گننے سے قاصر تھا۔ اور جب عدد

سے ہی ناواقف ہو تو آخر گنے کیسے؟ اگر یہ سچ ہے تو وہ کیسا سپہ سالار رہا ہوگا؟

گ:۔ اگر واقعہ آپ کے بیان کے مطابق تھا تو میں کہونگا کہ عجیب و غریب سپہ سالار تھا۔

میں:۔ کیا ہم اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ ایک جنگ آزما سپاہی کو حساب کا علم ہونا چاہیئے؟

گ:۔ یقیناً اگر یہ فوجی چالوں کو ذرا بھی سمجھنا چاہتا ہے، میں تو کہوں گا کہ اگر مطلقاً آدمی ہی ہونا چاہتا ہے تو اسے ضرور یہ علم ہونا چاہیئے۔

میں:۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس علم کے متعلق تمھارا بھی وہی خیال ہے جو میرا ہے؟

گ:۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

میں:۔ مجھے تو یہ اس قسم کا علم معلوم ہوتا ہے جس کے ہم متلاشی ہیں۔ اور جو قدرتاً تامل و تفکر کی طرف لیجاتا ہے۔ لیکن اسے کبھی صحیح طور پر استعمال نہیں کیا گیا، کیونکہ اسکا صحیح استعمال تو بس روح کو وجود کی طرف کھینچنا ہے۔

گ:۔ کیا آپ ذرا اپنے مفہوم کی توضیح فرمائیں گے؟

میں:۔ کوشش کرونگا، اور چاہتا ہوں کہ تم بھی اس تحقیق میں میرے شریک ہو اور جب میں اپنے ذہن میں علم کی ان شاخوں کو ممیز کرنا چاہوں، جن میں یہ قوت جاذبہ موجود ہے تو تم "ہاں" یا "نہیں" کہدینا۔ تاکہ ہم پھر ذرا اور

وضاحت سے ثابت ہو جائے کہ آیا علم الحساب میرے گمان کے مطابق منجملہ ان علوم کے ہے یا نہیں۔

گ:۔ بہت خوب فرمایئے۔

میں:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اشیاء حس دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض تو فکر و خیال کو متوجہ نہیں کرتیں اس لئے کہ انکے بارہ میں حس کا فی مناسب حکم ہے۔ برخلاف اس کے دوسری قسم کے اشیاء کے بارہ میں حواس اس درجہ ناقابل اعتماد ہیں کہ مزید تحقیق بشدت مطلوب ہوتی ہے۔

گ:۔ ظاہر ہے کہ آپ کا اشارہ اس طریقہ کی طرف ہے جس سے فاصلہ، حواس پر اثر ڈالتا ہے یا روشنی و سایہ کی مصوری، رنگ آمیزی۔

میں:۔ نہیں نہیں یہ مطلقاً میرا مفہوم نہیں۔

گ:۔ تو پھر اور آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں:۔ فکر و خیال کو متوجہ و مدعو کرنے والے چیزوں سے مراد ان سے ہے جو ایک حس سے دوسرے مخالف حس میں نہیں پہونچتے، اور متوجہ کرنے والے وہ ہیں جو پہونچتے ہیں۔ اس موخر الذکر صورت میں حاسہ جب کسی چیز پر عمل کرتا ہے تو سوائے اس کی ضد کے اور کسی خاص چیز کا واضح تصور پیدا نہیں کرتا۔ ایک تمثیل سے میرے معنی زیادہ صاف ہو جائیں گے۔

یہ دیکھو، تین انگلیاں ہیں۔ چھوٹی انگلی، دوسری اور بیچ کی انگلی۔

گ:۔ بہت خوب۔

میں:۔ فرض کرو کہ انہیں بالکل قریب سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور اب اصلی نکتہ آتا ہے۔

گ:۔ وہ کیا؟

میں:۔ ان میں سے ہر ایک مساوی طور پر انگلی معلوم ہوتی ہے، خواہ اسے بیچ میں دیکھو یا سرے پر، خواہ یہ سفید ہو یا سیاہ، موٹی ہو کہ پتلی۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ انگلی بہرحال انگلی ہی ہے۔ ایسی حالت میں انسان فکر و خیال سے یہ سوال کرنے پر مجبور نہیں ہوتا کہ انگلی کیا چیز ہے؟ کیونکہ باصرہ کبھی ذہن کو یہ نہیں بتاتی کہ انگلی علاوہ انگلی کے اور کچھ ہے۔

گ:۔ درست۔

میں:۔ چنانچہ ہمارے حسب توقع اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو سمجھ کی دعوت یا تحریک کا باعث ہو۔

گ:۔ بیشک نہیں ہے۔

میں:۔ لیکن انگلیوں کی بڑائی اور چھوٹائی کے متعلق بھی کیا یہ بات ایسی ہی صحیح ہے؟ کیا باصرہ انہیں کافی طور پر محسوس کر سکتی ہے؟ اور کیا اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ایک انگلی بیچ میں ہے اور ایک سرے پر؟ اسی طرح کیا لامسہ موٹے یا پتلے پن کو کافی صحت کے ساتھ محسوس کر سکتی ہے یا سختی اور نرمی

کو علیٰ ہذالقیاس دوسرے حواس بھی کیا ایسے امور میں کامل اطلاع بخشتے ہیں؟ کیا ان کا طریقہ عمل کچھ اس قسم کا نہیں کہ جو حس سختی کی صفت سے متعلق ہے وہی لازمی طور پر نرمی سے بھی تعلق رکھتی ہو اور روح کو بس یہ اطلاع پہونچاتی ہے کہ ایک ہی چیز سخت اور نرم دونوں محسوس ہوتی ہو۔

گ:- آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔

میں:- اور کیا روح اس اطلاع پر پریشان نہ ہوتی ہوگی جو حاسہ ایک ایسی سخت چیز کے متعلق دیتا ہو جو نرم بھی ہو۔ پھر اسی طرح دیکھو کہ ہلکے اور بھاری کے آخر کیا معنی ہیں جب ہر وہ شے جو ہلکی ہو بھاری بھی ہو اور ہر بھاری چیز ہلکی بھی ہو۔

گ: جی بیشک۔ یہ اطلاعیں جو روح کو پہونچتی ہیں کچھ عجیب و غریب ہیں اور محتاج توضیح۔

میں:- ان پیچیدگیوں میں روح فطرتاً اپنی مدد کے لئے سمجھ اور حساب کو طلب کرتی ہو تاکہ یہ دیکھ سکے کہ یہ جو مختلف چیزیں اس کے سامنے پیش کی گئی ہیں ایک ہی ہیں یا دو۔

گ:- درست۔

میں:- اور اگر یہ دو نکلیں تو کیا ان میں سے ہر ایک خود ایک اور جداگانہ چیز نہیں؟

گ:- یقیناً۔

میں:- اور جب ان میں سے ہر خود ایک ہو اور دونوں ملکر

تو روح ان دو کو حالت تقسیم میں تصور کرے گی۔ کیونکہ اگر یہ غیر منقسم ہ

تصور ایک ہی کی حیثیت سے ہو سکتا۔

گ:- درست۔

میں:- آنکھ نے بلاشبہ چھوٹے اور بڑے دونوں کو دیکھا تھا لیکن

صرف ایک گنجلک طریقہ سے۔ یہ دونوں باہمدگر ممتاز نہ تھے۔

گ:- جی۔

میں:- برخلاف اس کے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے ذہن

طریقہ عمل کو بالکل پلٹ دینے پر مجبور ہوا اور اس نے چھوٹے اور بڑے

حیثیت سے نہیں بلکہ جدا جدا نظر کی۔

گ:- بہت صحیح۔

میں:- تو کیا یہ اس تحقیق کا آغاز نہ تھا کہ "بڑا کیا ہے" اور "چھو

گ:- یقیناً۔

میں:- چنانچہ اس طرح مرئی اور مفہوم کی تفریق پیدا ہوئی

گ:- بالکل درست۔

میں:- جب میں نے ان آثار کا ذکر کیا تھا جو عقل کو متوجہ کر

ان کا جو متوجہ نہیں کرتے تو اس سے میرا مفہوم یہ تھا جن آثار کے ساتھ ساتھ انکی ضد بھی ہو وہ فکر کو متوجہ کرتے ہیں اور جنکی ساتھ نہ ہو وہ نہیں کرتے۔

گ:- میں سمجھ گیا اور آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں:- اور وحدت اور عدد ان میں سے کس قسم میں آتے ہیں؟

گ:- میں نہیں جانتا۔

میں:- ذرا غور کرو تو معلوم ہو گا کہ سابقہ گفتگو سے اس کا جواب ملجاتا ہے اسلئے کہ اگر ہم محض سادہ وحدت کو باصرہ یا کسی دوسری حس سے محسوس کرسکتے تو جیسا کہ ہم انگلی کے بارہ میں کہہ چکے ہیں اس میں بھی کوئی چیز وجود مطلق کیطرف کھینچنے والی نہ ہوتی۔ لیکن جہاں ہمیشہ ایک ضد موجود ہو اور ایک ایک کا الٹا بھی ہو اور وحدت میں کثرت کا تصور بھی مضمر ہو تو پھر ہم میں فکر و خیال کو تحریک ہوتی ہے اور پریشان روح فیصلہ پر پہونچنے کے لئے سوال کرتی ہے کہ "وحدت مطلق کیا ہے"؟ اس واسطے وحدت کے مطالعہ میں دماغ کو وجود مطلق کے سوچنے کی طرف منعطف اور مائل کرنے کی قوت ہے۔

گ:- اور یقیناً یہ بات وحدت کے معاملہ میں تو اور بھی خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ایسی چیز کو ہم بطور وحدت بھی دیکھتے ہیں اور بطور کثرت لاحد و لایحصیٰ۔

میں:- ہاں اور جب یہ وحدت کے متعلق ٹھیک ہے تو اور اعداد کے

متعلق بھی ایسا ہی درست ہوگا؟

گ:۔ یقیناً۔

میں:۔ اور تمام علم الحساب اور شمار کو اعداد ہی سے واسطہ ہے!

گ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ذہن کو صداقت کی طرف لیجاتے ہیں؟

گ:۔ جی ہاں ایک بہت خاص انداز سے۔

میں:۔ تو یہی اس قسم کا علم ہے جس کی ہمیں تلاش ہے یعنی جسکا دوہرا استعمال ہو، فوجی اور فلسفیانہ جنگی آدمی کو فن اعداد کو سیکھنا لازمی ہے ورنہ وہ اپنی افواج کو صف بستہ کرنا نہ جانیگا اور فلسفی کو بھی ضروری ہے کہ یہ تغیر کے بحر بیکراں سے نکلکر وجود حقیقی کو پانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اسے بھی حساب داں ہونا چاہیئے۔

گ:۔ بجا ہے۔

میں:۔ اور ہمارا محافظ سپاہی بھی ہے اور فلسفی بھی؟

گ:۔ یقیناً۔

میں:۔ لہٰذا یہ ایسا علم ہے جسے واضعین قانون بجا طور پر لازم قرار دے سکتے ہیں۔ اور ہمیں اپنی ریاست کے خاصان مستقبل کو رغبت دلانی چاہیے کہ وہ علم الحساب کو محض شوقیہ مبتدیوں کی طرح نہ سیکھیں بلکہ اسوقت تک اس کا

مطالعہ جاری رکھیں جب تک صرف ذہن سے وہ ماہیت اعداد کو نہ دیکھ لیں، اسی طرح اس کا مطالعہ تاجروں اور خردہ فروشوں کی طرح خرید و فروخت کے خیال سے نہیں بلکہ اس کے فوجی فائدہ اور خود روح کی خاطر کریں۔ کیونکہ روح کے لیے شہود سے صداقت اور وجود مطلق تک پہونچنے کا یہ سب سے سہل راستہ ہوگا۔

گ:۔ بہت ہی خوب۔

میں:۔ ہاں اب جبکہ یہ ذکر ہو چکا ہے مجھے یہ بھی اضافہ کر دینا چاہئے کہ یہ کس قدر دلفریب علم ہے! اور اگر دوکانداروں کی طرح نہیں بلکہ فلسفیانہ انداز سے اسے حاصل کیا جائے تو ہمارے مطلوبہ مقصد کے حصول میں کس کس طریقے سے ممد ہوتا ہے۔

گ:۔ کیسے کیسے؟

میں:۔ جیسا کہ کہہ رہا تھا علم الحساب نہایت عظیم الشان اور رفعت بخش اثر رکھتا ہے، یہ روح کو مجرد اعداد کے متعلق توجیہ و تعقل پر مجبور کرتا اور جہاں کہیں دلیل میں مرئی یا محسوس چیزیں داخل ہوئیں بگڑ بیٹھتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس فن کے اساتذہ کس پامردی سے ہر اس شخص کو رد کرتے اور اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں جو حساب کرنے میں وحدت مطلق کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگر تم ادھر تقسیم کرو وہ ادھر ضرب دیدیتے ہیں تاکہ وحدت وحدت

باقی رہے اور کسور میں گم نہ ہو جائے۔

گ:۔ بالکل بجا۔

میں:۔ اب اگر ان سے کوئی شخص پوچھے کہ "اے میرے دوستو! یہ جن عجیب و غریب اعداد کے متعلق تم بحث کر رہے ہو یہ ہیں کیا کہ ان میں بقول تمہارے تمہاری مطلوبہ وحدت بھی ہے اور ہر واحد مساوی، غیر متغیر اور غیر تقسیم پذیر ہے، تو یہ کیا جواب دیں گے؟

گ:۔ میرے خیال کے مطابق تو وہ یہ جواب دیں گے کہ ہم ان اعداد کا ذکر کر رہے ہیں جو صرف فکر و خیال میں حاصل کئے جا سکتے ہیں

میں:۔ ہاں تو تم نے دیکھا کہ ہم اس علم کو بجا طور پر لازمی کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس میں خالص صداقت کے حصول کے لئے خالص فہم و عقل کا استعمال ضروری ہے۔

گ:۔ جی ہاں۔ یہ اسکی ایک ممتاز خصوصیت ہے۔

میں:۔ اور تم نے کبھی یہ بھی مشاہدہ کیا ہے کہ جن لوگوں میں حساب و شمار کا فطری ملکہ ہوتا ہے وہ دوسری قسم کے علم میں بھی عام طور پر تیز ہوتے ہیں اور اگر غبی لوگوں کو بھی حساب کی تعلیم دیدی جائے تو چاہے اس سے وہ کوئی اور فائدہ نہ اٹھائیں لیکن اس سے زیادہ ذکی اور تیز ضرور ہو جاتے ہیں جتنا کہ بصورت دیگر ہوتے۔

گ بہت درست۔

میں:۔اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے مشکل علم بآسانی نہ ملے گا اور نہ بہت سے اس کے برابر دشوار۔

گ:۔ہاں۔نہ ملیگا۔

میں:۔چنانچہ بایں وجوہ حساب ایک ایسی نوع علم ہے جس کی تعلیم بہترین طبائع کو دینی چاہیے اور اسے ہرگز ترک نہ کرنا چاہیے۔

گ:۔میں اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔اچھا تو منجملہ مضامین تعلیم کے ایک تو یہ ہوا۔اب اسکے بعد کیا اس امر کی تحقیق کریں کہ آیا اس سے بہت قریب کا تعلق رکھنے والے علم سے بھی ہمیں سروکار ہوگا یا نہیں۔

گ:۔آپکا مطلب ہندسے سے ہے؟

میں:۔بالکل۔

گ:۔ظاہر ہے کہ ہندسہ کے اس حصہ سے تو ہمیں واسطہ ہے ہی جو جنگ سے متعلق ہے۔کیونکہ پڑاؤ ڈالنے، کوئی موقع اختیار کرنے، اپنی فوج کی صفوں کو مجتمع کرنے یا وسعت دینے یا کسی دوسری فوجی حرکت میں خواہ اصلی معرکۂ جنگ میں ہو یا فوجی نقل وحرکت میں، اس بات سے بہت بڑا فرق پڑیگا کہ آیا سپہ سالار مہندس ہے یا نہیں۔

میں:۔ ہاں لیکن اس غرض کے لیے تو بہت تھوڑا سا ہندسہ یا حساب کافی ہوگا۔ سوال تو دراصل ہندسہ کے بڑے اور زیادہ اعلیٰ حصہ کا ہے کہ آیا یہ عین خیر کے منظر کو کسی درجہ سہل تر بناتا ہے یا نہیں۔ اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا اس غرض کے لیے ہر وہ چیز مدد دیتی ہے جو روح کو اس جگہ کی طرف دیکھنے پر مجبور کرے جہاں وجود کا کمال اتم ہے اور جو اسے بہر صورت دیکھنا چاہیے۔

گ:۔ سچ ہے۔

میں:۔ چنانچہ اگر ہندسہ ہمیں وجود کے دیکھنے پر مجبور کرتا ہے تو ہمیں اس سے واسطہ ہے، اور اگر صرف شہود کے دیکھنے پر مجبور کرے تو ہمیں اس سے کچھ سروکار نہیں۔

گ:۔ جی ہاں۔ یہ تو ہمارا دعویٰ ہی ہے۔

میں:۔ تاہم کوئی شخص جسے ہندسہ سے ذرا بھی واقفیت ہے وہ اس سے انکار نہ کرے گا کہ اس علم کا یہ تصور ہندسین کی معمولی گفتگو کے بالکل متضاد ہے۔

گ:۔ یہ کیسے؟

میں:۔ ان لوگوں کے پیش نظر محض اس کی عملی حیثیت ہے یہ ہمیشہ نہایت تنگ نظر اور مضحکہ خیز انداز سے مربع کرنے، وسعت دینے، وضع کرنے، یا اسی قسم کی اور باتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہندسہ کی ضروریات کو روزانہ زندگی کی ضرورتوں سے خلط ملط کر دیتے ہیں حالانکہ اس ساری حکمت کا مقصد اصلی

علم اور جاننا ہی۔

گ:۔ بیشک۔

میں:۔ تو پھر ایک مزید اقرار درکار ہی۔

گ:۔ وہ کونسا اقرار؟

میں:۔ یہ کہ جو علم ہندسہ کا مقصود ہی وہ ازلی و ابدی چیزوں کا علم ہے کسی فانی اور عارضی شے کا نہیں۔

گ:۔ یہ تو فوراً تسلیم کیا جا سکتا ہی اور سچ بھی ہے۔

میں:۔ تو پھر میرے مکرم دوست، علم ہندسہ رُوح کو صداقت کیطرف کھینچیگا، فلسفہ کا جذبہ پیدا کریگا، اور اس چیز کو رفعت بخشیگا جسے آج کل بدبختی سے گرنے دیا جاتا ہے۔

گ:۔ یہ اثر غالباً کوئی اور دوسری چیز اس طرح نہ پیدا کر سکے۔

میں:۔ چنانچہ کوئی اور چیز اتنی سختی سے نافذ نہ کیجائے جتنی یہ کہ ہمارے حسین شہر کے باشندے بہر صورت ہندسہ سیکھیں۔ علاوہ بریں اس علم کے اور بالواسطہ اثرات بھی ہیں جو کچھ کم نہیں۔

گ:۔ وہ کس قسم کے اثرات ہیں؟

میں:۔ مثلاً فوجی فوائد ہیں جنکا تمنے ذکر کیا اور اسکے علاوہ علم کی تمام شاخوں میں تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ جس شخص نے ہندسہ کا مطالعہ کیا ہے وہ

اس کے مقابلہ میں بہت ذکی الفہم ہوتا ہے جس نے اسے نہیں سیکھا۔

گ:۔ ہاں۔ بلاشبہ، ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

میں:۔ تو پھر اپنے نوجوانوں کے مطالعہ کے لئے اسے بطور علم کی دوسری شاخ کے تجویز کردیں؟

گ:۔ ضرور۔

میں:۔ اور فرض کرو ہیئت کو ہم تیسری شاخ بنادیں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟

گ:۔ میرا اس طرف بہت میلان ہے۔ موسموں اور ماہ وسال کا مشاہدہ سپہ سالار کے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسان یا جہاز ران کے لئے۔

میں:۔ میں تمہارے خوف دنیا پر بہت محظوظ ہوتا ہوں کہ تم کیسے اپنے کو اس سے بچاتے ہو کہ کہیں یہ نہ ظاہر ہو کہ بیکار چیزوں کے مطالعہ پر اصرار کر رہے ہو۔ اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس بات کا یقین بڑا دشوار ہے کہ ہر انسان میں ایک روحانی آنکھ ہوتی ہے کہ جب یہ دوسرے مشاغل سے دھندلی یا ضائع ہوجاتی ہے تو پھر یہ اسے منزہ اور دوبارہ روشن کرتے ہیں۔ اور یہ آنکھ دس ہزار جسمانی آنکھوں سے بیش قیمت ہے کہ بس اسی کے ذریعہ صداقت کا دیکھنا ممکن ہوتا ہے۔ اب سنو انسانوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جو تم سے اتفاق کریگا۔ اور تمہارے الفاظ کو وحی و تنزیل جانیگا۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جسے یہ محض لایعنی باتیں معلوم ہونگی اور وہ انہیں محض خوش گپیاں تصور کرے گا کیونکہ انکی نظر میں

انسے کسی قسم کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا بہتر ہے کہ فوراً اس امر کا فیصلہ کرلو کہ ان دو طبقوں میں سے تم کس سے دلیل کرنا چاہتے ہو۔ ظن غالب یہ ہو کہ تم کہو گے کہ کسی سے نہیں، اور دلیل کے جاری رکھنے میں تمہارا اصلی مقصد خود اپنی بہتری ہو لیکن پھر بھی دوسروں کو اس تھوڑے بہت فائدہ سے کیوں محروم رکھو جو وہ حاصل کرسکتے ہیں۔

گ:- میں تو خود اپنے ہی لئے دلیل کو جاری رکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

س:- تو ایک قدم پیچھے ہٹاؤ، کیونکہ ہم علوم کی ترتیب میں غلط راستہ پر چل دیئے ہیں۔

گ:- آخر کیا غلطی ہوئی؟

س:- ہندسہ سطحی سے بجائے اس کے کہ ہم محض اجسام صلب کو لیتے ہم ایک دم متحرک اجسام پر پہونچ گئے۔ حالانکہ دوسری قدر مساحت کے بعد تیسری کو آنا چاہیئے تھا جو کعوب اور عمق سے متعلق ہو۔

گ:- جناب سقراط یہ سچ ہو۔ لیکن ان مضامین کے متعلق فی الحال تو بظاہر بہت کم معلومات ہو۔

س:- ہاں کیوں نہو۔ اسکی دو وجوہ ہیں۔ اولاً تو یہ کہ کوئی حکومت انکی سرپرستی نہیں کرتی جس کی وجہ سے ان کے اوپر محنت کم صرف کیجاتی ہو، اور یہ مشکل۔ دوسری بات یہ ہو کہ جبتک کوئی راہ بتانے والا نہو طلبا انہیں سیکھ نہیں

سکتے۔ اور رہنما شاذ ہی دستیاب ہوتا ہے اور اگر ہو بھی سکے تو موجودہ صورت حال کچھ ایسی ہے اور طلبا کچھ ایسے۔ برخود غلط ہیں کہ اس کی بات پر دھیان ہی دیں۔ یہ صورت بالکل بدل جائے اگر کل ریاست ان علوم کی رہنما بن جائے اور ان کو معزز کردے پھر شاگرد آنا چاہیں گے مسلسل اور مخلصانہ تلاش و جستجو ہوگی اور انکشافات ہونگے۔ کیونکہ اب بھی کہ دنیا انکی طرف سے بے پرواہ ہے اور انکا حسن تناسب مجروح اور خود ان کے دلدادوں میں کوئی بھی ان کا استعمال اور افادہ نہیں بتلا سکتا۔ تاہم یہ اپنی فطری دلفریبی کے باعث گھس بیٹھ کر اپنی جگہ نکال ہی لیتی ہیں۔ اگر انہیں ریاست کی امداد ملے تو بہت ممکن ہے یہ کسی دن تاریکی سے، روز روشن میں رونما ہوں۔

گ: جی ہاں۔ ان میں ایک عجیب دلفریبی ہے۔ لیکن میں اس تغیر کو نہیں سمجھا جو آپنے ترتیب میں کیا۔ پہلے آپنے مستوی سطحوں کے ہندسہ سے شروع فرمایا تھا نا؛

میں: جی ہاں۔

گ:۔ پھر آپ نے ہیئت کو اسکے بعد رکھا اور بعد میں ایک قدم پیچھے ہٹے؟

میں:۔ ہاں۔ اپنی عجلت سے میں نے تاخیر پیدا کی۔ اجسام صلب کے ہندسہ کی مضحکہ خیز حالت نے مجھے اس شاخ پر سے گذار دیا حالانکہ قدرتی ترتیب سے باری اسی کی تھی اور میں ہیئت یعنی حرکت اجسام پر جا پہونچا۔

گ:۔ درست۔

میں:۔ یہ فرض کرکے جس علم کو ہمنے فی الحال حذف کردیا ہے وہ ریاست کی ہمت افزائی سے وجود میں آجائیگا ہم ہئیت پر پہونچتے ہیں جس کا نمبر چوتھا ہوگا۔

گ:۔ بہت صحیح ترتیب ہے۔

پہلے میں نے جس بھونڈے پن سے ہئیت کی مدح کی تھی اسپر چونکہ آپنے ہجو ملیح فرمائی اس لئے ابکی مرتبہ میری مدح سرائی آپ کے خیال کے مطابق ہوگی۔ کیونکہ میرے خیال میں ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ ہئیت روح کو اوپر دیکھنے پر مجبور کرتی ہے اور ہمیں اس دنیا سے ایک دوسرے عالم کیطرف لیجاتی ہے۔

میں:۔ ہاں سوائے میرے ہر شخص! اور ہر شخص کے لئے ممکن ہے یہ بات واضح ہو لیکن میرے لئے تو نہیں۔

گ:۔ اور آپ کیا فرماتے ہیں؟

میں: تو یہ کہوں گا کہ جو لوگ ہئیت کو فلسفہ کا بلند درجہ دیتے ہیں وہ ہم سے بلندی کی طرف نہیں دکھواتے بلکہ پستی کی طرف۔

گ:۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں:۔ بالائی اشیاء کے متعلق آپکا تصور (ماشاءاللہ) واقعاً بہت بلند ہے، اور میں یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنا سر پیچھے

ڈالکر چھت کا مطالعہ کرے تو آپ کے نزدیک اسوقت بھی اسکی آنکھیں نہیں بلکہ اس کا دماغ ادراک کر رہا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ آپ ہی صحیح ہوں اور میں ممکن ہے کہ ایک سادہ لوح بیوقوف ہوں لیکن میری رائے میں صرف وہی علم روح کو رفعت نظر عطا کرتا ہے جو وجود حقیقی اور غیر مرئی کا علم ہو۔ اور یوں چاہے انسان منہ پھاڑکر آسمان کو گھورے یا زمین پر نظر ڈالے تاکہ کسی خاصہ حسی کا علم حاصل کرے تو میں تو ہر دو حال میں اس کا منکر ہوں کہ وہ کچھ سیکھ سکتا ہے کیونکہ اس قسم کی کوئی چیز حکمت کا موضوع نہیں اس کی روح کی نگاہ پستی کی جانب ہے بلندی کی طرف نہیں خواہ اسکی راہ علم خشکی کے ذریعہ ہو خواہ تری کے چاہے وہ پانی پر تیر تیرا پھرے یا زمین پر اپنی پیٹھ کے سہارے لیٹے۔

گ:۔ میں آپ کے طعن کو حق بجانب تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن پھر بھی میں یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہیئت کی تحصیل کا وہ کونسا دوسرا طریقہ ہے جس سے وہ اس علم میں ممد ہو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔

میں:۔ عرض کرتا ہوں۔ یہ تاروں بھرا آسمان جو ہم دیکھتے ہیں ایک مرئی زمین اگر وہ پر بنا ہوا ہے اور اسلئے اگرچہ مرئی چیزوں میں سب سے حسین اور کامل چیز ہے تاہم سرعت مطلق اور کسل مطلق کی ان حقیقی حرکتوں سے لازماً اسے ادنیٰ درجہ دینا پڑتا ہے جو ایک دوسرے سے نسبت رکھتی اور ہر عدد و شکل صحیح میں اپنے ساتھ اپنے مافیہ کو کہتی ہیں۔ اور ان کا ادراک عقل اور فہم

سے ہوتا ہے لیکن باصرہ سے نہیں۔

گ:۔ درست

میں:۔ان مرصع افلاک کو اس اعلیٰ علم کی غرض سے بطور نمونہ استعمال کرنا چاہئے۔ ان کا حسن ان نقوش اور تصاویر کا سا حسن ہو جنہیں ڈیڈا اس یا کسی دوسرے بڑے مصور کے ہاتھ نے نہایت خوبی سے بنایا ہو اور جو اب اتفاق سے ہمارے پیش نظر ہے، اگر کوئی مہندس انہیں دیکھے تو ضرور ہے کہ انکی کاریگری کی نفاست کی داد دے لیکن یہ خیال تو اس کے خواب میں بھی نہ گذریگا کہ ان میں اسے حقیقی مساوی ملیگا یا حقیقی دو چند یا کسی اور نسبت کی حقیقت۔

گ:۔جی ہرگز نہیں۔ یہ خیال تو مضحکہ خیز ہو گا۔

میں:۔ تو کیا تاروں کی حرکت دیکھکر ایک حقیقی ہیئت دان کو بھی ایسا ہی احساس نہ ہو گا؟ وہ یہ ضرور سمجھیگا کہ خالق نے افلاک اور اجرام فلکی کو نہایت کامل طریقہ سے مرتب کیا ہے لیکن وہ یہ کبھی نہ خیال کرے گا کہ روز و شب کا تناسب، یا ان دونوں کی نسبت ماہ سے، یا مہینہ کی نسبت سال سے، اور اور کوئی چیز جو مادی اور مرئی ہو وہ ابدی اور ناقابل تغیر بھی ہو سکتی ہے۔ ایسا خیال مہمل ہوگا اور ان کی صحیح حقیقت کی تحقیق بھی اتنی ہی مہمل۔

گ:۔میں بالکل اتفاق کرتا ہوں، اگرچہ میں نے کبھی پہلے اس کا خیال

نہ کیا تھا۔

میں:۔ چنانچہ اگر ہم اس مضمون تک صحیح راستے سے پہونچنا اور اس طرح عقل کی عطیہ فطری کا کوئی حقیقی استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ہندسہ کیطرح ہئیت میں بھی مسائل کا استعمال کرنا چاہئیے۔ اور افلاک وسماوات کو الگ رکھنا چاہیئے۔

گ:۔ یہ کام ہمارے موجودہ ہئیت دانوں سے بید بعید ہے۔

میں:۔ ہاں۔ اور اگر ہمارے قوانین سے کچھ بھی فائدہ اٹھانا ہو تو اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں اسی قسم کی وسعت دینا ضروری ہو۔ کیا تم مجھے کوئی اور مناسب مضمون مطالعہ بتا سکتے ہو؟۔

گ جی نہیں۔ بے سوچے تو نہیں تبلا سکتا۔

میں:۔ حرکت کی ایک ہی نہیں بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ دو تو ہم ایسی عقلوں کے لئے بھی بین ہیں اور میں خیال کرتا ہون اور بھی ہونگی انہیں زیادہ عقلمند لوگوں کے لئے چھوڑ دین۔

گ:۔ لیکن وہ دو کونسی ہیں؟

میں:۔ ایک کا تو ذکر ہو چکا اور دوسری اسی کا شقیقہ ہے۔

گ:۔ یعنی؟

مین:۔ اس دوسری قسم کو کانوں سے وہی نسبت ہو جو پہلی کو آنکھوں سے

کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے آنکھیں ستاروں کی طرف دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں اسی طرح کان ہم آہنگ حرکتوں کے سننے کے لئے بنے ہیں بقول متبعین فیثاغورث یہ دونوں بہنیں بہنیں ہیں۔ اور ہم بھی انکے قول سے اتفاق کرتے ہیں۔

گ:۔ جی ہاں۔

میں:۔ لیکن اسکے مطالعہ میں بڑی محنت درکار ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم لوگ ان لوگوں کے پاس جاکر اسے سیکھیں یہ لوگ ہمیں بتا سکینگے کہ آیا ان علوم کے اور کوئی استعمال بھی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنے مقصد اعلیٰ سے بھی چشم پوشی نہ کرنی چاہئے۔

گ:۔ وہ کیا؟

میں:۔ ایک درجہ کمال ہے جس تک ہر علم کو پہنچنا ہے اور جو ہمارے شاگردوں کو بھی حاصل کرنا چاہئے۔ اس میں ناقص رہنا درست نہیں جیسے کہ میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ ہئیت میں ناقص رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ یک آہنگی کے علم میں بھی یہی صورت پیش آتی ہے اور تم تو شاید اس سے واقف ہو۔ اس ہم آہنگی کے اساتذہ صرف ان صداؤں اور تعلق اصوات کا مقابلہ کرتے ہیں جو سنائی دیں چنانچہ ماہرین ہئیت کی طرح انکی محنت بھی رائگاں جاتی ہے۔

گ:۔ ہاں، بخدا۔ یہ لوگ جب اپنے نام نہاد بندھے ہوئے مقامات کے

متعلق گفتگو کرتے ہیں تو ان کی باتیں ایسی ہی ہیں جیسے کھیل کود۔ یہ اپنے کان تار کے برابر لگا دیتے ہیں جیسے کوئی اپنے پڑوسی کی دیوار سے کان لگا کر اسکی باتیں چرانا چاہتا ہو ان میں سے ایک گروہ مدعی ہے کہ اس نے ایک درمیانی مقام دریافت کر لیا اور اس قلیل ترین دقفہ کا پتہ لگا لیا جو پیمایش کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسرا گروہ اس پہ مصر ہے کہ دونوں آوازیں ملکر ایک ہو گئی ہیں۔ بہر حال فریقین اپنی سمجھ پر اپنے کانوں کو فضیلت دیتے ہیں۔

میں:۔ آپ کا مطلب ان حضرات سے ہے جو تاروں کو چھیڑتے اور زحمت دیتے ہیں اور انہیں اپنے ساز کی کھونٹیوں پر کستے ہیں۔ میں اسی استعارہ کو اور بڑھا کر ان ضربوں کا ذکر کر سکتا ہوں جو مضراب دیتا ہے اور اسی طرح تاروں پر آواز سے آگے بڑھنے یا پیچھے رہنے کا الزام لگا سکتا ہوں۔ لیکن اس سب سے طبیعت اکتا جائیگی لہذا میں صرف اسقدر عرض کرونگا کہ میرا مطلب ان لوگوں سے نہ تھا بلکہ میں نے ابھی جو تجویز پیش کی تھی وہ متبعین فیثا غورث کے متعلق تھی کہ ان سے چلکر آہنگ کے بابت دریافت کیا جائے۔ کیونکہ ہیئت دانوں کی طرح یہ لوگ بھی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ مسموع نغمہ کی تعداد کی تحقیق کرتے ہیں لیکن مسائل مجردہ تک کبھی نہیں پہونچتے۔ عدد کی فطری یک آہنگی تک انکی رسائی نہیں ہوتی اور نہ یہ اسپر غور کرتے ہیں کہ بعض اعداد کیوں ہم آہنگ ہوتے ہیں اور بعض کیوں نہیں ہوتے۔

گ:۔ یہ تو علم فانی سے بالاتر چیز ہے۔

میں:۔ بلکہ ایسی چیز جسے میں مفید کے لفظ سے تعبیر کروں گا یعنی اس حالت میں مفید کہ حسن و خیر کی خاطر اس کی تلاش ہو لیکن اگر کسی اور نیت سے اس کی تحصیل کیجائے تو بے سود۔

گ:۔ بہت صحیح۔

میں:۔ چنانچہ جب یہ سب علوم باہمی ارتباط و ائتلاف کے درجہ پر پہونچ جائیں اور پھر ان پر باعتبار انکے باہمی تعلقات کے نظر کیجائے اس وقت (اور اس سے پہلے نہیں) انکی تحصیل ہمارے مقاصد کے لیے قابل قدر ثابت ہوگی۔ ورنہ ان سے کوئی فائدہ نہیں۔

گ:۔ میرا بھی ایسا ہی گمان ہے لیکن جناب سقراط! آپ ایک بڑے وسیع کام کا ذکر کر رہے ہیں۔

میں:۔ آپکا کیا مطلب ہے؟ مقدمہ سے یا اور کچھ؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ یہ سب کچھ . . . . اس اصلی کام کا مقدمہ ہے جو ہمیں سیکھنا ہے؟ کیونکہ آپ یقیناً ایک ماہر ریاضی داں کو منطقی تو نہ مانیں گے؟

گ:۔ یقیناً نہیں۔ میں تو مشکل سے کسی ایسے ریاضی داں کو جانتا ہوں جسمیں تعقل یا استنباط کلیات کی صلاحیت ہو۔

میں:۔ لیکن کیا تم سمجھتے ہو کہ جن لوگوں میں تعقل کے داد و ستد کی صلاحیت نہ ہو ان میں وہ علم ہوگا جو ہمیں ان سے مطلوب ہے؟

گ:۔ نہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں:۔ چنانچہ، گلاکن، ہم بالآخر منطق کی ماح پر آن پہونچے۔ یہ وہ لے ہے جو صرف ذہن سے متعلق ہے لیکن پھر بھی قوت باصرہ اس کی نقالی کرتی ہے، تمہیں یاد ہوگا کہ ہمنے باصرہ کا تخیل یوں کیا تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد حقیقی جانوروں اور ستاروں کو اور بالآخر خود آفتاب کو دیکھ سکتی ہے یہی حال منطق کا ہے جب کوئی شخص صرف عقل کی روشنی میں بلا حواس کی مدد کے اکتشاف مطلق کے لیئے نکلتا ہے اور اسوقت تک ثابت قدم رہتا ہے کہ خالص عقل کے ذریعہ خیر مطلق کا ادراک حاصل کرلے تو وہ آخرکار اپنے کو ذہنی دنیا کے خاتمہ پر پاتا ہے جیسے کہ باصرہ اپنے کو عالم مرئی کے ختم پر پاتی ہے۔

گ:۔ بالکل درست۔

میں:۔ تو کیا یہی وہ ترقی ہے جسے آپ منطق کہتے ہیں؟

گ:۔ جی

میں:۔ لیکن سلاسل سے قیدیوں کی رہائی، سایوں سے صورتک اور روشنی میں انکا انتقال مکانی، زیر زمین غار سے آفتاب تک انکا ارتفاع جہاں یہ آفتاب کے حضور میں جانوروں، درختوں، اور آفتاب کی روشنی کی طرف

دیکھنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہیں البتہ اپنی ان کمزور آنکھوں تک سے پانی میں عکس کو دیکھ سکتے ہیں جو ہی ہیں اور وجود حقیقی کا سایہ ہیں (نہ کہ) اس عکس کا سایہ جو آگ کی روشنی سے پڑتا ہو جو آفتاب کے مقابلہ میں خود بمنزلہ عکس کے ہے۔ یہ روح کی اعلیٰ ترین اصل کو وجود کے بہترین حصہ کے تفکر تک مرتفع کرنے کی قوت جس سے ہم عالم مادی مرئی کی روشن ترین حصوں تک اس صلاحیت کے ارتفاع کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو جسم کا نور ہے۔ ہاں تو یہ قوت جیسا کہ میں کہہ رہا تھا اس علم سے عطا ہوتی ہے اور ان فنون کی تحصیل سے جنکا بیان ہو چکا ہو۔

گ: میں آپ کے قول سے اتفاق کرتا ہوں اگرچہ اس پر یقین ذرا دشوار ہے تاہم اگر ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس سے انکار اور بھی زیادہ دشوار ہے۔ بہرحال یہ ایسا مسئلہ نہیں کہ اس پر چلتے چلتے سرسری نظر کی جائے، اس پر تو بار بار بحث کرنی ہوگی۔ لہٰذا خواہ ہمارا نتیجہ صحیح ہو یا غلط اس وقت تو ہم اسے سب کو فرض کر لیں اور اس مقدمہ یا تمہید سے فوراً اس خاص لے کی طرف بڑھیں اور اسے بھی اسی طرح بیان کریں۔ ہاں تو فرمایئے کہ منطق کی ماہیت اور اس کی تقسیمیں کیا ہیں اور اس تک پہنچانے والے راستے کون کون ہیں کیونکہ یہی راستے ہمیں اپنے آخری سکون تک بھی پہونچائیں گے۔

میں:۔ عزیزمن گلاکن! تم مجھے سمجھ نہ سکوگے اگرچہ میں اپنے امکان بھر

پوری کوشش کروں گا اور تم میرے تصور کے مطابق ایک عکس ہی نہ دیکھوگے بلکہ صداقت مطلق کا نظارہ کروگے۔ اسکے کہنے کی تو میں جرأت نہیں کر سکتا کہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ حقیقت ہوگی یا نہیں، البتہ اس کا مجھے پورا اعتماد ہے کہ تم ایک ایسی چیز دیکھ لوگے جو حقیقت سے بہت مشابہ ہے۔

گ:۔ بلاشبہ۔

میں:۔ لیکن میں یہ پھر یاد دلادوں کہ صرف منطق ہی کی قوت اس کا انکشاف کر سکتی ہے اور وہ بھی صرف اس شخص پر جو علوم متذکرہ سابق کا تلمیذ ہو۔

گ:۔ اس دعوی پر آپ اسیقدر اعتماد کر سکتے ہیں جتنا کہ دعوی ماسبق پر۔

میں:۔ اور یقیناً کوئی شخص یہ نہ کہیگا کہ تمام وجود حقیقی کے تفحص اور ہر چیز کی ذاتی ماہیت کی دریافت کا کوئی اور باضابطہ طریقہ بھی ہے۔ کیونکہ فنون تو عموماً انسانوں کی خواہشات یا آرا سے متعلق ہوتے ہیں، یا تخلیق و تعمیر کی خاطر انہیں ترقی دیجاتی ہے، یہ علوم ریاضیہ، مثلاً ہندسہ و مثلہ جنہیں، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، وجود حقیقی میں کچھ درک ہوتا ہے تو یہ وجود کے متعلق خواب سا دیکھتے ہیں لیکن کبھی جلتی پھرتی حقیقت کو اس وقت تک نہیں دیکھ سکتے جب تک کہ یہ ان مفروضات کو نہ ترک کردیں جنہیں یہ بے جانچے اور امتحان کئے استعمال کرتے ہیں اور جنکی یہ کوئی تشریح نہیں کر سکتے

کیونکہ جب انسان اپنے اصول اولیہ سے ہی نہ واقف ہو اور جبکہ درمیانی منازل اور نتیجہ کے متعلق بھی وہ نہ جانتا ہو کہ یہ کاہے سے بنے ہیں تو وہ کیسے خیال کرسکتا ہو کہ مشروط ومعتاد کا یہ جال کبھی بھی علم بن سکتا ہو۔

گ:۔ ناممکن۔

میں:۔ لہذا منطق اور رصرف منطق براہ راست اصل اولیہ تک جاتی ہو اور صرف یہی وہ علم ہو جو اپنی بنیاد کو محفوظ کرنے کے لئے مفروضات سے گزر کرتا ہو۔ چشم روحانی جو واقعۃً ایک خارجی دلدل میں مدفون ہو اس کی مشفقانہ مدد سے اوپر اٹھتی ہو۔ تحویل وتبدیل کے اس کام میں یہ ان علوم کو اپنا معاون اور خادم بناتی ہو جنپر ہم بحث کرچکے ہیں۔ رواج عام انہیں علم کے نام سے پکارتا ہے لیکن دراصل ان کے لئے کوئی اور ایسا نام چاہئے جس سے رائے و(قیاس) سے زیادہ اور علم سے کم وضاحت مترشح ہوتی ہو۔ چنانچہ اپنے سابقہ خاکہ میں ہمنے اسے سمجھ کے نام سے تعبیر کیاہے۔ لیکن جبکہ ہمیں ایسی اہم حقیقتوں پر غور کرنا ہو تو ناموں کے متعلق ہم کیوں جھگڑا کریں۔

گ:۔ ہاں کیوں جھگڑا کریں، جبکہ ہر نام کافی ہو جو ذہن کے خیال کی بوضاحت ترجمانی کرے۔

میں:۔ بہرصورت پہلے کی طرح ہم مطمئن ہیں کہ چار تقسیمیں ہونی چاہئیں دو عقل کے لئے اور دو رائے وقیاس کے لئے۔ پہلی تقسیم کو علم (یا حکمت)

کہنا چاہیے، دوسری کو سمجھ (یا فہم)، تیسری کو یقین (یا عقیدہ) اور چوتھے کو سایوں کا ادراک۔ رائے وقیاس کا تعلق مشہود سے ہوگا اور عقل کا وجود سے۔ چنانچہ ہم یہ نسبت قایم کرسکتے ہیں۔

وجود کو جو نسبت مشہود سے ہے، وہی نسبت عقل خالص کو رائے وقیاس سے ہے۔

اور عقل کو رائے وقیاس سے جو نسبت ہے، وہی نسبت علم کو یقین اور سمجھ کو سایوں کے ادراک سے ہے۔

لیکن رائے اور عقل کی مزید تقسیم اور انکے تعلقات باہمی کے مسئلہ کو ملتوی کرنا چاہیے کیونکہ یہ بڑی لمبی تحقیق ہوگی، جو تحقیق ہوچکی ہے اس سے کئی درجہ طویل۔

گ:۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں مجھے اتفاق ہے۔

میں:۔ اور کیا تم اس سے بھی اتفاق کرتے ہو کہ ہم اس شخص کو منطقی کہیں جسے ہر چیز کی اصلیت کا تصور حاصل ہو؟ اور جو یہ تصور نہ رکھتا ہو اور لہذا دوسرے تک اسے پہونچانے کی صلاحیت بھی اس میں نہ ہو تو اس میں جس درجہ کا یہ نقص ہے اسی کے بقدر گویا وہ عقل میں بھی ناقص مانا جائے؟ کیا تم یہ تسلیم کرتے ہو؟

گ:۔ جی ہاں آخر اس سے انکار کیسے کرسکتا ہوں؟

میں:۔ اور کیا عین خیر کے متعلق بھی تم یہی کہوگے؟ جبتک کوئی شخص

عین خیر کی عقلی تجرید اور تعریف کرنے کے قابل نہیں اور جب تک وہ تمام اعتراضات کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور ان اعتراضات کو یہ نہیں کہ رائے و قیاس کی بلکہ صداقت مطلق کی مدد سے منازل بحث میں کہیں بھی لغزش کہائے بغیر غلط ثابت کرنے پر آمادہ نہ ہو، ہاں تو جبتک وہ یہ سب کچھ نہ کرسکے تو تم کہوگے کہ وہ نہ عین خیر سے واقف ہے نہ کسی اور خیر سے۔ اگر کچھ ہے تو اسے صرف ایک سایہ کا ادراک ہے جو رائے و قیاس کا عطیہ ہے نہ کہ علم کا۔ وہ اس زندگی میں گویا سوتا ہے اور خواب دیکھتا ہے اور قبل اس کے کہ یہاں پوری طرح بیدار ہو عالم زیریں میں پہونچ جاتا اور اپنی آخری خلاصی پالیتا ہے۔

گ:۔ ان سب باتوں میں یقیناً آپ سے متفق ہوں۔

میں:۔ اور یقیناً تم اپنی خیالی ریاست کے بچوں کو جنکی تعلیم و تربیت تم کررہے ہو۔ اگر کبھی یہ خیال مبدل بہ حقیقت ہوا تو ان آیندہ حکمرانوں کو تم کندۂ ناتراش نہ بننے دوگے کہ انمیں عقل کا تو پتہ نہیں لیکن اعلیٰ سے اعلیٰ امور پر انہیں اختیار دیدیا جائے۔

گ:۔ یقیناً نہیں۔

میں:۔ تو پھر تم یہ قانون بناؤگے کہ انہیں ایسی تعلیم دیجائے جو انہیں سوال کرنے اور جواب دینے میں اعلیٰ ترین مہارت بہم پہونچائے۔

گ:۔جی ہاں ہم آپ ملکر ہی یہ قانون بنائیں گے۔

میں: چنانچہ تم اتفاق کروگے کہ منطق تمام علوم وحکم کا سنگ شرف ہے اور انکا سرتاج۔ کوئی اور علم اس سے بلند تر نہیں ہو سکتا کہ کہ ماہیت علم اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔

گ:۔میں اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔لیکن اب یہ سوال محتاج تحقیق رہے ہے کہ ان علوم کو کس کے سپرد کیا جاسے اور کس طرح کیا جائے ؟۔

گ:۔جی ظاہر ہے۔

میں:۔تمہیں یاد ہوگا کہ ہمنے پہلے حکمرانوں کا انتخاب کس طرح کیا تھا؟

گ:۔جی ہاں۔

میں:۔انہیں طبائع کو ایکے بھی منتخب کرنا چاہیے اور اب بھی ترجیح انہیں کو دینی چاہیے جو سب سے زیادہ قابل اعتماد اور بہادر اور اگر ہو سکے تو سب سے زیادہ حسین بھی ہوں۔ ان میں جہاں شرافت وسماحت مزاج ہو وہاں وہ فطری صفات بھی ہونے چاہیئے جو انکی تعلیم میں سہولت پیدا کریں

گ:۔یہ کیا ہیں؟

میں:۔ایسی صفات مثلاً ذکاوت اور کسی چیز کو جلدی سے حاصل کر لینے کی قوت۔ کیونکہ دماغ ورزش کی دشواری سے اتنا نہیں تھکتا جتنا کہ

مطالعہ کی شدت سے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ اس لئے کہ دوسری صورت میں محنت زیادہ کامل طور پر خود دماغ ہی کی ہوتی ہے اور جسم اس میں شریک نہیں ہوتا۔

گ:۔ بہت درست۔

میں:۔ علاوہ ازیں ہمیں جس کی تلاش ہے اس کا حافظہ بھی اچھا ہونا چاہئے اور ضروری ہے کہ وہ ایک ان تھک ٹھوس آدمی ہو جو ہر قسم کی محنت کا شایق ہو ورنہ اس کے لئے ورزش جسمانی کی برداشت یا ضبط ذہنی اور مطالعہ کے تمام مطلوبہ مراحل سے عہدہ برا ہونا کبھی ممکن نہ ہو گا۔

گ:۔ بیشک، اس میں فطری صفات کی ضرورت ہے۔

میں:۔ فی زمانہ یہ غلطی کیجاتی ہے کہ جو لوگ فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہیں انکا کوئی پیشہ نہیں ہوتا اور جیسے کہ پہلے کہہ چکا ہوں فلسفہ کی بدنامی کی یہی وجہ ہے اب ناخلفوں کو نہیں بلکہ اس کے سچے فرزندوں کو دستگیری کرنی چاہیئے

گ:۔ آپ کا کیا مطلب ہے۔؟

میں:۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی دلدادوں کی محنت لنگڑی اور اچکی نہ ہو۔ یعنی یہ نہیں کہ وہ آدھے محنتی ہوں اور آدھے کاہل۔ مثلاً جب ایک شخص ورزش اور دوسری جسمانی کھیلوں اور شکار کا بہت شایق ہو لیکن سننے، سیکھنے اور تحقیق کرنے کی محنت سے محبت رکھنا تو کجا واقعتاً نفور ہو

یا ہوسکتا ہے کہ جن اشغال میں وہ مصروف ہُوہ بالکل دوسری قسم کے ہوں اوراس کا لنگ بالکل دوسری قسم کا لنگ ہو

گ:۔ بیشک۔

میں:۔ اورکیا بالکل اسی طرح ایک روح بہ اعتبار صداقت لنگڑی نہ تصور کیجائے جو ارادی کذب سے تو نفرت کرتی اور جھوٹ بولنے پر خود اپنی ذات نیز دوسروں پر بجد برافروختہ بھی ہوتی ہو لیکن غیر ارادی جھوٹ کو گوارا کرے اور نہ جہالت کے دلدل میں ایک خنزیر صفت جانور کی طرح لتھڑے ہوئے چلنے کا کچھ خیال کرے نہ اس طرح دیکھے جانے پر شرمندہ ہو۔

گ:۔ بالیقین۔

میں:۔ اور پھر اسی طرح عفت و اعتدال، جرات، شوکت اور تمام دیگر محاسن کے اعتبار سے کیا ہمیں نہایت احتیاط کے ساتھ سچے فرزندوں اور ناخلفوں میں تفریق نہ کرنی چاہیئے؟ کیونکہ جہاں ان صفات پر نظر نہ ہو تو ریاستیں اور افراد دونوں بے جانے غلطی میں پڑجاتے ہیں اور ریاست ایسے شخص کو اپنا حاکم اور فرد اپنا دوست بنا لیتا ہے جو نیکی کے کسی جزو میں ناقص ہونے کے باعث ایک معنی کر لنگڑا اور ناخلف ہو۔

گ:۔ بہت صحیح۔

میں:۔ چنانچہ ان تمام چیزوں پر ہمیں نہایت احتیاط سے نظر رکھنی ہوگی

اور صرف اگر وہ لوگ جنہیں ہم تعلیم و تربیت کے اس وسیع نظام سے آشنا کرنا چاہتے ہیں تندرست دماغ اور جسم رکھتے ہوں تو خود عدل تک کو ہماری مخالفت میں کہنے کو کچھ نہ ملیگا۔ اور ہم ریاست اور دستور کے نجات دہندہ ثابت ہونگے۔ لیکن اگر کہیں ہمارے شاگرد دوسری وضع کے لوگ ہوئے تو معاملہ بالکل برعکس ہوگا اور ہم فلسفہ پر اس سے کہیں بڑا طوفان تضحیک و تحقیر نازل کرانے کا باعث ہونگے جو اسے آجکل برداشت کرنا پڑتا ہی۔

گ:۔ یہ تو اچھی بات نہ ہوگی۔

میں:۔ ہرگز نہیں۔ لیکن شاید مزاح کو ایسی اہمیت دیکر میں خود اسیقدر مستحق مضحکہ ہوں۔

گ: کس اعتبار سے؟

میں:۔ میں بھول گیا تھا کہ ہم لوگ ذرا متین نہ تھے اور بہت زیادہ اشتعال کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ وجہ یہ کہ جب میں نے فلسفہ کو ناحق انسانی قدموں سے پامال ہوتے دیکھا تو اُسکی ذلّت کے بانیوں پر میری برافروختگی مجھ سے روکے نہ رُکی اور غصہ نے مجھے ضرورت سے زیادہ شدید بنا دیا۔

گ:۔ واقعتاً! میں تو سن رہا تھا لیکن مجھے یہ خیال بھی نہ ہوا۔

میں:۔ لیکن میں نے، کہ خود گفتگو کر رہا تھا، یہ محسوس کیا کہ میں مشتعل تہا

اور اب میں تمہیں یاد دلاتا ہوں کہ اگرچہ سابقہ انتخاب میں ہم نے بڑے آدمیوں کو چنا تھا لیکن اس مرتبہ ایسا نہ کرینگے سولن مبتلائے توہم تھا جب اس نے کہا کہ آدمی بڈھا ہو کر بہت سی چیزیں سیکھ جاتا ہے۔ حالانکہ جس طرح وہ بڈھا ہو کر زیادہ دوڑ نہیں سکتا ویسے ہی زیادہ سیکھ بھی نہیں سکتا۔ ہر غیر معمولی محنت کا وقت شباب ہی ہے۔

گ:۔ بیشک۔

میں:۔ لہذا شمار و ہندسہ اور تمام وہ دیگر عناصر تدریس جو منطق کی تیاری ہیں یہ سب بچپن ہی میں دماغ کو پیش کر دینے چاہئیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اپنے نظام تعلیم کو بجبر عاید کرنیکا خیال نہ پیدا ہو۔

گ:۔ کیوں نہیں؟

میں:۔ کیونکہ ایک حُر کو کسی قسم کے علم کی تحصیل میں غلام نہ ہونا چاہئے ورزش جسمانی اگر لازمی بھی ہو تو جسم کو نقصان نہیں پہونچاتی لیکن جو علم بجبر حاصل کیا گیا ہو وہ دماغ پر تسلط نہیں حاصل کرتا۔

گ:۔ بہت صحیح۔

میں:۔ لہذا، محب من، جبر کا استعمال نہ کرو بلکہ ابتدائی تعلیم کو ایک قسم کی تفریح بناؤ۔ اس طرح تم فطری رجحان کو زیادہ بہتر طور پر معلوم کرسکوگے

گ:۔ نہایت معقول ہے۔

میں:۔ تمہیں یاد ہو گا کہ بچوں کو بھی گھوڑے پر بٹھا کر جنگ دکھانے کے لیے بیجا تا ہوتا تھا اور اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو انہیں بالکل قریب تک لیجاتے تھے تاکہ کم عمر شکاری کتوں کی طرح ان کے منہ کو بھی خون لگا دیا جائے۔

گ:۔ جی، مجھے یاد ہے۔

میں:۔ چنانچہ ہم بھی محنتوں، سبقوں، اور خطرات، ان سب چیزوں میں اسی عمل کی اتباع کر سکتے ہیں۔

پھر جو ان سب چیزوں میں سب سے زیادہ بے تکلف ہو اسے منتخب شدہ تعداد میں شامل کر لینا چاہیے۔

گ:۔ کس عمر میں؟

میں:۔ جس عمر میں ضروری ورزش جسمانی ختم ہو جائے۔ دو یا تین سال کا زمانہ جو اس تربیت میں صرف ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری غرض کے لئے بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ نیند اور ورزش حصول علم کے لئے نا مساعد ہیں۔ اور یہ جانچ کہ ورزش جسمانی میں کون سب سے اول ہے منجملہ ان اہم ترین امتحانوں کے ہے جو ہمارے نوجوانوں کو دینے پڑتے ہیں۔

گ:۔ یقیناً۔

میں:۔ اس مدت کے ختم ہونے پر بست سالہ طبقہ میں سے جن لوگوں کا انتخاب ہو گا انہیں اعلیٰ اعزاز میں ترقی دیجائے گی۔ جو علوم انہوں نے اپنی

ابتدائی تعلیم میں بلا کسی نظام کے سیکھے تھے وہ اب یکجا لائے جائیں گے اور یا اب ان کی باہمی فطری مناسبتوں اور وجود حقیقی سے انکے تعلق کو دیکھ سکیں گے

گ: جی ہاں۔ علم کی صرف یہی قسم پائیدار جڑ پکڑتی ہے۔

میں: ہاں۔ اور اس علم کی قابلیت منطقی صلاحیت کا بڑا معیار ہے۔ کہ فہیم و مدرک دماغ ہمیشہ منطقی ہوتا ہے۔

گ: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں: الغرض ان سب باتوں پر تمہیں نظر کرنی چاہئے۔ اور پھر جنہیں یہ ادراک سب سے زیادہ ہو اور جو تحصیل علم اور اپنے فوجی و دیگر مفوضہ فرائض کی انجام دہی میں سب سے زیادہ ثابت قدم ہوں تو تیس سال کی عمر پر پہونچنے کے بعد انہیں اس منتخبہ طبقہ میں سے چُننا اور اعلیٰ تر اعزاز تک ترقی دینا چاہئے اور پھر تمہیں منطق کی مدد سے ان لوگوں پر ثابت کرنا ہوگا تاکہ یہ معلوم کر سکو کہ ان میں سے کون باصرہ اور دیگر حواس کے استعمال کو ترک کرنے اور صداقت کی سعیت میں وجود مطلق تک پہونچنے کے لئے تیار ہے۔ اور میرے دوست اس جگہ بڑی احتیاط درکار ہے۔

گ: کیوں، اتنی احتیاط کیوں؟

میں: تم کیا نہیں دیکھتے کہ منطق نے ایک کیسی بری چیز پیدا کر دی ہے؟

گ: کونسی برائی؟

میں معاملات فن میں تمرد و بے راہ روی بھڑگئی۔

گ: بہت ٹھیک۔

میں: کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے لئے کوئی اور چیز اسقدر غیر فطری اور ناقابل معافی ہے؟ یا تم ان کو ساتھ کچھ رعایت کروگے؟

گ: کس طرح کی رعایت؟

میں: میں چاہتا ہوں کہ آپ بطور مقابل ایک لے پالک لڑکے کا تصور کریں جس کی تربیت بڑی دولت و ثروت میں ہوئی ہے، وہ ایک بڑے اور کثیر التعداد خاندان کا رکن ہے، اور اس کے بہت سے خوشامدی ہیں۔ یہ جب بڑا ہو کر سن بلوغ کو پہونچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس کے والدین بتائے جاتے ہیں وہ اس کے اصلی والدین نہیں۔ لیکن اصلی والدین کون ہیں اس کا پتہ یہ نہیں لگا سکتا کیا تم ان خوشامدیوں اور اپنے مفروضہ والدین کے ساتھ اسکے رویہ پر ان دونوں صورتوں میں قیاس کر سکتے ہو یعنی پہلی تو اس زمانہ میں جب وہ اپنے جھوٹے رشتہ سے بے خبر ہے اور پھر اس وقت جب اسے اس کا علم ہوگیا ہے؟ یا میں آپکی طرف سے قیاس کروں؟

گ: بسم اللہ

میں: میں تو یہ کہوں گا کہ جب وہ صداقت سے بے خبر ہے تو یہ قرین قیاس ہے کہ وہ اپنے ماں، باپ اور دوسرے مفروضہ رشتہ داروں کی عزت خوشامدیوں

سے زیادہ کرے گا۔ ضرورت کے وقت انہیں بھولنے یا ان کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا اس میں مقابلۃً کم رجحان ہوگا۔ اور کسی اہم معاملہ میں مقابلۃً کم وہ ان کی نافرمانی پر آمادہ ہوگا۔

گ:۔ جی۔

میں:۔ لیکن انکشاف حقیقت کے بعد میرے خیال میں ان لوگوں کی عزت و توقیر اس کی نظروں میں گھٹ جائے گی اور اب یہ خوشامدیوں کا زیادہ دلدادہ ہوجائے گا، اس پر ان کا اثر بہت بڑھ جائے گا، یہ اب انہیں کی وضع میں رہنا اور ان سے کھلے بندوں خلا ملا رکھنا شروع کرے گا اور اگر نہایت غیرمعمولی طور پر اچھی طبیعت کا آدمی نہیں ہے تو اب اپنے مفروضہ والدین و اعزا کی ذرا بھی پروا نہ کرے گا۔

گ:۔ بہت خوب۔ یہ سب کچھ تو بہت قرین قیاس ہے لیکن آخر یہ صورت فلسفہ کے متقدمین پر کیسے عاید ہوتا ہے؟

میں:۔ اس طرح آپ جانتے ہیں کہ عدل اور عزت کے متعلق بعض اصول ہیں جو بچپن میں ہمیں سکھائے گئے تھے اور انکے اختیار پدری کے ماتحت ہم نے پرورش پائی اور ہم ہمیشہ ان اصولوں کی عزت اور اطاعت کرتے رہے۔

گ:۔ درست۔

میں:۔ ان کے مخالف اور دوسرے اصول اور عادات انبساط بخش

بھی ہوتے ہیں جو روح کی چاپلوسی کرتے اور اسے بھانا چاہتے ہیں، لیکن ہم میں سے جن کا ذرا بھی احساس ہے ان پر ان کا اثر نہیں ہوتا اور یہ لوگ اپنے آبا کے اقوال کی عزت اور اطاعت کرتے رہتے ہیں۔

گ: صحیح۔

میں:۔ اچھا، ایک شخص اس حالت میں ہو اور فطرت سائلہ دریافت کرتی ہو کہ کیا جائز ہے اور کیا قابل عزت۔ اور وہ اسپر وہی جواب دیتا ہے جو واضع قانون نے اسے سکھایا ہو، اسپر بہت سی طرح طرح کی دلیلوں سے اس کے الفاظ رد ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ اس یقین پر مجبور ہو جاتا ہو کہ نہ کوئی چیز قابل عزت ہو نہ نا قابل عزت، نہ عادلانہ اور اچھی ہو اور نہ ان کی ضد الغرض یہی حال اسکے ان تمام تصورات کا ہوتا ہو۔ جن کی وہ ابتک بہت قدر کرتا تھا۔ تو ایسی حالت میں کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اب بھی حسب سابق انکی عزت اور اطاعت کریگا؟

گ:۔ کبھی نہیں سکتا۔

میں:۔ اور وہ قانون کو برقرار رکھنے کے بجائے اس کا توڑنے والا ہو گیا نا؟

گ:۔ بلاشک۔

میں:۔ اور فلسفہ کے ان طلبا، میں جنکا میں نے ذکر کیا ہو یہ سب کچھ بہت ہی قدرتی امر ہے اور جیسا کہ میں ابھی کہہ رہا تھا قابل معافی بھی۔

گ:۔ جی اور میں کہوں گا کہ قابل افسوس بھی۔

میں:۔ لہٰذا اس خیال سے کہ آپ کے جذبات افسوس و ترحم کو اپنے ایسے شہریوں کے متعلق تحریک نہ ہو جواب (ماشاءاللہ) تیس سال کی عمر کو پہونچ چکے ہیں ہمیں انکو منطق سے روشناس کرنے میں بہت احتیاط برتنی چاہئے

گ:۔ ضرور۔

میں:۔ خطرہ یہ ہے کہ کہیں یہ لوگ اس مسرت گراں بہا کا مزہ قبل از وقت نہ چکھ لیں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب پہلے پہل کم عمر لوگوں کے کام دہن ذائقہ سے آشنا ہوتے ہیں تو یہ لگتے ہیں تفریح کے موافق دلیلیں دینے اور جو لوگ ان کی تردید کرتے ہیں ان کی نقالی میں خود ہر ایک کی تردید و تغلیط کرنے کتے کے پلوں کی طرح انہیں بھی اپنے پاس کی ہر چیز کو نوچنے کھسوٹنے اور چیرنے پھاڑنے میں لطف آتا ہے۔

گ:۔ جی ہاں۔ اس سے بڑھکر اور کوئی چیز انہیں پسند نہیں ہوتی۔

میں:۔ اس طرح جب بہت سی جگہوں پر انہیں فتح حاصل ہوتی ہے اور اکثر کے ہاتھوں شکست کا منہ دیکھنا ہوتا ہے تو نہایت تیزی اور بڑی شدت کے ساتھ ہر اس چیز سے اپنا یقین ہٹا لینے کی راہ پیدا ہو جاتی ہے جس پر پہلے عقیدہ رکھتے تھے اور لہٰذا نہ صرف یہ بلکہ فلسفہ اور اس کے تمام متعلقات باقی دنیا میں بدنام ہوتے ہیں۔

گ:۔ بالکل درست۔

میں:۔ لیکن جب آدمی بڈھا ہونا شروع ہوتا ہے تو پھر اس قسم کی بے عقلی کا مرتکب نہیں ہوتا۔ وہ حق کے متلاشی منطقیوں کا تتبع کرتا ہے نہ کہ ان جنوں کا جو صرف تفریح کی خاطر تردید کرتے ہیں۔ اور اس شخص کا اعتدال اسکے شغل کی عزت میں تخفیف کے بجائے اضافہ کرتا ہے۔

گ:۔ بہت صحیح

میں:۔ ہمنے جب یہ کہا تھا کہ فلسفہ کے تلامذہ باضابطہ اور مستقل ہوں اور آج کل کی طرح ہر اتفاق سے ذرا رغبت رکھنے والا یا ہر فضولی و دخیل نہیں، تو کیا اسی امر کے لئے خاص اہتمام نہ کیا تھا؟

گ:۔ جی بیشک۔

میں:۔ فرض کرو کہ فلسفہ کا مطالعہ ورزش جسمانی کی جگہ لے اور جتنے سال ورزش میں صرف ہوتے اتنے دو چند زمانہ تک اس کا مطالعہ نہایت محنت خلوص اور دوسری چیزوں سے منہ موڑ کر کیا جائے تو کیا یہ کافی ہوگا؟

گ:۔ آپ کی رائے چھ برس ہے یا چار برس۔

میں:۔ فرض کرو پانچ سال اس مدت کے ختم پر انہیں پھر نیچے غار میں بھیجا جانا چاہیئے اور فوجی یا اور کسی ایسے عہدہ پر جس پر نوجوان لوگ مامور ہو سکتے ہوں کام کرنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ اس طرح ان لوگوں کو زندگی کا تجربہ حاصل ہوگا اور

یہ آزمانے کا موقع ملیگا کہ جب مختلف قسم کی لالچیں انہیں ہر طرف کھینچتی ہیں تو وہ ثابت قدم رہتے ہیں یا ان کے پائے ثبات کو لغزش ہو جاتی ہے۔

گ:۔ اور ان کی زندگی کی یہ منزل کتنے عرصہ تک جاری رہیگی؟

س:۔ پندرہ سال۔ اور جب یہ پچاس سال کی عمر کو پہونچ جائیں تو اس وقت ان میں سے جو باقی ہوں اور جنہوں نے اپنی زندگی کے تمام اعمال میں اور علم کے ہر شعبہ میں اپنے کو ممتاز کیا ہو وہ بالآخر اپنے معراج کمال کو پہونچیں۔ اب وقت ہے کہ وہ اپنی روح کی آنکھ کو اس عالمگیر روشنی کی طرف اٹھائیں جو ہر چیز کو منور کرتی ہے اور خیر مطلق کا نظارہ کریں۔ کیونکہ یہی وہ نمونہ ہے جس کے مطابق انہیں ریاست کو، حیات افراد کو، اور خود اپنی بقیہ زندگی کو منضبط کرنا ہے۔ فلسفہ ان کا شغل خاص ہو، لیکن جب باری آئے تو یہ سیاست کی مشقت بھی گوارا کریں اور مفاد عام کی خاطر حکومت بھی کریں، اس طرح نہیں کہ گویا یہ کوئی بڑی بہادری کا کام ہے بلکہ محض ایک فرض کے طور پر۔ اور جب یہ ہر نسل میں اپنے جیسے لوگ پیدا کر دیں اور انہیں اپنی جگہ حکام ریاست کی جگہ پر چھوڑ جائیں تو اس وقت یہ "مبارکوں کے جزیرہ" کو سدھار جائیں گے اور وہیں مقیم رہیں گے۔ اہل شہر کی طرف سے انہیں عام یادگاریں قربانیاں اور اعزازملیں گے، اگر پیتھی کاہن نے اجازت دی تو نیم دیوتاؤں کی طرح ورنہ کم از کم متبرک اور الٰہی انسانوں کی حیثیت سے۔

گ:۔جناب سقراط، آپ تو واقعی سنگ تراش ہیں اور اپنے حکام کے مجسمے باعتبار حسن آپ نے ایسے تراشے ہیں کہ انگلی دھرنے کی گنجایش نہیں۔

میں:۔ہاں گلاکن اور حاکمات کے بھی کیونکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ صرف مردوں ہی پر عاید ہوتا ہے جہاں تک انکی فطرت اجازت دیتی ہے عورتوں پر نہیں۔

گ:۔آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں، کیونکہ ہمنے عورتوں کو تمام چیزوں میں مردوں کا سا حصہ لینے دیا ہے۔

میں:۔خوب۔اور آپ مجھ سے اس امر میں بھی اتفاق کریں گے (کیوں کریں گے نا؟) کہ ہم نے ریاست اور حکومت کے متعلق جو کچھ کہا ہے یہ محض ایک خواب نہیں ہے۔اور اگرچہ دشوار ضرور ہے تاہم محال نہیں۔ہاں البتہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جو ہمنے فرض کی ہے۔یعنی ریاست میں حقیقی فلسفی بادشاہ پیدا ہوں اور ایک یا کئی ایسے بادشاہ اس موجودہ دنیا کے اعزازوں کو ذلیل اور بے وقعت جانکر ٹھکرا دیں، حق اور حق سے پیدا ہونے والی عزت کو سب چیزوں سے بالاتر سمجھیں، اور عدل کو سب سے اعلیٰ اور سب سے ضروری چیز خیال کریں، اسی کے کارگذار ہوں اور اپنے شہر کو منظم کرنے میں اسکے اصولوں کو ملبند کریں۔

گ:۔یہ آخر کام شروع کیسے کریں گے؟

میں:۔یہ شروع اس طرح کریں گے کہ باشندگان شہر میں سے سب

دس سال سے اوپر کی عمر والوں کو اطراف ملک میں بھیجکر ان کے بچوں پر قبضہ کریں گے۔ انہیں اپنے عادات اور قوانین کی تعلیم دیں گے یعنی ان قوانین کی جو ہم نے انہیں دیئے ہیں اس طرح وہ ریاست اور دستور جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں جلد سے جلد اور بہ سہولت تمام حصول سعادت کریں گے اور وہ قوم سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرے گی جسکا یہ دستور ہوگا۔

گ: جی ہاں۔ یہ بہترین طریقہ ہوگا اور جناب سقراط میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے نہایت خوبی سے بیان فرمادیا ہے۔ کہ ایسا دستور اساسی اگر کبھی عالم وجود میں آیا تو کیسے آئیگا۔

میں:۔ اچھا تو بس، کامل ریاست اور اس کے تصویر کے حامل انسان کا بہت کافی ذکر ہوچکا۔ اب اس کے بیان کرنے میں کوئی دقت نہیں۔

گ: جی کوئی دشواری نہیں اور میں آپ سے اس خیال میں متفق ہوں کہ اس کے متعلق اور کچھ اور زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔

آٹھویں کتاب

میں:۔ اچھا تو گلاکن، ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ کامل ریاست میں بیویاں عورتیں اور بچے مشترک ہوں، ساری تعلیم اور صلح و جنگ کے تمام مشاغل بھی مشترک ہوں اور بہترین فلسفی اور شجاع ترین جنگ آزما انکے بادشاہ ہوں

گ:۔ جی ہاں، یہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔

میں: جی۔ اور اس کے علاوہ ہم یہ بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ جب حکمرانوں کا اپنا تقرر ہو جائے گا تو یہ اپنے سپاہیوں کو لیکر ایسے مکانوں میں رہیں گے جیسے ہم بیان کر رہے تھے، یعنی جو سب میں مشترک ہوں اور کوئی شخصی یا انفرادی چیز نہ رکھتے ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ان لوگوں کی املاک کے متعلق ہمنے کیا تصفیہ کیا تھا؟

گ:۔ جی یاد ہے۔ کہ کسی کے پاس معمولی انسانی مقبوضات نہ ہوں گے یہ لوگ جنگ آزما، پہلوان اور محافظ ہوں گے اور دوسرے شہریوں سے بطور سالانہ معاوضہ کے انھیں صرف گذارہ مل جایا کریگا۔ اور یہ خود

اپنی اور سب ریاست کی نگہبانی کرتے رہیں گے۔

میں:- درست۔ اب کہ ہمارے کام کا یہ جزو ختم ہوا ذرا اس نقطہ کا پتہ چلائیں جہاں سے ہم لوگ ادھر مڑے تھے تاکہ ہم پھر اسی پرانے راستہ پر واپس جا سکیں۔

گ:- واپسی میں تو کوئی دشواری نہیں۔ جیسے اس وقت ویسے ہی اس وقت، آپ کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا کہ آپ نے ریاست کا بیان ختم کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ایسی ایسی ریاست اچھی ہوتی ہے اور اچھا انسان وہ ہوتا ہے جو اس کے مطابق ہو، حالانکہ جیسا اب پتہ چلا آپ کو ریاست اور فرد دونوں کے متعلق اور زیادہ عمدہ باتیں کہنی تھیں۔ اس کے علاوہ آپ نے فرمایا تھا کہ یہ حقیقی اور سچی شکل ہے اور باقی سب جھوٹی اور مجھے جہاں تک یاد ہے آپ نے کہا تھا کہ ان جھوٹی شکلوں کی چار خاص قسمیں ہیں اور انکے نیز ان سے مطابقت رکھنے والے افراد کے نقائص قابل تحقیق ہیں جب ہم سب افراد کو دیکھ چکیں اور اس امر پر متفق ہو جائیں کہ ان میں کون سب سے اچھا ہے اور کون سب سے برا تو پھر ہم یہ دیکھیں کہ آیا بہترین ہی سب سے زیادہ خوش اور بدترین ہی سب سے زیادہ مصیبت میں ہے یا نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ حکومت کی یہ چار قسمیں جن کا آپ نے تذکرہ کیا، کیا ہیں کہ پالیمارکس اور آیڈیمینٹس بیچ میں بول اٹھے، اس پر آپ نے پھر سرے سے قصہ شروع کیا اور بالآخر اس مقام تک چلے آئے جہاں ہم اس وقت پہونچے ہیں۔

میں:- تمہاری یاد بہت ہی صحیح ہے۔

گ :- تو پھر پہلوانوں کی طرح آپ اپنے آپ کو پھر اُسی پہلو پر لائیے، میں پھر وہی سوال کروں اور آپ ہی جواب دیں جو آپ اُس وقت دینے والے تھے۔

میں :- ہاں، اگر دیسکا تو ضرور دونگا۔

گ :- میں خاص طور پر یہ سُننا چاہتا ہوں کہ وہ چار اساسی دستور جنکا آپنے ذکر کیا تھا کیا ہیں؟

میں :- اس سوال کا جواب تو بآسانی دیا جا سکتا ہے۔ جہانتک ان کے جُدا جُدا نام ممکن ہیں، حکومت کی وہ چار قسمیں جن کا میں نے تذکرہ کیا تھا یہ ہیں: اوّل تو کریٹ اور اسپارٹا کی حکومتیں جن کی عام طور پر بہت تعریف ہوتی ہے؛ اسکے بعد نمبر آتا ہے حکومت خواص کا، اسے اتنا پسند نہیں کیا جاتا اور حکومت کی یہ قسم بُرائیوں سے مملو ہے؛ تیسری حکومت جمہوری ہے جو اگرچہ حکومت خواص سے بہت مختلف ہے تاہم قدرتاً اس کے بعد پیدا ہوتی ہے؛ اور سب سے آخر میں جبر و استبداد وہ بڑا اور مشہور استبداد جو ان سب سے مختلف اور ریاست کے اختلال کی چوتھی اور بدترین شکل ہے۔ ان کے علاوہ میں تو کوئی ایسا دستور اساسی نہیں جانتا جس کی کوئی ممتاز حیثیت ہو، کیا آپ کوئی جانتے ہیں؟ اس کے علاوہ زمینداریاں اور تعلقے ہوتے ہیں جن کی خرید و فروخت ہوتی ہے، اور حکومت کی بعض اور درمیانی شکلیں ہیں لیکن یہ سب بہت ہی مجہول سی ہیں اور یونانیوں اور بربروں میں یکساں پائی جاتی ہیں؟

گ :- جی بیشک؛ ان لوگوں میں تو حکومت کی عجیب عجیب شکلیں سُننے

میں آئی ہیں۔

میں :۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ جیسے انسانی طبائع متنوع ہوتی ہیں ویسی ہی حکومتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اور ایک کی جتنی قسمیں ہونگی لازم ہے کہ دوسرے کی بھی اتنی ہی ہوں ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ حکومتیں "لکڑی پتھر" سے بنتی ہیں اور ان انسانی طبائع سے نہیں جو اس میں موجود ہوتے اور تمثیلاً گویا پلہ اُلٹ دیتے اور ہر دوسری شئے کو اپنے ساتھ گھسیٹ لاتے ہیں۔

گ :۔ جی ہاں، جیسے آدمی ویسی ہی ریاستیں، ان کا نشو و نما تو انسانی سیرت سے ہوتا ہے۔

میں :۔ تو اگر ریاستوں کے اساسی دستور پانچ ہیں، تو دماغ انفرادی کے خصائل و میلان بھی پنجگانہ ہونگے؟

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ حکومت موتمری سے مطابقت رکھنے والے فرد کو جسے ہم بجا طور پر عادل اور اچھا کہتے ہیں، ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔

گ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ تو اب ہم ادنیٰ درجہ کے طبائع کا بیان کریں، مثلاً وہ لالچی اور جھگڑالو طبیعتیں جو اسپارٹا کی نسق دولت سے مناسبت رکھتی ہیں، نیز خواصی، جمہوری، اور مستبد طبائع کا۔ پھر ہم سب سے زیادہ عادل کو سب سے زیادہ غیر منصف کے ساتھ رکھیں اور انہیں دیکھکر

ہم خالص عدل کی زندگی گذارنے والے اور خالص ناانصافی کی زندگی والے کی نسبتی مسرت یا عدم مسرت کا موازنہ کرسکیں گے اُس وقت تحقیق پوری ہوجائیگی اور تب معلوم ہوجائیگا کہ آیا ہمیں تھریسی میکس کے مشورہ کے مطابق ناانصافی پر عمل پیرا ہونا چاہیئے یا اپنی دلیل کے نتائج کے مطابق عدل کو ترجیح دینی چاہیئے۔

گ:۔ بیشک، آپ جو فرماتے ہیں وہی تدبیر ٹھیک ہو۔

میں:۔ کیا پھر وہی اپنی پرانی تدبیر پر عمل کریں جو بخیال وضاحت ہم نے اختیار کی تھی، یعنی پہلے ریاست کو لیں اور پھر فرد کو۔ تو کیا عزت کی حکومت سے شروع کریں؛ میں اس حکومت کے لیے سوائے حکومت اغنیا ر کے اور کوئی نام نہیں جانتا۔ اس سے اس کے مماثل انفرادی سیرت کا مقابلہ کریں گے، پھر اس کے بعد حکومت خواص اور خواصی انسان پر نظر ڈالینگے بعدہ جمہوریت اور جمہوری انسان کی طرف اپنی توجہ منعطف کریں گے اور بالآخر چلکر استبداد کا شہر دیکھیں گے اور مستبد کی روح میں ایک بار پھر جھانکیں گے اور یوں ایک قابل اطمینان فیصلہ پر پہونچنے کی کوشش کرینگے۔

گ:۔ اس معاملہ پر غور اور فیصلہ کا یہ طریقہ نہایت مناسب ہوگا۔

میں:۔ چنانچہ پہلے ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ عزت کی حکومت (حکومت موٗتمری (بہترین اشخاص کی حکومت) سے کس طرح پیدا ہوتی ہی۔ یہ ظاہر ہی کہ تمام سیاسی تبدیلیاں واقعی حکمران قوت میں مناقشہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ جو حکومت متحد ہو

خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو اسے کوئی ہلا نہیں سکتا۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- تو ہمارے شہر میں آخر کس طرح تغیر پیدا ہوگا اور معاونین و حکام کے دو طبقوں میں کیسے اختلاف رونما ہوگا، ایک طبقہ کے لوگوں میں آپس میں یا ایک طبقہ کا دوسرے طبقہ سے؟ کیا ہم بھی ھومر کی طرح بنات الادب سے پوچھیں کہ "اختلاف پہلے پہل کیسے پیدا ہوا"؟ اور فرض کریں کہ یہ نہایت متانت آمیز سو کے منھ سے ہمارا مذاق اُڑا رہی ہیں، اور ہم سے بچوں کی طرح کھیلتی اور ٹھٹھا کرتی ہیں اور پھر نہایت بلند المناک انداز سے ہمیں مخاطب کر کے باور کرانا چاہتی ہیں کہ نہایت متین ہیں۔

گ :- ہاں تو کہئے، یہ ہمیں کیسے مخاطب کریں گی؟

میں :- اس طرح، ایک شہر جو یوں مرتب ہو مشکل ہی سے ہلایا جا سکتا ہے لیکن چونکہ ہر چیز جس کی ابتدا ہی اُس کی ایک انتہا بھی ہے اس لیے ایک ایسا دستور اساسی تک جیسا کہ تم نے بتایا ہی ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا اور امتداد زمانہ سے یہ بھی منتشر ہو جائے گا۔ اور اس کا انتشار یوں ہوگا، زمین پر اُگنے والے درختوں اور سطح زمین پر چلنے والے جانوروں سب میں روح اور جسم کی بار آوری اور بے باری اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کے دوائر کا چکر پورا ہو جاتا ہے۔ یہ چکر کم زندہ رہنے والی ہستیوں میں تھوڑی سی اور زیادہ زندہ رہنے والوں میں بہت سی فضا پر گذرتا ہے لیکن اس انسانی پیدائش

یا بانجھ پن کے علم تک تمہارے حکمرانوں کی دانش و تعلیم کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ انکو منضبط کرنیوالے قوانین کا اکتشاف ایسی عقل کے لیے ممکن نہیں جو حواس سے آلودہ ہو۔ یہ قوانین اس سے بچکر نکل جائیں گے اور چنانچہ یہ حکام ایسی حالت میں دنیا میں بچے پیدا کریں گے جس میں انہیں نہ کرنے چاہئیں .... لہ

....

....

....

....

....

لہ اسکے بعد چند سطریں ترجمہ میں چھوڑ دی گئی ہیں اس لیے کہ انکا قابل فہم ترجمہ ہم سے ممکن نہ تھا۔ دوسری زبانوں میں بھی ریاست کے جو ترجمے ہیں ان میں ان سطور کے معنی واضح نہیں کیے جا سکے ہیں۔ ڈیویس اور واگھن نے تو اپنے انگریزی ترجمہ میں ان کا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔ دلیل و گفتگو کے تسلسل پر ان سطروں کے چھوڑنے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (مترجم)

کیونکہ جب تمہارے محافظین قانون توالد سے ناآشنا ہوں گے اور وہ دلہا دلھن کو
بے موسم یکجا کر دینگے تو بچے لازماً اچھے اور خوش بخت نہ ہوں گے اور اگرچہ ان بچوں
کے پیشرو ان میں سے بہترین ہی کو اپنی جگہ متعین کریں پھر بھی یہ اپنے آبا کی جگہ پر
کرنے کے اہل نہ ہونگے اور جب بحیثیت محافظ برسر اقتدار آئیں گے تو جلد ہی پتہ
چل جائیگا کہ یہ ہماری (بنات الادب کی) خبرگیری نہیں کرتے۔ پہلے یہ موسیقی کی
بیقدری کریں گے اور یہی غفلت بڑھ کر ورزش جسمانی تک پہونچیگی۔ چنانچہ تمہاری ریاست
کے نوجوان بہ نسبت سابق کم متمدن ہوں گے۔ ایک پشت بعد ایسے حکام
مقرر ہوں گے جن میں محافظین کی یہ قوت نہ ہو گی کہ تمہاری ان مختلف نسلوں کی
کیفیت فلزاتی کو پرکھ سکیں جو ہسیاد کے مختلف طبقوں کی طرح سونے، چاندی،
پیتل اور لوہے سے بنی ہیں۔ اس طرح چاندی میں لوہے اور سونے میں پیتل کی آمیزش
ہو جائیگی، اس سے عدم مطابقت، عدم مساوات اور بے ضابطگی تراوش کریگی
اور یہی ہمیشہ اور ہر جگہ نفرت اور جنگ کا سبب رہی ہیں، بنات الادب کے خیال میں
جہاں کہیں اختلاف پیدا ہوا ہی اسی اصل سے پیدا ہوا ہی اور (ہمارے سوال پر)
ان کا یہ جواب ہی۔

گ :- جی، اور ہم فرض کر سکتے ہیں کہ انکا جواب سچ ہی۔

میں :- اور کیا! ظاہر ہی کہ صحیح ہی۔ بھلا بنات الادب کیسے جھوٹ بول سکتی ہیں؟

گ :- اچھا تو یہ بنات اور آگے کیا فرماتی ہیں؟

میں :- اختلاف پیدا ہونے پر دونوں گروہ مختلف راستوں پر پڑ لیے۔ لوہے اور پیتل والے روپیہ، زمین، مکانات اور سیم وزر کے حصول پر ٹوٹ پڑے، لیکن سونے چاندی والا گروہ جنھیں روپیہ پیسہ کی حاجت نہ تھی کہ حقیقی دولت خود انکی طبائع میں موجود تھی، وہ نیکی اور قدیم صورت حالات کی طرف جھکا رہا۔ ان میں ایک جنگ ہوئی اور بالآخر باہم طے پایا کہ یہ اپنی زمین اور مکانات مختلف افراد میں تقسیم کر دیں اور اب لپنے ان دوستوں اور گذارہ فراہم کرنے والوں کو جن کی آزادی کو یہ پہلے بچاتے تھے لگے یہ خود غلام بنانے، انھیں اپنی رعایا اور چاکر بنا لیا اور خود ان کے خلاف پہرہ چوکی رکھنے اور جنگ کرنے میں مشغول ہو گئے۔

گ :- میں یقین کرتا ہوں کہ آپ نے اس تغیر کی ابتدا کا صحیح تصور قائم کیا ہے۔

میں :- اس طرح جو نئی حکومت پیدا ہو گی وہ حکومت خواص اور موتمری حکومت کی ایک درمیانی شکل ہو گی؟

گ :- بہت درست۔

میں :- اچھا، تغیر تو یہ پیدا ہو گا۔ لیکن اس تغیر کے بعد یہ کس طرح عمل پیرا ہو گی؟ ظاہر ہے کہ یہ نئی ریاست چونکہ حکومت خواص اور کامل ریاست کے بین بین ہے اس لیے بعض جزئیات میں ایک کی اتباع کریگی اور بعض میں دوسری کی اور بعض خصوصیات خود اس کی ہونگی۔

گ :- درست۔

میں :۔ حکام کی تعلیم، فوجی طبقہ کی زراعت، دستکاری اور عام تجارت سے علیحدگی، عام دسترخوان پر مشترک کھانے کی رسم اور ورزش جسمانی اور تربیت جنگی پر توجہ، ان تمام امور میں تو یہ ریاست پہلی ریاست سے مشابہ ہوگی۔

گ :۔ صحیح۔

میں :۔ لیکن چونکہ سادہ اور خالص فلسفی ملتے نہیں بلکہ اب یہ مخلوط عناصر سے بنے ہوتے ہیں اس لیے فلسفیوں کو اقتدار دیتے ڈرتے اور انھیں چھوڑ کر یہی کم پیچیدہ اور جذباتی سیرتوں کی طرف رخ کرتے ہیں جو بالطبع امن کے مقابلہ میں جنگ کے لیے زیادہ موزوں ہیں، اور پھر فوجی مضارب اور تدابیر کی قدر اور دائم جنگ آزمائی۔ یہ چیزیں زیادہ تر اس ریاست ہی سے مخصوص ہونگی۔

گ :۔ جی۔

میں :۔ ہاں، اور اس قماش کے لوگ روپیہ کی بڑی ہوس رکھیں گے جیسے حکومت خواص میں رہنے والے رکھتے ہیں؛ ان میں سیم و زر کی ایک مخفی اور خوفناک خواہش ہوگی، یہ اس مال کو تاریک مقاموں میں جمع کریں گے، انکے اپنے خزانے اور گودام ہوں گے جن میں انھیں چھپا کر رکھ سکیں۔ یہ محل بنائیں گے جو ان کے انڈوں کے لیے مناسب حال گھونسلے ہوں گے اور ان میں یہ اپنی بیویوں پر یا اور جس پر چاہینگے بڑی بڑی رقمیں صرف کرینگے۔

گ :۔ بالکل سچ ہے۔

میں :- یہ کنجوس ہوں گے کہ جس روپیہ کی یہ قدر کرتے ہیں اسے علانیہ حاصل کرنیکا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہیں؛ یہ اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے لیے وہ مال صرف کرتے ہیں جو درصل دوسرے کا ہی؛ یہ اپنی مسرتیں چوری سے حاصل کرتے ہیں اور پھر جس طرح بچے اپنے باپ سے بھاگتے ہیں یہ قانون سے فرار ہوتے ہیں، انکی تربیت نرم اثرات سے نہیں بلکہ جبر سے ہوئی ہی، کیونکہ انھوں نے اس سے پہلوتہی کی جو حقیقی ادب کی دیوی ہے اور عقل اور فلسفہ کے ہمرکاب، اور ورزش جسمانی کی موسیقی سے زیادہ عزت کی۔

گ :- بلاشبہ حکومت کی جس قسم کو آپ بیان کر رہے ہیں وہ خیر و شر کی ایک آمیزش ہی۔

میں :- ہاں، آمیزش تو ہی، لیکن اس میں ایک چیز اور بس ایک ہی چیز بین طور پر نظر آتی ہی یعنی ہوس اور نزاع کا جذبہ، اور اس کی وجہ ہی جذباتی یا تجسیع عنصر کا تسلط عام۔

گ :- یقیناً۔

میں :- تو اس ریاست کی اصل اور اس کی حالت یہ ہی۔ میں نے صرف خاکہ بیان کیا ہی، زیادہ تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ کامل طور پر عدل پر اور کامل طور پر بے انصافی پر مبنی نمونوں کے اظہار کے لیئے بس ایک خاکہ ہی کافی ہی۔ ورنہ یو تو تمام ریاستوں اور تمام انسانی سیرتوں کا ایسا بیان کہ کوئی نہ چھوٹنے پائے ایک

سعی لاحاصل ہی ہوگا۔

گ:۔ بہت صحیح۔

میں:۔ اب دیکھیں کہ حکومت کی اس قسم کا جواب کون انسان ہی یہ کیسے پیدا ہوتا ہی اور کس چیز سے مشابہ ہی؟

ایڈیمینٹس:۔ میرے خیال میں اس میں جذبۂ نزاع کی جو خصوصیت امتیازی ہی اس کے اعتبار سے وہ ہمارے دوست گلاکن سے کچھ مختلف نہیں۔

میں:۔ ہاں، شاید اس ایک اعتبار سے وہ انکا مشابہ ہو، لیکن اور بہت سے اعتبارات سے وہ بہت مختلف ہوتا ہی۔

ایڈ:۔ یہ کونسے اعتبارات؟

میں:۔ اس میں اپنی بات کی ذرا زیادہ پچ ہونی چاہیئے۔ اسے ذرا کم متمدن ہونا چاہیئے لیکن پھر بھی وہ تمدن کا دوست ضرور ہو۔ سامع اچھا ہو لیکن بولتا نہ ہو۔ برخلاف تعلیم یافتہ آدمیوں کے جو اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ یہ غلاموں کے ساتھ ذرا درشت ہوگا، احرار کے ساتھ متواضع اور حکومت کا خاص طور پر تابعدار۔ یہ اقتدار اور عزت کا عاشق ہوگا اور حاکم بننے کا مدعی، اس بنا پر نہیں کہ نہایت جادو بیان ہی یا اور کسی ایسی وجہ کے بنا پر بلکہ اس لیے کہ یہ سپاہی ہی اور سپہ گری کے کارہائے نمایاں انجام دیچکا ہی۔ یہ ورزش جسمانی کا بھی بڑا شائق ہوگا اور نیز شکار کا۔

ایڈ:۔ جی ہاں ۔ یہ سیرت کا وہ نمونہ ہی جو حکومت اعیان سے مطابق ہی۔

میں :- ایسا شخص صرف اپنی جوانی میں دولت کو نظر حقارت سے دیکھیگا لیکن جوں جوں اس کی عمر بڑہتی جائیگی یہ روز بروز اس کی طرف زیادہ کھنچتا جائیگا۔ کیونکہ اس کی فطرت میں حریص اور لالچی طبیعت کا ایک جزو موجود ہی اور چونکہ اپنے بہترین محافظ کو کھو چکا ہی اس لیے نیکی کی طرف یکسوئی کے ساتھ مائل نہیں۔

ایڈ :- یہ محافظ کون تھا ؟

میں :- موسیقی میں تپا ہوا فلسفہ۔ جو اگر انسان کے اندر اپنی جگہ کر لیتا ہی اور پھر ساری عمر اس کی نیکی کا تنہا محافظ رہتا ہی۔

ایڈ :- خوب۔

میں :- اچھا تو غنی نوجوان ایسا ہوتا ہے اور یہ اغنیاء کی ریاست کا مشابہ اور مماثل ہی۔

ایڈ :- بالکل۔

میں :- اس کا آغاز یوں ہوتا ہی۔ یہ عموماً کسی نیک باپ کا جوان لڑکا ہوتا ہی یہ باپ کسی بری طرح محکوم شہر کا باشندہ ہی، اس شہر کے اعزاز و منصب سے انکار کرتا ہی، اور نہ عدالتی چارہ جوئی کرتا ہی نہ اور کسی طرح اپنا اثر ڈالتا ہی بلکہ مصیبت سے بچنے کیلئے اپنے حقوق سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہی۔

ایڈ :- اور بیٹا پھر کس طرح عالم وجود میں آتا ہی ؟

میں :- اس کی سیرت کی نشوونما اسوقت شروع ہوتی ہی جب یہ اپنی ماں کو شکوہ

کرتے سُنتا ہی کہ میرے شوہر کی حکومت میں کوئی حیثیت نہیں اور اس وجہ سے مجھے عورتوں میں کوئی تفوق حاصل نہیں ہوتا۔ پھر جب یہ اپنے شوہر کو دیکھتی ہو کہ اُسے روپیہ پیسے سے زیادہ شغف نہیں اور بجائے اسکے کہ قانونی عدالتوں یا مجلسوں میں جاکر اس کے لیے لڑے جھگڑے اس کو جو بھی پیش آے اسپر چُپ ہو رہتا ہو، نیز جب یہ دیکھتی کہ اُسکے خیالات کا مرکز خود اس کی اپنی ذات ہو اور وہ اس کے ساتھ بہت بے اعتنائی کا برتاؤ کرتا ہو تو یہ اسپر چڑتی بگڑتی ہو اور اپنے بیٹے سے کہتی ہو کہ تیرا باپ بس آدھا انسان ہو اور نہایت سہل انگار۔ اور اسپر اپنے ساتھ بدسلوکی کی وہ تمام شکایتیں بھی اضافہ کردیتی ہو جن کی تکرار کی عورتیں بہت شائق ہوتی ہیں۔

ایڈ :۔ جی ہاں، شکایتوں کی انکے پاس کیا کمی ہو جیسی یہ ویسی انکی شکایتیں۔

س:۔ اور تم جانو بوڑھے بوڑھے نوکر چاکر جو خاندان کے ساتھ وابستہ سے ہوتے ہیں یہ بھی کبھی کبھی اپنے طور پر لڑکے سے اسی انداز کی بات چیت کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہی جس پر اس کے باپ کا کچھ قرض آتا ہو یا کوئی کسی اور طرح اسے نقصان پہنچا رہا ہو اور یہ اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں کرتا تو یہ اس نوجوان بیٹے سے کہتے ہیں کہ تم جب بڑے ہونا تو اس قسم کے لوگوں سے بدلہ لینا اور اپنے باپ سے زیادہ مرد بننا۔ پھر یہ جہاں ذرا باہر نکلتا ہو تو اسی قسم کی باتیں دیکھتا اور سُنتا ہو۔ شہر میں جو لوگ بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اُنھیں سادہ لوح سمجھا جاتا ہو اور اُن کی کوئی عزت نہیں کرتا اور خواہ مخواہ دخل در معقولات دینے والوں کی تعریف بھی ہوتی ہو عزت بھی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے

کہ جب یہ نوجوان ادھر یہ ساری باتیں سُنتا اور دیکھتا ہے اُدھر اپنے باپ کی باتیں سُنتا اور اُس کے طریقۂ زندگی کو قریب سے دیکھتا ہے اور دوسروں کے حال سے اُسکا مقابلہ کرتا ہے تو دو مخالف سمتوں میں کھنچتا ہے۔ باپ تو اس کی روح کے اصول عقلی کی پرورش اور آبیاری کر رہا ہے اور دوسرے جذباتی اور اشتہاری اُصولوں کو اُگا رہے ہیں، خود چونکہ اس کی فطرت تو خراب ہے نہیں صرف صحبت بُری ہے اس لیے ان مشترک اثرات سے یہ ایک درمیانی نقطہ پر آجاتا ہے اور مسابقت اور جذبہ کے اس درمیانی اصول کے بدلے اس دولت کو کھو بیٹھتا ہے جو اُس کے اندر موجود تھی اور متمرد و حریص بنجاتا ہے۔

ایڈ :- میری رائے میں تو اسکی اصل آپنے نہایت کمال کیساتھ بیان فرمائی۔

میں :- تو اب حکومت کی دوسری قسم اور سیرت کا دوسرا نمونہ آتا ہے؟

ایڈ :- جی۔

میں :- آؤ اب ایک دوسرے شخص کو دیکھیں جو بقول ایسکلس "ایک دوسری ریاست کے مطابق ہے"، یا پھر اپنی تدبیر کے موافق پہلے ریاست سے شروع کریں۔

ایڈ :- ضرور۔

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ ترتیب سے اب حکومت خواص کا نمبر ہے۔

ایڈ :- آپ کس قسم کی حکومت کو حکومت خواص کہتے ہیں؟

میں :- ایسی حکومت کو جس کی بنیاد املاک کی قدر پر ہو جس میں مالدار با اقتدار

ہوں اور غریب اس سے محروم۔

ایڈ:۔ میں سمجھا۔

میں :۔ شروع میں مجھے یہ بیان کرنا چاہیئے ناکہ حکومت اغنیا سے حکومت خواص میں تبدیلی کس طرح پیدا ہوئی ؟

ایڈ:۔ جی ہاں ۔

میں :۔ اس کے دیکھنے کے لیے تو کچھ ایسی آنکھیں درکار نہیں کہ ایک قسم دوسری میں کس طرح آملتی ہے۔

ایڈ :۔ کیسے !

میں :۔ افراد کے خانگی خزانوں میں مال وزر کا جمع ہونا حکومت اغنیاء کی تباہی ہے ۔ یہ لوگ پھر اس مال کے صرف کرنے کے ناجائز طریقے اختراع کرتے ہیں کیونکہ انھیں اور ان کی بیویوں کو بھلا قانون کا کیا کھٹکا ؟

ایڈ :۔ جی، بیشک ۔

میں :۔ پھر جب ایک دوسرے کو مالدار ہوتے دیکھتا ہے تو اس کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے اور اس طرح شہریوں کی تعداد کثیر مال وزر کی دلدادہ ہو جاتی ہے۔

ایڈ :۔ بہت ممکن ہے۔

میں :۔ یوں یہ دن بدن مالدار ہوتے جاتے ہیں اور جوں جوں دولت کمانے کا خیال بڑھتا ہے نیکی کا دھیان کم ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ جب دولت اور نیکی ساتھ ساتھ ترازو

کے پلّوں میں رکھی ہوں تو ہمیشہ جیسے جیسے ایک پلہ جھکیگا دوسرا پلہ اُٹھیگا۔

ایڈ :۔ سچ ہے۔

میں :۔ اور جس نسبت سے دولت اور دولتمند لوگوں کی ریاست میں عزت ہوگی اسی نسبت سے نیکوں کی بے عزتی ہوگی۔

ایڈ :۔ ظاہر ہے۔

میں :۔ اور جس کی عزت ہوتی ہے اسی کی لوگ پرورش کرتے ہیں اور جس کی عزت نہیں اس سے غفلت کرتے ہیں۔

ایڈ :۔ ظاہر ہے۔

میں :۔ اس طرح بالآخر مسابقت اور جاہ و جلال کے بجائے لوگ تجارت اور روپیہ کے عاشق ہوجاتے ہیں۔ اب یہ مالدار کی عزت اور توقیر کرنے لگتے اور اُسے اپنا حاکم بناتے ہیں اور غریب آدمی کی بے عزتی ہونے لگتی ہے۔

ایڈ :۔ جی، ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں :۔ پھر یہ ایک قانون بناتے ہیں جس میں شہری بننے کے لیے ایک رقم بطور شرط مقرر کردی جاتی ہے اور حکومت خواص کے کم یا زیادہ محدود ہونے کے اعتبار سے کہیں یہ رقم کم ہوتی ہے کہیں زیادہ۔ جس شخص کی املاک اس رقم مقررہ سے کم ہوتی ہے اسے یہ حکومت میں کوئی حصّہ نہیں لینے دیتے۔ اگر ڈرانے دھمکانے ہی سے کام نہ چل گیا تو دستوراساسی میں یہ تغیر یہ لوگ بزور شمشیر عمل میں لاتے ہیں۔

اِیڈ :- بہت درست ۔

میں :- عام طور پر حکومت خواص کے قیام کا یہ طریقہ ہے۔

اِیڈ :- جی درست۔ لیکن اس قسم حکومت کی خصوصیات کیا ہیں اور ہم جن عیوب کا ذکر کر رہے ہیں وہ کیا ؟

میں :- سب سے پہلے تو شہریت کے لیے جو شرط ہے اس کی ماہیت پر نظر کرو۔ ذرا سوچو کہ اگر ناخدا اور کشتی بانوں کا انتخاب ان کی املاک کے اعتبار سے ہونے لگے اور ایک غریب آدمی کو چاہے وہ بہتر ناخدا ہو کشتی بانی سے منع کر دیا جائے تو کیا پیش آئے

اِیڈ :- آپ کا مطلب ہے کہ جہاز غرق ہو جائے ؟

میں :- ہاں۔ اور کیا یہی بات اور ہر چیز کی حکومت کے بارہ میں صحیح نہیں ؟

اِیڈ :- میں تو یہی سمجھتا ہوں۔

میں :- لیکن شہر مستثنیٰ ہے ؟ یا آپ شہر کو بھی شامل کرتے ہیں ؟

اِیڈ :- نہیں نہیں۔ شہر کا معاملہ تو سب سے زیادہ سنگین ہے۔ چونکہ شہر کی حکومت سب سے بڑی بھی ہے اور سب سے مشکل بھی۔

میں :- اچھا تو حکومت خواص کا پہلا بڑا عیب تو یہ ہے۔

اِیڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- اور ایک عیب یہ ہے اور یہ بھی اتنا ہی برا ہے۔

اِیڈ :- وہ کیا ؟

میں :۔ اس کی ناگزیر تقسیم۔ ایسی ریاست ایک نہیں بلکہ دو ریاستیں ہیں۔ ایک غریبوں کی ریاست اور ایک امیروں کی، یہ دونوں ایک جگہ پر رہتی اور ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتی رہتی ہیں۔

ایڈ :۔ یقیناً۔ یہ بھی کم از کم اتنی ہی خراب بات ہے۔

میں :۔ ایک اور بُری بات یہ ہے کہ اسی گزشتہ بالا وجہ سے یہ کوئی جنگ نہیں کر سکتے۔ یا تو یہ جمہور کو مسلح کریں اور اس صورت میں یہ دشمن سے زیادہ خود اُنسے خائف ہوتے ہیں یا پھر اگر جنگ کیوقت انہیں نہ نکالیں تو یہ خود تو پھر خواص ہی ہیں جیسے حکومت کرنے کے لیے تھوڑے سے ویسے ہی لڑنے کے لیے تھوڑے سے اور اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ روپیہ سے انہیں محبت ہوتی ہے اس لیے محاصل ادا نہیں کرنا چاہتے۔

ایڈ :۔ کیسی عیب کی بات ہے!

میں :۔ اور جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس قسم کے دستور کے ماتحت ایک ہی شخص کے متعدد پیشے ہوتے ہیں۔ فلاح، تاجر، سپاہی سب کچھ ایک ذات میں جمع ہیں۔ یہ کیا کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے؟

ایڈ :۔ اور سب کچھ سہی اچھا ہی نہیں۔

میں :۔ ایک عیب اور ہے جو غالباً سب سے بڑا ہے اور جو پہلے پہل اس ریاست پر اپنا اثر کرتا ہے۔

ایڈ :- وہ کیا عیب؟

میں :- ایک شخص کے پاس جو کچھ بھی ہو وہ اُسے سب کو بیچ سکتا اور دوسرا اُسے حاصل کرسکتا ہے، اور پھر اس بیع کے بعد بھی وہ اس شہر میں رہ سکتا ہے جس کا اب وہ جز نہیں۔ نہ وہ تاجر ہے نہ دستکار، نہ شہسوار ہے نہ پانجا بس ایک غریب اور بے یار و مددگار ہستی

ایڈ :- جی ہاں، یہ بھی ایک عیب ہے جو پہلے پہل اسی ریاست میں شروع ہوتا ہے

میں :- یقیناً یہ عیب وہاں منع نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ حکومت خواص میں کثیر دولت اور مطلق افلاس کے دونوں انتہائی سرے ہوتے ہیں۔

ایڈ :- درست۔

میں :- لیکن ذرا پھر غور کرو کہ اپنے ایام تموّل میں جب یہ شخص اپنی دولت صرف کرتا تھا کیا شہریت کے اغراض کے لیے اس حالت سے ذرّہ بھر بھی زیادہ مفید تھا؟ یا کہ محض بظاہر حکمران جماعت کا ایک رکن معلوم ہوتا تھا، اگرچہ درحقیقت نہ حاکم تھا نہ محکوم بس ایک فضول خرچ آدمی تھا۔

ایڈ :- جیسا آپ نے فرمایا یہ بظاہر حاکم معلوم ہوتا تھا لیکن تھا محض فضول خرچ۔

میں :- کیا اس کی حالت گھر کے نکھٹو کی سی نہیں جیسے شہد کے چھتے میں نکھٹو ہوتا ہے۔ اور جس طرح وہ چھتے کے لیے وبال ہوتا ہے یہ شہر کے لیے عذاب ہے۔

ایڈ :- بالکل درست (جناب) سقراط۔

میں :- اور ایڈمینٹس، خدا نے ان اڑنے والے نکھٹوؤں کو تو

سب کو بے ڈنک بنایا ہی لیکن ان چلنے والوں میں کچھ تو اُسنے بے ڈنک بنائے ہیں لیکن بعض کے نہایت خوفناک ڈنک ہوتے ہیں۔ بے ڈنک طبقہ میں تو وہ ہیں جو بڑھاپے میں پہنچکر اپنی زندگی بطور نادار فقیر کے ختم کرتے ہیں اور ڈنک والے گروہ سے وہ سارا طبقہ نکلتا ہی جسے مجرم کہتے ہیں۔

ایڈ :۔ نہایت بجا۔

میں :۔ صاف بات ہی کہ جب کبھی تم کسی ریاست میں مفلس دریوزہ گر دیکھو تو سمجھلو کہ یہیں کہیں پر وس میں چور، گرہ کٹ، معبدوں کے لوٹنے والے اور ہر قسم کے بدمعاش بھی ضرور پوشیدہ ہونگے۔

ایڈ :۔ ظاہر ہے۔

میں :۔ اچھا تو کیا خواص کی ریاست میں تمھیں فقیر نہیں ملتے؟

ایڈ :۔ ہاں، (کیوں نہیں) ہر شخص جو حاکم نہیں وہ فقیر ہی۔

میں :۔ اور کیا ہم یہ کہنے کی جرات کرسکتے ہیں کہ ان میں بہت سے مجرم بھی ملتے ہیں، یہی ڈنک دار بدمعاش جنہیں حکام با اختیار بجبر روک تھام رکھتے ہیں۔

ایڈ :۔ بیشک ہم یہ جرأت کرسکتے ہیں۔

میں :۔ ایسے لوگوں کے وجود کی علت تعلیم کا فقدان، تربیت کی خرابی، اور ریاست کا بُرا دستور اساسی ہی۔

ایڈ :۔ درست۔

میں :۔ تو حکومت خواص کی یہ شکل ہے اور یہ اس کی برائیاں۔ اور ممکن ہے اور بہت سی برائیاں ہوں۔

ایڈ :۔ بہت ممکن ہے۔

میں :۔ اب ہم حکومت خواص یعنی حکومت کی اس قسم کو ختم کر سکتے ہیں جس میں حکام کا انتخاب ان کی دولت کی بنا پر ہوتا ہے۔ آؤ اب اس فرد کی ماہیت اور اس کی اصل پر نظر کریں جو اس ریاست کے مطابق ہے۔

ایڈ :۔ ضرور۔

میں :۔ کیا اغنیا خاصان میں اس طرح نہیں بدلتے۔؟

ایڈ :۔ کس طرح؟

میں :۔ ایک وقت آتا ہے کہ طبقہ اغنیاء کے نمائندہ کے لڑکا ہوتا ہے۔ یہ لڑکا پہلے اپنے باپ کی نقل کرتا اور اس کے قدم بقدم چلتا ہے۔ لیکن آگے چلکر یہ دیکھتا ہے کہ اس کا باپ ریاست سے ٹکرا کر اس طرح برباد ہو گیا جیسے کسی چٹان سے۔ یہ خود بھی تباہ ہوا اور جو کچھ اس کے پاس تھا وہ بھی۔ مثلاً ممکن ہے کہ اس کا باپ کوئی سپہ سالار یا اور کوئی اعلیٰ افسر ہو جسکے خلاف چغلخوروں نے بدگمانی پھیلائی۔ اس کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلا اور سزائے موت دی گئی یا اُسے جلاوطن کر دیا گیا یا شہری کے تمام حقوق سے اسے محروم کر کے اس کی ساری املاک اس سے چھین لی گئی۔

ایڈ :۔ بہت ہی قرین قیاس بات ہے۔

میں :- اور اس کے بیٹے نے یہ سب کچھ دیکھا اور سب کچھ جانا۔ اب وہ ایک تباہ شدہ آدمی ہے اور خوف نے اسے سکھایا کہ اپنے تخت دل سے حوصلہ اور جذبہ کو دھکے دیکر نکالدے۔ جب افلاس نے اسے ذلیل کیا تو اسنے روپیہ کمانے کی طرف توجہ کی اور کمینہ پن اور کنجوسی سے پس انداز کر کے بڑی محنت سے دولت جمع کی۔ کیا قرین قیاس نہیں کہ ایسا شخص اُس خالی تخت پر اب اپنی فطرت کے شہوانی اور لالچی عنصر کو جگہ دے، اور اُسے تاج، زریں توڑوں اور عصا رشاہی سے آراستہ کر کے اپنے اندر شہنشاہی کرنے کی اجازت دے

ایڈ :- بہت صحیح۔

میں :- اس شہنشاہ کے ہر دو جانب عقل اور نفس (دلوامہ) کو بطور تابعدار کے بٹھا کر نہیں ان کی ایک حیثیت جتائیگا اور ان میں سے ایک کو مجبور کرے گا کہ سوائے اسکے اور کچھ نہ سوچے کہ چھوٹی رقمیں بڑی رقموں میں کیونکر مبدل ہو سکتی ہیں اور دوسرے کو دولت اور دولتمند لوگوں کے علاوہ کسی کی تعریف و تکریم نہ کرنے دیگا نہ کسی اور چیز کا اتنا حوصلہ رکھنے دیگا جتنا کہ دولت اور ذریعہ حصول دولت کا۔

ایڈ :- کوئی تغیر اسقدر سریع اور اسدرجہ یقینی نہیں ہوتا جتنا کہ حوصلہ مند نوجوان کا لالچی نوجوان میں۔

میں :- اور یہی لالچی نوجوان ریاست خواص کا نمائندہ ہے۔

ایڈ :- جی۔ کم از کم جس فرد میں سے یہ پیدا ہوا ہے وہ اس ریاست کے مماثل

ضروری جس سے حکومت خواص پیدا ہوئی تھی۔

میں :- اچھا تو ذرا دیکھیں کہ ان میں کچھ مشابہت ہی یا نہیں؟

ایڈ :- بہت خوب۔

میں :- اولاً تو یہ دونوں دولت کی قدر کرنے میں مشابہ ہیں۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- نیز اپنی مفلسانہ محنتی سیرت میں۔ یہ فرد صرف اپنی ضروری خواہشوں کو پورا کرتا ہی اور اپنا صرف انھیں تک محدود رکھتا ہی۔ اور دوسری خواہشوں کو اس خیال سے دباتا ہی کہ بے سود ہیں۔

ایڈ :- درست۔

میں :- یہ بڑا ہی خسیس ہوتا ہی، ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے اپنی تھیلی بھرتا ہی اور اس قسم کے آدمی کی لغو اور دنی لوگ مدح و ستائش کرتے ہیں۔ کیا یہ شخص جس ریاست کی نمائندگی کر رہا ہی اُسکا صحیح عکس اور نمونہ نہیں؟

ایڈ :- مجھے تو معلوم ہوتا ہی۔ کم سے کم یہ بھی روپیہ پیسے کی بڑی قدر کرتا ہی اور یہ ریاست بھی۔

میں :- ہاں۔ اور یہ تربیت یافتہ آدمی بھی نہیں۔

ایڈ :- میرے خیال میں نہیں ہی۔ کیونکہ اگر یہ تعلیم یافتہ ہوتا تو ایک اندھے دیوتا کو اپنی جمعیتہ مغنین کا ناظر وہادی نہ بناتا نہ اسے کوئی مخصوص عزت دیتا۔

میں :- بہت خوب۔ لیکن ذرا اس پر غور کرو کہ آیا ہمیں اس شخص کے متعلق یہ بات اور نہ تسلیم کرنی چاہیئے کہ عدم تربیت کے باعث اس میں نادار اور بد معاش کی سی عفشلانہ خواہشیں پائی جائیں گی، جو اس کی زندگی کی عام عادت سے مجبوراً دبی رہتی ہیں۔

ایڈ :- درست۔

میں :- تم جانتے ہو کہ اس کی بدمعاشیاں دیکھنی ہوں تو کہاں دیکھ سکتے ہو؟

ایڈ :- کہاں دیکھنا چاہیئے؟

میں :- نہیں اسے ایسی جگہ دیکھنا چاہیئے جہاں اسے بے ایمانی کا بہت بڑا موقع ہو مثلاً یہ کسی یتیم بچہ کا ولی و محافظ بنے۔

ایڈ :- اچھا!

میں :- ایسی صورت میں ظاہر ہوجائیگا کہ اپنے عام معاملات میں جن کے سبب سے اسے دیانتداری کی شہرت حاصل ہے یہ اپنے بُرے جذبات کو جبر نیکی سے دبا تا ہے۔ یہ نہیں کہ انہیں ان کی غلطی ثابت کردے یا عقل کے ذریعہ انہیں سدھالے بلکہ چونکہ اپنے مقبوضات کے لیے مارے ڈر کے کانپتا ہے لہذا ضرورت اور خوف سے ان جذبات کو روکے تھامے رہتا ہے۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- ہاں، میرے عزیز دوست! تم فی الواقعہ یہ بات پاؤ گے کہ اسے جب کبھی

ایسی چیز صرف کرنی ہوتی ہو جو اس کی نہیں تو کھٹو ...... کی فطری خواہشیں عموماً اس میں موجود ہوتی ہیں۔

ایڈ :- ہاں، اور اسمیں یہ قوی بھی ہونگی۔

میں :- یہ آدمی گویا خود اپنے سے برسرپیکار ہوگا، یہ دو آدمی ہونگے، ایک نہیں لیکن عام طور پر اس کی بہتر خواہشات ادنی پر غالب ہونگی۔

ایڈ :- درست۔

میں :- ان وجوہ سے ایسے آدمی کی اوروں سے زیادہ عزت ہوگی مگر پھر بھی ایک آزاد و ہم آہنگ روح کی سچی نیکی اس سے دور بھاگیگی اور کبھی اس کے قریب نہ پھٹکے گی۔

ایڈ :- میں تو یہی توقع کرتا ہوں۔

میں :- اور بالیقین انفرادی حیثیت سے یہ کنجوس ریاست کے ہر انعام فتحمندی اور دوسری قابل عزت حوصلہ مندیوں کے لیے بڑے کم درجہ کا رذیل مقابل ہوگا۔ یہ ایسے مقابلوں میں عزت حاصل کرنے کے لیے روپیہ نہ صرف کریگا، کیونکہ اپنی خرچیلی مصرفانہ خواہشوں کو بیدار کرکے اس کشمکش میں شامل کرنے اور اپنے مدد لینے سے یہ بہت ڈرتا ہی۔ خالص خواصی انداز سے یہ اس معرکہ میں اپنے وسائل کا ایک تھوڑا سا حصہ لگاتا ہی اور نتیجہ عموماً یہ ہوتا ہی کہ انعام تو ہات سے جاتا ہی لیکن روپیہ بچ رہتا ہی۔

ایڈ :- بہت صحیح۔

میں:- کیا ابھی اور کوئی شبہ باقی ہے کہ کنجوس اور روپیہ کمانے والا آدمی خواص ریاست کے مطابق ہوتا ہے۔

ایڈ:- کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

میں:- اس کے بعد جمہوریت آتی ہے۔ اس کی اصل اور ماہیت پر ہمیں ابھی غور کرنا ہے پھر جمہوری انسان کے چلن کی تحقیق کرنی اور اس پر اپنا فیصلہ صادر کرنا ہے۔

ایڈ:- جی۔ یہ تو ہمارا قاعدہ ہی ہے۔

میں:- اچھا تو حکومت خواص سے جمہوریت میں تبدیلی کیسے پیدا ہوتی ہے؟ کیا اس طرح نہیں ہوتی کہ یہ ریاست جس خوبی کو اپنا مقصد بناتی ہے وہ یہ ہے کہ جس قدر ہو سکے مالدار بنے اور یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی؟

ایڈ:- اچھا تو پھر؟

میں:- حکمراں چونکہ یہ جانتے ہیں کہ ان کی طاقت کا مدار ان کی دولت پر ہے اس لیے نوجوانوں کی فضول خرچیوں کو قانوناً روکنے سے انکار کرتے ہیں کہ اُن کی تباہی میں ان کا فائدہ ہے۔ وہ انہیں سود دیتے ہیں ان کی جائدادیں خرید لیتے ہیں اور اس طرح اپنی دولت اور اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔

ایڈ:- بالیقین۔

میں:- اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ دولت کی محبت اور جذبۂ اعتدال ایک ہی ریاست کے شہریوں میں کسی قابل لحاظ حد تک یکجا نہیں رہ سکتے۔ ایک کی

طرف سے غفلت ہوگی یا دوسرے کی طرف سے۔

ایڈ :- خاصی صاف بات ہے۔

میں :- اور خواصی ریاستوں میں بے پروائی اور فضول خرچی کے رواج عام کے باعث اچھے اچھے خاندانوں کے لوگ اکثر بھیک کے ٹکڑوں سے لگ گئے ہیں۔

ایڈ :- جی، اکثر۔

میں :- لیکن پھر بھی یہ رہتے شہر ہی میں ہیں۔ یہ سب کے سب پورے مسلح اور آمادۂ نیش زنی یہاں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض قرضدار ہیں بعض کا حق شہریت ضبط ہو چکا ہے، ایک تیسرا گروہ ہے جو دونوں وبالوں میں مبتلا ہے۔ یہ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں جنھوں نے ان کی املاک لے لی ہے اور انہیں سے کیا ہر دوسرے شخص سے پھران کے خلاف سازشیں کرتے اور انقلاب کے آرزومند رہتے ہیں۔

ایڈ :- سچ ہے۔

میں :- دوسری طرف کاروباری لوگ ہیں جو سر جھکائے چلتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو انھوں نے تباہ کیا ہے انہیں دیکھتے تک نہیں۔ یہ اپنا ڈنک (یعنی اپنا روپیہ)۔ اور کسی کے مارتے ہیں جو اپنے خبردار نہیں، اور جو اصل رقم یہ دیتے ہیں (اور جو بمنزلہ والدین کے ہوتی ہے) اسکے بچے کچے ہو کر ایک خاندان کی شکل میں کئی گنہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ریاست میں کاہلوں اور مفلسوں کی کثرت کا باعث ہوتے ہیں۔

ایڈ :- ہاں، یقیناً ان کی تو کثرت ہو گی۔

میں :- چنانچہ یہ خرابی اب آگ کی طرح بھڑک اٹھتی ہے اور نہ تو استعمال املاک پر قیود لگا کر اسے بجھاتے ہیں نہ دوسرے طریقے سے۔

ایڈ :- کون دوسرا طریقہ۔

میں :- وہ جو اسکے بعد بہترین طریقہ ہے اور جسمیں یہ فائدہ ہے کہ وہ شہریوں کو اپنے اخلاق کی طرف توجہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یعنی ایک عام قاعدہ ہو جائے کہ جو کوئی اپنی مرضی سے معاہدہ کرے وہ اپنی ذمہ داری پر کرے اس سے یہ شرمناک زرگری بہت کم ہو جائے گی اور جن برائیوں کا ہم ذکر کر رہے تھے وہ ریاست میں گھٹ جائینگی۔

ایڈ :- جی، ان میں بہت کمی ہو جائیگی۔

میں :- فی الحال تو حکام ان محرکات کی وجہ سے جن کا میں نے ذکر کیا اپنی رعایا سے برا برتاؤ کرتے ہیں۔ یہ خود اور ان کے ملحقین خصوصاً حکمراں طبقہ کے نوجوان تعیش اور جسمانی و دماغی کاہلی کی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں، یہ کچھ کرتے دھرتے تو ہیں نہیں اور مسرت و الم دونوں کے مقابلہ کی صلاحیت ان میں نہیں رہتی۔

ایڈ :- بہت درست۔

میں :- انھیں تو بس روپیہ کمانے کی فکر ہوتی ہے اور نیکی کی پرورش کیطرف سے یہ بھی اتنے ہی بے اعتنا ہوتے ہیں جتنا کہ نادار فقیر۔

ایڈ :- جی، بالکل یونہی بے نیاز۔

میں :- اچھا ایسی صورت حالات ہو اور حکمراں اور رعایا اکثر ایک دوسرے سے ملتے ہی ہیں، کبھی سفر میں، کبھی کسی اور باہم ملنے کے موقع پر، کسی جاترا پر یا جنگ کے کوچ میں ساتھ کے سپاہی یا ملاح کی حیثیت سے - اچھا اور خطرہ کے موقع پر ہی ایک دوسرے کا رویہ دیکھ لیتے ہیں، کیونکہ جہاں خطرہ ہو وہاں اس کا کوئی ڈر نہیں کہ مالدار غریبوں کی تحقیر کریں گے بہت ممکن ہے کہ دھوپ کا تپا ہوا مضبوط آدمی جنگ میں ایک ایسے مالدار آدمی کے دوش بدوش ہو جس نے کبھی اپنا رنگ نہیں خراب ہونے دیا اور جس کے پاس گوشت کی بھی (ماشاء اللہ) افراط ہو - اچھا جب یہ غریب اسے ہانپتا کانپتا اور بدحواس دیکھیگا تو بھلا کیسے اس نتیجہ پر نہ پہنچیگا کہ یہ لوگ مالدار محض اس وجہ سے ہیں کہ کسی دوسرے میں ان کے لوٹنے کی ہمت نہیں؟ پھر جب یہ اپنے طور پر باہم ملیں گے تو کیا ایک دوسرے سے یہ نہ کہیں گے کہ "ہمارے جنگ آزما تو بس کچھ یوں ہی سے ہیں"

ایڈ :- جی، میں تو خوب واقف ہوں کہ یہ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں -

میں :- اور جس طرح ایک کمزور جسم میں ایک معمولی سی خارجی بات واقعاً بیماری پیدا کر سکتی ہے اور بعض وقت تو بلا کسی خارجی تحریک کے خود اس میں ایک اندرونی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح ریاست میں جہاں کہیں کمزوری ہوتی ہے وہاں مرض کا ہونا بھی قرین قیاس ہے اور اس کے پیدا ہونے کی وجہ بہت خفیف سی ہو سکتی ہے - پھر ایک جماعت اپنے خواصی اور دوسری اپنے جمہوری حلیفوں سے مدد لیتی ہے، ریاست

گویا بیمار پڑ جاتی اور خود اپنے سے برسرپیکار رہتی ہی۔ اور بعض وقت ممکن ہو کہ بلا کسی خارجی سبب کے اندرونی انتشار پیدا ہو جائے۔

ایڈ :- جی ہاں۔ یقیناً۔

میں :- اور جب غریب لوگ اپنے مخالفوں پر فتحیاب ہو جاتے ہیں، کچھ کو قتل اور کچھ کو جلاوطن کر چکتے ہیں، اور بقیہ کو آزادی اور اقتدار کا مساوی حصہ دیدیتے ہیں تو اسوقت جمہوریت وجود میں آتی ہی۔ یہ حکومت کی وہ قسم ہی جس میں حکام اور عہدہ دار عموماً قرعہ اندازی سے منتخب کیے جاتے ہیں۔

ایڈ :- جی، جمہوریت کی ماہیت یہی ہی، چاہے انقلاب بزور شمشیر ہوا ہو یا خوف کی وجہ سے مخالف جماعت نے اپنے کو ہٹا لیا ہو۔

میں :- اچھا اب دیکھیں کہ انکا طرز زندگی کیا ہی، اور انکی حکومت کیسی ہی، کیونکہ جیسی حکومت ہوگی ویسے ہی آدمی ہوں گے۔

ایڈ :- ظاہر ہی

میں :- پہلی بات یہ کہ کیا یہ لوگ آزاد نہیں، کیا شہر آزادی اور صاف گوئی سے پُر نہیں؟ آدمی جو چاہے کہہ سکتا ہی جو چاہے کر سکتا ہی۔

ایڈ :- کہا تو ایسا ہی جاتا ہی۔

میں :- اور جہاں آزادی ہو وہاں ظاہر ہی کہ ہر فرد اس قابل ہوتا ہی کہ اپنی زندگی کو جیسے چاہے مرتب کرے۔

ایڈ :- ظاہر ہے۔

مین :- ایسی ریاست میں انسانی طبائع کا بڑے سے بڑا تنوع ہوگا۔

ایڈ :- جی، ہوگا۔

مین :- چنانچہ یہ سب سے خوشنما ریاست معلوم ہوتی ہے، جس کی مثال ایک کڑھے ہوئے لباس کی سی ہے جس پہ طرح طرح کے پھول بنے ہیں۔ اور جس طرح عورتیں اور بچے رنگوں کے تنوع کو اور سب چیزوں سے زیادہ دلفریب سمجھتی ہیں اسی طرح بہت سے آدمی ہیں جنھیں یہ ریاست جو مختلف انسانی اطوار اور سیرت سے پیراستہ ہے سب سے حسین اور خوشنما ریاست معلوم ہوگی۔

ایڈ :- جی۔

مین :- جی ہاں، جناب عالی، اور حکومت کی تلاش کرنیوالے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی ریاست نہ ہوگی۔

ایڈ :- یہ کیوں؟

مین :- اس ریاست میں جو حریت ہے اسکے سبب سے یہاں ہر طرح کے دستور اساسی کا ایک کامل مجموعہ ملیگا۔ اور جس کسی کو ہماری طرح ایک ریاست بنانیکا خیال ہو اسے جمہوریت میں ایسے چلا جانا چاہیئے جیسے ایک بازار میں جہاں دستور بکتے ہیں اور جو اس کے مناسب حال ہو اُسے چن لینا چاہیے۔ پھر اس انتخاب کے بعد وہ اپنی ریاست قائم کرسکتا ہے۔

ایڈ :۔ اسے یقیناً کافی نمونے ملیں گے۔

میں :۔ اور اگر آپ خود ہی نہ چاہیں تو باوجود صلاحیت کے آپ کے لیے حکومت کرنا یا محکوم بننا لازمی نہیں، نہ یہ ضروری ہے کہ جب سب جنگ کریں تو آپ بھی جنگ کریں یا سب امن سے رہتے ہوں تو آپ بھی امن سے رہیں۔ ہاں آپ ہی کا جی چاہے تو اور بات ہے۔ نہ یہ ہی ضروری ہے کہ اگر کوئی قانون آپ کو کسی عہدے کے پُر کرنے سے یا قاضی بننے سے منع کرتا ہے اور آپ کا جی اُسکو چاہتا ہے تو آپ اس عہدہ کو نہ حاصل کرسکیں یا قاضی نہ بن سکیں۔ کیا زندگی کا یہ طریقہ کم ہے کم ایک لمحہ کے لیے بغایت خوش آیند نہیں معلوم ہوتا؟۔

ایڈ :۔ ہاں، فی الوقت تو معلوم ہوتا ہے۔

میں :۔ اور کیا بعض صورتوں میں مجرموں کے ساتھ ان کی انسانیت نہایت دلفریب نہیں ہوتی؟ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جمہوریت میں بہت سے لوگ جنھیں سزائے موت یا جلاوطنی کا حکم ملچکا ہے وہ جہاں تھے وہیں رہتے ہیں اور ادھر ادھر ساری دنیا میں گشت لگاتے ہیں یہ بزرگ بڑے بطل بنے اکڑتے پھرتے ہیں اور کوئی نہ دیکھتا ہے نہ خیال کرتا ہے۔

ایڈ :۔ جی، بہت سارے۔

میں :۔ اس کے علاوہ جمہوریت کے جذبہ عفو اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق "چہ غم" کا اندازہ بھی دیکھو اور ان تمام لطیف اُصولوں کی طرف سے بے اعتنائی

جو ہم نے اپنے شہر کے قیام کے وقت نہایت اہتمام سے قائم کیے تھے، مثلاً یہ کہ سوائے نہایت ہی نادر طور پر فاضل طبائع کے اور کوئی اچھا آدمی ہرگز ایسا نہ ہوگا جو بچپن سے حسین چیزوں کے ساتھ کھیلنے اُنسے لطف اندوز ہونے اور سبق حاصل کرنے کا عادی نہ ہو۔ یہ جمہوریت کس شان سے ہمارے اُن تمام لطیف تصوّرات کو پاؤں تلے روندتی ہے اور ان مشاغل کی طرف ایک آن دھیان نہیں کرتی جنسے مدبر بنتا ہے بلکہ ہر اس شخص کو عزت بخش دیتی ہے جو جمہور کا دوست ہونے کا مدعی ہو۔

ایڈ :۔ یہ جمہوریت تو پھر نہایت ہی شریف الطبع چیز ہے!

میں :۔ جمہوریت کی یہ اور ان ہی جیسی اور خصوصیات ہیں؛ بہر حال، ہے یہ حکومت کی نہایت دلفریب شکل، تنوع اور بدنظمی سے پُر، اور مساوی اور غیر مساوی سب کو یکساں مساوات دینے والی۔

ایڈ :۔ جی، ہم اس سے تو خوب واقف ہیں۔

میں :۔ اب ذرا دیکھو کہ اس کا فرد کس قسم کا انسان ہے، بلکہ جیسے ریاست کے ساتھ کیا ہے یہ دیکھو کہ یہ فرد کس طرح وجود میں آتا ہے؟

ایڈ :۔ بہت خوب۔

میں :۔ کیا اس طرح نہیں ؟۔ کہ یہ ایک کنجوس حکومت خواص سے تعلق رکھنے والے باپ کا بیٹا ہے جسنے اسے اپنی جیسی عادتوں ہی کی تربیت کی ہے؟

ایڈ :۔ بالکل۔

میں :- اور باپ کی طرح یہ بھی اپنی ان تمام خواہشوں کو بجبر دباتا ہے جو کمانے سے نہیں بلکہ خرچ کرنے سے متعلق ہیں کہ یہ وہ حاجتیں ہیں جنھیں غیر ضروری کہا جاتا ہے۔

ایڈ :- ظاہر ہے۔

میں :- کیا وضاحت کی خاطر تم ضروری اور غیر ضروری خواہشوں میں امتیاز کرنا چاہتے ہو؟

ایڈ :- ضرور۔

میں :- ضروری خواہشیں کیا وہ نہیں جنسے ہمیں کوئی مفر نہیں اور جن کے پورا کرنے سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے؟ انھیں بجا طور پر ضروری کہا جاتا ہے، کیونکہ ہمیں فطرت نے بنایا ہی اس طرح ہے کہ ہم ان چیزوں کی خواہش کریں جو مفید بھی ہوں اور لازمی بھی اور ان کے خلاف ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔

ایڈ :- درست۔

میں :- لہذا انھیں ضروری بتلانے میں ہم غلطی پر نہیں ہیں ؟

ایڈ :- جی، نہیں۔

میں :- لیکن وہ خواہشیں جنسے آدمی اگر بچپن سے برابر سعی کرے تو بچ سکتا ہے اور علاوہ بریں جن کی موجودگی سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتوں میں اسکے برعکس ہے۔ تو کیا ایسی خواہشوں کو غیر ضروری کہنے میں ہم حق بجانب نہ ہونگے!۔

ایڈ :- ہاں، یقیناً۔

میں :- اچھا تو دو نو قسموں کی ایک ایک مثال لیں تاکہ ان کا ایک عام تصور قائم ہو جائے۔

ایڈ :- بہت خوب۔

میں :- کیا کھانے کی خواہش ضروری قسم میں شامل نہ ہو گی، یعنی ایسی سادہ غذا اور مسالہ کی خواہش جو تندرستی اور جسمانی قوت کے لیے درکار ہو۔؟

ایڈ :- میں تو سمجھتا ہوں۔

میں :- کھانے کی خواہش دو طرح ضروری ہے، ایک تو اس سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے، اور دوسرے یہ زندگی کے بقا کے لیے لازمی ہے۔

ایڈ :- جی۔

میں :- لیکن چاٹ اور مسالے تو بس وہیں تک ضروری ہیں جہاں تک صحت کو فائدہ پہنچائیں؟۔

ایڈ :- یقیناً

میں :- لیکن وہ خواہشیں جو اس سے آگے بڑھتی ہیں، مثلاً زیادہ نفیس غذا اور دیگر تعیشات کی خواہش کہ جسے اگر لڑکپن سے سادھا اور قابو میں لایا جائے تو عموماً اس سے بچاؤ ہو سکتا ہے اور جو (ادھر) جسم کے لیے مضر اور (اُدھر) خیر و حکمت کی تلاش میں روح کے لیے مضر، تو انھیں تو بجا طور پر غیر ضروری کہا جا سکتا ہے؟

ایڈ :- بہت بجا۔

میں :۔ کیا شہوانی اور دیگر خواہشات کا بھی یہی حال ہے؟

ایڈ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ وہ نکھٹو جس کا ہم نے ذکر کیا تھا وہ شخص ہے جو اس قسم کی خواہشات اور شہوات سے پُر اور غیر ضروری خواہشوں کا غلام ہو، برخلاف اس کے جو صرف ضروری خواہشات کے اثر میں ہو وہ کنجوس اور حکومتِ خواص سے تعلق رکھنے والا ہے۔

ایڈ :۔ بہت درست۔

میں :۔ اچھا تو پھر یہ دیکھیں کہ خواص سے جمہوری آدمی کیسے پیدا ہوتا ہے؟ میرا گمان ہے کہ عام طور پر یہ صورت ہوتی ہے۔

ایڈ :۔ وہ کیا؟

میں :۔ ایک نوجوان شخص جس کی تربیت نہایت گندے اور کنجوس طریقہ سے ایسی ہوئی ہے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا جب اپنے نکھٹو کو شہد کا چسکا لگتا ہے اور ایسی خونخوار اور مکار طبائع کی صحبت میں رہتا ہے جو اسکے لیے ہر قسم کے نفائس، اور نت نئی مسرتیں مہیا کر سکتے ہیں تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اسکے اندر جو خواصی اصول ہے وہ جمہوری اصول میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ایڈ :۔ لازماً۔

میں :۔ اور جیسے شہر میں مماثل نے مماثل کی مدد کی تھی اور انقلاب اس طرح ہوا تھا کہ باہر سے ایک حلیف نے شہریوں کی ایک جماعت کی کمک کی اسی طرح

اس نوجوان میں بھی تبدیلی یونہی رونما ہوتی ہو کہ اس کی اندرونی خواہشوں کی مدد کے لیے باہر سے خواہشوں کا ایک گروہ آتا ہو اور یہاں بھی مشابہ و مماثل مشابہ و مماثل کی مدد کرتے ہیں۔

ایڈ :- یقیناً۔

مں :- اور اگر کوئی حلیف اس کے خواصی اُصول کی مدد کرتا ہو چاہے یہ باپ یا رشتہ داروں کی نصیحت ہو یا ملامت، تو اس کی روح میں ایک فرقہ پیدا ہوتا ہی، پھر اسکے مخالف ایک اور فرقہ۔ اور یہ خود اپنے سے برسرپیکار ہو جاتا ہی۔

ایڈ :- ایسا ہونا لازمی ہی۔

میں :- چنانچہ بعض وقت جمہوری اُصول خواصی اصول سے دبنے لگتا ہی اسکی بعض خواہشیں مرجاتی ہیں بعض فرار ہو جاتی ہیں، اس نوجوان کی روح میں جذبۂ تکریم داخل ہو جاتا ہی اور اس طرح (اس کی روح کا) نظم رابس آجاتا ہی۔

ایڈ - جی، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہی۔

میں :- پھر جب پُرانی خواہشیں نکل جاتی ہیں تو ان جیسی اور نئی اُٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور چونکہ یہ انکا پیدا کرنیوالا انھیں تعلیم دینا نہیں جانتا اس لیے یہ تعداد میں بڑھتی اور زور پکڑتی ہیں —

ایڈ :- جی، اکثر ایسا ہوتا ہی۔

میں :- یہ پھر اسے اپنے پُرانے ہمنشینوں کی طرف کھینچتی اور ان سے خفیہ رابطہ

پیدا کرکے خوب بچے دیتی ہیں اور بڑھتی ہیں۔

ایڈ:- بہت صحیح۔

میں:- بالآخر یہ اس نوجوان کی روح کے قلعہ پر قابض ہوجاتی ہیں اور اسے تمام مکارم، مشاغل حسنہ اور کلمات صادقہ سے خالی پاتی ہیں کہ یہ چیزیں تو اُن انسانوں کے دماغوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں جو دیوتاؤں کے چہیتے اور انکے بہترین محافظ و پاسبان ہیں۔

ایڈ:- ان سے بہتر اور کون ہوسکتا ہے۔

میں:- چنانچہ جھوٹے اور شیخی خورے عقائد و اقوال اوپر چڑھ کر ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔

ایڈ:- ایسا ہونا تو یقینی ہے۔

میں:- اب یہ نوجوان پھر اس افیونیوں کے ملک میں لوٹتا ہے اور وہیں اپنا اختیار کرتا ہے۔ پھر اگر اس کے دوست اس کے خواصی حصہ کو کوئی مدد بھیجیں تو یہ متفاخرانہ عقائد جن کا ذکر ہوا قلعہ شاہی کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور نہ اُس سفارت کو داخل ہونے دیتے ہیں نہ بزرگوں کی اس پدرانہ پند ہی کو سنتے یا مانتے ہیں جو خانگی طور پر کوئی پیش کرے۔ پھر ایک جنگ ہوتی ہے اور معرکہ انھیں کے ہاتھ رہتا ہے۔ اب یہ انکسار کو جسے یہ حماقت کہتے ہیں نہایت شرمناک طریقہ سے نکال باہر کرتے ہیں اور عفت و اعتدال کو جس کا عرف انھوں نے نامردی رکھا ہے دلدل میں

روندکر الگ پھینک دیتے ہیں۔ یہ لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ اعتدال اور باضابطہ خرچ دناءۃ اور کم ظرفی ہے۔ چنانچہ بُری خواہشات کے ایک انبوہ کی مدد سے یہ انھیں سرحد پار بھگا دیتے ہیں۔

ایڈ:- جی، دیدہ و دانستہ۔

س:- جب اس شخص کی روح پر تسلط حاصل ہو گیا اور انھوں نے اسے بالکل خالی اور صاف کر کے اسے بڑے بڑے اسرار کا محرم بنا لیا تو اب دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے مسکن میں گستاخی اور بے راہ روی، تعیش اور بیحیائی کو اس انداز سے واپس لاتے ہیں کہ یہ ایک شاندار جلوس میں سروں پر ہار پہنے آتے ہیں، انکی معیت میں ایک کثیر مجمع ہوتا ہے جو انکی مدح کے گیت گاتا اور انھیں پیارے پیارے ناموں سے مخاطب کرتا ہے۔ گستاخی کو یہ حسن تربیت کہتے ہیں اور بے راہ روی کو آزادی، تعیش کا نام ان کے ہاں شان و شوکت ہے اور بیحیائی کا جرأت۔ اور اس طرح یہ نوجوان اپنی اصلی فطرت سے جس کی تربیت ضرورت کے مدرسہ میں ہوئی تھی بیکار اور غیر ضروری مسرتوں کی آزادی اور فسق و فجور میں پہونچ جاتا ہے۔

ایڈ:- جی ہاں۔ اسکی یہ تبدیلی تو نہایت واضح ہے۔

س:- پھر اس کے بعد یہ اپنی زندگی کے دن یوں گذارتا ہے کہ غیر ضروری مسرتوں پر بھی اسیطرح اپنا مال، اپنی محنت اور اپنا وقت صرف کرتا ہے جیسے ضروری پر۔ لیکن اگر یہ قسمت کا اچھا ہے اور اس کے حواس بہت زیادہ منتشر نہیں ہوتے ہیں تو کچھ عمر کٹنے پر جب

جذبات کا شباب ڈھل جائیگا تو ممکن ہی یہ شہر بدر کی ہوئی خوبیوں میں سے بعض کو پھر داخل ہونے دے اور اپنے کو بالکل اُن کے جانشینوں کے ہاتھ میں نہ رہنے دے۔ ایسی صورت میں یہ اپنی مسرتوں میں باہم ایک قسم کا توازن پیدا کرلیتا ہی یعنی اپنی حکومت اسکے سپرد کرتا ہی جو سب سے پہلے آے اور بازی جیت لے، پھر جب اس سے سیری ہوجاتی ہی تو دوسرے کے ہاتھ میں دیدیتا ہی۔ یہ کسی کی تحقیر نہیں کرتا اور سب کی یکساں ہمت افزائی کرتا رہتا ہی۔

ایڈ :- بہت صحیح۔

میں :- یہ اب اس قلعہ میں پند ونصیحت کے کسی کلمۂ صادقہ کو نہ قبول کرتا بت نہ آنے کی اجازت دیتا ہی۔ مثلاً اگر کوئی اس سے کہے کہ بعض مسرّتیں اچھی اور شریف خواہشات کی تسکین سے عبارت ہیں اور بعض بُری خواہشوں سے، اور تمہیں چاہئے کہ بعض کو استعمال کرو اور اُن کی عزت کرو، اور بعض کو سزا دیکر انپر غالب آؤ۔ غرض جب کبھی اس قسم کی کوئی بات اس کے سامنے کہی جاے تو اپنا سر ہلاتا ہی اور کہدیتا ہی کہ یہ تو سب کی سب یکساں ہیں اور ان میں ہر ایک اتنی ہی اچھی ہی جتنی کوئی دوسری۔

ایڈ :- جی۔ اس کا تو یہی رویّہ ہوگا۔

میں :- جی ہاں۔ اسی طرح آئی خواہشات کی تسکین میں صبح ہوتی ہی شام ہوتی ہی۔ یہ کبھی نشۂ شراب میں مست اور نغمۂ نَے سے سرشار ہوتا ہی، کبھی خالص پانی پر اُتر آتا ہی اور دُبلا ہونے کی فکر کرتا ہی۔ کبھی ورزش جسمانی کی طرف توجہ ہوجاتی ہی اور کبھی

سہلنکاری پر آتا ہی تو ہر چیز کو بالائے طاق رکھدیتا ہی، اور کبھی فلسفیانہ زندگی بسر کرنے لگتا ہی۔ اکثر آپ سیاسیات سے شغل رکھتے ہیں کہ کھڑے ہو کر جو سر میں سمایا کہہ ڈالا اور کر ڈالا۔ اگر کہیں کسی فوجی آدمی پر رشک آگیا تو اس طرف چل کھڑے ہوئے اور کسی کاروباری شخص پر آگیا تو اس طرف۔ اس کی زندگی میں نہ کوئی آئین ہی نہ کوئی نظام۔ اور اس گندہ وجود کو یہ خوشی، برکت اور آزادی کے ناموں سے موسوم کرتا ہی اور بس اسی طرح گزر دیتا ہی

ایڈ :- جی ہاں۔ یہ تو سراپا حریت اور مساوات ہی!

میں :- ہاں۔ اس کی زندگی نہایت متنوع اور رنگا رنگ ہوتی ہی۔ یعنی بہت سی زندگیوں کا خلاصہ۔ یہ اس ریاست کا جواب ہی جسے ہم نے حسین اور مرقع بتایا تھا۔ بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اسے اپنا نمونہ بنائیں گی اور اس کے وجود میں بہت سے دستور اساسی اور چال چلن کی بہت سی مثالیں ملینگی۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- اچھا تو اسے جمہوریت کے مقابل رکھیں کہ اسے بجا طور پر جمہوری انسان کہا جاسکتا ہی۔

ایڈ :- جی۔ اسکی یہی جگہ ہونی چاہیئے۔

میں :- آخر میں سب سے خوبصورت انسان اور ریاست آتی ہی یعنی جبر و استبداد اور جابر مستبد۔ اب ہمیں انپر نظر کرنی ہی۔

ایڈ :- بالکل درست۔

میں :- اچھا تو فرمایئے کہ استبداد کس طرح پیدا ہوتا ہی؟ یہ تو واضح ہی کہ اس کی اصل جمہوری ہی۔

ایڈ :- ظاہر ہی۔

میں :- کیا جمہوریت سے استبداد اسی طرح پیدا نہیں ہوتا جیسے حکومت خواص سے جمہوریت؛ یعنی ایک معنی کر۔

ایڈ :- کیسے؟

میں :- حکومت خواص نے اپنے لیے جو خیر اور اس کے قیام کا جو ذریعہ تجویز کیا تھا کثرت دولت تھا۔ کیوں میں صحیح کہتا ہوں نا؟

ایڈ :- جی ہاں۔

میں :- اور دولت کی غیر تسکین پذیر آرزو اور روپیہ حاصل کرنے کے لیے ہر چیز سے غفلت یہی حکومت خواص کی تباہی کا باعث ہوئی؟

ایڈ :- درست۔

میں :- چنانچہ جمہوریت کا بھی ایک اپنا خیر ہی جس کی غیر تسکین پذیر آرزو اسے انتشار کا منھ دکھاتی ہی؟

ایڈ :- وہ کیا؟

میں :- آزادی۔ جس کے متعلق جمہوریت میں تم سے لوگ کہیں گے کہ یہ ریاست کا فخر ہی۔ اور اسی وجہ سے احرار صرف جمہوریت ہی میں رہنا پسند کرینگے۔

ایڈ :- جی ہاں۔ یہ مقولہ تو ہر ایک کی زبان پر ہے۔

میں :- ہاں تو میں یہ کہنے والا تھا کہ اس کی غیر تسکین پذیر آرزو اور دوسری چیزوں سے غفلت جمہوریت میں وہ تبدیلی پیدا کر دیتی ہے جس سے استبداد کا مطالبہ پیدا ہوتا ہے۔

ایڈ :- یہ کیسے؟

میں :- جب آزادی کی پیاسی جمہوریت میں بُرے ساقی صدرِ محفل ہوں اور جمہوریت نے حریت کی یہ مئے تند ضرورت سے زیادہ پی لی ہو تو اب اگر اسکے حکمراں اس کی بات مان کر اسے ایک اور بڑا جرعہ نہ دیں تو یہ انسے جواب طلب کرتی سزا دیتی اور منحوس خواص بتاتی ہے۔

ایڈ :- ہاں۔ یہ تو عام واقعہ ہے۔

میں :- ہاں۔ اور جو وفادار شہری ہیں انھیں یہ جمہوریت ہیچ بتاتی اور تحقیر سے انھیں غلام کہتی ہے جو اپنی زنجیروں کو سینہ سے لگاتے ہیں۔ یہ تو ایسی رعایا چاہتی ہے جو حاکموں کی طرح ہو اور ایسے حاکم جو رعایا کی طرح ہوں۔ اسکے جی کے سے تو یہی لوگ ہوتے ہیں اور یہ انھیں کی مداحی کرتی اور انفرادی و اجتماعی دونوں طرح سے انھیں کی عزت کرتی ہے۔ تو بھلا ایسی ریاست میں حریت کی کوئی حد ہو سکتی ہے؟

ایڈ :- یقیناً نہیں۔

میں :- رفتہ رفتہ یہ مزاج گھروں میں راہ پا لیتا ہے اور بالآخر جانوروں تک پہنچکر

ان میں بھی یہ وبا پھیلاتا ہی۔

ایڈ :۔ آپ کا کیا مطلب ہی کیسے ؟

میں :۔ میرا مطلب ہی کہ باپ بیٹوں کی سطح پر اُترنے اور اُنسے ڈرنیکا عادی ہوجاتا ہی اور بیٹا باپ کی برابری کرتا ہی، اس میں اپنے والدین کی نہ عزت ہوتی ہی نہ حرمت، اور بس یہی اس کی آزادی ہی۔ یہاں مقیم پردیسی شہری کے برابر اور شہری مقیم پردیسی کے اور بالکل اجنبی بھی ایسا ہی جیسے یہ دونوں۔

ایڈ :۔ جی ہاں، یہ تو ہوتا ہی۔

میں :۔ اور بس یہی خرابیاں تھوڑی ہی ہیں اور بھی بہت سی اس سی کم درجہ کی ہیں۔ مثلاً اس صورت حال میں اُستاد اپنے شاگردوں سے ڈرتا اور اُنکی خوشامد کرتا ہی، شاگرد اپنے اُستادوں اور اتالیقوں کی تحقیر کرتے ہیں، جوان بڈھے سب یکساں ہیں، جوان بڈھے کی برابری کرتا ہی اور قول وفعل میں اُسکا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہی، بڈھے جوانوں کی سطح پر جھک کر ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ یہ اسے پسند نہیں کرتے کہ لوگ انھیں مستبد اور تلخ مزاج خیال کریں، لہذا جوانوں کے انداز اختیار کرتے ہیں۔

ایڈ :۔ بہت درست۔

میں :۔ حریت عامّہ کی آخری حد وہ ہی جب زرخرید غلام مرد ہو کہ عورت اتنا ہی آزاد ہوتا ہی جتنا اس کا خریدار، نیز اس سلسلہ میں ذکور وانات کی باہمگر

آزادی اور مساوات کا ذکر بھی نہ فراموش کرنا چاہیئے۔

ایڈ :۔ کیوں، بقول ایسکیلس منہ پر آئی بات کہہ کیوں نہ ڈالیں؟

میں :۔ میں یہی تو کر رہا ہوں۔ ہاں یہ اور کہہ دوں کہ کوئی انجان آدمی اسے یقین نہ کریگا کہ انسانی اقتدار میں جو جانور ہیں انھیں جمہوریت میں جس قدر آزادی حاصل ہے کسی اور ریاست میں نصیب نہیں کیونکہ یہ کہاوت سچ ہے کہ کتیاں بھی وہی حیثیت رکھتی ہیں جو انکی مالکہ عورتیں۔ اور گھوڑے اور گدھے احرار کے تمام حقوق و اعزاز کے ساتھ چلنے کا انداز رکھتے ہیں، اگر کوئی ان کے رستہ میں آجائے اور ان کے لیے سڑک صاف نہ چھوڑے تو یہ اسکے اوپر سے گذر جائیں۔ الغرض تمام چیزیں کثرت آزادی سے ہیں کہ پھٹی پڑتی ہیں۔

ایڈ :۔ جی ہاں، میں جب کبھی دیہات میں گھومنے چلا جاتا ہوں تو یہی دیکھنے میں آتا ہے جو آپ نے بیان فرمایا۔ میں نے آپ نے معلوم ہوتا ہے ایک ہی خواب دیکھا ہے۔

میں :۔ ان سب سے بالاتر یہ کہ ان تمام چیزوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شہری نہایت ذکی الحس ہو جاتے ہیں، انھیں کہیں ذرا تحکم چھو نہیں گیا کہ یہ لگے بے صبری سے پیچ و تاب کھانے اور آپ جانتے ہی ہیں آخر کار تو یہ تمام تحریری اور غیر تحریری قوانین کا خیال کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اب کسی کو اپنے اوپر نہیں دیکھنا چاہتے۔

ایڈ :۔ جی ہاں۔ میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔

میں۔ تو عزیز من یہ ہے وہ حسین اور شاندار آغاز جس سے استبداد پیدا ہوتا ہے۔

ایڈ :۔ واقعی نہایت شاندار ہے۔ لیکن یہ فرمائیے کہ اب اس کے بعد کونسا قدم

اُٹھتا ہی؟

میں :- جو حکومت خواص کی تباہی کا باعث تھا وہی جمہوریت کی تباہی کا سبب ہے وہی مرض حریت زیادہ پھیلکر اور شدید ہوکر جمہوریت کو آن دباتا ہی اور سچ تو یہ ہے کہ ہر چیز کی حد سے زیادتی اکثر بالکل مخالف سمت میں ایک ردعمل پیدا کرتی ہی اور یہ بات صرف موسم یا نباتی و حیوانی زندگی تک ہی محدود نہیں بلکہ سب سے زیادہ یہ اقسام حکومت پر اپنا اثر رکھتی ہی۔

ایڈ :- درست۔

میں :- آزادی کی زیادتی سے خواہ ریاست میں ہو یا افراد میں غلامی کی زیادتی ہی پیدا ہوتی ہی۔

ایڈ :- جی۔ قدرتاً۔

میں :- چنانچہ جمہوریت سے استبداد قدرتاً تراوش کرتا ہی، اور جس درجہ انتہائی قسم کی آزادی ہوتی ہی اس سے اسی درجہ شدید استبداد اور غلامی پیدا ہوتی ہی۔

ایڈ :- یہی توقع کرنی چاہیئے تھی۔

میں :- لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا سوال تو یہ نہ تھا۔ آپ تو شاید یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کونسی بدنظمی ہی جو جمہوریت اور حکومت خواص میں یکساں پیدا ہوتی اور دونوں کی تباہی کا باعث ہی۔

ایڈ :- درست۔

میں :- اچھا تو میں اس سلسلہ میں اس کاہل اور مسرف طبقہ کا حوالہ دے رہا تھا جس میں جو ذرا باہمت ہوں وہ قائد اور جو دبو ہوں وہ متبع ہوتے ہیں۔ ہم نے انھیں کی نکھٹوؤں سے تمثیل دی تھی جن میں بعض ڈنک دار ہوتے ہیں اور بعض بلا ڈنک۔

ایڈ :- نہایت بجا مقابلہ تھا۔

میں :- اور یہ دونوں گروہ جس شہر میں پیدا ہو جائیں اسکے لیے وبال جان ہوتے ہیں، ان کی مثال جسم میں بلغم وصفرا کی سی ہے۔ چنانچہ اچھے طبیب اور ریاست کے واضع قوانین کا فرض ہے کہ عقلمند زنبور گیر کی طرح انھیں دور ہی دور رکھے۔ اور ہو سکے تو کبھی اندر آنے ہی نہ دے۔ اور بالفرض اگر یہ کسی طرح آن پہونچیں تو انھیں اور ان کے خانوں کو جلد سے جلد کاٹ پھینکے۔

ایڈ :- جی، ضرور۔

میں :- آؤ اپنے اس عمل کو واضح طور پر دیکھنے کے لیے فرض کریں کہ جمہوریت تین طبقوں میں منقسم ہے۔ اور واقعاً ہے بھی ایسا ہی۔ کیونکہ اولاً تو آزادی کی وجہ سے جمہوریت میں حکومت خواص سے بھی زیادہ نکھٹو پیدا ہوتے ہیں۔

ایڈ :- بجا ہے۔

میں :- اور جمہوریت میں یہ یقیناً زیادہ شدید بھی ہوتے ہیں۔

ایڈ :- یہ کیونکر؟

میں :- اس لئے کہ حکومت خواص میں ان کی عزت نہیں ہوتی اور یہ اپنے

عہدوں سے علیحدہ کر دیے جاتے ہیں لہذا یہ نہ اپنی تربیت کر سکتے ہیں نہ اپنی قوت بڑھا سکتے ہیں، لیکن جمہوریت میں حکومت کی تقریباً ساری قوت انھیں کے ہاتھ میں ہوتی ہے؛ ان میں جو ذرا تیز اور ذہین ہوتے ہیں وہ تقریریں اور کام کرتے ہیں اور باقی دوسرے منبر کے ارد گرد بھنبھناتے پھرتے ہیں اور کسی کو مخالفت میں ایک لفظ نہیں کہنے دیتے۔ چنانچہ جمہوریت میں کم و بیش ہر چیز کا انتظام و انصرام نکھٹوؤں کے ہاتھ ہی میں ہوتا ہے۔

ایڈ :- بہت درست۔

میں :- اس انبوہ میں ایک اور طبقہ بھی تمیز کیا جا سکتا ہے۔

ایڈ :- وہ کون؟

میں :- یہ با امن لوگوں کا طبقہ ہے جو تاجروں کی قوم میں یقیناً سب سے مالدار ہوتا ہے۔

ایڈ :- قدرتاً۔

میں :- یہ سب سے زیادہ دُبنے والے لوگ ہوتے ہیں اور نکھٹوؤں کو انھیں سے سب سے زیادہ شہد ملتا ہے۔

ایڈ :- اور کیا جن بیچاروں کے پاس ہو ہی کم انکے دبانے سے نکلیگا بھی کم۔

میں :- یہ طبقہ، امرا کہلاتا ہے اور نکھٹو انھیں سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

ایڈ :- اور کیا، یہی بات ہے۔

میں :- عوام کا ایک تیسرا طبقہ ہے۔ اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو اپنے ہاتھ سے

کام کرتے ہیں، یہ نہ سیاست داں ہیں نہ کھانے کو ان کے پاس بہت ہی۔ جب مجتمع ہو تو یہی طبقہ جمہوریت میں سب سے بڑا اور سب سے طاقتور ہوتا ہی۔

ایڈ:۔ یہ سچ ہی۔ لیکن یہ انبوہ مشکل ہی سے اجتماع پر آمادہ ہوتا ہی، ہاں سوائے اس کے کہ اسے بھی کچھ شہد ملے۔

میں:۔ اور کیا انھیں حصہ ملتا نہیں؟ کیا انکے عائد مالداروں سے ان کی جائدادیں چھین کر عوام میں تقسیم نہیں کرتے؟ البتہ یہ خیال ضرور رکھتے ہیں کہ اس کا بڑا حصہ خود اپنے لیے محفوظ رکھیں۔

ایڈ:۔ ہاں، کیوں نہیں، اس حد تک تو عوام ضرور حصہ دار ہوتے ہیں۔

میں:۔ اور جن لوگوں کی املاک ضبط کی جاتی ہی وہ مجبور ہوتے ہیں کہ انھیں عوام کے سامنے جیسے بن پڑے جوابدہی کریں!

ایڈ:۔ اور یہ کر ہی کیا سکتے ہیں؟

میں:۔ اور پھر (لطف یہ) کہ چاہے ان غریبوں میں انقلاب کی کوئی خواہش بھی نہ ہو لیکن دوسرے ان پر یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ انھوں نے عوام کے خلاف سازش کی ہی اور حکومت خواص کے دوست ہیں۔

ایڈ:۔ درست۔

میں:۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ جب یہ لوگ عوام کو اپنی مرضی سے نہ سہی بلکہ جہالت اور مخبروں کی فریب دہی سے ہی اپنے نقصان کے درپے دیکھتے ہیں تو یہ مجبوراً واقعی حکومت

خواص کے حامی بنجاتے ہیں۔ یہ جی سے چاہتے نہیں لیکن نکھٹوؤں کی نیش زنی نہیں اذیت پہنچاتی اور ان میں انقلاب کی خواہش پیدا کرتی ہے۔

ایڈ :- بالکل صحیح

میں :- پھر ایک دوسرے پر ملامت، مقدمہ اور فیصلوں کی نوبت آتی ہے۔

ایڈ :- درست۔

میں :- عوام کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی حمایتی ہوتا ہے، جسے یہ اپنا سردار بناتے اور بڑھا بڑھا کر عظمت کرتے ہیں۔

ایڈ :- جی ہاں، انکا یہی طریقہ ہے۔

میں :- یہی وہ جڑ ہے (اور اسکے علاوہ کوئی اور نہیں) جس سے مستبد پیدا ہوتا ہے، یہ جب پہلے پہل زمین سے اپنا سر نکالتا ہے تو بطور محافظ (حقوق عوام)

ایڈ :- ہاں، ظاہر ہے۔

میں :- پھر آخر یہ محافظ مستبد میں کیسے مبدل ہونا شروع ہوتا ہے؛ ظاہر ہے کہ جب یہ اس آدمی کی سی حرکت کرنے لگتا ہے جس کا ذکر زیس لائیسیئی کے آرکیڈیا والے معبد کے قصہ میں ہے۔

ایڈ :- کونسا قصہ؟

میں :- قصہ یہ ہے کہ جو کوئی ایک قربان شدہ انسان کی آنتوں کو دوسری قربانیوں کی آنتوں کے ساتھ قیمہ کرکے چکھ لے وہ بھیڑیا بنجائیگا۔ آپ نے کبھی یہ قصہ

نہیں سُنا تھا؟

ایڈ:- ہاں، ہاں سُنا تھا۔

میں:- چنانچہ جمہور کے محافظ کی مثال بھی اسی آدمی کی سی ہے۔ اس کے بس میں چونکہ ایک انبوہ ہوتا ہے اس لیے اپنے اعزا کا خون بہانے سے کوئی چیز اسے مانع نہیں ہوتی۔ اسی عام طریقہ سے یعنی جھوٹے الزام لگا لگا کر یہ انھیں عدالت میں پیش کراتا اور قتل کراتا ہے، اصل انسانی زندگی کی فنا کا باعث ہوتا ہے اور پھر اپنی ناپاک زبان اور لبوں سے اپنے ساتھی شہریوں کا خون چکھتا ہے۔ بعض کو تو یہ مروا ہی ڈالتا ہے اور بعض کو جلاوطن کر دیتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قرضوں کی معافی اور تقسیم اراضی کے اشارے بھی دیتا رہتا ہے۔ تو آخر ان سب باتوں کے بعد اسکا کیا حشر ہوگا؟ یا تو اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارا جائیگا یا پھر آدمی سے بھیڑیا یعنی مستبد ہو جائے گا۔

ایڈ:- لازماً۔

میں:- یہ وہی شخص تو ہے جسنے مالداروں کے خلاف ایک جماعت بنانی شروع کی تھی؟

ایڈ:- وہی۔

میں:- کچھ عرصہ بعد یہ نکال باہر کیا جاتا ہے، لیکن پھر باوجود اپنے دشمنوں کے واپس آتا ہے اور اب کی اچھا پورا مستبد بن کر؟

ایڈ:- صاف بات ہے۔

میں :- اب اگر یہ اسے خارج نہ کر سکے یا استغاثہ عام سے اسے سزائے موت نہ دلا سکے تو اس کے قتل کی خفیہ سازشیں کرتے ہیں۔

ایڈ :- جی ہاں۔ یہی ان لوگوں کا عام طریقہ ہے۔

میں :- اسپر حامی جمہور کے شخص کی حفاظت کے لیے ایک دستہ فوج کا مطالبہ ہوتا ہے۔ ہر شخص جو اپنی مستبدانہ زندگی میں اس حد تک پہنچ چکا ہے اس چال کا استعمال کرتا ہے۔ یعنی بقول عوام "محب جمہور ایسا نہ ہو کہ جمہور کے ہاتھ سے جاتا رہے"!

ایڈ :- بالکل۔

میں :- جمہور آسانی سے اسے تسلیم کر لیتے ہیں، اب انہیں جو کچھ خوف و خطر ہے سب اسی کے لیے ہے اپنی ذات کے لیے کوئی نہیں۔

ایڈ :- بہت صحیح۔

میں :- اب اگر کوئی مالدار شخص جسپر عوام کے دشمن ہونیکا الزام بھی ہے۔ یہ خبر سنتا ہے تو عزیز من اس کی حالت پر وہ الفاظ صادق آتے ہیں جو کاہن نے کریسس سے کہے تھے یعنی "وہ ہرموذ کے پتھریلے ساحل پر سرپٹ بھاگا جاتا ہے اور ذرا نہیں تھمتا نہ اپنی بزدلی پر شرماتا ہے"

ایڈ :- اور ٹھیک بھی ہے، اگر اس وقت شرمائے تو آئندہ کبھی شرمانے کا موقع ہی نہ ملے۔

میں :- پکڑا گیا کہ مارا گیا۔

ایڈ :- اور کیا۔

میں :- اور یہ محافظ جبکا ہم نے ذکر کیا انھیں کوئی نہ دیکھیگا کہ جناب کا جسم ضخیم خود زمین کے لیے فراہمی روغن کا کام انجام دے رہا ہے۔ بلکہ یہ بہت سوں کو گراکر اب ریاست کی بگھی پر ہاتھوں میں باگ تھامے کھڑا ہوگا، اب یہ محافظ نہیں بلکہ مستبد مطلق ہے۔

ایڈ :- بلاشبہ

میں :- اب ہم اس شخص نیز اس ریاست کی خوشی پر غور کریں جس میں ایسی ہستی وجود میں آئی۔

ایڈ :- ضرور، اب اس پر نظر کرنی چاہیئے۔

میں :- پہلے پہل اپنے اقتدار کے ابتدائی ایام میں تو یہ سراپا تبسم ہوتا ہے جس سے ملتا ہی اسے سلام کرتا ہی۔ بھلا اسے اور مستبد کہا جائے، یہ جو برابر عام اور خاص سے ہر طرح وعدہ وعید کر رہا ہی! جو قرضداروں کے قرض معاف کرا رہا اور عوام اور اپنے متبعین میں زمین بانٹ رہا ہی اور ہر شخص کے ساتھ نیکی اور مہربانی کرنا چاہتا ہی! ایسا اور مستبد!!

ایڈ :- واقعی!

میں :- لیکن جب یہ اپنے خارجی دشمنوں سے فتحیابی یا معاہدہ کے ذریعہ نبٹ چکیگا اور اب انکا کوئی ڈر باقی نہ رہیگا تب بھی یہ برابر کوئی نہ کوئی جنگ چھیڑتا

رہیگا تاکہ عوام کو قائد کی ضرورت رہے۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- اور کیا اس کے علاوہ اسکا ایک اور مقصد یہ بھی نہیں کہ یہ لوگ محصول ادا کر کے مفلس ہو جائیں اور اس طرح اپنی تمامتر توجہ روزانہ ضروریات کی فراہمی کیطرف رکھیں اور اس کے خلاف سازش کرنیکا کم احتمال ہو۔

ایڈ :- ظاہر ہی۔

میں :- اور اگر اسے کسی پر شبہ ہو کہ اسکے دماغ میں آزادی کے خیالات ہیں، اور اس کے اقتدار کے خلاف مقاومت کا گمان ہو تو اسے تو ان کی تباہی کا نہایت اچھا بہانہ یوں ملیگا کہ انہیں دشمن کے رحم پر چھوڑ دے۔ چنانچہ ان وجوہ کی بنا پر مستبد ہمیشہ ایک نہ ایک جنگ برپا کرتا رہیگا۔

ایڈ :- لازماً۔

میں :- اب (رفتہ رفتہ) یہ غیر ہر دلعزیز ہونا شروع ہوتا ہی۔

ایڈ :- لازمی نتیجہ ہی۔

میں :- بعض وہ لوگ جنھوں نے اسکے اقتدار کے قیام میں شرکت کی تھی اور جو اب بھی برسر اقتدار ہیں اسپر نیز باہم ایک دوسرے پر اپنے خیالات ظاہر کرنے لگتے ہیں، اور ان میں جو ذرا باہمت ہیں وہ ساری کارروائی کو لا اس کے منہ پر مارتے ہیں۔

ایڈ :- جی، ایسا ممکن ہے۔

میں :- اب اگر یہ مستبد حکمراں رہنا چاہتا ہے تو اسے ان سب سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا، یہ اس وقت تک نہیں رک سکتا کہ کوئی ایک کارآمد آدمی بھی خواہ اس کا دوست ہو خواہ دشمن باقی ہے۔

ایڈ :- نہیں رک سکتا۔

میں :- چنانچہ یہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کون بہادر ہے، کون عالی دماغ کون عقلمند ہے اور کون مالدار۔ کیا خوش نصیبی ہے کہ یہ ان سب کا دشمن ہے۔ اور چاہے اسکا دل کہے یا نہ کہے اسے اب لازم ہے کہ ان کے خلاف کوئی نہ کوئی موقع ڈھونڈھے اور بالآخر تمام ریاست کا تنقیہ ہوجائے۔

ایڈ :- جی، اور نہایت ہی نادر تنقیہ!

میں :- ہاں، یہ تنقیہ ویسا نہیں جیسا کہ طبیب جسم کا کرتے ہیں اس لیے کہ وہ تو بُرے کو نکال لیتے اور اچھے کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ اس کا بالکل اُلٹا کرتا ہے۔

ایڈ :- اگر اسے حکومت کرنی ہے تو اس سے کوئی مفر نہیں۔

میں :- کیسا مبارک انتخاب ہے۔ کہ یا تو بُروں کی اکثریت کے ساتھ رہنے اور انکی نفرت برداشت کرنے پر مجبور ہو یا پھر جینے ہی سے ہاتھ دھو۔

ایڈ :- ہاں، بس یہی ایک صورت ہے۔

میں :- اور شہریوں کی نگاہ میں اس کے اعمال جتنے قابل نفرت ہوتے جائیں گے

یہ لتنے ہی زیادہ وابستگان پیدا کریگا اور ان سے اتنی ہی زیادہ وفاشعاری کا طالب ہوتا جائے گا۔

ایڈ :۔ یقیناً۔

میں :۔ یہ وفادار گروہ آخر کون ہے اور یہ اسے کہاں سے حاصل کریگا؟

ایڈ :۔ اگر یہ انھیں دام دیگا تو یہ تو خود بخود اسکے گرد جمع ہو جائیں گے۔

میں :۔ قسم ہے کلب مصری کی۔ یہ کتنے بہت سے نکھٹو یہاں ہیں، طرح طرح کے اور تمام ملکوں کے۔

ایڈ :۔ جی، بیشک۔

میں :۔ لیکن کیا یہ انھیں وہیں جگہ کی جگہ حاصل کرنا نہ چاہیگا؟

ایڈ :۔ آپ کا کیا مطلب ہے، کیسے؟

میں :۔ یہ شہریوں سے انکے غلام چھین لیگا اور انھیں آزاد کر کے اپنے محافظ دستہ میں بھرتی کرلیگا۔

ایڈ :۔ یقیناً، اور ان پر وہ سب سے زیادہ اعتماد کرسکیگا۔

میں :۔ یہ مستبد بھی کیسی مبارک ہستی ہے، اور سبھوں کو تو قتل کر دیا اب یہ اس کے معتمد دوست رہ گئے ہیں۔

ایڈ :۔ جی :۔ اور یہ ہیں بھی بالکل اسی کی طرح۔

میں :۔ ہاں اور یہ وہ نئے شہری ہیں جنھیں یہ عالم وجود میں لایا ہے، یہ اسکی مدح سرائی

کرتے اور یہی اس کے ساتھی ہیں، کیونکہ اچھے لوگ تو اس سے نفرت کرتے اور الگ رہتے ہیں۔

ایڈ :- بیشک۔

میں :- سچ ہے، المناک ڈراما بڑی ہی دانشمندی کی چیز ہے! اور یوریپیڈیس بہت بڑا ڈراما نویس!!۔

ایڈ :- یہ کیوں؟

میں :- کیوں، اس لیے کہ وہی تو اس پرمغز مقولہ کا مصنف ہے کہ "مستبد عقلمندوں کے ساتھ رہ کر عقلمند ہوتے ہیں" اور اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ عقلمندوں کو مستبد اپنا ہمنشین بناتا ہے۔

ایڈ :- جی، وہ استبداد کی یوں بھی مدح کرتا ہے کہ یہ الٰہی ہے اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اسنے اور دوسرے شاعروں نے کہی ہیں۔

میں :- لہذا یہ المناک شعرا جو خود سمجھدار لوگ ہیں ہمیں اور ہماری طرح رہنے والے اور لوگوں کو معاف کریں اگر ہم انھیں اپنی ریاست میں نہ آنے دیں، کیونکہ یہ ٹھہرے استبداد کے قصیدہ خواں۔

ایڈ :- جی، بیشک، جنہیں عقل ہوگی وہ تو ضرور معاف کرینگے۔

میں :- لیکن یہ دوسرے شہروں میں جاجا کر برابر عوام کو اپنی طرف کھینچتے رہینگے اور عمدہ، بلند و مؤثر آوازوں کو کرایہ پر رکھ رکھ کر یہ شہروں کو استبداد اور جمہوریت

کی جانب مائل کرتے رہیں گے۔

ایڈ:۔ بہت صحیح۔

میں:۔ علاوہ بریں انھیں دام بھی ملتے ہیں اورعزت بھی۔ سب سے بڑی عزت تو مستبدین سے ملتی ہے اور اسکے بعد جمہوریتوں سے لیکن ہمارے جیسی دستوریہ جوں جوں اوپر چڑھتے ہیں ان کی شہرت ساتھ چھوڑتی جاتی ہے انکا سانس پھول جاتا ہے اور اور یہ آگے نہیں چل سکتے۔

ایڈ:۔ سچ ہے۔

میں:۔ مگر دیکھا ہم اپنے مضمون سے بھٹک گئے۔ اچھا پھر اسی طرف لوٹیں اور دریافت کریں کہ مستبد اپنی اس حسین اور کثیر التعداد، متنوع اور ہر دم متغیر فوج کو کیسے قائم رکھتا ہے۔

ایڈ:۔ اگر شہر میں مقدس خزانے ہیں تو یہ انھیں ضبط کرکے خرچ کرڈالیگا۔ جہاں تک ان لوگوں کا مال کفایت کریگا جن پر غداری کا الزام ہے، اس حدتک یہ عوام کے محاصل کو کم کرسکیگا۔

میں:۔ اور جب ان سے کام نہ چلے؟

ایڈ:۔ تو ظاہر ہے کہ یہ خود اور اسکے سب گھرے ساتھی مرد ہوں کہ عورتیں اسکے باپ کی ریاست پر گذر اوقات کرینگے۔

میں:۔ آپ کا مطلب شاید یہ ہے کہ عوام جن کی وجہ سے یہ عالم وجود میں آیا ہے

اور اسکے ساتھیوں کو گذارا دینگے۔

ایڈ:- ہاں، سوائے اس کے انگے پاس اور چارہ ہی کیا ہی؟

میں:- لیکن اگر عوام کو غصہ آجائے اور وہ لگیں کہنے کہ ایک بڑے پلے ہوئے لڑکے کو حق نہیں کہ اپنے باپ سے گذارا لے بلکہ حق تو یہ ہی کہ اب بیٹا باپ کی پرورش کرے اگر یہ صورت پیش آئی تو پھر کیسی ہوگی؟ باپ نے کچھ اس لیے اسے پیدا تھوڑے ہی کیا تھا اور کاروبار زندگی میں اس لیے تو نہیں جمایا تھا کہ جب یہ صاحبزادے بڑھ کر جوان ہوں تو یہ اپنے غلاموں کا غلام بنے اور پھر ان فرزند دلبند اور ان کے ساتھیوں اور غلاموں کی پرورش بھی کرے۔ اس کی غرض تو یہ تھی کہ بیٹا میری حفاظت کرے اور اس کی مدد سے مجھے مالداروں اور اُمرا کی حکومت سے نجات نصیب ہو۔ چنانچہ یہ ان صاحبزادہ اور ان کے ہمنشینوں کو اپنے گھر سے رخصت کرتا ہی جیسے کوئی دوسرا باپ ایک مسرف بیٹے اور اسکے احباب کو اپنے ہاں سے نکال باہر کرے۔

ایڈ:- واللہ۔ باپ کو اب پتہ چلیگا کہ وہ ابتک کس بلا کو سینہ سے لگائے تھا۔ اب جو اسے نکالنے کی ضرورت پڑی تو معلوم ہوا کہ حضرت خود تو کمزور ہیں اور بیٹا طاقتور۔

میں:- کیوں، آپ کا یہ تو کبھی مطلب نہ ہوگا کہ مستبد تشدد سے کام لیگا؟ کیا اگر باپ مخالفت کرے تو یہ اسے ماریگا؟

ایڈ:- ہاں، ضرور ماریگا، نہتا تو اسے پہلے ہی کرچکا ہی۔

میں:- تو یہ تو پھر پدر کش ہی، بوڑھے باپ کا بیرحم محافظ۔ اصلی استبداد یہ ہے،

جس کے متعلق کوئی غلط فہمی ممکن نہیں۔ مثل ہے کہ عوام دھوئیں یعنی احرار کی غلامی سے بچنے کے لیے آگ یعنی غلاموں کے استبداد میں جا پڑے۔ اس طرح گویا آزادی تمام حدود سے تجاوز کرکے غلامی کی سب سے سخت اور تلخ شکل اختیار کر لیتی ہے۔

ایڈ :۔ صحیح ہے۔

میں :۔ بہت خوب۔ اب تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے استبداد کی ماہیت اور جمہوریت سے اسکے تدریجی طور پر پیدا ہونے کے طریقہ پر کافی بحث کر لی ہے۔

ایڈ :۔ جی ہاں۔ بہت کافی۔

نویں کتاب

میں :- سب سے آخر میں استبدادی آدمی کی باری آئی ہی اسکے متعلق بھی ہمیں دریافت کرنا ہی کہ یہ جمہوری آدمی میں سے کس طرح پیدا ہوتا ہی، اور پھر اپنی زندگی کیسے کاٹتا ہی، خوشی میں یا مصیبت سے ؟

ایڈ :- ہاں، اب تو ایک یہی باقی رہ گیا ہی۔

میں :- لیکن ابھی ایک پہلے کا سوال بھی باقی ہی، جس کا جواب ابھی تک نہیں ہوا۔

ایڈ :- وہ کیا ؟

میں :- میرے خیال میں ہم نے ابھی شہوتوں کی ماہیت اور تعداد کا اچھی طرح تعین نہیں کیا۔ اور جب تک یہ نہ ہو لے تحقیق ہمیشہ گنجلک رہیگی۔

ایڈ :- ابھی کچھ ایسی بہت دیر تو ہوئی نہیں، یہ فروگذاشت اب پوری کی جاسکتی ہی۔

میں :- بہت صحیح۔ اچھا تو میں جو نکتہ سمجھنا چاہتا ہوں اسے دیکھو بعض غیر ضروری مسرتوں اور اشتہاؤں کو میں ناجائز تصور کرتا ہوں۔ ظاہراً یہ ہر شخص میں ہوتی ہیں لیکن بعض میں یہ آئین و عقل کے ذریعہ قابو میں ہوتی ہیں اور ان پر اچھی خواہشات کا غلبہ ہوتا ہے اور اس طرح یا تو یہ بالکل خارج ہو جاتی ہیں یا انکی تعداد گھٹ جاتی اور یہ بہت کمزور ہو جاتی ہیں۔ لیکن دوسرے لوگوں میں یہ قوی بھی ہوتی ہیں اور تعداد میں بھی زیادہ۔

ایڈ :- آپ کا مطلب کن اشتہاؤں سے ہے؟

میں :- میرا مطلب انسے ہے جو اس وقت جو نکتی ہیں جب روح کی عقلی شریف اور حکمراں طاقت مصروف خواب ہوتی ہے۔ اُس وقت ہمارے اندر کا وحشی درندہ خوب گوشت کھا اور شراب پی نیند توڑ کر اچکنا کودنا شروع کرتا اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے نکلتا ہے۔ پھر کوئی قابل تصور حماقت یا جرم ایسا نہیں جس کا ایسے وقت کہ اسنے حواس اور شرم و حیا کا ساتھ چھوڑ ہی دیا ہے انسان مرتکب ہونے پر آمادہ نہ ہو۔ حتی کہ محرمات سے ہم بستری اور اور دوسرے غیر فطری تعلقات و الدین کا قتل یا حرام غذا کا کھانا تک بھی اُسنے مستثنیٰ نہیں۔

ایڈ :- نہایت درست۔

میں :- لیکن جس شخص کی نبض صحت و اعتدال پر ہے وہ سونے سے پہلے اپنے قوائے عقلیہ کو بیدار کر لیتا اور شریف خیالات اور مسائل سے انکی سیری کر کے

اپنے وجود کو دھیان میں مجتمع کرلیتا ہی۔ یہ اپنی اشتہاؤں کو بھوکا نہیں مارتا بلکہ انھیں تسکین دیتا ہی لیکن نہ بہت زیادہ نہ بہت کم یعنی اتنی کہ یہ چپکے سو جائیں اور یہ یا انکا حظ و کرب اس کے اصول اعلیٰ کے کام میں مخل نہ ہو۔ اس اصول کو یہ خالص تجرید کے میدان میں تنہا چھوڑ دیتا ہی تاکہ یہ نامعلوم کے علم پر فکر اور اس کی آرزو کرے، خواہ یہ علم ماضی سے متعلق ہو یا حال و استقبال سے۔ اسی طرح جب کسی سے اسکا جھگڑا ختم ہو جائے تو یہ اپنے جذباتی عنصر کا التیام کر دیتا ہی۔ الغرض میرا مطلب یہ ہی کہ یہ اپنے دونوں غیر عقلی اصولوں کو مطمئن کرنے کے بعد آرام کرنے سے قبل تیسری اصل یعنی عقل کو بیدار کر دیتا ہی اسوقت تم جانتے ہو کہ یہ حقیقت کے نہایت قریب ہو جاتا ہی اور کبھی پریشان اور ناجائز خوابوں کا کھیل نہیں بنتا۔

ایڈ:۔ میں بالکل اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔ یہ بات کرتے کرتے میں اصل مطلب سے بھٹک چلا تھا اس سب میں جو اصل نکتہ میں دکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہی کہ اچھے آدمیوں تک میں ایک ناجائز وحشی درندوں کی سی فطرت ہوتی ہی جو سوتے میں رونما ہوتی ہی۔ ذرا دیکھیے کہ میں صحیح عرض کرتا ہوں اور آپ مجھ سے متفق ہیں کہ نہیں؟

ایڈ:۔ جی۔ میں متفق ہوں۔

میں:۔ اب ذرا اس سیرت کو یاد کرو جو ہم نے جمہوری آدمی کے ساتھ منسوب کی تھی۔ اس کے متعلق یہی تو فرض کیا تھا کہ بچپن سے لیکر اس کی تربیت نہایت

کنجوس باپ کے ماتحت ہوئی تھی جس نے انکے تمام بجا بے اور بیں انداز کرنے والی خواہشات کو توا یک یا اور دوسری غیرضروری اشتہاؤں کو جن کا مقصد صرف تفریح و تزئین ہی دبایا۔

ایڈ :- درست۔

میں :- پھر یہ ذرا زیادہ لطافت پسند اور عیش پرست قسم کے لوگوں کی صحبت میں پڑگیا، ان کے سارے عبث طریقے اختیار کرلیے اور اپنے باپ کی کم ظرفی سے نفور ہو کر بالکل دوسرے مخالف سرے پر جا پڑا۔ لیکن تھا چونکہ یہ اپنے بگاڑنے والوں سے بہتر آدمی اس لیے یہ دونوں طرف کھنچا اور بالآخر بیچ میں رُک کر اپنی زندگی بسر کرنے لگا جو اُسکے نزدیک بیہودہ جذبات کی پوری غلامی نہیں بلکہ مختلف مسرتوں میں حد اعتدال تک مصروفیت سے عبارت ہی۔ چنانچہ خواص سے جمہوری انسان یوں پیدا ہوا۔

ایڈ :- جی ہاں۔ اسکے متعلق اپنا یہی خیال تھا اور ابتک ہی۔

میں :- اب فرض کرو کہ بہت سے سال گذر گئے اور اس شخص کے (یہ جیسا کچھ بھی ہی) ایک لڑکا ہوا جس کی تربیت اپنے باپ کے اُصولوں کے مطابق ہوئی۔

ایڈ :- میں اس کا تصور کرسکتا ہوں۔

میں :- اچھا تو آگے فرض کرو کہ لڑکے پر بھی وہی گذری جو باپ پر گذر چکی ہی یہ اس بالکل بے ضابطہ اور بے قاعدہ زندگی میں آن پڑا جسے اس کے بہکانے والے

کامل آزادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا باپ اور اسکے احباب معتدل خواہشات کی طرفداری کرتے ہیں، لیکن دوسری مخالف جماعت ان کے مخالف خواہشوں کو مدد دیتی ہے۔ جہاں ان خطرناک ساحروں ان مستبد گروں نے دیکھا کہ اب ہمارا اثر اسپر سے ہٹ چلا یہ فوراً ایسی تدبیر کرتے ہیں کہ اسپر ایک ہمہ گیر جذبہ کو مسلط کر دیتے ہیں، جو اس کی بیکار اور معتدعانہ شہوات پر قابو پا لیتا ہے، یہ ایک طرح کا مہیب پردار نکھٹو ہے کہ میرے خیال میں یہی شکل اس کی صلیت کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

ایڈ:۔ جی ہاں۔ اس کی یہی ایک معقول شکل ہے۔

میں:۔ اب خوشبو بخارات کے بادل چھائے ہوتے ہیں، عطر، پھولوں کے ہار اور شراب ہوتی ہے، ایسی حالت میں اس کی دوسری شہوات اور اس کی بدکردار زندگی کی تمام مسرتیں اپنے بندھن تڑا کر اس کے گرد بھنبھنانا شروع کرتی ہیں، اور خواہش کے اس ڈنک کو جو انھوں نے اس کی نکھٹو فطرت میں پیوستہ کیا ہے خوب نشو ونما دیتی ہیں۔ بالآخر اس کی روح کا یہ بادشاہ جنون کو اپنے محافظین کا سردار بناتا ہے، اور لگتا ہے کھل کھیلنے۔ جہاں کسی اچھے خیال یا خواہش کو اپنے اندر پیدا ہوتے دیکھا، یا جب ذرا شرم و حیا کا کوئی شمہ اپنے میں باقی پایا تو ان سب کو ختم کر دیتا اور انھیں نکال پھینکتا ہے حتی کہ عفت و اعتدال کو بالکل خارج کر کے انکے بجائے جنون کو کامل طور پر مسلط نہ کر دے۔

ایڈ:۔ جی۔ استبدادی آدمی اسی طرح پیدا ہوتا ہے۔

میں :- کیا یہی وجہ نہیں کہ عشق کو زمانہ قدیم سے مستبد کہتے آئے ہیں؟

ایڈ :- کچھ عجب نہیں۔

میں :- اسی طرح کیا جو آدمی نشہ میں مست ہو اس میں بھی مستبد کی روح نہیں ہوتی۔

ایڈ :- ہوتی ہے۔

میں :- تم جانتے ہو کہ جس آدمی کا دماغ صحیح نہ رہے اور چل نکلے وہ اپنے کو صرف آدمیوں پر ہی نہیں بلکہ دیوتاؤں تک پر حکومت کرنیکے قابل سمجھتا ہے۔

ایڈ :- ضرور وہ تو ضرور یہ سمجھیگا۔

میں :- اور صحیح معنوں میں استبدادی آدمی اسی وقت عالم وجود میں آتا ہے، جب فطرتاً، عادتاً، یا دونوں کے اثر سے وہ مخمور شہوت پرست اور جذبات کا بندہ ہو جائے۔ کیوں میرے دوست، کیا یہی بات نہیں؟

ایڈ :- بالیقین۔

میں :- یہ تو ہے اُس شخص کی حالت اور یہ ہے اس کی اصل۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ رہتا کس طرح ہے!

ایڈ :- جیسے لوگ ہنسی میں کہتے ہیں، فرض کیجیے کہ یہ بات آپ کو مجھ سے کہنی ہو تو کیسے کہیں؟ -

میں :- میرے خیال میں تو اس کی ترقی کی دوسری منزل میں دعوتیں

ہونگی اور شراب نوشیاں، بزمہائے خروش اور درباز داریاں، الغرض اسی نوع کی تمام باتیں۔ اب اس کے سارے وجود پر محبت (عشق) کی حکمرانی ہوگی، اور اس کی روح کے تمام معاملات میں اسی کا فرمان جاری۔

ایڈ :- یقیناً۔

میں :- ہاں اور پھر شب و روز نت نئی اور بہت قوی خواہشات پیدا ہوتی جائیں گی اور ان کے مطالبات، الامان!

ایڈ :- بیشک۔

میں :- مال و متاع اگر ان حضرت کے پاس کچھ تھا تو سب ختم ہو چکا ہوگا۔ اور اب قرض اور املاک کی قطع و برید کا لگھا لگیگا۔

ایڈ :- لازمی بات ہی۔

میں :- پھر جب اس کے پلے کچھ نہیں رہتا تو اس کی خواہشیں کیسی اُمنڈ امنڈ کر ہجوم کرتی ہیں اور اس طرح شور و غوغا کرتی ہیں جیسے گھونسلے میں اپنے چگنے کیلئے کوے کے بچے۔ اور یہاں سب کے اکسانے سے اور علی الخصوص خود جناب عشق کے بڑھاوے سے جو ایک طرح اس سارے لشکر کے سردار ہیں، جنون کے سے عالم میں ہو جاتا ہی اور اسی کا پتہ لگاتا رہتا ہی کہ کسے دھوکا دوں اور کسے لوٹوں تاکہ کسی طرح اپنا پیٹ بھرے۔

ایڈ :- ہاں، ایسا تو یقیناً ہوگا۔

میں :- اب تو اسکے لیے کرب والم سے بچنے کی بس ایک ہی تدبیر ہے یعنی جس طرح بن پڑے روپیہ ملے۔

ایڈ :- لازماً۔

میں :- جیسے اسکے اندر مختلف مسرتوں کی آرزو یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی تھی اور نئی خواہشیں پُرانیوں سے بڑھ چڑھ کر رہتی تھیں اور اُن کے حقوق تلف کر لیتی تھیں، اسی طرح چونکہ یہ ابھی نوجوان ہو اس لیے اپنے ماں باپ سے زیادہ کا دعویدار ہوتا ہے، اور اگر املاک میں خود اپنا حصہ کھا اُڑا چکا تو اب ان کے حصوں کی کتر بیونت کی فکر کرتا ہو۔

ایڈ :- بلاشبہ۔

میں :- اگر والدین نہ مانیں تو سب سے پہلے تو انھیں دھوکا اور فریب دینے کی کوشش کریگا۔

ایڈ :- بالکل سچ ہو

میں :- اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی تو یہ جبر کرکے انھیں لوٹ لیگا۔

ایڈ :- ہاں۔ غالباً۔

میں :- اور اگر ماں باپ اپنے حق کے لیے لڑے تو پھر؟ کیا انپر ظلم وستم کرتے اسکا دل کچھ پسیجیگا؟۔

ایڈ :- نہیں، غریب والدین کا تو جو حشر ہوگا وہ میرے نزدیک کچھ اچھا نہیں۔

میں :- لیکن - ایڈ منیٹس، بخدا ذرا دیکھو۔کیا تم باور کرسکتے ہو کہ کسی ایک وزہ محبوبہ کی خاطر جس کا اسپر کوئی حق نہیں یہ اپنی اس ماں پر ہاتھ اٹھائیگا جو ساری عمر اس کی مونس و ہمدم اور خود اسکے وجود کے لیے ایک ضروری ہستی رہی ہی یا اس نئی آشنا کو اپنے گھر لاکر اپنی ماں کو اُس کے زیر اختیار رکھیگا۔ یا اسی طرح کسی نوجوان رعنا کی خاطر جو اسکے لیے بالکل ضروری نہیں یہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ جو اسکا سب سے پہلا اور سب سے ضروری رفیق ہی اسی قسم کا سلوک روا رکھیگا۔ ؟

ایڈ :- ہاں، میں تو سمجھتا ہوں کہ بیشک رکھیگا۔

میں :- سچ ہی۔ ایک جابر و مستبد بیٹا اپنے ماں باپ کے لیے بڑی ہی گت ہے!

ایڈ :- جی، کیا کہنا !!

میں :- اب یہ سب سے پہلے تو انکی املاک ضبط کرتا ہی۔ اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا اور جب اس کی روح پر مختلف خواہشوں کا نرغہ یوں جاری رہتا ہی جیسے چھتے پر شہد کی مکھیوں کا تو پھر کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالتا ہی یا رات میں کسی راہ چلتے کے کپڑے اُتار لیتا ہی۔ اسکے بعد عبادت گاہوں پر ہاتھ صاف کرتا ہی۔ اسی دوران میں بچپن کے جو پُرانے خیالات اسکے ذہن میں تھے اور جن کے اعتبار سے یہ نیک و بد میں تمیز کرتا تھا ان سب کو وہ نئے خیالات خارج کر دینگے جو ابھی رہا ہوئے ہیں اور اس کے عشق کے محافظ اور اس کی سلطنت کے شریک ہیں۔ ایام جمہوری میں کہ ابھی یہ اپنے باپ نیز قوانین کا پابند تھا۔ یہ خیالات صرف عالم خواب میں آزادی پاتے تھے

لیکن اب کہ یہ سلطان عشق میں ہی اسیر جیسے جاگتے واقعاً وہ کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہی جو پہلے گاہے گاہے اور وہ بھی خواب میں طاری ہوتی تھی۔ اب یہ حرام غذا کھائیگا اور ناپاک سے ناپاک قتل اور سنگین سے سنگین جرم کا مرتکب ہوجائیگا عشق گویا اسکا مستبد ہی اور اس کے اندر بے آئین و قوانین فرمانروائی کرتا ہی۔ پھر جیسے مستبد ریاست کو جدھر چاہتا ہی لیجاتا ہی، اسی طرح یہ عشق بھی کہ بادشاہ مختار ہی اسے ہر اس بُرے کام پر آمادہ کرلیتا ہی جو اُسکے اور اس کے ساتھیوں کے انبوہ کے بقاو قیام کا باعث ہو پھر چاہے یہ ساتھی کسی بُرے سلسلے سے باہر سے آئے ہوں یا جنھیں خود اس کی بد اطواری نے یہیں پیدا کیا ہو۔ کیوں، کیا یہ اسکے طرز زندگی کی تصویر نہیں؟۔

ایڈ:۔ ہاں، بیشک۔

میں۔ اگر ایسے لوگ ریاست میں تھوڑے سے ہی ہیں اور باقی دوسرے صحیح الطبع ہیں تو پھر یہ یہاں سے چلدیتے ہیں اور جاکر کسی ایسے مستبد کے محافظ خاص یا بھاڑے کے سپاہی بنجاتے ہیں جنھیں شاید جنگ کے لیے ان کی ضرورت ہی۔ اور اگر جنگ نہیں تو یہ گھر ہی پر ٹھہرتے ہیں اور شہر میں اکثر چھوٹی چھوٹی شرارتیں برپا کرتے رہتے ہیں۔

ایڈ:۔ کیسی شرارتیں؟

میں:۔ مثلاً یہ کہ یہی لوگ چور، قزاق، گرہ کٹ، اُچکے ہوتے ہیں یہی معبدوں میں ڈاکہ ڈالتے اور یہی آدمیوں کو دھوکہ سے بھگالے جاتے ہیں، یا اگر زبان فصاحت چلتی ہوئی ہی تو مخبر بنجاتے ہیں، جھوٹی شہادتیں دیتے ہیں اور خوب رشوتیں اڑاتے ہیں۔

ایڈ :۔ برائیوں کی بہت چھوٹی سی فہرست ہی اگرچہ انکے تکب تھوڑے سے ہی ہی!

میں۔ جی ہاں۔ مگر 'چھوٹا' اور 'بڑا' یہ تو اضافی الفاظ ہیں۔ اور اگر اس خرابی اور تباہی کا خیال کیجیے جو انسے ریاست پر نازل ہوتی ہی تو یہ چیزیں تو مستبد کو ہزاروں کوس نہیں پہونچتیں۔ کیونکہ جب اس مضر طبقہ اور اسکے متبعین کی تعداد بڑھتی ہی اور جمہور کی سادہ دلی کی مدد سے ان میں اپنی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہی، تو پھر یہ اپنے میں سے اس ایک کو منتخب کرتے ہیں جس کی روح میں سب سے زیادہ مستبد کی صفات موجود ہوں اور اسے یہ اپنا مستبد بناتے ہیں۔

ایڈ۔ ہاں، اور مستبد بننے کے لیے ہی یہی سب میں موزوں۔

میں :۔ اب اگر لوگ دب گئے تو بجا و درست۔ لیکن اگر انھوں نے مخالفت کی تو اسنے جیسے اپنے ماں باپ کو ٹھوک کر ابتدا کی تھی ویسے ہی اب اگر اس میں قوت ہوئی تو انہیں ٹھوکیگا اور بقول اہل کریٹ اپنے عزیز و معمر یدر یا مادر وطن کو ان کم عمر ملحقین کی ماتحتی میں رکھیگا جنھیں اسنے ان کا حکمراں اور آقا بنایا ہی۔ اس کے سارے جذبات اور خواہشات کا یہ نتیجہ ہوگا۔

ایڈ :۔ بالکل درست۔

میں :۔ جب تک ان لوگوں کو طاقت حاصل نہیں ہوتی تو خانگی زندگی میں انکی سیرت یہ ہوتی ہی کہ یہ تمامتر اپنے خوشامدیوں سے یا ایسے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں جو

ان کے ہاتھ میں ہر دم ایک آلہ بنے رہیں۔ اور اگر خود انھیں کسی سے کچھ ضرورت پڑجائے
تو اس کے سامنے سر جھکانے کو بھی اسی طرح تیار رہیں۔ انسے ہر قسم کی محبت اور تعلق
کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن جہاں مطلب نکل گیا تو گویا جانتے بھی نہ تھے۔

ایڈ :- جی صحیح ہے۔

میں :- یہ ہمیشہ یا تو آقا رہتے ہیں یا غلام کبھی کسی کے دوست نہیں ہوتے
(سچ ہے) مستبد کبھی حقیقی آزادی اور دوستی کا مزا نہیں چکھتا۔

ایڈ :- ہرگز نہیں۔

میں :- کیا ہم بجا طور پر ایسے لوگوں کو دغاباز نہیں کہہ سکتے؟

ایڈ :- اس میں کیا کلام ہے۔

میں :- اور اگر انصاف کے متعلق ہمارا تصور صحیح تھا تو یہ لوگ مطلقاً غیر منصف
بھی ہوتے ہیں۔

ایڈ :- جی ہاں، ہم لوگ بالکل صحیح تھے۔

میں :- اچھا تو اب اس بدترین انسان کی سیرت کو ایک لفظ میں یوں بیان
کریں کہ ہم نے جو خواب دیکھا تھا یہ اُسکی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ایڈ :- بالکل صحیح

میں :- اور یہ چونکہ بالطبع مستبد ہے اس لیے حکمرانی کرتا ہے اور جتنا زیادہ زندہ رہتا
ہے اتنا ہی اس کا استبداد بڑھتا جاتا ہے۔ اب جواب کی باری گلاکن کی تھی چنانچہ وہ بولے

"یہ تو یقینی امر ہے"

میں :- اور یہ انسان جس کو ہم نے سب سے زیادہ شریر ظاہر کیا ہے کیا سب سے زیادہ تباہ حال بھی نہ ہوگا۔ اور جس نے سب سے شدید اور سب سے زیادہ جبر و استبداد سے کام لیا ہے وہ گویا متواتر اور حقیقی معنوں میں تباہ حال۔ اگرچہ ممکن ہے کہ عوام الناس کی یہ رائے نہ ہو۔

گ :- جی ہاں، لازماً۔

میں :- اور کیا استبدادی آدمی کو استبدادی ریاست کی طرح اور جمہوری آدمی کو جمہوری ریاست کی طرح نہ ہونا چاہیئے اور علیٰ ہذا القیاس۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اور نیکی اور خوشحالی میں جو تعلق ریاست کو ریاست سے ہے وہی ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہے۔

گ :- بالیقین۔

میں :- پھر اگر ہم اپنے اصلی شہر کا جو ایک بادشاہ کے ماتحت تھا اس شہر سے مقابلہ کریں جو ایک مستبد کے تحت میں ہے تو باعتبار نیکی ان کی کیا نسبت ہوگی؟

گ :- یہ تو ایک دوسرے کی انتہائی ضد ہیں کیونکہ ایک اگر بہترین ہے تو دوسرا بدترین۔

میں :- اس میں تو کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی کہ کون بدترین ہے اور کون بہترین

لہذا اب فوراً یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ آیا انکی اضافی خوشحالی و بدحالی کے متعلق بھی ہم اسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں، البتہ اس معاملہ میں ہمیں مستبد کے ہبوت کو دیکھکر بہت سراسیمانہ ہونا چاہیئے کہ یہ تو ایک فرد ہو اور اسکے اردگرد شاید چند ہی متعلقین۔ بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ہم شہر کے کونے کونے میں جاکر دیکھ بھال کریں اور پھر اپنی راے دیں۔

گ :- نہایت معقول بات ہے اور میں تو صاف دیکھتا ہوں (جیسا کہ ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے) کہ استبداد حکومت کی سب سے منحوس اور بادشاہ کی حکومت سب سے خوشحال قسم ہے۔

میں :- اسی طرح انسانوں کے متعلق رائے قائم کرنے میں بھی کیا میں بجا طور پر یہی درخواست نہیں کرسکتا کہ مجھے ایک ایسا حکَم چاہیئے جس کا دماغ فطرت انسانی میں داخل ہوکر اُسے دیکھ سکتا ہو؟ وہ بچہ کی طرح نہ ہو جو صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اس شاندار و پُرشوکت دا کے مشاہدہ سے خیرہ ہوجاتا ہے جو استبدادی فطرت اپنے ناظر کے سامنے اختیار کرتی ہے بلکہ مجھے تو ایسا آدمی چاہیئے جو واضح بصیرت رکھتا ہو۔ کیا میں فرض کروں کہ یہ حکم ایک ایسا شخص ہم سب لوگوں کی موجودگی میں سُناتا ہے جو اُس پر حکم لگانے کا اہل ہے، اس شخص کے ساتھ ایک ہی مقام پر رہ چکا ہے، اس کی روزانہ زندگی کو بھی دیکھا ہے اور اسے اس ناٹک کے سے ظاہر الباس سے معرا خانگی تعلقات میں بھی جانتا ہے اور عام خطرے کے وقت بھی اس کا مشاہدہ کرچکا ہے۔ یہ شخص بتلا سکتا ہے

کہ مستبد کی خوشحالی یا بدحالی کی بمقابلہ دوسرے انسانوں کے کیا کیفیت ہی؟

گ :- جی ہاں، یہ بھی نہایت معقول تجویز ہی۔

میں :- تو کیا میں یہ سمجھ لوں کہ ہم خود ہی اسکے اہل اور تجربہ کار حَکَم ہیں اور اس سے قبل ایسے انسان سے مل چکے ہیں؟ تاکہ کوئی تو ہو جو ہمارے سوالات کا جواب دے سکے۔

گ :- ضرور۔

میں :- لیکن فرد اور ریاست کی مماثلت نہ بھولائی جائے، یہ ہر وقت پیش نظر رہے باری باری سے کبھی اس پر نظر ڈال کر کبھی اُس پر ان کی جداگانہ کیفیات بتلائیے۔

گ :- آپ کا کیا مطلب ہی؟

میں :- ریاست سے شروع کیجئے اور دیکھئے کہ جس شہر پر مستبد کی حکومت ہو اسے آپ آزاد کہیں گے یا غلام؟

گ :- کوئی شہر اس سے زیادہ کامل طور پر غلام نہیں ہوسکتا۔

میں :- لیکن پھر بھی آپ دیکھتے ہیں ایسی ریاست میں احرار بھی ہیں اور آقا بھی

گ :- جی ہاں، میں دیکھتا ہوں۔ لیکن معدودے چند۔ عام طور پر جمہور اور ان میں سے بھی بہترین نہایت درجہ ذلت اور غلامی میں ہیں۔

میں :- پھر اگر فرد ریاست کی طرح ہوتا ہی تو یہی حال یہاں ہوگا۔ اس کی روح

کمینہ پن اور بیہودگی سے پُر ہوگی، اس کی طبیعت کے بہترین عناصر غلامی کی حالت میں ہوں گے۔ ایک چھوٹا سا جزو حکمراں ہوگا اور یہی سب سے بُرا اور سب سے پاگل ہوگا

گ :- لازماً۔

میں :- اچھا پھر آپ کیا کہیں گے کہ ایسے آدمی کی روح ایک آزاد انسان کی روح ہے یا ایک غلام کی؟

گ :- میری رائے میں اس میں غلام کی روح ہے۔

میں :- اور جو ریاست مستبد کی غلامی میں ہو وہ خود کسی آزادی فعل کے قابل نہیں رہتی؟

گ :- مطلق ناقابل ہو جاتی ہے۔

میں :- اسی طرح جو روح ایک مستبد کے ماتحت ہو (میں روح کا ذکر بہ حیثیت کُل کے کر رہا ہوں) اس میں اپنے من مانے کام کے کرنے کی سب سے کم صلاحیت ہوتی ہے۔ ایک ڈانس ہوتی ہے جو اسے برابر اکساتی ہے اور یہ غریب رنج و تکلیف سے پُر رہتی ہے

گ :- یقیناً۔

میں :- اور مستبد کے تحت والا شہر مالدار رہتا ہے یا مفلس؟

گ :- مفلس۔

میں :- تو استبدادی روح کو بھی ہمیشہ مفلس و ناقابل تسکین ہونا چاہئے

گ :- درست۔

میں :- پھر کیا یہ ضروری نہیں کہ ایسی ریاست اور ایسا انسان ہمیشہ پُر از خوف رہے۔

گ :- جی ہاں، یقیناً۔

میں :- کیا اور کسی ریاست میں اس سے زیادہ نالہ و زاری آہ و بکا، رنج و الم تمھیں ملسکیگا؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اور کیا کسی اور انسان میں تمہیں مستبد سے زیادہ اس قسم کی مصیبت ملیگی۔ یہ مستبد جس پر جذبات اور خواہشات کی ایک بدحواسی سی طاری ہے؟

گ :- ناممکن۔

میں :- ان اور ان جیسی دوسری برائیوں کا خیال کر کے ہی تو آپنے استبدادی ریاست کو سب سے بدحال ریاست قرار دیا تھا؟

گ :- جی ہاں، اور ٹھیک قرار دیا تھا۔

میں :- بیشک، اور جب یہی سب خرابیاں آپ استبدادی آدمی میں دیکھیں تو اسکے متعلق کیا کہیں گے؟

گ :- یہ کہ وہ ساری دنیا میں سب سے زیادہ بدحال و گرفتار مصیبت انسان ہے۔

میں :- میرا خیال ہے کہ بس یہیں آپ نے غلطی شروع کی۔

گ :- کیا مطلب؟

میں :- میری رائے میں یہ ابھی بدحالی و مصیبت کی حد آخر تک نہیں پہنچا ہو
گ :- کیوں؟ اور اس سے زیادہ بدحال و مصیبت زدہ کون ہو؟
میں :- وہ جسکا ذکر میں ابھی کرتا ہوں۔
گ :- وہ کون؟
میں :- وہ شخص جو بالطبع استبدادی ہو، اور بجائے اسکے کہ اپنی شخصی زندگی اپنے طور پر گزارے اسپر شومی قسمت سے جبر و استبداد عام کا عذاب نازل ہوا ہو۔
گ :- ہم لوگ پہلے جو کچھ کہہ چکے ہیں اُسکی رو سے تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا خیال صحیح ہے۔
میں :- ہاں، لیکن اس اعلیٰ بحث میں آپ کو صرف قیاس پر قناعت نکرنی چاہئے بلکہ اچھا ہو کہ آپ کو ذرا زیادہ تیقن ہو، کیونکہ سارے سوالوں میں یہ خیر و شر والا سوال سب سے بڑا ہو اور سب سے اہم۔
گ :- بہت درست۔
میں :- اچھا تو میں ایک مثال دوں جو میں سمجھتا ہوں اس مضمون پر روشنی ڈالے گی۔
گ :- فرمائیے۔ کیا مثال ہو؟
میں :- شہروں میں بہت سے غلام رکھنے والے مالدار افراد کا جو حال ہوتا ہے اس سے آپ مستبد کی کیفیت کا ایک تصور قائم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ غلام تو دونوں

کے پاس ہوتے ہیں، فرق صرف اتنا ہی کہ مؤخرالذکر کے پاس زیادہ ہوتے ہیں۔

گ :- جی، بس یہی فرق ہے۔

میں :- آپ جانتے ہونگے کہ یہ لوگ نہایت اطمینان سے رہتے ہیں اور اپنے نوکروں سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں رکھتے؟

گ :- کیوں، اندیشہ یا ڈر کا ہیکا؟

میں :- کسی کا نہیں۔ لیکن آپ نے اس کی وجہ بھی ملاحظہ کی؟

گ :- ہاں، وجہ یہ ہی سارا کا سارا شہر ہر فرد واحد کی حفاظت کیلئے متحد ہے۔

میں :- بہت صحیح۔ لیکن ذرا فرض کیجیے کہ ان میں سے ایک مالک کو جو کیئے پچاس غلاموں کا آقا ہے کوئی دیوتا مع اسکے خاندان، املاک اور غلاموں کے اڑا کر جنگل میں لے گیا جہاں اسکی مدد کے لیے ایک بھی آزاد انسان نہیں تو ایسی حالتیں کیا اسے نہایت شدت سے یہ خوف نہ ہوگا کہ کہیں اس کے غلام اسکے بیوی بچوں کو مار نہ ڈالیں؟ -

گ :- جی ہاں، بیشک، یہ نہایت درجہ خائف ہوگا۔

میں :- اب وہ وقت آن پہونچا ہے کہ یہ اپنے غلاموں کی خوشامد کرنے پر مجبور ہوگا اور انسے آزادی اور دوسری چیزوں کے بہت سے وعدے کریگا، اور اپنی مرضی کے خلاف اسے اپنے غلاموں کی ناز برداری کرنی ہوگی۔

گ :- جی ہاں، اس کے پاس اپنے بچانے کا اب بس یہی تو ایک طریقہ ہے۔

میں :- پھر فرض کردیں دیوتا جو اسے لے گیا ہے اس کے چاروں طرف ایسے ہمسایے پیدا کر دے جنھیں یہ بات گوارا نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کا آقا ہو، اور اگر کوئی اس جرم کا مرتکب ہو اور یہ اُسے پکڑ پائیں تو جان ہی لے لیں۔

گ :- اب تو اس کی حالت اور بھی خراب ہو جائیگی، کیونکہ آپ فرض کرتے ہیں کہ یہ ہر طرف دشمنوں سے محصور ہے اور یہ اسیر ہر دم پہرہ چوکی رکھتے ہیں۔

میں :- تو کیا یہی وہ زندان نہیں جس میں مستبد مقید ہوگا۔ کیونکہ اس کی طبیعت کا حال تو وہ ہے جو ہم بیان کر چکے یعنی طرح طرح کے اندیشوں اور خواہشوں سے لبریز۔ اس کی روح بہت نازک اور نہایت حریص ہے، لیکن سارے شہر میں بس یہی ایک شخص ہے جو نہ کبھی سفر کر سکتا ہے نہ وہ چیزیں دیکھ سکتا ہے جو آزاد انسان دیکھنا چاہتے ہیں، یہ اپنے بل میں لیے رہتا ہے جیسے عورتیں اپنے مکانوں میں چھپی رہتی ہیں اور ہر اُس شہری سے جلتا ہے جو خارجی ممالک میں جا کر کوئی دلچسپ چیز دیکھے۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- یہ آدمی جس کی اپنی ذات بہت بُری طرح محکوم ہے، یہ استبدادی جسے آپ نے ابھی سب سے بدحال انسان کہنے کا فیصلہ کیا ہے کیا اس وقت اور بھی زیادہ بدحال نہ ہوگا جب بجائے اسکے کہ یہ اپنی شخصی زندگی گذارے قسمت سے اسیر مجبور ہوتا ہے کہ ایک مستبد حاکم بنے ؟ اسے دوسروں کا آقا بننا پڑتا ہے جب کہ یہ خود اپنا آقا نہیں اس کی مثال ایک مریض یا مفلوج انسان کی سی ہے جو بجائے گوشۂ عزلت میں اپنی

زندگی کے دن کاٹنے کے لئے اسپر مجبور کیا جاتا ہی کہ اسے دوسرے انسانوں سے لڑائی اور معرکہ آرائی میں گذارے۔

گ:- جی ہاں، یہ تمثیل نہایت صحیح ہی۔

میں:- کیا اس کی حالت حد درجہ مصیبت ناک نہیں؟ کیا یہ اصلی مستبد اس شخص سے بھی بدتر زندگی نہیں گذارتا جس کی زندگی کو آپ نے بدترین قرار دیا تھا؟

گ:- بیشک۔

میں:- لوگ جو چاہیں سمجھیں سچ یہ ہی کہ جو حقیقی مستبد ہی وہی حقیقی غلام ہی اسی کو سب سے زیادہ لجاجت اور غلامانہ باتیں کرنی پڑتی ہیں اور اسی کو بُرے سے بُرے انسانوں کی خوشامد کرنا پڑتی ہی۔ اسکے دل میں آرزوئیں ہیں جنھیں کبھی پورا نہیں کرسکتا، اسکے احتیاجات اور سبھوں سے زیادہ ہیں، چنانچہ اگر آپ اس کی ساری روح کو دیکھ سکیں تو یہ حقیقی معنوں میں نادار ہی۔ اپنی مماثل ریاست کی طرح یہ ساری عمر خوف زدہ رہتا ہی اور اس کی زندگی درد والم، تشنج و انتشار کا ایک مجموعہ ہی۔ سچ ہی ایک ریاست اور فرد کی یہ مماثلت بالکل پوری اترتی ہی۔

گ:- نہایت سچ۔

میں:- اسپر طرہ یہ کہ جیسا ہم ابھی کہہ رہے تھے قوت و اقتدار کے باعث یہ اور بھی بدتر ہوجاتا ہی۔ یہ لازماً پہلے سے زیادہ حاسد، زیادہ بے وفا، زیادہ غیر منصف،

زیادہ بے یار اور زیادہ بد دیانت ہوجاتا ہے۔ یہ ہر قسم کا عیب پالتا ہے اور ہر نوع کی برائی کا حامل ہے۔ نیتجہ یہ کہ خود غایت درجہ بدحال ہے اور ہر ایک کو اپنی طرح بد حال بناتا ہے۔

گ :- کوئی معقول آدمی آپ کے الفاظ کی صحت سے انکار نہیں کرسکتا۔

میں :- اچھا تو آئیے جس طرح ناٹکوں کے مقابلہ میں ایک عام حکم نتیجہ کا اعلان کرتا ہے اسی طرح آپ بھی فیصلہ کیجیے کہ آپ کی رائے میں خوشحالی کے اعتبار سے کون سب سے اول ہے، کون دوم، اور پھر اسکے بعد دوسرے کس ترتیب سے آتے ہیں۔ یہ سب کل پانچ ہیں یعنی حکومت شاہی، حکومت اغنیا، حکومت خواص، حکومت جمہوری اور حکومت استبدادی۔

گ :- اس کا فیصلہ تو نہایت سہل ہے۔ یہ گویا میرے سامنے اس طرح آئینگے جیسے باہم ملکر گانے والے اسٹیج پر آتے ہیں اور پھر جیسے جیسے یہ آتے جائیں، میں خیر و شر، نیکی و بدی، خوشحالی و بدحالی کے معیار سے انپر حکم لگاتا جاؤں۔

میں :- کیا اس کی ضرورت ہے کہ کوئی نقیب کرایہ پر بلائیں، یا میں ہی اعلان کردوں کہ ابن ارسطن (بہترین) نے فیصلہ کردیا ہے کہ جو سب سے اچھا اور سب سے عادل ہے وہی سب سے زیادہ خوشحال بھی ہے اور یہ وہ سب سے زیادہ شاہی انسان ہے جو خود اپنی ذات کا بادشاہ ہے۔ اور جو سب سے برا اور سب سے غیر منصف ہے وہی سب سے زیادہ بدحال بھی ہے اور یہ وہ ہے جو اپنی ذات کا سب سے بڑا جابر و مستبد ہے اور اسلیئے ریاست کا

سب سے بڑا جابر و مستبد۔

گ :- ہاں، آپ ہی اعلان کر دیجئے۔

میں :- اسمیں میں ان الفاظ کا اور اضافہ کر دوں کہ "چاہے دیوتا اور انسان اسے دیکھیں یا نہ دیکھیں"؟

گ :- جی ہاں، کر دیجئے۔

میں :- اچھا تو یہ تو ہمارا پہلا ثبوت ہی، اسکے علاوہ ایک اور بھی ہی، ممکن ہی یہ کچھ وزن رکھے۔

گ :- وہ کیا؟

میں :- دوسرا ثبوت ماہیت روح سے مستنبط ہوتا ہی۔ یاد ہوگا کہ ریاست کی طرح ہم نے انفرادی روح کو بھی تین اصولوں میں تقسیم کیا ہی، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس تقسیم سے بھی اس بارہ میں ایک مظاہرہ فراہم ہو سکتا ہی۔

گ :- کس قسم کا مظاہرہ؟

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ ان تین اصولوں کے مطابق تین مسرتیں ہوتی ہیں نیز تین خواہشیں اور تین حکمراں طاقتیں۔

گ :- کیسے؟ کیا مطلب؟

میں :- ایک اصول تو وہ ہی جس سے بقول خود ہمارے انسان سیکھتا ہی، دوسرا وہ ہی جس سے وہ غصہ کرتا ہی، تیسرے کی چونکہ بہت سی شکلیں ہیں اس لیئے

اس کا کوئی خاص نام نہیں البتہ اسے اشتہائیہ کی عام اصطلاح سے اس لیے ظاہر کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی خواہشوں نیز دیگر شہوات نفسانی کو نہایت غیر معمولی قوت و شدت حاصل ہے اور یہی اس کے خاص عناصر ہیں حُبِّ زر بھی اس میں شامل ہے کیونکہ ایسی خواہشیں عموماً روپیہ کی مدد ہی سے پوری ہوتی ہیں۔

گ:۔ بجا ہے۔

میں:۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس تیسری قسم کی محبتیں و مسرتیں تمامتر نفع سے وابستہ ہیں تو ہم ان سب کو ایک واحد تصوّر کے تحت میں لے آئیں گے اور بجا طور پر کہہ سکیں گے کہ روح کا یہ جزو طالب نفع اور عاشق زر ہے اور یہ بات قابل فہم بھی ہوگی۔

گ:۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔

میں:۔ اسی طرح جذباتی عنصر کیا تمامتر حکمرانی، وفتحمندی، اور حصول شہرت میں مشغول نہیں رہتا؟

گ:۔ بجا۔

میں:۔ فرض کرو ہم اسے مسابق یا حوصلہ مند اصول کہیں، تو کیا یہ مناسب نام نہ ہوگا؟

گ:۔ نہایت مناسب۔

میں:۔ برخلاف اس کے ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اصول علم تمامتر حقیقت

صداقت کیطرف متوجہ رہتا ہی اور نفع یا شہرت کے لیے ہر دو سابقہ اصولوں سے کم خیال رکھتا ہی۔

گ :- بہت کم۔

میں :- روح کے اس حصّہ کو ہم بجا طور پر "عاشق علم" و "محب دانش" کا لقب دے سکتے ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- ایک طبقہ کے لوگوں کی روح میں ایک اُصول ساری ہوتا ہی اور دوسرے طبقہ میں دوسرا اور یونہیں۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- اچھا تو ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ انسانوں کے تین گروہ ہوتے ہیں: عقل و دانش کے عاشق، عزت کے عاشق اور نفع کے عاشق۔

گ :- صحیح۔

میں :- اور تین ہی قسم کی مسرتیں ہوتی ہیں جو ان میں سے ایک ایک کا مقصودِ خارجی ہوتی ہیں۔

گ :- بہت بجا

میں :- اب اگر آپ ان تینوں طبقوں کے آدمیوں سے ملیں اور پوچھیں کہ کس کی زندگی سب سے زیادہ پر مسرت ہی، تو ہر ایک اپنی زندگی کی تعریف اور دوسروں کی

تنقیص کریگا۔ محبِ زر سونے چاندی کے ٹھوس فائدہ سے عزت و علم کا مقابلہ کر کے کہیگا کہ اگر ان سے روپیہ نہ حاصل ہو تو یہ بالکل ہیچ ہیں۔

گ :- یہ سچ ہے۔

میں :- اور جو عزت کا دلدادہ ہو بھلا اس کی کیا رائے ہوگی؟ کیا یہ مال و دولت کی محبت کو نہایت رکیک نہ تصور کریگا اور حبِ علم کو اگر اس کے ہمرکاب عزت و امتیاز نہ ہو تو اپنے لیے محض ایک غبار اور بے معنی چیز؟

گ :- بہت درست۔

میں :- اب رہا فلسفی تو کیا یہ علمِ حقیقت کی مسرت کے مقابلہ میں دوسری مسرتوں کی کچھ قدر کریگا۔ یہ تو ہر دم اسی دھن میں مشغول اور ہر آن کچھ نہ کچھ سیکھنے میں مصروف رہیگا اور پھر بھی آسمان مسرت سے کیا کچھ بہت دور ہوگا؟ یہ شاید دوسری مسرتوں کو ضروری خیال کریگا کیونکہ اگر یہ ضروری نہ ہوتیں تو پھر یہ ان سے سروکار ہی کیوں رکھتا؟

گ :- اسمیں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

میں :- اب چونکہ مابہ النزاع معاملہ مختلف طبقوں کی مسرتیں اور انکی زندگیاں ہیں۔ اور سوال یہ ہو نہیں کہ کون زندگی زیادہ قابلِ عزت ہے اور کون کم، نہ سوال یہ ہے کہ کون بہتر ہے اور کون بدتر، بلکہ چونکہ سوال یہ ہو کہ کونسی زندگی خط و مسرت سے زیادہ پُر اور کربِ الم سے زیادہ بری ہے، اس لیے ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ ان میں سے کونسا

گر وہ سچ کہہ رہا ہے؟

گ :- میں تو خود نہیں بتا سکتا۔

میں :- لیکن آخر کوئی معیار تو ہونا چاہیئے اور وہ کیا ہو؟ کیا تجربہ دانش و عقل سے بھی بہتر کوئی معیار ہے؟

گ :- اس سے بہتر بھلا اور کون معیار ہو سکتا ہے؟

میں :- اچھا تو ذرا غور کرو۔ ہم نے جو مسرتیں گنوائی تھیں ان سب کا سب سے زیادہ تجربہ ان تین افراد میں سے کس کو حاصل ہے؟ کیا نفع کے دلدادہ کو صداقت حقیقی کی ماہیت کے سیکھنے میں مسرت علم کا اس سے زیادہ تجربہ ہے جتنا کہ فلسفی کو مسرت نفع کا؟

گ :- اس معاملہ میں تو فلسفی بڑے فائدہ میں ہے۔ کیونکہ یہ تو لازمی طور پر بچپن سے تمام دوسری مسرتوں کے مزے سے واقف ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ طالب نفع کی زبان اپنے سارے تجربہ میں کبھی صداقت کا علم اور سیکھنے کی حلاوت سے لذت آشنا ہوئی ہو۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ یہ اگر چاہتا بھی تو مشکل ہی سے اسے چکھ سکتا۔

میں :- لہٰذا محب دانش کو طالب نفع پر بڑی فضیلت ہے، کیونکہ اسے دہ چند تجربہ حاصل ہے۔

گ :- بیشک یہ بڑی فضیلت ہے۔

میں :- پھر کیا اسے مسرت عزت کا زیادہ تجربہ ہے یا عزت کے دلدادہ کو مسرت

علم و دانش کا؟

گ :۔ نہیں۔ عزت تو تینوں کی اسی نسبت سے ہوتی ہی جس نسبت سے یہ اپنا اپنا مقصد حاصل کریں۔ مالدار، بہادر، اور عقلمند تینوں کے لیے مداحوں کا ایک مجمع ہوتا ہی، اور چوں کہ سب کی عزت ہوتی ہی اسلیے سب کو عزت کی مسرت کا تجربہ ہوتا ہی۔ لیکن وجود حقیقی کے علم میں جو مسرت ہی اُس سے صرف فلسفی ہی آشنا ہوتا ہے۔

میں :۔ اپنے اس تجربہ کے باعث اُسمیں سب سے بہتر فیصلہ کی قابلیت ہوگی۔

گ :۔ کہیں بہتر۔

میں :۔ اور یہی تو ایک ہی جسمیں علم و دانش بھی ہی اور تجربہ بھی۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ مزید براں وہ قوت اور صلاحیت جو فیصلہ کا آلہ ہی، لالچی اور حوصلہ مند آدمی میں تو وہ نہیں ہوتی، یہ تو صرف فلسفی میں ہوتی ہی۔

گ :۔ کون صلاحیت؟

میں :۔ عقل، کیونکہ، جیسے کہ ہم کہہ چکے ہیں فیصلہ اسی کے ہاتھ رہنا چاہیئے۔

گ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ اور تعقل اسکا مخصوص آلہ ہی۔

گ :۔ بیشک۔

میں :- اگر دولت اور نفع معیار ہوتے تو بیشک طالب نفع کی تعریف یا تنقیص سب سے زیادہ قابل اعتماد مانی جاتی؟

گ :- یقیناً

میں :- اور اگر عزت، جرأت، یا فتحمندی معیار ہوتے تو حوصلہ مند اور فاتح کا فیصلہ سب سے سچا ہوتا -؟

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- لیکن چونکہ حکَم تجربہ، عقل و دانش ہیں......

گ :- اس لیے یہی ایک استنباط ممکن ہے کہ جن مسرتوں کو عقل و دانش کا عاشق پسند کرے وہی سچی مسرتیں ہیں۔

میں :- چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہونچے کہ روح کے جزو فہیم و دانا کی خوشی تینوں میں سب سے زیادہ پُرمسرت ہے اور ہم میں سے جسمیں یہ اُصول حکمراں ہو اُسی کی زندگی سب سے پرحظ و خوش آیند۔

گ :- اس میں کیا کلام ہے۔ دانشمند انسان جب اپنی زندگی کو پسند کرتا ہے تو اسے نہایت اعتماد سے کہتا بھی ہے۔

میں :- پھر اس کے بعد کونسی زندگی اچھی ہے اور کونسی مسرت؟ اسکے متعلق ہمارے حکَم صاحب کیا کہتے ہیں؟

گ :- ظاہر ہے کہ اس کے بعد سپاہی اور دلدادۂ عزت کی زندگی ہے کہ یہ بمقابلہ

طالب نفع کے اس سے قریب تر ہو۔

میں :- اور سب سے آخر میں طالب نفع؟

گ :- ہاں، اور کیا۔

میں :- اچھا تو تم نے دیکھا عادل آدمی نے غیر منصف کو پیہم دو مرتبہ پچھاڑا، اب تیسرا امتحان آتا ہے اور یہ اولمپیا کے دیوتا زیوس شافع کے نام سے منسوب ہے، کوئی مرد دانا آہستہ سے میرے کان میں کہتا ہے کہ سوائے عقلمند کی مسرت کے اور کوئی مسرت بالکل سچی اور خالص نہیں، اور باقی سب صرف سایہ ہیں مجھے یقین ہے کہ ابھی یہ شکست سب سے بڑی اور فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

گ :- ہاں سب سے بڑی تو ہوگی، لیکن ذرا اپنا مفہوم تو واضح کیجئے؟

میں :- میں اس مسئلہ کو حل کرتا ہوں، تم میرے سوالوں کا جواب دیتے جاؤ۔

گ :- اچھا، چلیے۔

میں :- کہئے مسرت الم کی مخالف ہے یا نہیں؟

گ :- ہے۔

میں :- اور ایک سکون کی کیفیت ہوتی ہے جو مسرت ہے نہ الم۔

گ :- جی، ہوتی ہے۔

میں :- گویا درمیانی حالت ہوتی ہے، اور ان دونوں کے قریب قریب روح کا آرام اور سہارا، کیوں تمہارا یہی مطلب تو ہے؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- تمھیں خیال ہے کہ لوگ بیماری میں کیسی باتیں کرتے ہیں؟

گ :- کیوں، کیا کہتے ہیں؟

میں :- کہ کچھ ہو صحت و تندرستی سے زیادہ اور کوئی چیز مسرت بخش نہیں۔ لیکن بیمار ہوے تک انھیں کبھی یہ خبر نہ تھی کہ صحت سب سے بڑی مسرت ہے۔

گ :- جی ہاں۔ یہ تو میں جانتا ہوں۔

میں :- اور جب لوگ کسی شدید کرب میں مبتلا ہوتے ہیں تو تم نے انھیں کہتے سُنا ہوگا کہ کرب سے بچنے سے بڑھ کر کوئی حظ نہیں؟

گ :- جی، سُنا ہے۔

میں :- اسی طرح تکلیف کی بہت سی قسمیں ہیں جنمیں یہ لوگ کسی مثبت تفریح کو نہیں بلکہ محض کرب کے بند ہونے کو سب سے بڑا حظ تبلاتے ہیں۔؟

گ :- جی ہاں۔ فی الوقت تو یہ اس رہائی اور آرام ہی پر قانع ہوجاتے ہیں۔

میں :- پھر جب مسرت و حظ رُک جاے تو یہ رُکاوٹ کرب دہ ہوگی۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- چنانچہ سکون کی درمیانی حالت حظ و مسرت بھی ہوگی اور کرب و الم بھی۔

گ :- معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں :- لیکن کیا یہ ہوسکتا ہے کہ جو دونوں میں سے کچھ نہیں (یعنی نہ حظ ہو

نہ کرب) وہ دونوں ہو جائے۔

گ :- میں تو کہوں گا کہ نہیں ہو سکتا۔

میں :- اور حظ و کرب، مسرت و الم دونوں روح کی حرکتیں ہیں۔ کیوں ہے نا؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور جو نہ حظ ہے نہ کرب اسے ابھی ابھی ہم نے سکون قرار دیا تھا نہ کہ حرکت اور ہم نے کہا تھا کہ یہ دونوں کے درمیانی ایک کیفیت ہے۔

گ :- جی۔

میں :- تو پھر یہ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے کہ ہم عدم کرب کو حظ اور عدم حظ کو کرب سمجھیں۔

گ :- ناممکن۔

میں :- لہٰذا یہ سب کچھ محض ظاہر ہے حقیقت نہیں۔ یعنی سکون ایک لمحہ کے لیے کرب کے مقابلہ میں حظ اور حظ کے مقابلہ میں کرب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ان تمام مظاہر کو مسرت حقیقی کی کسوٹی پر جانچو تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت نہیں، بس ایک طرح کا دھوکا ہے۔

گ :- نتیجہ تو یہی نکلتا معلوم ہوتا ہے۔

میں :- اب ذرا دوسری قسم کی مسرتوں کو دیکھو جن سے قبل کوئی کرب نہیں ہوتا۔ اب آپ یہ فرض نہیں کر سکتے کہ حظ کرب کے رک جانے اور کرب حظ کے بند

ہوجانے کا نام ہے۔

گ :- یہ کونسی مسرتیں ہیں اور کہاں ملتی ہیں ؟

میں :- ایسی تو بہت سی مسرتیں ہیں مثال کے طور پر شامہ کے حظ نے لو کہ یہ نہایت عمدہ ہوتے ہیں اور ان سے قبل کوئی کرب نہیں ہوتا۔ یہ آن کی آن میں آتے ہیں اور جب جاتے ہیں تو کوئی کرب چھوڑ کر نہیں جاتے۔

گ :- بہت درست۔

میں :- چنانچہ ہمیں یہ باور نہ کرنا چاہیئے کہ خالص حظ کرب کا بند ہوجانا اور خالص کرب مسرت کا بند ہوجانا ہے۔

گ :- نہیں۔

میں :- مگر پھر بھی اکثر اور عموماً شدید مسرتیں جو روح کو جسم کی وساطت سے پہونچتی ہیں وہ اسی قبیل کی ہوتی ہیں، یعنی کرب سے رستگاری۔

گ :- یہ تو سچ ہے۔

میں :- اور آنے والے حظ و کرب کی توقع کی بھی یہی کیفیت ہوگی ؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- کیا ان کی کچھ مثالیں دوں ؟

گ :- فرمائیے۔

میں :- یہ تو آپ مانیں گے کہ فطرت میں ایک اعلیٰ ایک ادنیٰ اور ایک درمیانی

طبقہ ہوتا ہی؟

گ :- جی، مانتا ہوں۔

میں :- ایک شخص اگر ادنیٰ سے درمیانی طبقہ کی طرف جاے تو کیا وہ یہ خیال نہ کریگا کہ وہ اوپر جارہا ہی، اسی طرح جو شخص درمیانی طبقہ میں کھڑا اسے نیچے سے آتا دیکھتا ہی اور اسنے حقیقی طبقۂ اعلیٰ کو کبھی دیکھا نہیں تو وہ اپنے متعلق سمجھیگا کہ پہلے سے ہی طبقہ اعلیٰ میں ہی۔

گ :- یقیناً۔ اسکے سوا اور سمجھ ہی کیسے سکتا ہی؟

میں :- لیکن اس کو پھر واپس لیجائیں تو یہ خیال کریگا اور بجا طور پر خیال کریگا کہ اب یہ نیچے اُتر رہا ہی۔

گ :- بلا شبہ۔

میں :- یہ سب کچھ غلط فہمی حقیقی اعلیٰ، ادنیٰ اور متوسط درجہ سے ناواقفیت کے باعث پیدا ہوتی ہی۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- تو پھر اس میں بھی کونسے بڑے تعجب کی بات ہی کہ جن لوگوں کو صداقت کا تجربہ نہیں ہوتا وہ جہاں اور بہت سی چیزوں کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہیں وہاں حظ و کرب اور انکے درمیانی کیفیت کے متعلق بھی غلط تصورات کو ذہن نشین کریں۔ چنانچہ جیسا یہ کرب کی طرف محض کھنچ ہی رہے ہوں تو انھیں کرب محسوس ہوتے

لگے اور یہ اسے حقیقی کرب تصور کریں، اسی طرح جب کرب سے درمیانی کیفیت کیطرف جارہے ہوں تو یقین واثق ہوجائے کہ بس اب مسرّت و تسکین کے منتہا کو پہنچ گئے یہ غریب چونکہ مسرّت و حظ سے واقف نہیں لہذا غلطی سے کرب کا عدم کرب سے موازنہ کرتے ہیں اور اس کی مثال بالکل ایسی ہی کہ سیاہ کا موازنہ سفید سے کرنے کے بجائے اپنے بھورے سے کرنے لگیں۔ کیوں، فرمایئے اگر ایسا ہو تو کونسی ایسی تعجب کی بات ہے؟

گ :۔ ذرا تعجب کی بات نہیں، میں تو اس وقت زیادہ متعجب ہوتا کہ صورت حال اس کے مخالف ہوتی۔

میں :۔ اس معاملہ پر یوں نظر ڈالو۔ بھوک، پیاس وغیرہ جسم کی تکان پژمردگی سے عبارت ہیں؟

گ :۔ جی۔

میں :۔ اور جہل و حماقت روح کی پژمردگی ہے؟

گ :۔ درُست۔

میں :۔ اور ان کے مقابل وجہ تسکین، کھانا پینا اور عقل و دانش ہیں۔

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ اور کونسی تسکین زیادہ سچی ہی، وہ جو ایسی چیز سے پیدا ہو جسکی ہستی کم ہی یا اس سے جس کی ہستی زیادہ ہو؟

گ :۔ ظاہر ہی، اس سے جس کی ہستی زیادہ ہو۔

میں :- تمہارے خیال میں وجود حقیقی کا زیادہ حصہ کن چیزوں کو ملا ہے، کھانے پینے، مصالحہ، اور دوسری کھانے پینے کی چیزوں کو یا ان کو جنہیں رائے صادقہ، علم، ذہن اور ہر قسم کی نیکیاں شامل ہیں؟ بلکہ اس سوال کو یوں پیش کرو، کہ کس کا وجود زیادہ خالص ہے، اس کا جو غیر متبدل، غیر فانی اور صداقت سے متعلق ہے اور بالطبع ایسا ہے اور ایسی طبائع میں پایا جاتا ہے یا اس کا جسے متغیر و فانی سے تعلق ہے اور اسی میں پایا بھی جاتا ہے اور پھر خود بھی متغیر اور فانی ہے؟

گ :- اس کا وجود کہیں زیادہ خالص ہے جسے غیر متغیر سے تعلق ہو۔

میں :- اور غیر متغیر جس درجہ اصلیت و حقیقت اپنے اندر رکھتا ہے اسی حد تک علم سے حصہ پاتا ہے؟

گ :- جی ہاں، اسی درجہ کا علم رکھتا ہے۔

میں :- اور اسی درجہ کی صداقت؟

گ :- جی۔

میں :- یا اس کے برعکس یوں کہو کہ جس چیز میں صداقت کم ہوگی اس میں اصلیت اور حقیقت بھی کم ہوگی؟

گ :- لازماً

میں :- گویا عام طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو چیزیں جسم کی خدمت گذار ہوتی ہیں ان میں صداقت و اصلیت کم ہوتی ہے اور ان میں زیادہ ہوتی ہے جو روح

کی خادم ہیں۔

گ :۔ جی ہاں۔

میں :۔ اور کیا خود جسم میں روح سے کم صداقت و صلیت نہیں ہوتی؟

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ جو چیز زیادہ حقیقی وجود سے پُر ہو اور واقعاً زیادہ حقیقی ہستی رکھتی ہو وہ اس سے زیادہ حقیقی معنوں میں پُر ہے جو کم حقیقی وجود سے بھری ہو اور خود بھی کم حقیقی ہو۔

گ :۔ بلاشبہ۔

میں :۔ اور اگر اس چیز سے پُر ہونے میں واقعی کوئی مسرّت ہے جو مطابق فطرت ہو تو پھر جو زیادہ حقیقی وجود سے زیادہ حقیقی طور پر لبریز ہوگا وہی زیادہ حقیقی اور سچے معنی میں مسرّت صادقہ سے لطف اندوز بھی ہوگا، اور اس کے برخلاف جسے کم حقیقی وجود سے حصہ ملا ہوگا وہ سچّی اور یقینی معنوں میں مطمئن بھی کم ہی ہوگا، اور ایک کم حقیقی اور فریب دہ مسرّت کا حصّہ دار۔

گ :۔ اس میں کیا کلام ہے۔

میں :۔ چنانچہ جو لوگ عقل اور نیکی سے ناآشنا ہیں اور ہمہ وقت زبان کے چٹخارے اور شہوات نفسانی کی تسکین میں مشغول، وہ بس درمیانی درجہ تک ہی اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں اور ساری عمر اسی علاقہ میں ادھر اُدھر سرگشت

کیا کرتے ہیں اور حقیقی عالم بالا میں بیچاروں کا گذر ہی نہیں ہوتا۔ نہ تو خود یہ اُدھر آنکھ اُٹھا کر دیکھتے ہیں نہ وہاں کی راہ کا انھیں پتہ چلتا ہے نہ یہ واقعاً وجود حقیقی سے پُر ہوتے ہیں اور نہ خالص اور دائمی مسرّت سے انکے کام و دہن لذت یاب۔ ان کی مثال بس مویشیوں کے ایک گلہ کی سی ہے کہ آنکھیں نیچی کیئے اور سرزمین کیطرف یعنی اپنے دسترخوان کی طرف جھکائے ہیں کہ کھا کھا کر پھول رہے ہیں اور اپنی پود بڑھا رہے ہیں۔ پھر ان مسرّتوں سے انتہائی عشق کے باعث اپنے آہنی سینگوں اور کھروں سے ایک دوسرے کو ٹکّریں اور لاتیں مارتے ہیں اور غیر تسکین پذیر خواہش کی خاطر ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ اپنے کو ایک غیر حقیقی شئے سے پُر کر لیتے ہیں۔ لہذا انکا وہ حصہ بھی جسے یہ پُر کرتے ہیں غیر حقیقی بے قابو اور بے لگام ہو جاتا ہے۔

گ:۔ جناب سقراط، سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ان عوام کی زندگی کا نقشہ ایسا اُتارا جیسے کوئی کاہن بول رہا ہو۔

میں:۔ ان کی مسرّتیں آلام سے مملو ہوتی ہیں اور بھلا ایسا نہ ہو تو کیا ہو کیونکہ یہ تو صداقت کی محض تصویریں اور اس کا سایہ ہیں؛ پھر انپر رنگ کیا گیا ہے تضاد سے جو روشنی اور سایہ دونوں میں مبالغہ پیدا کرتا ہے اور اس طرح یہ ان احمقوں کے دماغ میں اپنی مجنونانہ آرزو پیوستہ کر دیتی ہیں۔ اور پھر ان کے لیے یہ لوگ یوں ہی لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے بقول استیسی کورس یونانی ٹرائے میں صداقت سے بیخبر

هیلن کے سایہ کے لیے جنگ آزمائی کر رہے تھے۔

گ۔ ایسی کوئی نہ کوئی بات تو لازمی ہونی چاہیئے؟

میں :۔ اور کیا یہی معاملہ روح کے جذباتی عنصر کے ساتھ بھی پیش نہ آئیگا؟ کیا ایک جذباتی آدمی کی بھی یہی کیفیت نہ ہوگی، جب وہ اپنے جذبہ کو مبدل بہ عمل کرنا چاہیگا، پھر اس میں چاہے وہ حاسد اور لالچی ہو، یا متشدد اور جھگڑالو، غصہ اور غضب سے پُر ہو یا اپنے حال سے بیزار، صرف اتنا کافی ہے کہ وہ بلا عقل و ہوش عزت و فتحمندی کے حصول اور اپنا غصہ اُتارنے کی فکر میں ہو۔

گ :۔ جی ہاں۔ جذباتی عنصر کو بھی یہی پیش آئیگا۔

میں :۔ تو کیا ہم بہ اعتماد یہ نہیں کہہ سکتے کہ دولت و عزت کے چاہنے والے جب اپنی مسرتوں کو عقل و علم کی رہنمائی میں اور ان کے دوش بدوش حاصل کرتے ہیں اور انھیں مسرتوں کے طلب و حصول میں کوشاں ہوتے ہیں جو عقل انھیں بتلاتی ہے تو انھیں اس حقیقی مسرت کے اعلےٰ ترین مدارج نصیب ہوتے ہیں جو ان کے لیے قابل حصول ہے وجہ یہ کہ یہ حقیقت و صداقت کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اگر ہر انسان کے لیے جو کچھ بہترین ہے وہی سب سے زیادہ مطابق فطرت بھی ہے تو انھیں وہ مسرتیں نصیب ہوں گی جو انکی فطرت کے عین مطابق ہیں۔

گ :۔ جی۔ یقیناً۔ جو بہترین ہے وہ مطابق ترین فطرت بھی ہے۔

میں :۔ اور جب ساری کی ساری روح فلسفیانہ اُصول کی تابع ہو، اس میں

کوئی تقسیم و مناقشہ نہو، اسکے اجزا ترکیبی سب پابند عدل اور اپنے اپنے کام میں مشغول ہوں، ہر ایک اپنی جگہ پر بہترین و صادق ترین مسرتوں سے شاد کام ہو جسکی اسمیں صلاحیت ہی؟

گ :- جی بجا۔

میں :- لیکن جہاں دوسرے دو اُصولوں میں سے کسی کا غلبہ ہوا تو یہ اول تو خود اپنی مسرت کے حصول میں ناکام رہتا ہی اور پھر دوسرے حصص کو مجبور کرتا ہی کہ وہ ایسی مسرت کی طلب کریں جو ایک سایہ ہی اور انکے مخصوص نہیں؟

گ :- درست۔

میں :- اور فلسفہ و عقل سے جسقدر انکا بُعد زیادہ ہوگا اسی قدر یہ مسرّت انکے لیے اجنبی اور فریب دہ ہوگی۔

گ :- جی۔

میں :- اور کیا وہی شے عقل سے بعید ترین نہیں جو آئین و نظام سے بعید تر ہو؟

گ :- ظاہر ہی۔

میں :- اور جیسے ہم دیکھ چکے ہیں شہوانی اور ظالمانہ خواہشیں ان سے سب سے زیادہ بعید ہیں؟

گ :- جی۔

میں :- اور شاہی اور منظم خواہشیں قریب ترین؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- لہٰذا ظالم مستبد حقیقی اور فطری مسرت سے سب سے زیادہ اور بادشاہ سب سے کم بُعد پر رہیں گے؟

گ :- یقیناً۔

میں :- لیکن اگر ایسا ہی تو ظالم مستبد سب سے زیادہ بدحال اور بادشاہ سب سے زیادہ خوشحال زندگی بسر کریگا۔

گ :- لازمی بات ہی۔

میں :- کیا تم اس بُعد و فرق کا پیمانہ معلوم کرنا چاہتے ہو؟

گ :- جی، فرمائیے۔

میں :- معلوم ہوتا ہی کہ مسرتیں تین قسم کی ہوتی ہیں، ایک اصلی اور دو نقلی ظالم کی بدعنوانی نقلی مسرتوں سے بھی پرے پہنچتی ہی، یہ عقل و آئین کی حدود سے بھاگ کر بعض غلامانہ مسرتوں کے ساتھ بود و باش اختیار کرتا ہی، یہ مسرتیں اس کی تابع ہوتی ہیں، اور اس کی کم حیثیتی کا اندازہ بس ایک مثال ہی سے ہو سکتا ہی۔

گ :- کیسے؟

میں :- میں سمجھتا ہوں کہ ظالم مستبد خواص سے تیسرے نمبر پر ہی اور جمہوریت پسند بیچ میں؟

گ :- جی۔

میں :- اگر جو کچھ گذر چکا وہ صحیح ہے تو ظالم مستبد کا مسرت کے ایک ایسے عکس سے تعلق ہوگا جو خواص کی مسرت کے مقابلہ میں حقیقت سے سہ چند دور ہے؟

گ :- ضرور

میں :- اور خواص بادشاہ سے تیسرے درجہ پر ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک شاہی اور مؤتمری تو ایک ہی ہیں؟

گ :- بیشک تیسرے درجہ پر

میں :- گویا ظالم مستبد کا حقیقی مسرت سے جو بُعد ہے وہ تین کا سہ چند ہے؟

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- اچھا تو ظالمانہ مسرت کا سایہ اگر اس کے طول کے عدد سے نکالا جائے تو وہ ایک سطح شکل ہوگی۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اب اگر اسے اس کی ذات میں ضرب دیں اور اس سطح کو صلب بنائیں تو ہم بلا دشواری دیکھ سکتے ہیں کہ بادشاہ اور ظالم مستبد کا درمیانی فصل کس قدر وسیع ہے۔

گ :- جی ہاں، کوئی حساب داں اس سوال کو بآسانی حل کر سکتا ہے۔

میں :- یا اگر کوئی شخص دوسرے سرے سے ابتدا کرے اور یہ اندازہ کرنا چاہے کہ بادشاہ باعتبار سچی مسرت کے ظالم مستبد سے کتنے فصل پر ہے تو ضرب وغیرہ

دیکھنے کے بعد اُسے معلوم ہوگا کہ بادشاہ ۷۲۹ گنا خوشحال اور ظالم مستبد اسی قدر بدحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

گ :- کیسا عجیب شمار اعداد ہی! اور باعتبار مسرّت و الم عادل اور غیر منصف کو جو فاصلہ جُدا کرتا ہی وہ کسقدر وسیع!

میں :- اور پھر لطف یہ کہ صحیح شمار ہی اور یہ عدد ایسا ہی کہ اگر انسانوں کو روز و شب اور ماہ و سال سے سروکار ہی تو ایسے عدد سے بھی انسانی زندگی کو بہت قریبی واسطہ ہی۔[1]

گ :- جی ہاں۔ انسانی زندگی کو اس سے یقیناً واسطہ ہی۔

میں :- اچھا تو اگر باعتبار مسرّت کے اچھا اور عادل انسان بُرے اور غیر منصف سے اسقدر افضل ہی تو بہ لحاظ عمدگیٔ حیات اور حسن و خوبی تو اس کی فضیلت بیحد زیادہ ہوگی؟

گ :- بے حساب و بیشمار۔

میں :- اب کہ ہم دلیل کی اس منزل پر آن پہونچے ہیں مناسب معلوم ہوتا ہی کہ ان الفاظ کی طرف رجوع کریں جنھوں نے ہمیں یہاں پہنچایا۔ کیوں، کوئی صاحب یہی تو کہہ رہے تھے نا کہ ایسے کامل غیر منصف انسان کے لیے جسے عادل ہونے کی شہرت حاصل ہو ناانصافی سودمند ہی؟

---

[1] سال میں دن اور رات کی مجموعی تعداد تقریباً ۷۲۹ ہی ہی!

گ :۔ جی ہاں، یہ کہا گیا تھا۔

میں :۔ اچھا تو اب کہ ہم نے عدل و نا انصافی کی کیفیت اور قوت کا تعین کر لیا ان صاحب سے دو دو باتیں ہو جائیں۔

گ :۔ اچھا، ہم انہے کہیں گے کیا؟

میں :۔ ہم روح کی ایک شکل بنائیں گے تاکہ اس کے الفاظ خود اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں۔

گ :۔ کیسی شکل؟

میں :۔ روح کا ایک خیالی مجسمہ جیسے قدیم اساطیر کے مرکب مجسمے مثلاً شمیرا، سکلا یا سیربرس ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن میں دو یا چند مختلف طبائع کی یکجا نمود بتاتے ہیں۔

گ :۔ جی ہاں، کہتے تو ہیں کہ اس قسم کے میل ہوئے ہیں۔

میں :۔ اچھا تو پھر تم بھی میرے لیے ایک عظیم الشان بہت سے سروں والے راکشس کا مجسمہ تیار کرو جس کے شانوں پر طرح طرح کے جانوروں کے سروں کا حلقہ ہو اس میں پالتو جانور بھی ہوں، جنگلی بھی اور یہ انھیں جب چاہے پیدا کر لے اور جب چاہے بالکل بدل دے۔

گ :۔ آپ سمجھتے ہیں کہ بت گروں میں بڑی قوتیں ہیں، لیکن چونکہ زبان موم یا کسی اور مادی چیز سے زیادہ لوچدار ہے اس لیے اس مجسمہ کو تو آپ ہی تیار کریں۔

میں :- تو پھر ایک اور دوسری شکل شیر کی سی اور ایک تیسری انسان کی سی تیار کرو، دوسری شکل پہلی سے اور تیسری دوسری سے چھوٹی ہو۔

گ :- یہ تو آسان کام ہے، اچھا بنائیے؟

میں :- اب ان تینوں کو باہم یوں جوڑ دو کہ تینوں ایک ہو جائیں۔

گ :- یہ بھی ہو گیا۔

میں :- اب اس کے ارد گرد ایک آدمی کی شکل بنا دو تاکہ جو اندر نہ دیکھ سکے اور صرف خارجی خول کو دیکھے وہ یہ سمجھے کہ یہ ایک انفرادی انسانی ہستی ہے۔

گ :- جی بہتر۔

میں :- اور اب ہم اس شخص کو جواب دیں جو انسان کے لیے ظالم و غیر منصف ہونا سودمند اور عادل و باانصاف ہونا ضرر رساں بتلاتا ہے کہ بھائی اگر تم سچ کہتے ہو تو اس مخلوق کے لیے فائدہ اسی میں ہے کہ اپنے سو سرے راکشس کو کھلا کھلا کر خوب پالے، اپنے شیر اور دوسری شیرانہ صفات کو تقویت پہنچائے لیکن اپنے انسان کو بھوکوں مار کر بالکل کمزور کر دے، تاکہ پھر دوسرے دولے جدھر چاہیں گھسیٹتے پھریں۔ نیز یہ کبھی ان میں باہمی یگانگت و ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ آپس میں ہمیشہ لڑنے جھگڑنے کاٹنے کھسوٹنے اور ایک دوسرے کو کھا جانے کی سعی میں مشغول رہنے دے۔

گ :- سچ ہے، ظلم و ناانصافی کا حامی یہی کہتا ہے۔

میں :- عدل کا جانبدار اس پر یہ جواب دیتا ہے کہ اسے اپنے قول اور فعل سے ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ کسی طرح اس کے اندر کے انسان کو پورے انسان کا وجود پر تسلط حاصل ہو جائے۔ اسے چاہیئے کہ اپنے سو سرے اژدہے پر ایسی نگاہ رکھے جیسے باغبان اپنے پودوں پر یعنی اس میں جو اچھی اور نرم صفات ہیں انہیں نشو و نما دے اور جو وحشی اور جنگلی عناصر ہیں انہیں نہ بڑھنے دے، پھر اسے چاہیئے کہ اس کے اندر جو شیر ہے اُسے اپنا معاون بنا لے اور ان سب کی نگہبانی یوں کرے کہ پہلے تو مختلف اجزا، کو باہم ایک دوسرے سے اور پھر خود اپنی ذات سے متحد کر لے۔

گ :- جی ہاں، عدل کا حامی بالکل یہی کہیگا۔

میں :- تو کیا ہر لحاظ سے یعنی مسرّت و حظ، عزت یا فائدہ ہر اعتبار سے عدل کا حامی صحیح ہے اور سچ کہتا ہے اور نا انصافی کا طرفدار جھوٹ بولتا ہے اور جاہل ہے؟

گ :- جی ہاں، ہر لحاظ سے۔

میں :- اچھا آؤ اب ذرا غیر منصف کو نرمی سے سمجھائیں اس لیے کہ ارادۃً تو غلطی پر اڑا ہوا ہی نہیں کہ " بھائی صاحب ! آپ کے نزدیک شریف اور رذیل چیزوں کا معیار کیا ہے؟ کیا وہ شریف نہیں جو درندے کو انسان کے یا یوں کہو کہ انسان میں جو الٰہیت ہے اس کے ماتحت لائے اور کیا رذیل وہ نہیں جو انسان کو درندے کا زبردست کرے"؟ تو سوائے 'ہاں' کے اس کے لیے اور کوئی جواب مشکل ہے، کیوں نہ ؟-

گ :- اگر وہ میری رائے کا کچھ بھی پاس کرے تو۔ تو اُسکے لیے اور کوئی چارہ نہیں

میں :- لیکن اگر اسنے یہ مان لیا تو پھر ہم اس سے یہ سوال اد کرینگے، اچھا تو پھر کوئی آدمی اگر اس شرط پر سیم و زر وصول کرے کہ اپنے شریف ترین حصہ کو رذیل ترین کا غلام بنائے تو وہ بھلا اس سیم و زر سے کیسے کوئی نفع حاصل کرسکیگا؟ کوئی شخص اگر اپنی اولاد کو روپیہ کی خاطر غلام بناکر بیچ دے اور پھر وحشی اور بدآدمیوں کے ہاتھ تو کون ہی جو اس کو نفع میں خیال کرے، چاہے پھر اس میں اُسے کتنی ہی کثیر رقم ملی ہو۔ اور پھر جب کوئی اپنے وجود کے جزو الٰہی کو اس کی خاطر بیچدے جو الٰہیت سے سب سے زیادہ بعید اور قابل نفرت ہی تو کون ہی جو اسے کمبخت و بدنصیب نہ بتائے۔ اریفلی نے اپنے شوہر کی جان کی قیمت میں ہار لیا تھا لیکن یہ تو اس سے کہیں بڑی تباہی کے لیے رشوت لیتا ہی!"

گ :- ہاں ہاں، میں اس کی طرف سے جواب دیتا ہوں، بیشک یہ اس سے کہیں بڑی تباہی ہی۔

میں :- بے اعتدال و بے عفت آدمی پر ہمیشہ سے اسی لیے تو لعنت ملامت ہی ہی کہ اس میں اس سو سرے راکشس کو بڑی آزادی ہوتی ہی۔

گ :- ظاہر ہی۔

میں :- اور جب انسانوں میں شیر اور سانپ والا عنصر خلاف تناسب بڑھکر قوت پکڑ لیتا ہی تو انپر غرور اور بد مزاجی کا الزام لگاتے ہیں؟

گ :۔ جی۔

میں :۔ اسی طرح عیاشی اور بیجا نرمی اس لیے بُری سمجھی جاتی ہیں کہ یہ انسان کو کمزور اور ڈھیلا کر کے بزدل بنا دیتی ہیں۔

گ :۔ بہت درست۔

میں :۔ اور جب کوئی اپنے اندر کے جری جانور کو اس بے لگام رکھشش کا مطیع بنا دیتا ہے اور دولت کی خاطر جس سے اس کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں عین عالم شباب میں اپنے کو قدموں تلے گھندے جانے کا عادی بناتا اور بجائے شیر کے بوزینہ کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس پر خوشامد اور کمینہ پن کا الزام لگاتے ہیں

گ :۔ درست۔

میں :۔ اور ذلیل نوکریاں اور دستی کام یہ کیوں قابل ملامت سمجھی جاتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ ان میں اصول اعلیٰ کی قدرتاً تضعیف ہوتی ہے فرد اپنی اندرونی حیثیتوں پر قابو پاتا نہیں اس لیے ان کی مصاحبت کرتا ہے اور اس کا سارا علم و مطالعہ اسپر محدود رہی کہ ان کی چاپلوسی کس طرح کرے۔

گ :۔ بظاہر تو یہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔

میں :۔ اور چونکہ ہم ان لوگوں کو بھی ایسی ہی حکومت میں رکھنا چاہتے ہیں جیسی کہ بہترین انسانوں کی، لہذا ہماری رائے ہے کہ نہیں ان بہترین انسانوں کا خادم ہونا چاہیے جنمیں الٰہیت حکمراں ہے، یہ نہیں کہ تھریسی میکس کی رائے کی

مطابق خادم پر اسے نقصان پہونچانے کے لیے حکومت کیجائے بلکہ اس وجہ سے کہ بہترین صورت یہ ہی کہ ہر شخص پر حکمرانی ہو اس فہم و عرفان الٰہی کی جو خود اسکی ذات میں موجود ہی اور جب یہ ممکن نہو تو پھر کسی خارجی حاکم کی تا کہ حتی الامکان ہم سب کے سب ایک ہی حکومت کے زیر سایہ برابروں اور دوستوں کیطرح رہ سکیں۔

گ :۔ سچ ہی

میں :۔ اسی قسم کا ارادہ آئین میں بھی بین طور پر ظاہر ہی کہ آئین سارے شہر کے محافظ و مددگار ہوتے ہیں۔ یہی خیال اس اختیار میں دکھائی دیتا ہی جو ہم بچوں کے اوپر عمل میں لاتے ہیں۔ ہم نہیں اسوقت تک آزاد نہیں ہونے دیتے جب تک ان میں ایسا اصول قائم نہ کردیں جو ریاست کے دستور اساسی کا مرادف ہو اور جب تک اس عنصر اعلیٰ کی نشو و نما سے ان کے دلوں میں اپنے جیسے ایک محافظ اور حاکم کو نصب کردیں۔ ہاں جب یہ ہو گیا تو وہ اپنی من مانی راہ چل سکتے ہیں۔

گ :۔ جی ہاں، آئین کا مقصد تو ظاہر ہی۔

میں :۔ تو پھر کس نقطۂ نظر سے اور کن وجوہ کی بنا پر کوئی یہ کہہ سکتا ہی کہ کسی کو ناانصافی، بے اعتدالی، و بےعفتی، یا دوسری صفات رذیلہ سے کوئی نفع پہونچ سکتا ہی کہ یہ تو اسے بہرحال بُرا بناتی ہیں چاہے وہ اپنی شرارت اور بدی کے باعث مال و دولت یا قوت و اقتدار ہی کیوں نہ حاصل کرلے۔

گ :- جی، کسی نقطۂ نظر سے نہیں۔

میں :- اور اس سے بھی لے بھلا کیا نفع ہوگا کہ اس کی ناانصافی پکڑی نہ جائے اور وہ اس کی سزا سے بچا رہے؟ جو پکڑا نہیں جاتا وہ تو اور بھی بدتر ہوتا جاتا ہے اور جو سزا پا لیتا ہے اس کی طبیعت کا وحشی حصہ خاموش ہو کر مائل بہ انسانیت ہو جاتا ہے، اس کی ذات کے شریف عناصر آزاد ہو جاتے ہیں اور عدل، عفت اور حکمت کے حصول سے اسکی ساری روح مشرف و مکمل ہو جاتی ہے، اور یہ شرف و کمال اس شرف سے جو جسم انسانی حسن، قوت اور تندرستی کے عطیہ سے حاصل کرتا ہے اسی درجہ برتر ہوتا ہے جس درجہ روح جسم سے زیادہ قابل عزت ہے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- یہ ہے وہ مقصد اعلیٰ جس کے حصول کے لیے سمجھدار آدمی اپنی زندگی کی ساری قوتیں وقف کر دیگا۔ اولاً تو وہ ان علوم کی تکریم کریگا جو اس کی روح پر ان صفات کا سکہ جمائیں اور دیگر علوم کو نظر انداز کر دیگا؟

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- دوسرے، وہ اپنی جسمانی عادات و کیفیات کو منظم کریگا۔ حیوانی اور خلاف عقل مسرتوں پر اپنے جسم کو لگنے دینے کا سوال ہی نہیں کہ یہ تو صحت تک کو ایک ثانوی چیز تصور کرے گا، اسکا مقصد اولین حسین یا قوی، یا تندرست ہونا نہ ہوگا جب تک کہ ان صفات سے اعتدال کا حصول قرین قیاس نہ ہو۔ یہ تو جسم کو ہمیشہ

اس طرح ٹھیک کریگا کہ اس سے روح کی ہم آہنگی کو قائم رکھ سکے۔

گ :۔ اگر اس میں سچی موسیقی ہے تو تو یقیناً اس کا عمل یہی ہوگا۔

میں :۔ پھر حصول دولت میں نظم و تناسب کا ایک اصول ہے جسے یہ ہمیشہ پیش نظر رکھیگا۔ دنیا کی ابلہانہ مدح سرائی سے اس کی آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی اور یہ اپنے لیے بے تعداد بُرائیوں کے اس جز یعنی دولت کے انبار نہ جمع کریگا۔

گ :۔ یقیناً نہیں،

میں :۔ یہ تو اس مدینۂ داخلی کا نگراں ہوگا جو خود اس میں موجود ہے اور ہمیشہ خیال رکھیگا کہ اس میں بدنظمی نہ پیدا ہو، اور یہ بدنظمیاں پیدا ہوتی ہیں یا تو دولت کے بے حساب فراوانی سے یا پھر اسکے مطلق فقدان سے۔ وہ اپنی ملک و آمدنی کو اسی اصول کے مطابق منضبط کر لیگا اور اپنے وسائل کے اعتبار سے خرچ کریگا۔

گ :۔ نہایت درست۔

میں اور اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر یہ ان تمام اعزازوں کو بخوشی قبول کریگا جنکی بابت وہ سمجھتا ہے کہ یہ اسے ایک بہتر انسان بنانے میں مدد دینگے لیکن جن سے اس کی زندگی کا نظام بگڑتا ہوگا خواہ وہ شخصی ہوں یا ملکی ان سے گریز کریگا۔

گ :۔ اگر اس کا محرک عمل یہ اصول ہے تو پھر یہ مدبر تو بنیگا نہیں۔

میں :۔ کلب مصری کی قسم، ضرور بنیگا، اور جو اس کا اپنا شہر ہوگا اس میں تو لازمی بنیگا۔ ہاں ممکن ہے کہ اپنے مولد میں نہ بنے سوائے اس صورت کے کہ اسے کوئی

الٰہی ضرورت ہی مجبور نہ کرے۔

گ :۔ جی، میں سمجھا۔ آپ کا مطلب یہ ہی کہ وہ اس شہر میں حاکم بنیگا جسکی بنیاد ہم ڈال رہے ہیں اور جو صرف تصور میں اپنا وجود رکھتا ہی کیونکہ مجھے یقین نہیں کہ اور کہیں روے زمین پر اسکا وجود ہو۔

میں :۔ ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ آسمان پر اس کا نمونہ مرتب ہوا ہے۔ اسے جو چاہے دیکھ سکتا ہی اور، دیکھکر اپنا گھر ٹھیک کر سکتا ہی۔ لیکن یہ بات کہ یہاں اس کا وجود ہی یا کبھی بھی ہو سکتا ہی یا نہیں اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ دیکھنے والا تو ہمیشہ اسی شہر کے نمونہ کے مطابق اپنی زندگی بسر کریگا اور دوسروں سے اسے کچھ سروکار نہ ہوگا۔

گ :۔ میں بھی یہی خیال کرتا ہوں۔

دسویں کتاب

میں :- ہماری ریاست میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں، لیکن جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے کوئی خوبی اتنی پسند نہیں آتی جتنا کہ وہ قاعدہ جو ہم نے شاعری کے متعلق بنایا ہے۔

گ :- آپ کا مطلب کاہے سے ہے؟

میں :- محاکاتی شاعری کے رو سے، کہ یقیناً اسے قبول نہ کرنا چاہیئے۔ اور اب کہ روح کے اجزا الگ الگ ممیز ہو گئے ہیں مجھ پر یہ بات اور بھی زیادہ روشن ہو رہی ہے۔

گ :- یعنی؟ -

میں :- راز کی بات ہے، آپس ہی میں رہے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے الفاظ المناک ناٹک نویسوں اور نقالوں کے بقیہ قبیلہ کے سامنے دُہرائے جائیں ہاں تم سے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تمام شاعرانہ نقالی سامعین کی سمجھ کیلئے

تباہ کن ہو اور اس زہر کے لیے بس ایک تریاق ہی یعنی انکی اصلی ماہیت کا علم۔

گ :۔ ذرا اپنے قول کا مفہوم مجھے اچھی طرح سمجھائیے۔

میں :۔ اچھا میں کہتا ہوں سنو۔ یہ سچ ہی کہ ابتداء شباب ہی سے میرے دل میں ھومر کی بڑی عظمت اور محبت ہی اور یہی وجہ ہی کہ میرے الفاظ زبان سے نکلتے ہچکچاتے ہیں اس لیے کہ المیین کی اس ساری کی ساری دلفریب جماعت کا استاد اور سردار یہی شخص ہی۔ لیکن صداقت کے مقابلہ میں کسی شخص کی زیادہ عزت نہیں ہو سکتی چنانچہ میں کہتا ہوں :۔

گ :۔ بہت خوب فرمائیے ؟۔

میں :۔ اچھا تو سنو، بلکہ جواب دو۔

گ :۔ پوچھیے۔

میں :۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ نقالی ہی کیا ؟ کیونکہ در اصل مجھے تو معلوم نہیں

گ :۔ جی ہاں، تو تو نہایت قرین قیاس بات ہی کہ مجھے معلوم ہو !

میں :۔ کیوں نہیں ؟ اکثر ایسا ہوتا ہی کہ کمزور آنکھ ایک چیز کو تیز آنکھ سے پہلے دیکھ لیتی ہی۔

گ :۔ بجا درست، لیکن مجھے کچھ دھندلا سا دکھائی پڑا بھی تو آپ کی موجودگی میں میں اس کے بیان کی ہمت کہاں سے لاؤنگا۔ لہذا براہِ کرم آپ خود ہی تحقیق فرمائیے۔

میں :- اچھا تو اسی اپنے معمولی طریقہ سے اس تحقیق کو شروع کریں دیکھئے جب کبھی چند افراد کا ایک مشترک نام ہو تو ہم فرض کرتے ہیں ان میں کوئی تصور یا شکل بھی مشترک ہے، سمجھے ؟ -

گ :- جی ہاں -

میں :- کوئی عام مثال لے لو- دنیا میں پلنگ ہوتے ہیں میزیں ہوتی ہیں- بکثرت، کیوں نا ؟

گ :- جی-

میں :- لیکن ان کی صرف دو شکلیں یا دو تصور ہیں، ایک پلنگ کا تصور اور ایک میز کا تصور-

گ :- درست -

میں :- اور انمیں سے کسی کا بنانیوالا جب پلنگ یا میز بناتا ہے تو اس تصور کے مطابق بناتا ہے- ان صورتوں میں ہمارا طریقہ بیان یہی ہے- لیکن کوئی کاریگر ان تصورات (اعیان) کو نہیں بناتا، اور بنا سکتا بھی کیسے ہے ؟

گ :- ناممکن -

میں :- لیکن ایک کاریگر اور ہے، میں سننا چاہتا ہوں کہ تم اُسکے متعلق کیا کہتے ہو ؟

گ :- وہ کون ؟

میں :- وہ جو تمام دوسرے کاریگروں کے سارے کاموں کا بنانیوالا ہے۔

گ :- کیسا غیر معمولی اور نرالا آدمی ہوگا ۔!

میں :- ذرا ٹھہرو تو اس اظہار تعجب کے اور بھی وجوہ پیدا ہونگے۔ کیونکہ یہ وہ کاریگر ہے جو صرف ہر قسم کے ظرف ہی نہیں بناتا، بلکہ درخت اور جانور، خود اپنی ذات اور تمام دیگر اشیاء، ارض و سما، اور وہ ساری کائنات جو زمین کے نیچے اور آسمان کے نیچے ہے ان سب کا پیدا کرنیوالا ہے یہی دیوتاؤں کو بھی پیدا کرتا ہے۔

گ :- یہ تو کوئی جادوگر ہوگا ؟

میں :- اہا، تم باور نہیں کرتے، ایں نا ؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ کوئی ایسا بنانیوالا یا خالق نہیں ؟ یا یہ کہ ایک معنی کر ان سب چیزوں کا کوئی بنانیوالا ہو سکتا ہے لیکن دوسرے معنوں میں نہیں ؟ کیا تم جانتے ہو کہ ایک طریقہ ایسا بھی ہے کہ تم خود ان سب چیزوں کو بنا سکتے ہو ؟

گ :- وہ کون طریقہ ہے ؟

میں :- بہت سہل طریقہ ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اس کرتب کو نہایت آسانی اور تیزی سے کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، سب سے سریع یہ طریقہ ہے کہ ایک آئینہ کو نہایت تیزی سے گھماتے جاؤ۔ تو تم بڑی جلدی سے سورج، آسمان، زمین کو خود اپنے کو اور دوسرے جانوروں اور درختوں کو نیز تمام دوسری اشیاء کو جن کا ابھی ذکر تھا اس آئینہ میں پیدا کر سکو گے۔

گ :- ہاں، لیکن یہ محض ظاہری شکلیں ہوں گی۔

میں :- بہت ٹھیک، اب آپ پتہ پر آرہے ہیں، چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ نقاش و مصور بھی اسی نوع سے تعلق رکھتا ہے، یعنی محض ظاہری اشکال کا بنانے والا ہے، کیوں ہے نا؟

گ :- بیشک۔

میں :- لیکن شاید تم یہ کہو کہ یہ جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ جھوٹ ہے تاہم ایک اعتبار سے مصور بھی پلنگ کا خالق ہو سکتا ہے؟۔

گ :- ہاں، لیکن صحیح اصلی اور حقیقی پلنگ کا نہیں۔

میں :- اور پھر پلنگ کے بنانے والے کے متعلق کیا کہو گے؟ تمہیں کہہ رہے تھے کہ یہ بھی وہ تصوّر (عین) تو پیدا کر نہیں سکتا جو ہمارے نزدیک پلنگ کی اصل ہے بلکہ صرف ایک مخصوص پلنگ بنا سکتا ہے۔

گ :- جی ہاں، میں نے کہا تھا۔

میں :- جب یہ وہ چیز نہیں بناتا جس کا وجود ہے تو یہ گویا حقیقی وجود نہیں بنا سکتا بلکہ صرف وجود سے مشابہ کوئی چیز بناتا ہے۔ اور اگر کوئی کہے کہ پلنگ ساز یا کسی دوسرے کاریگر کا کام حقیقی وجود رکھتا ہے تو مشکل سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ سچ کہہ رہا ہے۔

گ :- بہر صورت فلسفی تو یہی کہیں گے کہ یہ سچ نہیں۔

میں :- پھر کوئی تعجب بھی نہیں کہ اس کا کام حقیقت کا ایک غیر واضح اظہار ہو۔

گ :- کوئی تعجب نہیں۔

میں :- آؤ اب گذشتہ مثالوں کی روشنی میں یہ تحقیق کریں کہ یہ نقال ہے کون؟

گ :- مناسب ہے۔

میں :- اچھا تو اب تین پلنگ ہیں؛ ایک تو قدرت میں موجود ہے جس کا بنانیوالا خدا ہے، میں سمجھتا ہوں یہی کہنا چاہیئے اس لیے کہ اور کوئی تو اس کا بنانیوالا ہو نہیں سکتا۔

گ :- جی۔

میں :- پھر دوسرا ہے جو بڑھئی کی کارگذاری ہے۔

گ :- جی

میں :- تیسرا پلنگ مصوّر کا بنایا ہوا ہے۔

گ :- جی۔

میں :- گویا پلنگ تین قسم کے ہوتے ہیں اور تین صناع انکے نگراں ہیں؛ خدا، پلنگ ساز، اور مصوّر؟

گ :- جی ہاں، تین ہیں۔

میں :- خدا نے مجبوراً یا باختیار قدرت میں بس ایک ہی پلنگ بنایا۔ دو یا دو سے زیادہ ایسے تصویری پلنگ نہ خدا نے بنائے ہیں نہ کبھی بنائے۔

گ :- یہ کیوں؟

میں :- اس لیے کہ اگر وہ دو ہی بناتا تب بھی ایک تیسرا ضرور ظاہر ہوتا جو ان

دونوں کے لیے بمنزلہ عین کے ہوتا، چنانچہ یہ تیسرا تصوری پلنگ (عین) ہو جاتا اور یہ دونوں نہ رہتے۔

گ :- بہت ٹھیک۔

میں :- خدا یہ جانتا تھا اور ایک حقیقی پلنگ کا حقیقی خالق بننا چاہتا تھا کسی مخصوص پلنگ کا مخصوص خالق نہیں، چنانچہ ایسا پلنگ بنایا جو قدرتاً اور اصلاً بس ایک ہے۔

گ :- جی، یہ ہمارا عقیدہ ہے۔

میں :- تو پھر اسی کو پلنگ کا قدرتی خالق و صانع کہنا چاہیئے۔

گ :- جی ہاں، کیونکہ قدرتی عمل تخلیق میں یہی اس کا اور نیز تمام دوسری چیزوں کا موجد ہے۔

میں :- اور بڑھئی کے لیے کیا کہیں؟ کیا یہ بھی پلنگ کا بنانیوالا ہے؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- لیکن کیا نقاش و مصوّر کو بھی خالق یا صانع کہوگے؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- لیکن اگر یہ خالق نہیں تو پھر پلنگ سے اسے اور کون علاقہ و نسبت ہے؟

گ :- میرے خیال میں اسے دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں کا نقال کہہ سکتے ہیں۔

میں :- خوب۔ گویا آپ اس شخص کو نقال کہتے ہیں جو فطرت سے تیسری منزل

میں ہو ؟-

گ :- جی ، بیشک۔

میں :- اور المناک شاعر بھی چونکہ نقال ہے اس لیے دوسرے نقالوں کی طرح یہ بھی بادشاہ اور صداقت سے بہ سہ مراتب دور ہے؟

گ :- معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں :- اچھا تو نقال کے متعلق تو ہم متفق ہیں۔ اب رہا مصور، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آیا اسے ان اشیا کا نقال خیال کریں جو اصلاً فطرت میں موجود ہیں، یا محض کاریگروں کی مصنوعات کا؟

گ :- میرے خیال میں تو مؤخر الذکر صورت صحیح ہے۔

میں :- لیکن ابھی یہ اور متعین کرنا ہے کہ ان چیزوں کی اس حالت میں نقل جیسی یہ واقعاً ہیں یا جیسی کہ یہ ظاہراً معلوم ہوتی ہیں؟

گ :- آپ کا کیا مطلب ہے؟

میں :- میرا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک پلنگ کو مختلف نقطہائے نظر سے دیکھ سکتے ہیں، مثلاً سامنے سے، ترچھے، یا کسی اور زاویہ نگاہ سے اور ہر دفعہ پلنگ مختلف معلوم ہوگا لیکن اس کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں اور یہی حال سب اور چیزوں کا ہے۔

گ :- جی ہاں، یہ جو فرق معلوم ہوتا ہے صرف ظاہری ہے۔

میں :- اب ایک سوال میں اور کروں۔ فن مصوری کا مقصد کیا ہے؟ چیزوں کی

نقل جیسی کہ وہ دراصل ہیں یا جیسی کہ وہ ظاہر معلوم ہوتی ہیں مجاز کی نقل یا حقیقت کی؟

گ :- شہود کی۔

میں :- گویا نقال صداقت سے بہت دُور ہی اور سب کچھ کر سکتا ہی کیونکہ یہ ہر چیز کے ایک چھوٹے سے حصہ کو مس کرتا ہی اور وہ حصہ بھی عکس۔ مثلاً ایک مصور ایک چمار کی، ایک بڑھی کی، یا کسی اور کاریگر کی تصویر بنا دیگا، حالانکہ یہ ان کے فن کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا، اور اگر اچھا مصور ہی تو بچوں اور بھولے بھالے لوگوں کو دھوکا دے لیگا، یعنی جب دُور سے یہ بڑھئی کی تصویر انھیں دکھائیگا تو یہ سمجھیں گے کہ یہ ایک سچ مچ کا بڑھئی دیکھ رہے ہیں،

گ :- بیشک۔

میں :- چنانچہ جب کبھی کوئی شخص ہم سے آکر کہے کہ مجھے ایک ایسا آدمی ملا جو تمام فن جانتا ہی، اور ان ساری چیزوں سے واقف ہی جو کسی اور کو معلوم ہیں پھر یہ کہ ان میں سے ہر چیز کو باعتبار صحت ہر دوسرے سے بہتر جانتا ہی تو ہم بس یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ غریب ایک بھولا بھالا آدمی ہی جو کسی جادوگر یا بہروپیے سے جا ملا ہی اور اُس کے فریب میں آکر اسے عالم کل سمجھنے لگا ہی۔ اور اس کی وجہ یہ ہی کہ یہ خود علم و جہل و نقل کی ماہیت کی تجزی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

گ :- بہت درست۔

میں :- چنانچہ جب ہم لوگوں کو کہتے سنیں کہ شعرا المیین اور ان کا سرگروہ ہومر یہ سب کے سب تمام فنون سے واقف تھے اور ساری انسانی چیزوں کا ہمیں نیکی ہو کہ بدی اور نیز الٰہی چیزوں کا انھیں علم تھا، کیونکہ شاعر اسوقت تک اچھا شعر نہیں کہہ سکتا جب تک اسے اپنے مضمون کا علم نہ ہو اور جو یہ علم نہ رکھتا ہو وہ کبھی شاعر ہو ہی نہیں سکتا، ہاں تو جب ہم لوگوں کو یہ کہتے سنیں تو ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ کہیں یہاں بھی اسی قسم کا فریب نظر نہ ہو۔ شاید ان لوگوں کو بھی نقالوں سے سابقہ پڑا ہی اور یہ بھی ان کے فریب میں آ گئے ہیں۔ ان لوگوں نے جب ان کی تصنیفیں دیکھیں تو شاید یہ یاد نہیں رکھا کہ یہ تو محض نقلیں ہیں اور یہ صداقت سے سہ گانہ بُعد پر ان کا بنانا بلا علم حقیقت بآسانی ممکن ہی کیونکہ یہ تو صرف ظاہری شکلیں ہیں حقیقت نہیں؛ یا یہی ممکن ہی کہ یہ لوگ ٹھیک کہتے ہوں اور شعرا در اصل ان چیزوں کو جانتے ہوں جن کے متعلق عوام کے خیال میں وہ اس خوبی سے بیان کرتے ہیں؟

گ :- بہر صورت یہ سوال ہی غور طلب۔

میں :- اچھا اگر ایک شخص اصل بھی بنا سکتا ہو اور نقل بھی تو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ نقل سازی کی شاخ پر اپنی مساعی صرف نکریگا؟ کیا تمہارے خیال میں نقالی اسکی زندگی کا اُصول حاکم ہوگا گویا اس کے اندر اس سے بلند تر اور کوئی چیز ہی نہیں؟

گ :- میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں۔

میں :- حقیقی صنّاع جسے اشیاء منقولہ کا علم ہو وہ تو بجائے نقلوں کے اصل میں

دلچسپی لیگا اور بہت سے نفیس کاموں میں اپنی یادگار چھوڑیگا اور بجائے اس کے کہ مدحیہ قصائد کا مصنف ہو انکا موضوع بننا زیادہ پسند کریگا۔

گ :- جی ہاں، یہ اسکے لیے زیادہ عزت اور نفع کی بات ہوگی۔

میں :- اچھا تو اب ھومر سے ایک سوال کریں طب یا کسی اور ایسے فن کے متعلق نہیں جس کا حوالہ اُس کی نظموں میں یونہیں برسبیل تذکرہ آگیا ہی۔ اس سے یا کسی اور شاعر سے ہم یہ تو پوچھنے جائیں گے نہیں کہ آپ نے اسکلیپیس کی طرح مریضوں کو اچھا کیا ہی یا ان اسکلیپیسوں کی طرح طب کا کوئی مدرسہ اپنے بعد چھوڑا یا نہیں یا یہ کہ آپ طب اور دیگر فنون کے متعلق یونہیں سُنی سنائی باتیں کہا کرتے ہیں۔ ہاں تو یہ تو ہم پوچھنے نہیں لگے۔ البتہ فوجی نقل و حرکت، سیاست اور تعلیم کے متعلق اس سے سوال کرنے کا ہمیں حق ہی کہ یہ چیزیں اس کی نظموں کے مخصوص اور بلند ترین مضامین ہیں۔ اور ہم بجا طور پر انکے متعلق اس سے پوچھ سکتے ہیں۔ اچھا تو اب ہم اس سے کہیں کہ "دوست ھومر! اگر آپ نیکی کے متعلق اپنے اقوال میں حقیقت سے صرف دو درجہ ہٹے ہوے ہیں تین نہیں، یعنی اگر آپ عکس بنانے والے اور نقال نہیں، اگر آپ یہ معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ کون اشغال انسان کی خانگی اور سیاسی زندگی کو اچھا اور کون برا بناتے ہیں تو ذرا فرمائیے کہ وہ کون ریاست ہی جسپر آپ کی مدد سے بہتر حکومت ہوئی ہو؟ لسی ڈیمون کا عمدہ نظام لائکرگس کا رہین منت ہی، اسی طرح بہتیرے چھوٹے بڑے

شہر ہیں جنھیں اوروں سے فیض پہنچا ہی، لیکن کون ہی جو یہ کہتا ہو کہ آپ نے ان کے لیے اچھے قوانین نافذ کیے ہوں اور انھیں کچھ فائدہ پہونچایا ہو؟ اٹلی اور سسلی کو اپنے چرن داس پر ناز ہی اور ہم میں سولن کے نام کا ڈنکا بج رہا ہی، لیکن کون شہر ہی جسے آپ کے متعلق کچھ کہنا ہو؟" کیا کوئی شہر ہی جس کا یہ نام لے سکے؟

گ:۔ میرے خیال میں تو نہیں۔ خود ھومر کے مقلد اور معتقد اسکے مدعی نہیں کہ وہ واضع قوانین تھا۔

میں:۔ اچھا تو کیا کوئی ایسی جنگ ہی جو اس کی زندگی میں ہوئی ہو اور اسنے اسے کامیابی سے انجام کو پہنچایا یا اپنی صلاح و مشورہ سے انہیں مدد دی ہو؟

گ:۔ کوئی نہیں۔

میں:۔ پھر کیا کوئی ایجاد و اختراع اسکے نام سے ایسی منسوب ہی جو مختلف فنون یا حیات انسانی کے لیے قابل استعمال ہوئے جیسی کہ مثلاً ملیسیا کے تھیلس اور سیتھیا کے اناکرسس یا دوسرے ذہین اشخاص نے سوچ کر نکالیں؟

گ:۔ ایسی بھی کوئی چیز نام کو نہیں۔

میں:۔ خیر، اگر ھومر نے کبھی کوئی عام خدمت انجام نہیں دی تو کیا یہ خانگی طور پر کسی کا رہنما یا استاد تھا؟ کیا زندگی میں اس کے ایسے دوست تھے جو اس کی صحبت کے دلدادہ ہوں اور جنھوں نے آنے والی نسلوں تک ھومر کا طریق زندگی پہنچایا ہو، مثلاً ایسا حلقہ جیسا فیثاغورث نے قائم کیا تھا کہ لوگ

اس کے عرفان کے باعث اسے محبوب رکھتے تھے اور آج کے دن تک اسکے متبعین اس سلسلے سے معروف ہیں جو اسکے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔

گ :- ایسی کوئی بات بھی اس کے متعلق مرقوم نہیں اور واقعی ھومر کا وہ ہمنشین کریونلس جس کا نام سُنکر ہمیں ہمیشہ ہنسی آجاتی ہے اس وقت اپنی حماقت کی وجہ سے اور بھی زیادہ مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے جب ہم خیال کرتے ہیں کہ یہ اور یہی کیا اور سب لوگ بھی، زندگی میں ھومر کا ذرا بھی خیال نہ کرتے تھے۔

میں :- ہاں، روایت تو یہی ہے۔ لیکن گلاکن! کیا تم تصوّر کر سکتے ہو کہ اگر ھومر واقعاً آدمیوں کی تحسین و تعلیم کا اہل ہوتا، یعنی اگر بجائے محض نقال ہونے کے اس کے پاس علم ہوتا تو اسکے بہت سے معتقد و متبع نہ ہوتے جو اس کی عزت اور اس سے محبت کرتے؟ آبدرا والے پروتاگورس اور سیوس کے پروڈیکس اور بہتیروں نے بس اپنے معاصرین کے کان میں یہ بات آہستہ سے ڈالدی تھی کہ تم اُس وقت تک نہ اپنا گھر سنبھال سکو گے نہ اپنی ریاست جبتک ہمیں اپنا وزیر تعلیم نہ بنا دو" اور ان کی یہ چالاک ترکیب ایسی کارگر ہوئی کہ لوگ لنسے محبت کرنے اور انھیں کندھوں پر چڑھائے چڑھائے پھرنے لگے۔ تو کیا یہ دھیان میں آنیوالی بات ہے کہ اگر ان میں نوع انسانی کو نیک و صالح بنانے کی صلاحیت ہوتی تو ھومر یا ھیسیاد کے معاصرین نہیں بھاٹوں کی طرح مارے مارے پھرنے دیتے؟۔ انسے جُدائی تو ان لوگوں کے لیے اتنی ہی ناگوار ہوتی جتنی سونے سے اور یہ نھیں اپنے ساتھ

رہنے پر مجبور کرتے۔ اور اگر استاد ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوتا تو شاگرد اس کے ساتھ ساتھ اس وقت تک ہر جگہ جاتے جب تک ان کی کافی تعلیم نہ ہو جائے۔

گ :- جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بالکل درست ہے۔

میں :- پھر ہم یہ نتیجہ کیوں نہ نکالیں کہ یہ سارے کے سارے شعرا ہومر سے لیکر اب تک محض نقال ہیں، یہ نیکی اور دوسری چیزوں کے عکس کی نقل کرتے ہیں لیکن حقیقت تک کبھی نہیں پہونچتے؛ شاعر کی مثال اس مصور کی سی ہے جو چمار کی تصویر بناتا ہے حالانکہ اُس کے فن کو ذرا نہیں سمجھتا۔ اس کی تصویریں ان کے لیے ٹھیک ہیں جو خود اس سے زیادہ نہیں جانتے اور صرف رنگ اور صورت کو دیکھکر فیصلہ کر لیتے ہیں۔

گ :- بالکل بجا۔

میں :- اسی طرح شاعر اپنے الفاظ اور ترکیبوں سے مختلف فنون کا رنگ جماتا ہے اور ان کی ماہیت سے بس اسی حد تک واقفیت رکھتا ہے جتنی کہ نقالی کے لیے کافی ہو، دوسرے لوگ جو خود اسی کی طرح جاہل ہیں اور صرف اس کے الفاظ پر فیصلہ کر لیتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ جب یہ وزن اور بحر و ایقاع کے ساتھ موچی کے کام کا، فوجی نقل و حرکت کا یا اور کسی بات کا ذکر کرتا ہے تو نہایت اچھی طرح انہیں بیان کرتا ہے۔ ہاں کیوں نہ ہو، نغمہ و ایقاع میں قدرتاً یہ شیریں اثر ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اگر ان شاعروں کے قصوں کو اس رنگ آمیزی سے معریٰ کر دیجیے جو موسیقی سے ان پر چڑھایا جاتا ہے اور معمولی سیدھی سادی نثر میں انھیں بیان کیجیے تو ان کی کیسی حقیر شکل نکل آتی ہے۔

گ :- جی ہاں۔

میں :- ان کی مثال اُن چہروں کی سی ہے جو کبھی حسین نہ تھے ان میں صرف اوپری چمک دمک تھی اور اب شباب کی یہ آب و تاب ان پر سے اُتر گئی؟

گ :- بالکل۔

میں :- ایک نکتہ اور ہے نقال یا عکسوں کا بنانیوالا وجود حقیقی کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتا، یہ صرف ظاہری شکل کو جانتا ہے۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- اچھا تو معاملہ کو صاف طور پر سمجھ لیں، آدھی توضیح سے مطمئن نہ ہو جانا چاہیئے۔

گ :- فرمایئے۔

میں :- مصور کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ یہ لگام کی تصویر بنائیگا، اور وہ بھی اُس کے صرف ایک ٹکڑے کی؟

گ :- جی۔

میں :- اور زین ساز، اور پیتل کا کام کرنیوالا لگام میں بنائیگا؟

گ :- بیشک۔

میں :- لیکن کیا مصور یہ جانتا ہے کہ لگام اور دہانہ کیسا ہونا چاہیئے؟ نہیں یہ تو زین ساز اور لوہار کو بھی جو انھیں بناتے ہیں مشکل سے معلوم ہوتا ہے۔ صرف شہسوار جو

انکا استعمال جانتا ہی وہی اُنکی صحیح شکل بھی جانتا ہی۔

گ :- بہت درست۔

میں :- اور کیا یہی حال اور سب چیزوں کا نہیں ؟

گ :- یعنی کیا- ؟

میں :- یہ کہ تین فن ہیں جن کا ہر چیز سے واسطہ ہی، ایک وہ جو استعمال کرتا ہی دوسرا وہ جو بناتا ہی اور تیسرا وہ جو انکی نقل کرتا ہی

گ :- جی ہاں-

میں :- اور ہر حیّ یا غیر حیّ جسم نیز ہر عمل انسانی کی خوبی، حسن، صداقت اس استعمال کے اعتبار سے ہوتی ہی جس کے لیے قدرت یا صنّاع نے انھیں مقصود کیا ہی۔

گ :- درست۔

میں :- چنانچہ ان کے استعمال کرنے والے کو ہی ان کا سب سے زیادہ تجربہ ہونا چاہیئے اور یہی بتانیوالے کو بتا بھی سکتا ہی کہ دوران استعمال میں کون کون سی اچھی یا بُری صفات اس میں رونما ہوتی ہیں۔ مثلاً بانسری بجانے والا بنانیوالے کو بتا سکتا ہی کہ اسکی کونسی بانسری بجانے میں اچھی ہی اور اسے کس طرح بانسری بنانی چاہیئے اور بنانے والے کا فرض ہی کہ اس کی ہدایتوں کی پابندی کرے ؟

گ :- لازماً-

میں :- ایک چونکہ جانتا ہی اس لیے بانسریوں کی اچھائی یا بُرائی کے متعلق اعتماد

گفتگو کر سکتا ہی اور دوسرا اُس پر اعتماد کرکے جو کچھ کہا جاتا ہی وہ کرتا ہی۔

گ :- درست۔

میں :- بانسری تو وہی ایک ہی، لیکن اس کے بھلے بُرے کی بابت بنانیوالے کو تو محض ایک صحیح یقین یا عقیدہ حاصل ہو سکتا ہی اور یہ یوں کہ جاننے والے سے اس کے متعلق گفتگو کرے اور پھر جو کچھ وہ کہے اُس کے سننے پر مجبور رہو۔ رہا استعمال کرنے والا تو اُسے ہوتا ہی علم۔

گ :- بیشک۔

میں :- مگر نقال کو کیا ان میں سے کوئی بات بھی نصیب ہو گی؟ کیا اسے خود استعمال سے پتہ چل سکیگا کہ اس کی نقاشی صحیح اور خوشنما ہی یا نہیں؟ یا کیا یہ ممکن ہی کہ یہ کسی جاننے والے سے ملنے اور اس کی ہدایت سُننے پر مجبور ہو کہ اسے کس طرح نقش اُتارنا چاہیئے اور اس طرح یہ صحیح رائے قائم کر سکے؟

گ :- دونوں میں کوئی صورت ممکن نہیں۔

میں :- گویا اپنی نقلوں کی اچھائی یا بُرائی کی بابت نہ تو اسے صحیح رائے ہی حاصل ہو گی نہ علم؟

گ :- میں تو سمجھتا ہوں کہ نہیں۔

میں :- تو تو ماشاء اللہ یہ نقال صنّاع اپنی مصنوعات کے متعلق نہایت روشن کیفیت عرفان رکھتا ہوگا!

گ :- جی، نہ کہیں۔

میں :- لیکن جناب نقل ضرور کیے جائینگے، چاہے علم ہو یا نہ ہو کہ ایک چیز کیونکر اچھی ہوتی ہو اور کیسے بُری، چنانچہ یہی توقع کرنی چاہیے کہ یہ انھیں چیزوں کی نقل کریں گے جو جاہل انبوہ کو اچھی معلوم ہوتی ہیں ؟

گ :- بالکل بجا۔

میں :- اچھا، یہاں تک تو ہم خاصے متفق ہیں کہ نقال کو اشیاء منقولہ کے متعلق کوئی قابل ذکر علم نہیں ہوتا۔ نقالی بس ایک طرح کا کھیل ہو یا تفریح اور یہ کہ سارے المناک شعر کہنے والے چاہے رجز لکھتے ہوں چاہے حمیس بدرجۂ اولیٰ نقال ہیں ؟-

گ :- بہت درست۔

میں :- ہاں تو آپ کو قسم ہو فرمایئے کہ ہم کیا یہ نہیں ظاہر کر چکے ہیں کہ نقالی کو اس چیز سے واسطہ ہو جو حقیقت سے بدارج سہ گانہ بعید ہو؟

گ :- جی، بیشک۔

میں :- اور وہ کونسی انسانی صلاحیت ہو جس پر یہ نقالی اپنا اثر رکھتی ہو؟

گ :- آپ کا کیا مطلب ہو۔

میں :- بتاتا ہوں : ایک جسم جو قریب سے دیکھنے میں بڑا معلوم ہوتا ہو، دور سے چھوٹا معلوم ہوتا ہو!

گ :- جی۔

میں :- وہی چیز پانی کے باہر سیدھی دکھائی دیتی ہو اور پانی کے اندر ٹیڑھی! نگاہ کو رنگوں میں جو دھوکا ہوجاتا ہو اس کی وجہ سے اُحدب اجوف دکھائی دیتا ہو۔ الغرض ہمارے اندر اس قسم کے تمام فریب موجود ہیں، اور انسانی دماغ کی اسی کمزوری پر روشنی اور سایہ سے نظر بندی کرنے اور فریب دینے کا فن اور دوسری چالاکی کی تدبیریں اپنا اثر دکھاتی ہیں اور ہم پر جادو کا سا اثر کرتی ہیں۔

گ :- سچ ہے۔

میں :- اب ناپنے، گننے اور تولنے کے فن عقل انسانی کی مدد کو آتے ہیں۔ یہی ہو ان کا اصلی حُسن۔ اور وہ جو ظاہرا بڑا یا چھوٹا، ہلکا یا بھاری معلوم ہوتا تھا اب ہم پر غالب نہیں رہ سکتا، بلکہ حساب، پیمانہ اور وزن کے سامنے غائب ہوجاتا ہے۔

گ :- حق ہو۔

میں :- اور یہ یقیناً روح کے حساب داں اور عاقل اصول کا کام ہونا چاہیئے؟

گ :- یقیناً۔

میں :- جب یہ اصول ناپکر تصدیق کرتا ہو کہ یہ چیزیں برابر ہیں، فلاں فلاں بڑی ہیں اور فلاں فلاں چھوٹی تو اس وقت بظاہر ایک تضاد پیدا ہوتا ہو! ۔

گ :- درست۔

میں :- لیکن ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ تضاد محال ہے، وہی صلاحیت ایک ہی وقت
میں ایک ہی چیز کے متعلق دو متضاد رائیں نہیں رکھہ سکتی۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- تو گویا روح کا وہ حصہ جس کی رائے پیمانہ کے خلاف ہے اس حصہ سے مختلف
ہوگا جسکی رائے پیمانہ کے مطابق ہے؟

گ :- ٹھیک۔

میں :- اور روح کا بہتر حصہ شاید وہی ہوگا جو پیمانہ اور حساب پر بھروسہ کرے۔

گ :- یقیناً۔

میں :- اور جو انکا مخالف ہے وہ اصول ادنیٰ درجہ کا ہوگا۔

گ :- بلاشبہ۔

میں :- میرا مقصد دراصل اسی نتیجہ پر پہنچنا تھا جیسا میں نے کہا تھا کہ مصوری،
نقاشی اور نقالی فی الجملہ جب اپنا اصلی کام کرتے ہوں تو حقیقت سے بہت بعید ہوتے
ہیں اور ہماری روح کے ایسے اصول کے ہمنشین، دوست اور ساتھی ہیں جو خود عقلیت
سے اسی درجہ بعید ہے اور سچ پوچھو تو ان کا کوئی سچا اور اچھا مقصد نہیں؛

گ :- بالکل ٹھیک۔

میں :- نقالی کا فن ایک پنچ ذات ہے جو پنچ ذات سے عقد کرتا ہے، لہذا اولاد بھی
پنچ ذات ہوتی ہے۔

گ :۔ بہت صحیح۔

میں :۔ اچھا تو کیا یہ معاملہ صرف باصرہ پر محدود ہی یا سامعہ پر بھی اور خصوصاً اُسپر جسے ہم شاعری کہتے ہیں اسکا اطلاق ہو سکتا ہی؟

گ :۔ ظن غالب ہی کہ شاعری کے متعلق بھی یہی بات صحیح ہو گی۔

میں :۔ نہیں بھائی مصوری کی تمثیل سے جو غلبۂ ظن حاصل ہوا ہی اسپر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں؛ آؤ آگے تحقیق کریں اور دیکھیں کہ آیا جس صلاحیت سے شاعری کو سروکار ہی وہ اچھی ہی یا بُری۔

گ :۔ ضرور۔

میں :۔ اچھا تو مسئلہ یوں پیش ہوتا ہے: نقالی ان اعمال انسانی کی (خواہ ارادی ہوں یا غیر ارادی) نقل کرتی ہی جنسے اسکے خیال میں کوئی اچھا نتیجہ مترتب ہوا ہو یا کیا کوئی بُرا نتیجہ، اور پھر اسی نتیجہ کی نوعیت کے موافق اسپر خوشی مناتی ہی یا رنج کرتی ہی۔ کیوں کیا اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہی؟

گ :۔ نہیں اور کیا ہی۔

میں :۔ لیکن کیا حالات و اسباب کے اس تنوع میں انسان خود اپنے سے متحد ہی؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ جیسے نگاہ کے معاملہ میں اسی چیز کے متعلق اس کی رائے میں تضاد تھا اور عدم وضاحت اسیطرح یہاں بھی اس کی زندگی میں کشاکش اور عدم مطابقت ہی؟ اگرچہ سچ پوچھو تو اب سوال کو دوبارہ اٹھانیکی کوئی ضرورت نہیں، مجھے یاد ہی کہ ہم سب یہ

تسلیم کر چکے ہیں اور ہم نے مان لیا ہی کہ روح ہر لحظہ ان اور ان جیسی اور ہزاروں مخالفتوں سے پُر ہوتی ہی؟

گ :- جی، اور ہم ٹھیک بھی تھے۔

میں :- ہاں، یہاں تک تو ہم ٹھیک تھے، لیکن ایک بات البتہ رہ گئی تھی جسے اب پورا کرنا چاہیئے۔

گ :- کیوں، وہ کیا رہ گیا تھا؟

میں :- تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے کہا تھا کہ اگر کسی نیک آدمی پر اس کے بیٹے کی موت کی بلا ٹوٹ پڑے اور اُس سے کوئی ایسی چیز چھن جائے جو اسے نہایت عزیز تھی تو وہ اوروں کے مقابلہ میں اس کو زیادہ سکون کے ساتھ برداشت کریگا؟

گ :- جی۔

میں :- لیکن کیا اسے رنج ہی نہ ہوگا، یا یہ کہ رنج ہونا تو لازمی ہی البتہ یہ اپنے غم کو جیسے تیسے دُور کرنے کی کوشش کریگا؟

گ :- دوسری صورت زیادہ صحیح ہی۔

میں :- اچھا بتاؤ کہ یہ اپنے غم کو دبانے اور دور کرنے کی کوشش اپنے ہمچشموں کی موجودگی میں زیادہ کریگا یا تنہائی میں؟

گ جی ہاں، اس سے بڑا فرق پڑیگا کہ کوئی اسے دیکھتا ہی یا نہیں۔

میں :- یہ جب اکیلا ہوگا تو بہت سی ایسی باتیں ہیں جو یہ کہہ یا کر سکتا ہی لیکن اگر

کہیں دوسرے نہیں دیکھ یا سُن لیں تو یہ شرم سے پانی پانی ہو جائے۔

گ۔ درست۔

میں :- ہم کہہ چکے ہیں کہ جب ایک شخص پر دو مخالف قوتیں عامل ہوں ایک کسی چیز کی طرف کھینچے اور ایک اُس سے دُور ہٹائے تو اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ اس میں دو جدا اصول موجود ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- ان میں سے ایک قانون کی رہنمائی میں چلنے پر آمادہ ہی۔

گ :- یہ کیسے؟

میں :- قانون کہتا ہی کہ مصیبت میں صبر کرنا بہترین صورت ہی، ہمیں بے صبری نہ کرنا چاہیئے اس لیے کہ کون جانتا ہی کہ یہ چیزیں اچھی ہیں یا بُری اور پھر بے صبری سے فائدہ کیا؟ نیز اس لیے کہ کوئی انسانی معاملہ ایسی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور غم اس چیز کی راہ میں حائل ہوتا ہی جسکی اسوقت سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہی۔

گ :- کاہیکی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہی۔

میں :- اس کی کہ جو کچھ پیش آچکا اس پر غور کریں اور جب پانسہ پڑچکا تو اُس وقت جو بہترین صورت ہی اسکے مطابق معاملات کا انصرام کریں، یہ نہیں کہ بچوں کی طرح جہاں جو جہاں ذرا گر پڑے تو چوٹ کو پکڑے بیٹھے رہتے ہیں اور چیخنے چلّانے میں ہی سارا وقت ضائع کرتے ہیں: بلکہ ہمیں تو چاہیئے کہ روح کو فوراً ہی اس کا علاج کرنے کی عادت ڈالیں۔

تاکہ جو مریض اور افتادہ ہو اُسے پھر اٹھا کر کھڑا کرے اور دکھ سے کراہنے کو طب سے دُور کرتے

گ :- بیشک، بدبختی کے حملوں کا مقابلہ یونہی کرنا چاہیئے۔

میں :- اور ہماری روح کا اعلیٰ اُصول عقل کے اس مشورہ پر عمل پیرا ہونے کو آمادہ ہے۔

گ :- ظاہر ہے۔

میں :- اور دوسرا اُصول جو ہمیشہ غم کی یاد تازہ رکھنے اور ہمیشہ نوحہ وزاری کیطرف مائل ہوتا ہے اور ان سے کبھی سیر نہیں ہوتا اسے ہم خلاف عقل، بے سود اور بُزدل کہہ سکتے ہیں۔

گ :- بیشک، کیوں نہیں۔

میں :- اور کیا یہی مُوخرالذکر یعنی مائل بہ بغاوت اصول نقالی کیلئے رنگا رنگ مواد نہیں فراہم کرتا؟ کیونکہ کسی فہیم و متین طبیعت کی نقل اول تو اُتارنی آسان نہیں کہ اس میں ہمیشہ ایک توازن و یکسانیت ہوتی ہے اور اگر اس کی نقل کی بھی جائے تو کوئی اسے پسند نہ کرے خصوصاً تہواروں کے موقع پر جب ایک عامیانہ انبوہ کسی منڈپ میں ان نقلوں کے دیکھنے کے لیے جمع ہوتا ہے۔ اور وجہ صاف ہے کہ جس جذبہ کی نقل اس حالت میں کی جائیگی یہ اس سے یک قلم ناآشنا ہیں۔

گ :- بیشک۔

میں :- چنانچہ نقال شاعر جسکا مقصد قبول عام ہے نہ تو قدرتاً اس غرض کے لئے

خلق ہوا ہی نہ اسکے ہنر کی غایت ہی یہ ہی کہ روح کے عقلی اصول کو خوش کرے یا اور کسی طرح اُسپر اثر ڈالے؛ بلکہ یہ تو ترجیح دیگا جذباتی اور متلون طبیعت کو کہ اسکی نقل اُتارنی آسان ہی۔

گ :- ظاہر ہی۔

میں :- اب ہم بجا طور پر اسے نیکر مصوّر کے پہلو بہ پہلو بٹھا سکتے ہیں کہ یہ دو طرح اس کا مثل ہی؛ اول تو یہ کہ اس کی مخلوقات اپنے اندر صداقت کا ایک ادنیٰ درجہ رکھتی ہیں، تو ہاں ایک تو اس بات میں یہ مصوّر کا مثل ہوا، دوسری بات یہ ہی کہ اسے بھی روح کے ایک ادنیٰ جزو سے سروکار ہی۔ لہذا ہم بالکل حق بجانب ہونگے اگر اسے ایک منظم ریاست میں داخل کرنے سے انکار کریں کیونکہ یہ جذبات کو تو بیدار کرتا، انکی آبیاری کرتا اور نھیں قوت بخشتا ہی لیکن عقل کو مضرت پہنچاتا ہی۔ جیسے کبھی کسی شہر میں بدکرداروں کو سارا اختیار ملجائے اور نیک مار کے الگ کر دئیے جائیں تو کیا حال ہو۔ اسی طرح روح انسانی میں یہ نقال شاعر ایک دستور باطل کو لاکر نصب کرتا ہی اس لیے کہ یہ روح کے اس غیر عاقل عنصر کی پچ کرتا ہی جسے بڑے چھوٹے کی تمیز نہیں، جو اسی چیز کو کبھی بڑا اور کبھی چھوٹا خیال کرتا ہی۔ یہ شاعر صورت گر ہے اور حقیقت سے کوسوں دُور۔

گ :- بالکل درست۔

میں :- لیکن ہم نے ابھی سب سے بھاری الزام تو پیش ہی نہیں کیا؛ یعنی شاعری

کو نقصان پہنچانے کی جو قوت شاعری اپنے اندر رکھتی ہے (اور بہت ہی چند لوگ ہیں جنھیں اس سے ضرر نہ پہنچا ہو) وہ واقعاً نہایت ہی خوفناک ہے۔

گ :- بلاشبہ، اگر اس کا اثر وہی ہوتا ہے جو آپ فرماتے ہیں۔

میں :- اچھا تو سنو اور فیصلہ کرو۔ ہم میں سے بہترین شخص جب هومر یا کسی اور المناک شاعر کا کلام سنتا ہے جس میں مشاہیر میں سے کوئی اپنے دکھ درد کی داستان طولانی دوہرا رہا ہو، رو دھو رہا ہو، یا آہ وزاری وسینہ کوبی میں مصروف ہو تو تم جانو اچھے سے اچھے کا دل پسیج جاتا ہے اور ہم اس شاعری کی خوبی پر سب سے زیادہ غش غش کرنے لگتے ہیں جو ہمارے جذبات کو سب سے زیادہ متحرک کر دے۔

گ :- جی، میں اس سے واقف ہوں۔

میں :- لیکن جب کوئی ذاتی مصیبت آن پڑے تو تم دیکھ سکتے ہو کہ ہم اسکے بالکل مخالف صفت پر فخر کرتے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ چپ رہیں اور صبر کریں، کیونکہ مردانہ شعار یہی ہے، اور وہ دوسری چیز جسے سنکر ہم متاثر ہوئے تھے اسے ہم اب نسائیت پر محمول کرتے ہیں۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- اچھا تو بھلا تمہیں بتاؤ کہ جس کام کو ہم اپنی ذات کے لیے قابل نفرت اور باعث شرم سمجھیں تو کیا جب دوسرا اسے کرے تو اس کی تعریف و مدح میں ہم حق بجانب ہو سکتے ہیں؟-

گ :- نہیں، واقعی یہ تو معقول بات نہیں۔

میں :- کیوں نہیں، ایک نقطۂ نظر سے تو بالکل معقول ہے۔

گ :- کونسے نقطۂ نظر سے؟

میں :- دیکھو، ہم اپنی ذاتی بپتا میں رو دھو کر اپنا غم غلط کرنے کی جس فطری خواہش کو دباتے اور قابو میں رکھتے ہیں اسی خواہش کو یہ شاعر پورا کرتے ہیں۔ ہماری اعلیٰ فطرت جب عقل یا عادت کی تربیت سے کافی بہرہ یاب نہیں ہوتی تو ہمدردی کے عنصر کو اس لیے آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ یہ غم تو دوسرے کا ہے۔ ناظر سمجھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے پاس نیکی کا دعویٰ کرتا اور ساتھ ساتھ اپنے مصائب کا دکھڑا روتا آئے تو اس کی تعریف اور اس پر افسوس کرنے میں اس کی کیا توہین اور اس اظہار سے جو حظ حاصل ہوتا ہے وہ الگ ایک فائدہ۔ پھر یہ کیوں خواہ مخواہ اس درجہ محتاط ہو اور اس حظ کو نیز لطفِ شعر کو کیوں ہاتھ سے جانے دے۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں بہت ہی کم لوگ اس بات پر دھیان کرتے ہیں کہ دوسروں کی برائی سے خود ان میں بھی کچھ برائی منتقل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دوسروں کی مصیبت دیکھ کر جس جذبۂ رنج و افسوس نے قوت پکڑلی ہے پھر اس کا خود اپنی بپتا میں دبانا بھی بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

گ :- نہایت درست۔

میں :- اور کیا ظرافت کا بھی یہی حال نہیں؟ بہت سے مزاح ہیں کہ تم خود کہتے شرماؤ گے، لیکن جب طربناک ناٹک میں یا حلقۂ احباب میں انھیں سنتے ہو تو بے حد محظوظ

ہوتے ہو اور ان کی بیہودگی سے ذرا متنفر نہیں ہوتے، یعنی وہی افسوس والا معاملہ! انسانی روح میں ایک اُصول ہی جو ہنسی کی طرف مائل ہی، اسے تم نے اس ڈر سے روک رکھا تھا کہ لوگ تمہیں مسخرہ نہ خیال کرنے لگیں سو اب یہ آزاد ہو جاتا ہی اور چونکہ ناٹک میں تم اسے تحریک دے چکے ہو تو گھر پر تم خود بھی بلا ارادہ و بلا شعور ظریف شاعر کا روپ اختیار کر لیتے ہو۔

گ :- بہت صحیح۔

میں :- پھر یہی حال شہوت و غضب اور دیگر جذبات کا ہی، نیز خواہش کا اور حظ و کرب کا جو افعال انسانی سے کبھی جدا نہیں ہو سکتے، ان سب میں شاعری بجائے اسکے کہ جذبات کے سوتھ سکھائے ان کی پرورش و آبیاری کرتی ہی، اور انسانی مسرت و خوبی کے لیے جن چیزوں کو قابو میں رکھنا ضروری ہی یہ اُن کے ہاتھ میں عنان حکومت دیدیتی ہی۔

گ :- میں اس سے تو انکار نہیں کر سکتا۔

میں :- چنانچہ، گلاکن جب کبھی ہومر کے کسی مداح سے ملاقات ہو جس کا دعویٰ ہو کہ ہومر یونان کا معلم تھا، تعلیم و معاملات انسانی کی تنظیم کے لیے اسکا کلام نہایت مفید ہی اور ہمارا فرض ہی کہ اسے بار بار پڑھیں اور اسے سمجھکر اس کی تعلیم کے مطابق اپنی ساری زندگی کو ترتیب دیں، تو بھائی ہم ان لوگوں کی تعظیم و تکریم تو سب کچھ کرینگے کہ جہاں تک ان کی روشنی کام دیتی ہی غریب اچھے لوگ ہیں اور ساتھ ہی ہم ہومر کو

سب سے بڑا شاعر اور اولین المناک مصنف بھی تسلیم کریں گے لیکن ہم اس عقیدہ پر پختگی
سے قائم رہیں گے کہ دیوتاؤں کی تسبیح اور مشاہیر کی مدح ہی صرف شاعری کی دو
قسمیں ہیں جنھیں اپنی ریاست میں داخل ہونے دینا چاہئے۔ اس لیے کہ جہاں اس سے
آگے قدم بڑھایا اور رزمی یا غنائی کی شکل میں شعر کی شکریں دیوی کو آنے دیا
کہ بس بجائے قانون و عقل کی فرمانروائی کے جنھیں اجماع عام نے بہترین حکمران تسلیم کیا
ہے حظ و کرب اور مسرت و الم کا دور دورہ ہوگا۔

گ :- نہایت درست۔

میں :- اب کہ ہم دوبارہ شاعری کے موضوع پر لوٹے ہیں ہمیں چاہیئے کہ اپنے
پہلے فیصلہ کی معقولیت اس عذر سے ثابت کریں جس کی رو سے ہم نے اس فن کو جس میں
مذکورہ رجحانات ہوں اپنی ریاست سے خارج کیا تھا۔ لیکن اسلئے کہ یہ ہم پر تشدد و
عدم رواداری کا الزام نہ لگا سکے، آؤ ہم اس سے یہ بھی کہدیں کہ فلسفہ اور شاعری میں
تو بڑی قدیم عداوت ہے اور اسکے بہتیرے ثبوت ہیں "وہ کتیا جو اپنے آقا پر بھونکتی ہے" والا
مقولہ یا "احمقوں کی بیکار صحبت میں سربلند" یا وہ "انبوہ عقلا" والا حوالہ "جو زیس
کی دربارداری کیا کرتے ہیں" یا "وہ باریک بین نازک خیال سارے کے سارے دریوزہ گر
الغرض اس پر اپنے تخاصم کی ان جیسی اور بے گنتی نشانیاں ہیں۔ لیکن باوجود اس کے
آؤ ہم اپنی محبتہ شیریں اور اس کی دیگر بہنوں کو یقین دلائیں کہ بس اگر یہ ایک منظم ریاست
میں اپنے وجود کا حق ثابت کردیں تو ہم نہایت خوشی سے ان کا خیر مقدم کریں گے

ہمیں تو خود اس کی دلاویزی کا احساس ہے، لیکن ہم کچھ اس وجہ سے حق کا ساتھ تو چھوڑ نہیں سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی اس کی دلفریبی سے اسی قدر متاثر ہوتے ہوگے جتنا کہ میں اور خصوصاً جب یہ ہومر کے پیکر میں رونما ہوتی ہے؟

گ :- ہاں، سچ ہے، میں بھی بہت متاثر ہوں۔

میں :- تو میں تجویز کروں کہ اسے جلاوطنی سے واپسی کی اجازت مل جائے لیکن بس اس شرط پر کہ یہ غنائی یا کسی اور بحر میں اپنی صفائی پیش کرے؟

گ :- ضرور

میں :- اسکے علاوہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان عاشقان شعر اور مذر خواہان شاعری کو جو خود شاعر نہیں اس امر کی اجازت دیں کہ یہ اس کی طرف سے نثر میں گفتگو کر سکیں یہ لوگ ہمیں جتائیں کہ شاعری محض مسرت بخش ہی نہیں بلکہ ریاستوں اور انسانی زندگی کے لیے مفید بھی ہے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ نہایت ہمدردانہ طریق سے ان کا عذر سینگے اس لیے کہ اگر یہ ثابت ہوجائے تو ہمارا بھی تو فائدہ ہے، یعنی میں نے کہا اگر شاعری میں مسرت کے علاوہ افادہ بھی ہو۔

گ :- بیشک، ہمارا فائدہ ہے۔

میں :- اگر اس کا عذر ناکام رہا تو پھر محب عزیز، مثل اس شخص کیطرح جو ایک چیز کا دلدادہ ہے لیکن چونکہ اس کی آرزو اسکے اغراض کے منافی ہے لہذا اپنے اوپر جبر کرتا ہے ہم بھی کہ دلدادگان شعر ہیں اسے چھوڑ دیں گے اگرچہ بلا کشمکش تو نہیں۔ ہم میں بھی تو آخر

محبت شعر کی وہ روح موجود ہی جو شریف ریاستوں کی تعلیم نے ہمارے اندر پھونکی ہے
چنانچہ ہماری خود بھی خواہش ہی کہ یہ اپنی سچی اور بہترین شکل میں ہمارے سامنے آئے
لیکن جب تک وہ یہ صفائی نہ پیش کر سکے تو ہماری گزشتہ دلیل ہمارے لیئے
ایک منتر کا کام دیگی، ہم جب اس کے نغموں کو سنیں گے تو اپنا یہ منتر بھی برابر دہراتے
جائیں گے، تاکہ ہم بھی اس کے اس طفلانہ عشق کا شکار نہ ہو جائیں، جو عوام کو پابزنجیر
کیے ہوئے ہی۔ بہرحال ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ چونکہ شاعری کی حقیقت وہی ہے جو
ہم نے بیان کی لہذا اس سے حصول حق کی کچھ سنگین توقع نہیں کیجا سکتی۔ چنانچہ
جو بھی اسے سنے اور اپنے اندرونی شہر کی حفاظت کا کھٹکا بھی رکھتا ہو اُسے چاہیئے کہ
ہمارے الفاظ کو اپنا آئین بنائے اور اسکے بہکاوے سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی
کوشش کرے۔

گ:- جی ہاں، میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔

میں:- ہاں، عزیزمن گلاکن، امر فیصلہ طلب نہایت عظیم الشان ہی جتنا
بظاہر معلوم ہوتا ہی اس سے کہیں زیادہ، یعنی یہ کہ انسان نیک بنے یا بد؟ اور بھلا
اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہی کہ عزت، دولت، یا قوت کی خاطر یا ہاں شعر کے ہیجان
سے کوئی نیکی اور عدل کو بھول بیٹھے؟۔

گ:- جی، میں تو اس دلیل سے پورا قائل ہو گیا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ
ہر ایک قائل ہو جاتا۔

میں :- اور پھر بھی ابھی ان انعام اکراموں کا ذکر ہی نہیں ہوا جو نیکی کے لیے محفوظ ہیں -

گ :- کیا؟ کیا ابھی اور بھی بڑے انعام ہیں؟ اور اگر ہیں تو نا قابلِ فہم عظمت کے انعام ہونگے؟ -

میں :- کیوں، تھوڑے سے وقت بھلا کون چیز بہت بڑی ہو سکتی ہے؟ یہ تین بیس اور دس سال کا زمانہ ازل کے مقابلہ میں تو نہایت ہی چھوٹی چیز ہے -

گ :- بلکہ کہئے کہ کچھ نہیں -

میں :- تو کیا ایک غیر فانی وجود کو اس کُل کے مقابلہ میں اس قلیل زمانہ کا خیال کرنا چاہیئے -

گ :- ظاہر ہے کل کا خیال کرنا چاہیئے - لیکن حضرت آپ یہ پوچھتے کیوں ہیں؟

میں :- کیوں، کیا تم نہیں جانتے کہ روحِ انسانی غیر فانی ہے اور کبھی نہیں مرتی -

گ :- (میری طرف تحیّر و استعجاب سے دیکھکر) نہیں، بخدا - اور کیا آپ واقعی اُسے ماننے کو تیار ہیں؟

میں :- ہاں، مجھے ماننا چاہیئے اور تمہیں بھی - اس کے ثابت کرنے میں کوئی دشواری نہیں -

گ :- مجھے تو بڑی دشواری معلوم ہوتی ہے - لیکن بہر حال میں آپکی دلیل ضرور سُنونگا جسے آپ ایسا سہل بتاتے ہیں -

میں :- تو سُنیئے؟

گ :- میں متوجہ ہوں۔

میں :- ایک چیز ہی جسے ہم خیر یا اچھائی کہتے ہیں اور ایک دوسری چیز ہی جسے شر یا برائی؟۔

گ :- جی۔

میں :- کیا آپ مجھ سے متفق ہیں کہ مخرب اور تباہ کن عنصر شر ہی اور بچانے والا اور ترقی دینے والا عنصر خیر؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- اور آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر چیز کی ایک اچھائی ہوتی ہی اور ایک بُرائی مثلاً قصر بصارت (   ) آنکھوں کی بُرائی ہی اور مرض سارے جسم کی عفونت غلہ کی بُرائی ہی، گھُن لکڑی کی، زنگ لوہے تانبے کی۔ ہر چیز میں یا یوں کہو کہ تقریباً ہر چیز میں ایک قدرتی بُرائی اور مرض ہوتا ہی؟۔

گ :- جی۔

میں :- اور جب ان میں سے کوئی بُرائی کسی چیز میں پیدا ہوجائے تو یہ چیز بھی بُری ہوجاتی ہی اور بالآخر بالکل تحلیل ہو کر فنا ہوجاتی ہی۔

گ :- درست۔

میں :- جو شر اور عیب ہر ایک کی فطرت میں مضمر ہی وہی اُس کی تباہی ہی، اور

اگر یہ نہ تباہ کر سکے تو پھر اسے کوئی تباہ نہیں کر سکتا، کیونکہ خیر و نیکی تو تباہ کرے گی ہی نہیں اور نہ وہ جو نہ شر ہی نہ خیر۔

گ :- یقیناً نہیں۔

میں :- چنانچہ اگر کوئی ایسی طبیعت ملے جس میں یہ قدرتی خرابی تو ہو لیکن اسے تحلیل و تباہ نہ کر سکے تو ہم بہ یقین کہہ سکتے ہیں کہ اسکے لیے کوئی تباہی نہیں۔

گ :- جی، یہ تو فرض کیا جا سکتا ہے۔

میں :- اچھا، اور کیا ایسی کوئی برائی نہیں جو روح کی تخریب کر سکے؟

گ :- کیوں نہیں، وہ ساری کی ساری برائیاں ہیں جن پر ہم ابھی ابھی نظر ڈال رہے تھے، بدی، بے عقلی، بزدلی۔ جہالت۔

میں :- لیکن ان میں سے کوئی بھی کیا اسے تحلیل یا تباہ کر دیتی ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے اس دھوکہ میں نہ پڑنا چاہیئے کہ جب بیوقوف غیر منصف انسان پکڑا جاتا ہے تو وہ اپنی ناانصافی کے باعث تباہ ہوتا ہے جو روح کا عیب ہے۔ جسم کی تمثیل لو، جسم کی برائی ایک مرض ہے جو اسے گھلا گھلا کر گھٹاتی اور بالآخر بالکل برباد کر دیتی ہے۔ اور وہ ساری چیزیں جن کا ہم ابھی ذکر کر رہے تھے ان خرابیوں اور عیبوں سے تباہ ہوتی ہیں جو ان سے وابستہ اور ان میں مضمر ہیں۔ کیوں، سچ ہے نا؟

گ :- جی ہاں۔

میں :- اسی طرح روح پر دھیان کرو۔ کیا ناانصافی یا اور کوئی برائی جو روح

میں موجود ہو اسے تحلیل کرسکتی ہو؟ کیا بُرائیاں روح سے وابستہ رہ کر بالآخر اُس کی موت کا باعث ہوتیں اور اس طرح اسے جسم سے جدا کرتی ہیں؟

گ :- ہرگز نہیں۔

میں :- اور تاہم یہ فرض کرنا خلاف عقل ہوگا کہ جس چیز کو اس کی اپنی برائی تباہ نہ کرسکے وہ کسی خارجی بُرائی کے اثر سے تباہ ہو جائے۔

گ :- جی۔

میں :- گلاکن! ذرا سوچو کہ غذا تک کی بُرائی مثلاً بدمزگی، سڑن یا کوئی اور بُری صفت اگر غذا ہی تک محدود ہو تو یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس سے جسم کی تباہی رونما ہوئی۔ ہاں جب غذا کی خرابی جسم میں خرابی ڈالے تو اس وقت یہ کہنا چاہیئے کہ جسم خود اپنے عیب سے تباہ ہوا یعنی مرض سے جسے غذا نے پیدا کیا لیکن یہ ہم کبھی تسلیم نہ کرینگے کہ جسم ایک الگ چیز ہے اور غذا ایک الگ چیز جس سے کوئی قدرتی تعدی نہیں ہوتی اور یہ کہ پھر بھی غذا نے جسم کو تباہ کر دیا۔

گ :- بہت درست۔

میں :- اور اسی اصول پر جب تک ایک جسمانی بُرائی روحانی برائی پیدا نہ کرسکے ہمیں کبھی یہ فرض نہ کرنا چاہیئے کہ روح جو بالکل جدا چیز ہے کسی ایسی خارجی بُرائی سے تباہ ہو سکتی ہے جو کسی دوسری چیز سے تعلق رکھتی ہو۔

گ :- بیشک، اس خیال میں تو کوئی معقولیت نہیں۔

میں :۔ لہذا یا تو اس نتیجہ کا رد ہو، یا پھر جب تک ہے رہی ہم کبھی یہ نہ کہیں کہ بخار یا کوئی دوسرا مرض گلے پر خنجر کا چلنا، یا جسم کا چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹا جانا روح کو تباہ کر سکتا ہے۔ جبتک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ جب جسم کے ساتھ یہ اعمال ظہور میں آئیں تو وہ (روح) بھی اس وجہ سے ناپاک یا بد ہو جاتی ہے لیکن جب روح یا کوئی اور شے اپنی داخلی برائی سے تباہ نہ ہو تو پھر یہ تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی خارجی عیب سے تباہ ہو سکتی ہے۔

گ :۔ اور یقیناً یہ تو کوئی بھی ثابت نہ کر سکیگا کہ موت کے باعث انسانوں کی روحیں بد یا غیر منصف ہو جاتی ہیں۔

میں :۔ لیکن اگر کوئی شخص روح کے غیر فانی ہونے کو تسلیم نہ کرے اور اسکا صاف منکر ہو اور یہ کہے کہ مرنے والے واقعی بد اور غیر منصف ہو جاتے ہیں تو اگر اسکا قول صحیح ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ناانصافی کو بھی مرض کی طرح غیر منصف کے لیے مہلک تصور کرنا چاہیئے یعنی جنہیں یہ روگ لگ گیا وہ برائی کی اُس ذاتی تباہ کن قوت سے مر جاتے ہیں جو بُرائی کی فطرت میں مضمر ہے اور جو جلد یا بہ دیر ہلاکی کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت اس سے بالکل جُدا گانہ ہے جسمیں آج کل بد لوگ دوسرے کے ہاتھوں اپنے اعمال بد کی پاداش میں موت کا منہ دیکھتے ہیں۔

گ :۔ نہیں۔ اگر ناانصافی غیر منصف کے لیے مہلک ہو تو اس صورت میں تو یہ اس کے لیے اسقدر ہیبتناک نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ اپنی بُرائی سے نجات پا جائیگا

میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقت اسکے بالکل خلاف ہی۔ یعنی اگر نا انصافی میں طاقت ہو تو دوسروں کو تو قتل کرے لیکن خود قاتل کو سلامت رکھے اور خوب جیتا جاگتا۔ اس کا مسکن اور دار اجل باہم بہت بعید ہیں ؛

میں :- سچ ہے۔ اگر روح کی فطری بُرائی اور اسکا ذاتی عیب اسے ہلاک و برباد کرنے سے معذور ہی تو پھر جو چیز کسی دوسرے جسم کی تباہی کے لیے متعین کی گئی ہو وہ اس روح کو یا سوائے اس چیز کے جس کی بربادی اسکا مقصود ہی کسی اور کو کیونکر تباہ کر سکیگی۔

گ :- جی ہاں ، یہ تو مشکل ہی سے ممکن ہے۔

میں :- لیکن جو روح کسی بُرائی سے تباہ نہ ہو نہ خارجی سے نہ داخلی سے وہ تو ہمیشہ موجود رہیگی اور چونکہ ہمیشہ موجود رہیگی اس لیے غیر فانی ہوگی ؟

گ :- یقیناً

میں :- تو یہ نتیجہ نکلا۔ اور اگر یہ نتیجہ صحیح ہے تو روحیں ہمیشہ وہی رہنی چاہئیں کیونکہ جب ان میں سے کوئی ہلاک نہ ہوگی تو ان کی تعداد بھی نہ گھٹیگی۔ اور نہ ان کی تعداد بڑھیگی ، کیونکہ غیر فانی طبائع کی تکثیر کہیں کسی فانی چیز سے آنی چاہیئے اور اس طرح سب چیزوں کا انجام جاکر بقا میں ہوگا۔

گ :- بہت بجا۔

میں :- لیکن یہ تو ہم یقین کر نہیں کر سکتے۔ عقل اسکی اجازت نہیں دیتی۔ جس طرح ہم یہ بات باور نہیں کر سکتے کہ روح اپنی صادق ترین ماہیت میں عدمِ

یکسانیت، تنوع اور اختلاف سے پر ہو۔

گ :- یعنی کیا ؟

میں :- جیسا کہ ثابت ہو چکا روح کی ترکیب حسین ترین ہونی چاہیئے! اور پھر یہ بہت سے عناصر سے کس طرح مرکب ہو سکتی ہو؟

گ :- جی، ہرگز نہیں۔

میں :- اس کا غیر فانی ہونا تو سابقہ دلیل سے ثابت ہو گیا اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ثبوت ہیں۔ لیکن اگر اسے اس کی حقیقی شکل میں دیکھنا ہو، ایسے نہیں جس طرح ہم اب دیکھتے ہیں، یعنی جسم اور دیگر معائب کے تعلق سے آلودہ، تو ہمیں اسے اصلی و خالص حالت میں عقل کی آنکھ سے دیکھنا چاہیئے تب اس کا حسن بے نقاب ہوگا اور اس وقت جا کر کہیں عدل و نا انصافی اور وہ ساری چیزیں جنکا ہم نے ذکر کیا ہو نہایت واضح طور پر ظاہر ہونگی۔ اب تک تو ہم نے اسکے متعلق جو حقائق بیان کیے ہیں وہ اس حالت کی بابت ہیں جس میں وہ اسوقت ظاہر ہوتی ہو! لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم نے اسے جس حال میں دیکھا ہو اس کی مثال بحری دیوتا گلاکس کی سی ہو جس کی اصلی شکل مشکل دکھائی دیتی ہو کہ اسکے عناصر جسم کو سمندر کی موجوں نے طرح طرح سے توڑا مروڑا اور مجروح کیا ہو! بحری نباتات، گھونگھوں اور پتھروں کے کھیپٹ کے کھیپٹ اس پر جم گئے ہیں اور یہ اپنی فطری شکل سے مشابہ ہونیکے بجائے یہ ایک وحشت خیز و ہیبتناک درندہ معلوم ہوتا ہو۔ اسی طرح جو روح ہم دیکھتے ہیں اسکی

شکل بھی ہزار ہا عیوب سے یونہی مسخ ہوتی ہی۔ اس لیے گلاکن بس ادھر دیکھو ہی نہیں۔

گ :۔ پھر آخر کدھر؟

میں :۔ اسی کے حب عرفان کی طرف، اس کی طرف جسے یہ متاثر کرتی ہی اور غیر فانی، ازلی و الٰہی سے اپنے تعلق قریبی کے باعث جس کی صحبت و ہمنشینی کی یہ تمنی ہوتی ہی۔ نیز اس طرف کہ اگر اس اعلیٰ اصول کی اتباع اور ایک ہیجان الٰہی سے یہ اس بحر تاریک سی نکل آے جس میں یہ اب ہی اور ان کنکر پتھروں، ارضی چیزوں اور چٹانوں سے جو اس لیے اسکے گرد جنگلی چیزوں کی طرح پھوٹی پڑتی ہیں کہ یہ ارضی غذا رکھتی ہی اور اس زندگی کی نام نہاد پسندیدہ چیزوں سے پٹی پڑی ہی ہاں اگر یہ ان سب سے پاک ہو جائے تو پھر یہ کس درجہ مختلف ہو جائیگی۔ ہاں تو جب اس طرف نظر کروگے اُسوقت اسے اصلی حالت میں دیکھو گے اور معلوم کرسکو گے کہ اس کی ایک ہی شکل ہی یا بہت سی شکلیں اور اس کی ماہیت کیا ہی۔ موجودہ زندگی اسکے عوارض اور جو اشکال یہ اختیار کرتی ہی ان کی بابت میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم کافی کہہ چکے۔

گ :۔ درست۔

میں :۔ اور اس طرح ہم نے دلیل کے شرائط کو پورا کردیا۔ ہم نے انصاف کے ان انعامات اور اعزاز کو بیچ میں آنے ہی نہ دیا جو بقول تمہارے ھومر اور ھیسیاڈ میں مذکور ہیں بلکہ ہم نے تو نفس انصاف کو نفس روح کے لیے بہترین شے ثابت کردیا ہے، کسی کے پاس گائیگیس کی انگشتری ہو یا نہو اسے انصاف کرنا چاہیئے، اور اگر صرف

گائیگیس کی انگشتری ہی نہیں اُسکے ساتھ ظلمات کا خود بھی ہو تب بھی (انصاف ہی کرنا چاہیئے)۔

گ :- نہایت درست۔

میں :- تو اب چنداں مضائقہ نہیں اگر ہم، یہ بھی گنوا دیں کہ انصاف اور دوسرے محاسن روح کیلیے حیات میں اور بعد ممات دیوتاؤں اور انسانوں سے کتنے اور کیسے کیسے انعامات حاصل کرتے ہیں۔

گ :- جی، مطلق نہیں۔

میں :- اچھا تو بھائی تم نے دوران دلیل میں جو قرض لیا تھا وہ اب واپس کرو!

گ :- کیا، قرض کیا لیا تھا؟

میں :- یہ مفروضہ کہ منصف نا انصاف اور غیر منصف عادل معلوم ہو۔ تمہارا خیال تھا کہ ہر چند کہ معاملہ کی اصلی نوعیت دیوتاؤں اور انسانوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تاہم خالص انصاف کا خالص نا انصافی سے تقابل کرنے کے لیے یہ فرض کرنا ضروری تھا۔ کیوں! یاد ہی نا؟

گ :- اگر بھول جاؤں تو نہایت قابل الزام بات ہو گی۔

میں :- اب کہ معاملہ فیصل ہو چکا میں انصاف کی طرف سے مطالبہ کرتا ہوں کہ ہم انصاف کو وہ منزلت و شہرت واپس دیں جو یہ دیوتاؤں اور انسانوں کی نظر میں رکھتا ہی اور ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ اس کا حق ہی۔ اور چونکہ یہ بھی ظاہر ہو چکا کہ یہ اپنے

سچے عاملوں کو دھوکہ نہیں دیتا بلکہ ان میں واقعی حقیقت پیدا کرتا ہی لہذا وہ جو اس سے چھینا گیا تھا اب اسے واپس ملنا چاہیئے تاکہ یہ ظاہریت کا نشان فتح بھی حاصل کرے جو دراصل اس کا حق ہی اور جو یہ اپنے عاملوں کو عطا بھی کرتا ہی۔

گ :۔ مطالبہ تو نہایت حق بجانب ہی۔

میں :۔ پہلی بات تو یہ۔ اور یہ اول چیز ہی جو آپ کو واپس کرنی ہی۔ کہ منصف اور غیر منصف دونوں کی ماہیت دیوتاؤں کو اچھی طرح معلوم ہوتی ہی۔

گ :۔ تسلیم۔

میں :۔ اور جب یہ دونوں ان کے علم میں ہیں تو ان میں سے ایک انکا دوست اور دوسرا ان کا دشمن ہونا چاہیئے، یہ تو ہم شروع ہی سے تسلیم کرتے آئے ہیں؟

گ :۔ بجا ہی۔

میں :۔ اور سمجھنا چاہیئے کہ دیوتاؤں کے دوستوں کو تو ہمیشہ سب چیزیں اچھی ہی اچھی ملیں گی، سوائے ان بری چیزوں کے جو سابقہ معصیت کا لازمی نتیجہ ہوں۔

گ :۔ بیشک۔

میں :۔ چنانچہ با انصاف انسان کے متعلق ہمارا تصور یہ ہونا چاہیئے کہ خواہ وہ افلاس میں مبتلا ہو یا مرض میں یا اور کسی فلاکت و مصیبت میں آخر میں جاکر ساری باتیں زندگی و موت میں اس کی بھلائی کا باعث ہونگی۔ کیونکہ دیوتا ہمیشہ اس کی فکر رکھتے ہیں جو عادل بننے اور جہانتک عمل صالح سے تمثال الٰہی کا حصول ممکن ہی خدا کی طرح ہونیکا

آرزومند ہوتا ہے۔

گ :۔ جی ہاں، جو خود اُس کا سا ہو اُسے تو خدا یقیناً نہ بھولیگا۔

میں :۔ اور غیر منصف کے معاملہ میں اس کا اُلٹا؟

گ :۔ یقیناً۔

میں :۔ تو یہ ہیں وہ انعامات فتح جو عادل انسان کو دیوتاؤں سے ملتے ہیں؟

گ :۔ جی، میرا تو یہی عقیدہ ہے۔

میں :۔ اور انسانوں سے اسے کیا ملتا ہے؟ ذرا واقعات کو انکی اصلی نوعیت میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ چالاک ناانصاف لوگوں کی مثال ان دوڑنے والونکی سی ہے جو دوڑ کے شروع والے سرے سے دوسرے سرے تک تو خوب اچھی طرح دوڑ جاتے ہیں لیکن پھر وہاں سے واپس نہیں ہو سکتے پہلے پہل تو خوب سرپٹ بھاگ لیتے ہیں لیکن آخر میں احمق بنتے ہیں اور بلا فتح کے تاج کے کندھوں پر کان ڈالے لشتم پشتم چلے آتے ہیں۔ جو واقعی اچھا دوڑنے والا ہوتا ہے وہ آخر تک پہونچتا ہے، چنانچہ اسے انعام بھی ملتا ہے اور سر پر فتح کا تاج بھی رکھا جاتا ہے، یہی حال باانصاف آدمی کا ہے، یہ اپنے تمام اعمال و معاملات کو بہ جبر تا اختتام پہونچاتا اور ختم حیات پر سب کی زبان پر اس کی بھلائی ہوتی ہے اور یہ وہ انعام پالیتا ہے جو انسان عطا کر سکتے ہیں۔

گ :۔ درست۔

میں :۔ اور اب مجھے اجازت دو کہ میں باانصاف آدمی کے ساتھ ان تمام برکتوں

کو منسوب کردں جو تم خوش نصیب بے انصاف کے لیے بیان کر رہے تھے۔ تم جو اوروں کے لیے کہتے تھے میں اب اُن کے لیے کہتا ہوں یعنی جب ان کا سن ترقی کرتا ہے تو یہ اگر چاہیں تو اپنے شہر میں حاکم بن سکتے ہیں، جس سے چاہتے ہیں شادی کرتے اور جسے چاہتے ہیں اپنی بیٹیاں بیاہتے ہیں؛ غرض جو جو بھی تم نے اوروں کی بابتہ کہا وہ اب میں سب کا سب ان کے لیے کہتا ہوں۔ اور برخلاف اس کے اب بے انصافوں کی بابت میں کہتا ہوں کہ ان میں سے اکثر چاہے جوانی میں بچ نکلیں بالآخر پکڑے ہی جاتے ہیں اور اپنے دور کے ختم پر احمق ہی بنتے ہیں۔ پھر جب بڑھاپا آتا ہے تو اپنے پرائے، شہری اور اجنبی سب ان کی توہین کرتے ہیں؛ مار کھاتے ہیں اور وہ درگت بنتی ہے کہ ان کا ذکر بقول تمہارے کانوں پر گراں ہے؛ طرح طرح کے عذاب ہوتے ہیں، آنکھیں جلا کر نکالی جاتی ہیں بس فرض کر لو کہ میں نے تمہارا وہ سارا قصۂ مصائب دُہرا دیا۔ انھیں بلا بیان کیے میں فرض کر سکتا ہوں نا کہ یہ ساری باتیں صحیح ہیں؟

گ:۔ بیشک، آپ جو فرماتے ہیں بالکل درست ہے۔

میں:۔ تو یہ ہیں وہ انعام، اکرام اور تحفے جو عادل انسانوں کو موجودہ زندگی میں آدمیوں اور دیوتاؤں سے حاصل ہوتے ہیں اور یہ سب ان اچھی چیزوں کے علاوہ ہیں جو عدل وانصاف سے بذات خود پیدا ہوتی ہیں۔

گ:۔ جی ہاں، اور یہ انعام خوب ہیں اور پائدار بھی۔

میں:۔ اور پھر بھی یہ سب کچھ اس معاوضہ کے مقابلہ میں باعتبار تعداد اور

با عتبار عظمت کوئی اصلیت نہیں رکھتے جو بعد موت منصف اور غیر منصف دونوں کے لیے منتظر ہیں۔ اب انھیں سنو، تب جاکر کہیں وہ قرض ادا ہوگا جسکا منصف اور غیر منصف دونوں کو ہماری دلیل پر حق پہونچتا ہی۔

گ:۔ فرمائیے، فرمائیے۔ کم ہی چیزیں ہونگی جنھیں میں اس شوق سے سنونگا۔

میں:۔ اچھا تو میں ایک قصہ سناؤں، ان قصّوں میں سے نہیں جو اوڈیسیس نے بطل السی نوس کو سنائے ہیں، لیکن ہاں یہ بھی ایک بطل کا قصہ ہی یعنی ایر بن ارمینیس کا جو پیدایشاً پامفلی تھا۔ یہ لڑائی میں مارا گیا، اور دس دن بعد جب لوگوں نے لاشیں اٹھائیں تو اور سب جسم تو سڑ چلے تھے لیکن اس کے جسم پر کوئی اثر نہ تھا، چنانچہ اس کی نعش کو دفن کرنے کے لیے گھر لے گئے۔ بارھویں دن کہ نعش پر رکھی تھی یہ دوبارہ زندہ ہوگیا اور دوسرے عالم میں جو کچھ دیکھا تھا وہ لوگوں کو سنایا اس نے کہا کہ جب میری روح نے جسم کو چھوڑا تو میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ سفر پر چلا، چلتے چلتے ہم ایک خفیہ مقام پر پہونچے جہاں زمین میں دو دروازے تھے، یہ دونوں دروازے پاس ہی پاس تھے اور ان کے مقابل اوپر آسمان میں بھی دو دروازے تھے۔ درمیانی فضا میں حاکم اجلاس کررہے تھے۔ جب عادل انسانوں کا معاملہ فیصل ہوچکتا اور حکم ان کے سامنے باندھ دیا جاتا تو انھیں حکم ملتا تھا کہ آسمانی رستہ سے سیدھے ہاتھ کی طرف چڑھ جاؤ، اسی طرح ناانصافوں کو الٹے ہاتھ کی طرف نیچے اترنے کا حکم ہوتا تھا، انکے اعمال کی نشانیاں بھی ساتھ ہوتی تھیں لیکن بجائے سامنے کے،

پشت پر آویزاں۔ میں جو قریب بڑھا تو مجھ سے کہا کہ تو وہ پیامبر ہے جو اس عالم کی اطلاع انسانوں تک لیجائیگا اور مجھے حکم ہوا کہ یہاں جو کچھ دیکھنے سننے کی باتیں ہیں سب دیکھ سن لوں۔ میں نے جو نظر کی تو دیکھا کہ جب انکا فیصلہ سنا دیا جاتا تھا تو زمین اور آسمان کے ایک ایک دروازے سے تو روحیں رخصت ہو رہی تھیں اور دوسرے دونوں دروازوں سے روحیں کچھ تو گرد آلود اور سفر سے ماندہ زمین سے اوپر آتیں اور کچھ نہایت صاف جاگ مگ آسمان سے نیچے اُترتیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب کی سب کسی لمبے سفر سے ابھی ابھی آرہی ہیں۔ یہ سب خوشی خوشی سبزہ زار کو جاتیں اور وہاں جاکر یوں پڑاؤ ہوتا گویا کوئی تہوار ہے۔ جو روحیں ایک دوسرے سے واقف تھیں وہ گلے ملتیں اور خوب باتیں کرتیں، زمین سے آنیوالی روحیں نہایت اشتیاق سے حالات بالائی کے متعلق دریافت کرتیں اور آسمان سے آنیوالی روحیں کوائف زیریں کی بابتہ، سب ایک دوسرے سے رستہ کے واقعات بیان کرتیں، نیچے سے آنے والی روحیں اپنے جو کچھ زیر زمین سفر میں گذری تھی (اور یہ سفر ہزار سال کا تھا) اس کی یاد پر روتیں اور افسوس کرتیں، اوپر سے آنیوالیاں آسمانی مسرتوں اور ناقابل تصور مظاہر حسن کا بیان کرتیں۔ سارا قصہ تو گلاکن بڑا وقت لیگا خلاصہ یہ ہی اس نے بیان کیا کہ انھوں نے کسی کے ساتھ جو بُرائی کی تھی اس کا دہ چند عذاب بھگتنا پڑا یعنی اگر سو سال میں ایک دفعہ بُرائی کی تھی۔ (اور انسانی عمر کا یہی اندازہ کیا گیا ہے) تو سزا دس گنی ایک ہزار سال میں پوری ہوئی۔ مثلاً اگر کوئی بہت موتوں کا باعث

ہوا ہو، اگر کسی نے شہروں یا لشکروں کو غلام بنایا یا انہیں دغا دی ہو یا کسی اور بدکرداری کا مرتکب ہوا ہو تو ان تمام گناہوں کے لیے اور ایک ایک کر کے دس گنی سزا ملتی ہے اسی طرح احسان، عدل اور تقویٰ کا انعام بھی اسی نسبت سے ملتا ہے۔ اس کے دہرانے کی تو چنداں ضرورت نہیں جو اس نے ان چھوٹے بچوں کی بابت کہا جو پیدا ہوتے ہی مرجاتے ہیں۔ دیوتاؤں اور والدین کے ساتھ سعادتمندی یا غیر سعادتمندی کی بابت نیز قاتلوں کے متعلق اس نے اور بہت بڑی بڑی جزاؤں سزاؤں کا بیان کیا۔ یہ کہتا تھا کہ جب ایک روح نے دوسری سے دریافت کیا کہ "آدریائیس اعظم کہاں ہے؟" تو یہ خود وہاں موجود تھا۔ (اور یہ آدریائیس، ایر کے زمانہ سے کوئی ہزار سال قبل تھا، یہ پامفیلیا کے کسی شہر کا مستبد حاکم تھا، اپنے بوڑھے باپ اور بڑے بھائی کو اس نے قتل کرا ڈالا تھا اور کہتے ہیں کہ ایسے ہی اور بہت سے نفرت انگیز گناہوں کا مرتکب تھا) دوسری روح نے جواب دیا کہ "وہ یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی آئے۔ اور یہ منجملہ ان ہیبتناک مناظر کے تھا جن کا ہم نے خود مشاہدہ کیا۔ ہم غار کے دہانہ پر تھے اور چونکہ اپنا سارا تجربہ حاصل کر چکے تھے اس لیے اب اوپر چڑھنے والے تھے کہ یکایک آدریائیس اور اور کئی لوگ نمودار ہوئے، ان میں سے اکثر جابر مستبد تھے۔ اور ان ظالموں کے علاوہ اور افراد بھی تھے جو دنیا میں بڑے بڑے مجرم رہ چکے تھے۔ انکا خیال تھا کہ بس ابھی عالم بالا کو واپس جاتے ہیں لیکن بجائے اسکے کہ دہانہ میں یہ داخل ہو سکیں جب ان میں سے کوئی جس کی کافی سزا نہ ہو چکی تھی چڑھنے کی کوشش کرتا اس سے ایک سخت چیخ نکلتی

اسپر کچھ ہیبت آتشیں روانسان جو پاس کھڑے اس آواز کو سنتے تھے انھیں پکڑ کر ساتھ لیجاتے اور پاتیں اور بعض دوسروں کو تو انھوں نے سر پیر ہاتھ سب باندھ کر نیچے پھینک دیا پھر راستہ بھر انھیں خوب گھسیٹا، انھیں کانٹوں پر ادن کی طرح دھنکا۔ اور راہ چلتوں سے برابر کہتے جاتے تھے کہ انھوں نے یہ یہ جرم کیے تھے اور اب ہم انھیں جہنم میں ڈالنے لیئے جاتے ہیں۔ ہم نے جو بہت سی صعوبتیں اٹھائی ہیں ان میں کوئی مصیبت اس گھڑی سے کٹھن نہ تھی جب ہم یہ سوچتے تھے کہ کہیں ہمارے لیے بھی یہ آواز نہ نکلے لیکن جب خاموشی رہی تو ہم ایک ایک کرکے خوشی خوشی اوپر چڑھ آئے" بقول آیرٌ یہ تو تھے وہاں کے بدلے اور سزائیں اور پھر انعام اور برکتیں بھی ایسی ہی تھیں۔

یہ روحیں سات دن تک اسی میدان میں مقیم رہیں، آٹھویں دن انھیں حکم ملا کہ پھر سفر شروع کریں۔ چوتھے دن یہ ایک جگہ پہونچیں جہاں سے روشنی کی شعاع دکھائی دیتی تھی سیدھی جیسے ستون، آسمان و زمین کے آر پار، رنگ میں دھنک سی مشابہ لیکن پاکیزہ اور روشن تر۔ ایک دن بھر اور چلکر اس جگہ پہنچ گئے۔ یہاں اس روشنی میں انھوں نے آسمانی زنجیروں کے سرے دیکھے جو اوپر سے لٹکی ہوئی تھیں۔ یہ روشنی آسمان کی پیٹی ہے اور سارے کرۂ عالم کو اس طرح یکجا کیے ہوئے ہے جیسے تمنکے جہاز کی نیچ کی کڑیاں زنجیر کی ان سروں میں جبر دلزدم کا تکلا لٹکا ہے اور اسی پر سارے چکر ہوتے ہیں۔ اس تکلے کے سہم اور کلابہ فولاد کے ہیں اور پھر کی کچھ فولاد کی اور کچھ اور دوسرے مسالہ کی پھرکی کی شکل وہی ہے جیسی یہاں دنیا میں عام رواج ہے، آیر نے اسکا جو بیان دیا اس سے

پتہ چلتا تھا کہ ایک بڑی سی پھرکی ہے جسے اندر سے بالکل کھوکھلا کر دیا ہے اس کے اندر اس سے ایک ذرا چھوٹی پھرکی بٹھا دی ہے، اس کے اندر ایک اور، پھر ایک اور، اسی طرح چار اور الغرض کل آٹھ پھرکیاں ہیں ایسے جیسے ایک برتن کے اندر دوسرا برتن رکھ دیا ہو۔ اوپر کی طرف تو ان پھرکیوں کے سرے دکھائی دیتے ہیں لیکن نیچے سب کے سب ملکر ایک پھرکی بناتے ہیں۔ اس کے اندر سے تکلا گذرتا ہے اور آٹھویں پھرکی کو بیچ میں سے چھیدتا ہے، پہلی پھرکی جو سب سے باہر ہے اس کا کنارہ بھی سب میں بڑا ہے دوسروں کے کنارے اس ترتیب سے چھوٹے ہیں: بڑائی میں چھٹی کا نمبر پہلے کے بعد ہے، چھٹی کے بعد چوتھی کا؛ اس کے بعد آٹھویں، پانچواں نمبر ساتویں کا اور چھٹا نمبر پانچویں کا ہے، تیسری ساتویں نمبر پر ہے اور دوسری سب سے آخر یعنی آٹھویں نمبر پر۔ سب سے بڑی پھرکی (یعنی ثوابت) نہایت مرصع ہے؛ ساتویں (سورج) روشن ترین ہے؛ آٹھویں (چاند) ساتویں کی روشنی کے عکس سے حصول رنگ کرتی ہے؛ دوسری اور پانچویں (زحل اور عطارد) رنگ میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، ہاں اوروں کے مقابلہ میں ذرا پیلے ہیں؛ تیسرے کی (زہرہ) روشنی سب میں سپید ہے؛ چوتھی (مریخ) کچھ سرخی مائل، اور چھٹی (مشتری) سپیدی میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اچھا سارے تکلے کی تو ایک ہی حرکت ہے لیکن جب یہ کل ایک طرف حرکت کرتا ہے تو اندر کے سات چکر سمت مخالف میں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں، ان میں آٹھواں سب سے تیز چلتا ہے اس کے بعد بہ اعتبار تیزی ساتویں، چھٹے اور پانچویں کا نمبر ہے اور سب کے سب

ساتھ ساتھ حرکت کرتے ہیں، پھر حرکت قہقری کے اس قانون کے ماتحت باعتبار تیزی تیسرے نمبر پر چوتھا چکر آتا تھا، چوتھے نمبر پر تیسرا اور پانچویں پر دوسرا۔ تکلا جبر و لزوم کے گھٹنوں پر گھومتا ہے، ہر چکر کے اوپر ایک (جنیہ) مغنیہ ہے جو ساتھ چکر کھاتی اور ایک ہی انداز سے ایک سُر گائے جاتی ہے۔ آٹھوں ملکر ایک متناسب نغمہ مرتب کر لیتے ہیں۔ انکے چاروں طرف برابر برابر فصل سے ایک اور تین کا گروہ ہے، یہ اپنے اپنے تخت پر بیٹھی ہیں یہ ہیں جبر و لزوم کی بیٹیاں، قضا و قدر کی دیویاں۔ یہ سفید لباس زیب تن کئے ہیں، سر پر ہر ایک کے ایک ایک ہار ہے۔ لچیس، کلوتھو اور آترو پوس ان کے نام ہیں۔ یہ اپنی آواز سے مغنیہ (جنیہ) کی موسیقی کا ساتھ دیتی ہیں لچیس ماضی کا ترانہ گاتی ہے، کلوتھو حال کا اور آترو پوس استقبال کا، کلوتھو اپنے سیدھے ہاتھ سے کبھی کبھی تکلے کے باہر والے چکر کو ذرا گھما دیتی ہے، آترو پوس اُلٹے ہاتھ سے اندرونی چکروں کو چھو کران کی رفتار سادھتی ہے، اور لچیس باری باری دونوں کو چھوتی رہتی ہے، کبھی ایک ہاتھ سے کبھی دوسرے سے۔

آیر اور دوسری روحیں جب یہاں پہونچیں تو ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے لچیس کے پاس جائیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک پیغمبر نمودار ہوا جس نے ان سب کو ایک نظام سے مرتب کیا، پھر لچیس کے قدموں سے قسمتیں اور زندگی کے مختلف نمونے لیکر یہ ایک مرتفع منبر پر چڑھ گیا اور انھیں یوں مخاطب کیا، ''سنو! جبر و لزوم کی بیٹی لچیس کا پیغام سنو! فانی روحو! حیات و فنا کا ایک اور دور دیکھو۔ تمہارا رشتہ

تمہیں دیا نہ جائے گا بلکہ تم خود اپنے فرشتہ کا انتخاب کروگے۔ جو پہلی چٹھی اُٹھائے گا اسی کو پہلا حق انتخاب ہوگا، پھر یہ جو زندگی چُنے گا وہی اس کی قسمت ہوجائیگی۔ نیکی آزاد ہوا ور بے آقا؛ جو اس کی جتنی عزت یا جتنی ذلت کریگا اتنی ہی زیادہ یا کم اُسے ملیگی؛ ذمہ داری انتخاب کرنے والے پر ہی اور خدا بری الذمہ" ترجمان نے یہ کہہ کر بلا امتیاز ان میں چٹھیاں منتشر کردیں، جو چٹھی جس کے قریب تھی وہ اُس نے اُٹھالی' اس طرح سوائے آیر کے سب نے اُٹھائیں (اسے اجازت نہ تھی) اور ہر ایک نے دیکھا کہ اسے کونسا عدد ملا ہی۔ اب ترجمان نے انکے سامنے زمین پر زندگی کے نمونے رکھدیئے۔ جتنی روحیں وہاں موجود تھیں ان سے کہیں زیادہ زندگیوں کے نمونے تھے، اور پھر طرح طرح کے۔ سب جانوروں کی زندگیاں تھیں اور ہر حالت کے انسانوں کی۔ ظالم استبدادی زندگیاں بھی تھیں، بعض ایسی کہ ظالم کی عمر بھر بلکہ اس سے زیادہ باقی رہیں بعض ایسی کہ بیچ ہی میں منقطع ہوجائیں اور خاتمہ افلاس دریوزہ گری اور جلا وطنی میں ہو۔ پھر مشاہیر کی زندگیاں تھیں، ایسوں کی جو اپنی شکل صورت اور حُسن نیز طاقت اور کھیلوں میں کامیابی کے لیے مشہور تھے، بعض ایسوں کی جو حسب و نسب اور اجداد کی خوبیوں کے باعث ممتاز تھے، کچھ زندگیاں ایسوں کی بھی تھیں جو انکی بالکل اُلٹی صفات کے باعث بدنام تھیں۔ عورتوں کی زندگیاں بھی تھیں لیکن ان روحوں کی سیرت متعین نہ تھی، کیونکہ جب روح نئی زندگی اختیار کرتی ہی تو لازم ہی وہ بالکل بدل جائے۔ لیکن اور ساری صفات موجود تھیں، سب کی سب ایک دوسرے

سے گذنڈ، دولت وافلاس صحت مرض کے عناصر کی بھی آمیزش تھی، علاوہ بریں دوسری
ذیل کیفیتیں بھی موجود تھیں۔ میرے عزیز گلاکن! یہاں ہی حیات انسانی کا خطرہ عظیم اور
یہیں صد درجہ احتیاط درکار ہے۔ ہر ایک کو چاہیئے کہ اور تمام علم کو بالائے طاق رکھکر بس
اس ایک چیز کی طلب و جستجو میں لگ جائے۔ کیا عجب کہ ہم نیک و بد میں تمیز کرنا سیکھ جائیں
یا ہمیں کوئی شخص ملجائے جو یہ چیز سکھا سکے تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملے ہم بہتر
زندگی منتخب کرسکیں اس کے اسباب پر دھیان رکھنا چاہیئے کہ یہ جو چیزیں ہم نے اوپر
بیان کیں انہیں سے ہر ایک علحدہ علحدہ اور پھر سب ملکر نیکی پر کیا اثر ڈالتی ہیں، اسے
جاننا ہوگا کہ کسی خاص روح میں اگر حسن صورت کو دولت یا افلاس سے ملا دیں تو اس کا
کیا اثر ہوگا؛ اچھے یا بُرے حسب و نسب، خانگی یا سرکاری عہدہ، قوت یا کمزوری چالاکی
و کند ذہنی، روح کے سارے فطری اور کسبی صفات اور ان کے باہمی عمل، ان سب
کے اچھے بُرے نتائج سے اسے آگاہ ہونا چاہیئے۔ تب کہیں یہ روح کی ماہیت کو
دیکھکر، اور ان تمام باتوں پر نظر کرکے بتلا سکیگا کہ کون زندگی بہتر ہے کون نہیں۔
اور اس طرح انتخاب کریگا کہ جو زندگی روح کو زیادہ نا انصاف بنائے وہ بری اور
جو اُسے زیادہ منصف بنائے وہ اچھی۔ باقی دوسری باتوں کو یہ بالکل نظر انداز کردیگا۔
ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ زندگی اور موت دونوں میں یہی بہترین انتخاب ہے۔ انسان کو
چاہیئے کہ اپنے ساتھ عالم زیریں میں بھی حق و صداقت پر ایک غیر متزلزل ایمان ساتھ
لیجائے، تاکہ وہاں بھی دولت کی آرزو اور باطل کے فریب اسکی نگاہ کو خیرہ نہ کرسکیں

اور یہ نہ ہو کہ ظلم و استبداد اور دوسری بدمعاشی کی زندگیوں کو دیکھکر یہ دوسروں کو ناقابل تلافی اذیت پہنچائے اور خود اپنی ذات کو اس سے بھی بڑی مضرت دینے کا باعث ہو۔ اسے جاننا چاہیئے کہ اسی زندگی میں نہیں بلکہ اس کے بعد کے تمام مراحل میں بھی جہاں تک ہو سکے دونوں طرف کے انتہائی سروں کو چھوڑ کر درمیانی راہ کس طرح اپنے لیے منتخب کرے کہ یہی مسرت و شادمانی کی راہ ہے۔

دوسرے عالم کے اس خبر دینے والے نے پھر بیان کیا کہ اس موقع پر اس پیغمبر نے یہ اور کہا: "بالکل آخر میں آنے والے کے لیے بھی اگر وہ سمجھ بوجھ کر انتخاب کرے اور محنت سے زندگی گزارے تو ایک مسرت بخش اور خاصی پسندیدہ حیات مقرر ہے۔ جو سب سے پہلے انتخاب کرتا ہے یہ نہ ہو کہ وہ بے پروا ہو جائے اور جو سب سے آخر میں ہے اسے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔" یہ جب کہہ چکا تو جسے سب سے پہلا حق انتخاب ملا تھا وہ آگے بڑھا اور دیکھتے دیکھتے اس نے سب سے بڑے ظلم و استبداد کو اپنے لیے چن لیا اس کا دماغ چونکہ حماقت اور حرص سے تاریک ہو چکا تھا اس نے انتخاب کرنے سے پہلے سارے معاملہ پر غور نہیں کیا اور پہلی نظر میں یہ بات اسے نہ سجھائی دی کہ منجملہ دیگر برائیوں کے اس کی قسمت میں یہ بھی رقم تھا کہ یہ اپنی اولاد کو خود نگل جائیگا۔ لیکن جب ذرا غور کرنیکا موقع ملا اور اس نے دیکھا کہ اس کی قسمت میں کیا کیا آیا تو لگا چھاتی پیٹنے اور اپنے انتخاب پر رونے دھونے اور پیغمبر کے سابقہ اعلان کو بھول گیا۔ اور بجائے اس کے کہ اپنی بدنصیبی کا الزام خود اپنے کو دے لگا اتفاق اور دیوتاؤں کو ذمہ دار

قرار دیئے، غرض ہر ایک مجرم تھا، بس یہی بے قصور رہ سنو! یہ اُن لوگوں میں سے تھا جو آسمان سے آئے تھے۔ سابقہ زندگی میں یہ ایک نہایت عمدہ منتظم ریاست میں رہ چکا تھا، لیکن اسکی نیکی محض عادت پر مبنی تھی، اس کے پاس کوئی فلسفہ نہ تھا۔ یہی حال اوروں کا تھا جنپر اسی قسم کی افتاد پڑی یعنی ان میں سے اکثر آسمان سے آئے تھے، امتحان آزمائش سے ان کی تعلیم نہ ہوئی تھی۔ ہاں زمین سے آنیوالے چونکہ خود تکلیفیں جھیل چکے تھے، اور دوسروں کو تکلیفیں اٹھاتے بھی دیکھ چکے تھے اس لیے انھیں انتخاب کرنے میں عجلت نہ تھی۔ کچھ تو اس ناتجربہ کاری کے باعث کچھ اس سبب سے کہ چٹھیوں کا نکلنا کچھ اتفاق پر منحصر تھا، بہت سی روحوں نے بری کے بدلے اچھی اور بہتوں نے اچھی کے بجاے بری قسمت پائی۔ ہمارے قاصد کا بیان ہے کہ اگر اس دنیا میں آنے کے بعد انسان اپنے کو تمامتر سچے فلسفہ کے لیے وقف کر دے اور پھر چٹھی نکلنے کے معاملہ میں بھی معمولی سا خوش قسمت ہو تو وہ یہاں خوش رہے اور دوسری زندگی میں اس کا سفر اور پھر وہاں سے دوبارہ واپسی دشوار گزار اور زیر زمین رستوں سے نہ ہو بلکہ نہایت ہموار آسمانی راہوں سے۔ یہ کہتا تھا کہ یہ منظر بھی نہایت حیرت خیز اور عجیب تھا، ایک ہنسی تھی ایک دُکھ۔ اکثر روحوں کا انتخاب سابقہ زندگی کے تجربوں پر مبنی تھا۔ مثلاً اسنے یہاں وہ روح دیکھی جو کبھی آرفیس تھی، اسے چونکہ عورتوں نے قتل کیا تھا اسلیے یہ عورت کے پیٹ سے پیدا ہونیکے خیال ہی سے نفرت کرتا تھا اور عورتوں کی ساری نسل سے اس عداوت کے باعث اسنے ھنس کی زندگی انتخاب کی، اسنے تھامیرا س کی

کی روح کو بھی بلبل کی زندگی منتخب کرتے دیکھا؛ برخلاف اس کے چڑیاں مثلاً ہنس اور دوسرے گانے والے پرند انسان بننا چاہتے تھے؛ جس روح کو بیسواں عدد ملا تھا اس نے شیر کی زندگی پسند کی، یہ اجاکس بن تیلامون کی روح تھی جو اسلیے انسان بننا نہیں چاہتی تھی کہ آسلحہ کے معاملہ میں اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی تھی۔ اسکے بعد اگممنان کی باری تھی؛ اس نے عقاب کی زندگی اختیار کی، کیونکہ اجاکس کی طرح اپنے مصائب کا خیال کرکے یہ بھی انسانی فطرت سے نفور تھا۔ تقریباً بیچ میں اٹلانٹا کا نمبر آیا؛ اسنے ایک کھلاڑی پہلوان کی شہرت جو دیکھی تو اس لالچ کا مقابلہ نہ کرسکی؛ اس کے بعد پنوپیس کے بیٹے ایپیس نے ایک مکار حرافہ عورت کی زندگی اختیار کی؛ آخر میں انتخاب کرنے والوں میں کہیں دور کو مسخرہ تھرسیٹیس بھی تھا، اسنے بندر کی شکل قبول کی۔ اب اوڈیسیس کی روح آئی کہ اس کا نمبر آخری تھا اور اسے ابھی اپنے لیے انتخاب کرنا تھا۔ سابقہ مشقتوں کی یاد نے اسکے حوصلہ کو پست کردیا تھا، یہ بڑی دیر تک ادھر ادھر ایک خانگی آدمی کی زندگی ڈھونڈھتا پھرا جسے کوئی غم و فکر نہ ہو۔ اسکے ملنے میں ذرا دشواری ہوئی، یہ کہیں ایک طرف کو پڑی تھی اور سبھوں نے اس کا ذرا خیال نہ کیا تھا۔ یہ جو اس زندگی کو دیکھ پایا تو بولا کہ اگر مجھے بجائے آخری کے اول حق انتخاب ملتا تو بھی میں اسی زندگی کو منتخب کرتا، اور اسے پاکر واقعی بڑا خوش تھا۔ یہی نہیں کہ آدمی ہی جانوروں کی زندگیاں اختیار کرتے تھے، میں یہ بھی ضرور کہدوں کہ جنگلی اور پالتو

جانور آپس میں بھی اپنی زندگیاں بدل رہے تھے اور اپنی طبیعت کے مطابق انسانی زندگیاں بھی اختیار کرتے تھے، مثلاً اچھے نرم مزاج بھلے مانسوں کی زندگی، اور بڑے وحشیوں کی، غرض طرح طرح اور ہر ممکن طریقہ سے۔ اب جب سب روحیں اپنی اپنی زندگی منتخب کر چکیں تو بہ ترتیب انتخاب لیکیسس کے سامنے پہونچیں۔ لیکیسس نے ان کے ساتھ وہ فرشتہ کر دیا جو ہر ایک نے منتخب کیا تھا، تاکہ یہ ان کی زندگی کا نگہبان رہے اور ان کے انتخاب کو پورا کرے۔ یہ فرشتہ پہلے تو انھیں کلوتھو کے روبرو لے گیا اور یہ اپنے ہاتھ سے جس تکلے کو چلا رہی تھی اس میں رکھکر انھیں چکر دیا اور اس طرح گویا ہر ایک کی قسمت کی تصدیق ہوگئی۔ پھر خود تکلے کو چھو کر یہ انہیں اتروپوس کے پاس لے گیا جو (قسمت کے) ڈورے کاٹ رہی تھی تاکہ یہ ناقابل تغیر ہو جائے۔ یہاں سے یہ بے منھ پھیرے جبر و لزوم کے تخت کے تلے سے گذرے جب سب اسکے نیچے سے نکل لیے تو خود فراموشی کے جلتے تپتے میدان میں پہونچے، یہ ایک چٹیل میدان تھا جس میں نہ درخت کا پتہ نہ سبزہ کا۔ شام ہوتے ہوتے دریائے تغافل کے کنارے پڑاؤ کیا۔ اس دریا کا پانی کسی برتن میں نہ سماتا تھا، ہر ایک کو مجبور کیا گیا کہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی پئیں، جنھیں عقل نے نہیں سنبھالا وہ ضرورت سے زیادہ پی گئے۔ اسکے پیتے ہی سب کے سب ساری باتیں بھول گئے۔ سب کے سب مصروف خواب تھے کہ آدھی رات کو برق و باد کا طوفان اور زلزلہ شروع ہوا اور جیسے ٹوٹے ہوئے تارے ادھر ادھر ہو جاتے ہیں یہ بھی دیکھتے دیکھتے مختلف راستوں سے اپنی

جائے ولادت تک پہنچا دئے گئے۔ ہمارے قاصد کو یہ پانی البتہ نہیں پینے دیا۔ لیکن یہ کیونکر اور کس طرح پھر جسم میں واپس آیا اس کا خود اسے پتہ نہیں، صبح جو یک بیک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ تابوت پر بیٹھا ہے۔

غرض گلاکن (لاج رہ گئی) اور قصہ بچ گیا فنا نہیں ہوا۔ اب اگر ہم بھی قول کے تابع رہیں تو یہ ہمیں بھی بچا لے اور ہم اطمینان سے بلا اپنی روح کو آلودہ کئے دریائے تغافل پر سے گذر جائیں۔ لہذا میرا مشورہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس آسمانی راہ پر ثابت قدم رہیں، ہمیشہ عدل اور خیر کا تتبع کریں، اور یقین رکھیں کہ روح غیر فانی ہے اور ہر طرح کی اچھائی نیز ہر طرح کی برائی برداشت کر سکتی ہے۔ یوں ہم ایک دوسرے کی نظر میں بھی عزیز رہیں گے اور دیوتاؤں کی نگاہ میں بھی، جب تک یہاں ہیں تو یہاں اور اس وقت بھی جب انعام لینے کے لیے ہم ان کھیل میں بازی جیتنے والوں کی طرح جائیں گے جو تحائف جمع کرنے کے لیے چکر لگاتے ہیں۔ اس سے اس زندگی میں بھی ہمارا بھلا ہوگا اور اس ہزار سالہ سفر میں بھی جسے ہم ابھی بیان کر رہے تھے۔

تمام شد